

حاضر غائب

اظہر کلیم ایم اے

وہ غائب ہونا چاہتا تو حاضر ہو جاتا
حاضر ہونا چاہتا تو غائب ہو جاتا
ایک مرد بدحواس کی داستانِ حیرت
شگوفے، پھل پھڑیاں اور بتاشے

قسم کے ناول، ماماندا اعظم، بچوں کی کہانیاں، مہراں سیریز
آئیڈیل پبلشرز
 0301-7283296
 0334-9630911
 عظیم احمد طارق
 نزد مہندہ کمر سمانیہ

حاضر غائب

قبقبیوں سے گناہی ہوئی تدبیر :-
 اداس اور غمگین قارئین کے لیے ایک غم گسار
 کہانی

ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میں کریک ہوں۔ میں نو جوان تھا لیکن میرا نہ تو کوئی دوست تھا اور نہ ہی کوئی سوشل لائف تھی۔ جوانی کا بڑا حصہ میں نے کباڑیوں کی دکانوں اور ٹھیلوں کی نذر کر دیا۔ کباڑی کا یہ مطلب نہ لیجئے گا کہ میں ٹین ڈبے، رومی کاغذ اور پرانے کنسترو فروخت کرنے والوں یا شیر شاہ کی کباڑی مارکیٹ والوں پر فدا تھا۔ دراصل مجھے پرانی کتابوں سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی بھی بلا وجہ نہیں تھی۔ لیکن میں اس سلسلے میں کسی کو کچھ بتا نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ جب لوگ میرا مذاق اڑانے لگتے تو کبھی میں مسکرا کر ٹال جاتا اور کبھی ٹال کر مسکرا دیتا تھا۔ پرانی کتابیں فروخت کرنے والے تمام کباڑی، میری اس کمزوری سے آگاہ تھے۔ ان کے خیال میں، میں ایک مرغ نایاب تھا، جسے تقدیر نے ان کی طرف سے پھانس رکھا تھا۔ کباڑی مجھے دیکھتے ہی رومی کتابیں دانستہ اس طرح چھپانے کی کوشش کرتے کہ یہ کوشش بہر حال میری نگاہ میں آ جاتی۔ اپنی دانست میں وہ گویا میرے تجسس کو ہوا دینے میں جان بوجھ کر انہی کتابوں پر جھپٹتا تو وہ جھینپ کر زیر لب گویا تاویل پیش کرتے۔ ”بڑا پرانا نسخہ ہے۔ جناب خود میں نے بہت مہنگے داموں خریدا ہے۔“ اور وہ کتابیں واقعی بے حد بوسیدہ اور کرم خوردہ ثابت ہوتیں۔ کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہی اس کا اچھا خاصا حصہ جھڑ جاتا۔ بعض کتابیں تو گھر پہنچتے پہنچتے ہی معدوم ہو جاتیں اور ہاتھوں میں صرف مہک رہ جاتی جو پرانی کتابوں سے مشروط ہوتی ہے ایسی کتابیں درحقیقت پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ سونگھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ میں اتنا تجربہ کار ہو گیا کہ کتاب سونگھ کر اس کی عمر کا اندازہ لگا لیتا تھا۔

”وہ ابھی شکم مادر میں بھی نہیں ہے۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”اور ام عمران کہاں ہے؟“ انہی تعلیم یافتہ صاحب نے اصرار کیا۔ ”اسے البتہ شکم مادر میں ہونا چاہئے۔“ میں نے دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے کہا۔ ”میاں بیوی کی عمر میں بیس سال کا فرق تو ہونا چاہئے۔“ ”درست ہے۔“ وہ صاحب فاضل لہجے میں بولے۔ ”تو میرے بھائی..... جب تمہارے بیٹے اور اس کی ماں کا وجود ہی نہیں ہے تو تم ابو العمران کیسے بن گئے؟“

یہی سب کچھ ہوتا رہا حتیٰ کہ میرا محل جواب دینے لگا۔ طبعاً میں ایک امن پسند آدمی ہوں۔ بیشتر لوگ مجھے بزدل بھی کہتے ہوں گے برہمی کے عالم میں بھی میں کسی کا سرو نہیں پھاڑ سکتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے اپنا آبائی مکان فروخت کر دیا اور ایک نئی بستی میں نیا مکان خرید لیا۔ وہاں کے لوگوں نے مجھے پہلے ہی دن ابو العمران کے نام سے قبول کر لیا..... ہاں تو میرا نام ابو العمران ہے اور میری کہانی ان دنوں سے شروع ہوتی ہے، جب میرے ذہن میں کامیاب اور اعلا زندگی گزارنے کا خیال پیدا ہوا۔ فی زمانہ ایسی زندگی اختیار کرنے کے کئی مروجہ طریقے ہیں۔ مثلاً کسی ایسے محکمے میں ملازمت کا حصول، جہاں فضل رنی کا دور دورہ ہو، امیر باپ کی چھوڑی ہوئی دولت، مال دار بیوہ سے محبت یا پھر شادی..... اور بھی بہت سے طریقے ہیں لیکن جو طریقہ میں نے سوچا، وہ بے حد مختلف اور منفرد تھا۔ پرانی کتابوں کی تلاش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ایک روز ایک کباڑی نے بہت ہی ضخیم لیکن بے حد بوسیدہ کتاب میرے سامنے اس انداز میں رکھ دی جیسے وہ کتاب پیش کر کے میری سات پشتوں پر احسان کر رہا ہو۔ ”یہ لیجیے جناب، بڑی مشکل سے آپ کے مطلب کی کتاب ہاتھ لگی ہے۔“ اس نے فاضلانہ لہجے میں کہا۔

”کس موضوع پر ہے؟“ میں نے چونکہ کر پوچھا۔ ”وہی آپ کا پسندیدہ موضوع..... یعنی کھانا پکانے کی ترکیبیں۔ اس کتاب میں ہنگری اور بلغاریہ کے کھانوں کی ترکیبیں لکھی ہیں۔“

جی تو چاہا کہ وہ پرانی کتاب اٹھا کر اس کی کھوپڑی پر دے ماروں۔ کم بخت مجھے باورچی سمجھ بیٹھا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کے چوڑے چکلے سینے پر نظر ڈالی تو میری یہ خواہش جھجک کی طرح بیٹھ گئی۔ عقل مند کی کاہلی تقاضا تھا اور میں بہر حال خود کو عقل مند سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں مسکرا دیا۔ ”تم نے تو کمال کر دیا بھائی۔“ میں نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”کیا قیمت ہوگی، اس کی؟“

”سستی ہے، صاحب۔“ اس نے دانت نکال کر دام بتائے۔ ”صرف بیس روپے۔“ اس کے دانتوں کا منظر میری صحت کے لیے مضر بھی ثابت ہو سکتا تھا، چنانچہ میں نے بیس

دراصل مجھے مخصوص قسم کی کتابوں کی ضرورت تھی۔ کباڑیوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ غصہ کے قیافہ شناس ہوتے ہیں اور خریدار کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوتے ہی چیز کی قیمت کا تعین کرنے لگتے ہیں۔ لہذا انہیں بے خبر رکھنے کے لیے میں بہت کم خصوصی دلچسپی لیتا بلکہ بعض اوقات تو ناٹھیل تک دیکھنا گوارہ نہ کرتا۔ وہ منہ پھاڑ کر قیمت بتاتے اور میں منہ پھیر کر بے نیازی سے چل دیتا۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھ گئے کہ میں صرف سستی کتابوں کا خریدار ہوں، خواہ وہ کسی بھی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس طرح مجھے سستی لیکن الم علم کتابیں تو خریدنا پڑ جاتیں لیکن کسی بھی کباڑی کو یہ اندازہ نہ ہوتا کہ مجھے دراصل کس موضوع پر کتابیں درکار ہیں۔

میرا نام ابو العمران ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن میں عمران نامی بیٹے کا باپ ضرور بنوں گا۔ ویسے والد بزرگوار نے میرا نام عید محمد رکھا تھا چنانچہ میٹرک تک میں عیدو کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ کالج لائف میں یکا یک یہ احساس ہوا کہ میرا نام آؤٹ آف ڈیٹ ہے تو بڑی الجھن پیدا ہو گئی۔ ان دنوں، ابن، کا بڑا زور تھا لیکن اس میں بھی ایک دشواری تھی۔ ابن رمضان بھی کچھ اچھا نام نہیں تھا۔ دوسری طرف والد صاحب جیسے بھی تھے، بہر حال میرے والد تھے اور میں ولدیت تبدیل کرنے کا قائل نہیں تھا۔ بہر حال، اسی الجھن میں، میں نے بی ایس سی آنرز کر لیا..... پھر اس سے پہلے کہ میری شادی ہوتی، میں صاحب اولاد ہوتا اور میرے والدین میری اولاد زینہ کا نام محرم علی تجویز کرتے، دونوں ہی یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دے گئے۔ پہلے میں اکلوتا تھا، ان کے بعد بھکوتا رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ نام بدلنے کے لیے یہ سب سے مناسب موقع ہے..... پھر خیال آیا کہ یہ نام تو میرے والدین کی نشانی ہے۔ میں از سر نو سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے بہر حال اپنے بیٹے کا نام رکھنے کا حق ہے لہذا میں نے اپنے نامو موجود بیٹے کا نام عمران احمد تجویز کیا اور خود ابو العمران بن بیٹھا۔ اخباروں میں اشتہار شائع کرائے، پھر بورڈ اور یونیورسٹی کورڈ خواتین دیں اور یوں بہ ہزار وقت اسناد پر بھی میرا نام تبدیل ہو گیا لیکن محلے والے یہ نیا نام ہضم نہ کر سکے۔

میں بے حد تحمل مزاج اور بہت ہی ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں، لیکن ایک پڑھے لکھے معزز آدمی کے لیے ابے عیدو، اوئے عیدو، کب تک برداشت کیا جاسکتا ہے۔ ہوتا یوں کہ میں اخبار میں اپنے اشتہار کا تراشہ دکھاتے ہوئے کسی بے تکلف بزرگ کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ اب میں عید محمد نہیں بلکہ ابو العمران ہوں تو اتنے میں کوئی میرے کندھے پر ہاتھ کا لٹھر سید کرتے ہوئے کہتا۔ ”اے عیدو، تو تو عید کا چاند ہو گیا ہے۔“ میں مارے غصے کے لرز کر رہ جاتا۔ لیکن صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا۔ ایسے جاہل لوگوں کو بھلا سمجھایا بھی کیسے جاسکتا ہے۔ محلے کے کچھ لوگ پڑھے لکھے بھی تھے، وہ اور طرح الجھتے۔ ”اچھا، میں تمہیں ابو العمران مان لوں گا۔ یہ بتاؤ کہ عمران کہاں ہے؟“

روپے ادا کئے اور کتاب لے کر گھر آ گیا۔

کچھ دن بعد یونہی اس کتاب کو پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس میں بہت سی ترکیبیں لکھی ہوئی تھیں، لیکن سب سے آسان مجھے باناباغ تاشا کی ترکیب لگی۔ کتاب میں دوا لکھا گیا تھا کہ یہ بلغاریہ کی مقبول ترین ڈش ہے۔ بس میرے دل میں اچانک ہی یہ ڈش پکانے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ بھاگ کر بازار سے دو کلو گوشت خرید لایا۔ بڑے پتے پڑوس سے حاصل کئے اور ترکیب کے مطابق، خاصی گوند پیس کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ ابھی ڈش تیار کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ نعت اللہ صاحب تشریف لائے۔ نعت صاحب زبردستی میرے دوست بن بیٹھے تھے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ بلغاریہ کو تو لیے برآمد کرنے کی وجہ سے انہیں بلغاریہ سے خصوصی نسبت تھی۔ میں نے ڈش ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ کبھی ڈش کو گھورتے اور کبھی مجھے گھورنے لگے..... دھیرے دھیرے ان کی نظریں سوالیہ ہوتی گئیں۔

میں خاموش رہا۔

”یہ تو کوئی خمیرہ معلوم ہوتا ہے؟“ بلا خرا نہوں نے تبصرہ کیا۔

”یہ باناباغ تاشا ہے، جناب۔“ میں نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ بلغاریہ کی مقبول ترین ڈش ہے۔ آپ تو ویسے بھی بلغاریہ والوں کی خوش خوراکی اور خوش ذوقی کے شدت سے قائل ہیں۔“

”یقیناً یقیناً۔“ نعت صاحب نے یوں گردن ہلائی جیسے بلغاریہ، انہوں نے دریافت کیا تھا۔ ”میں اس ڈش سے خوب واقف ہوں، بلکہ یہ مجھے بے حد مرغوب ہے۔“

”تو پھر بسم اللہ۔“ میں نے پلیٹ ان کی طرف بڑھادی۔

انہوں نے ایک بڑا سالقمہ منہ میں ڈالا۔ پھر وہ لقمہ غالباً جزو دہن ہو گیا۔ انہوں نے جیسے جیسے چبانے کی کوشش کی ویسے ویسے بلغاریہ ان سے چمٹتا چلا گیا۔ اس کوشش میں ان کی آنکھیں تک ابل پڑیں۔ بلا آخر جب انہوں نے بہت زور لگایا تو باناباغ تاشا ان کے دو دانتوں سمیت باہر نکل آیا۔

بلغاریہ انہیں بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ اس طرح گھبرا کر بھاگے جیسے بلغاریہ کی پوری فوج ان کے پیچھے لگی ہوئی ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے بلغاریہ سے کاروباری تعلقات ہی ختم کر لیے۔

خیر، صاحب..... مدتوں مجھے اپنے مطلب کی کتاب نہ مل سکی..... لیکن ٹھہریے، بہتر ہوگا، میں آپ کو بتا دوں کہ مجھے کون سی کتاب درکار تھی اور میں اس کی تلاش میں کیوں مارا مارا پھر رہا تھا۔

والدین کے انتقال کے بعد نقل مکانی کے موقع پر مجھے ایک بے حد قدیم قلمی نسخہ ملا تھا۔

کتاب عربی زبان میں تھی۔ موضوع میرے لیے پرکشش تھا۔ میں کیمسٹری میں آنرز ہوں، اس لیے کتاب کیمیا میری کمزوری تھی۔ کلر کی کرنے کے باوجود میں خود کو مستقبل کا ایک عظیم موجد خیال کرتا ہوں۔ کسی حد تک عربی بھی جانتا ہوں۔ لہذا عربی، اردو لغات کی مدد سے میں نے وہ کتاب پڑھ ڈالی۔ کتاب کارآمد تھی۔ اس میں ایسی دواؤں کے نسخے دیے گئے تھے جو انسان میں مخصوص جذبے ابھار سکتی ہیں۔ یعنی دوا کے ذریعے کسی بزدل ترین انسان کو بہادر بنایا جاسکتا تھا۔ وہ دوا میں زیادہ تر یونانی مرکبات و جراثیم پر مشتمل تھیں۔

میں نے دفتر سے پندرہ دن کی چھٹی لی۔ سب سے پہلے وہ تمام جڑی بوئیاں خریدیں، جن کے بغیر ان نسخوں کی تکمیل ناممکن تھی۔ پھر میں نے تجرباتی طور پر بہادری کی دوا پر کام شروع کر دیا۔ دس دن کی ان تھک محنت کے بعد نسخہ تیار ہو گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے آزما یا کس طرح جائے؟ کتاب میں ہر دوا کے مضر اثرات کے لیے تریاق بھی تحریر تھا۔ اس کے باوجود میں اسے استعمال کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں دوائے دلیری استعمال کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں باقر بھائی کا چہرہ گھوم گیا۔ باقر بھائی ایسے آدمی تھے کہ بزدلی ان کے مقابل احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہوگی۔ لیکن آپ یہ بات اتنی آسانی سے نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں آپ کو ان کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔

باقر بھائی میرے گھر کے برابر ہی رہتے ہیں۔ ایک رات دو بجے کے قریب میرے دروازے پر دھاک ہونے لگے۔ میں سوتے سے بوکھا کراٹھا اور دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باقر بھائی پسینے سے شرابور کھڑے ہیں۔ پلٹ پلٹ کر اپنے دروازے کی طرف بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ میں انہیں گھر کے اندر لایا اور کرسی پر بٹھا کر ان کی خدمت میں پانی پیش کیا۔ ان کے حلق سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پانی پی چکے تو کچھ جان میں جان آئی۔

”اب بتائیے باقر بھائی کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ ہکلا کر رہ گئے اور ان کے منہ سے کوئی بامعنی آواز نہ نکل سکی۔ میں انہیں دلاس دیتا رہا اور حوصلہ بڑھاتا رہا حتیٰ کہ وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہو گئے؟ ”میاں..... اچھا بھئیہ..... بھلا سورا تھا۔“ انہوں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”سوتے سوتے لحاف کے اندر کسی سے میرا ہاتھ ٹکرایا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں بہت محتاط آدمی ہوں۔ فوراً آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ کوئی بچہ ہوگا۔ لیکن میاں، پھر جو ہاتھ لگایا تو پتہ چلا کہ وہ پتھر کی طرح ٹھوس کوئی جسم ہے۔ بیوی کے بستر کی طرف نظر ڈالی تو وہ، دونوں بچوں کے ساتھ بے خبر سو رہی تھی۔ بس، میری، تو کھٹکی بندھ گئی۔ آواز بھی نہ لگی۔ جیسے تیسے بستر سے نکلا اور تمہارے پاس چلا آیا۔“

”اور بیوی بچوں کو وہیں اس نامعلوم شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے۔“ مجھے غصہ آ گیا۔

”بے حد بزدل ہیں، آپ۔“

”تو اور کیا کرتا۔ انہی کی حفاظت کے خیال سے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔ خود غرض ہوتا تو سرپٹ بھانتا اور پلٹ کر بھی نہ آتا۔ لعنت ہو ایسی بیوی پر جو شوہر کو زہر دوکوب کرتی ہو اور بچوں پر جو باپ کی عزت نہ کرتے ہوں۔ وہ تو میاں، شریف آدمی ہوں ورنہ.....“

ان سے بات کرنا فضول تھا۔ چنانچہ میں ان کو ساتھ لے کر گھر سے نکلا اور دبے پاؤں ان کے باں داخل ہو گیا۔ خواب گاہ میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نگاہوں کو اس ملگجی روشنی کا عادی ہونے میں کچھ دیر لگ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان کی بیوی اور دونوں بچے واقعی مسہری پر پڑے سو رہے تھے اور باقر بھائی کے بستر میں کوئی لحاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ یعنی صورت حال بے حد سنگین تھی۔ خود میں بھی زیادہ بہادر آدمی نہیں ہوں لیکن باقر بھائی کے سامنے تو گیدر بھی شیر ہو جاتے ہیں۔

پہلے تو جی میں آئی کہ محلے والوں کو اٹھالیا جائے لیکن رات کے ڈھائی بجے کوئی اتنی آسانی سے نہیں اٹھتا۔ شور مچانے میں یہ قیامت تھی کہ باقر بھائی کے بستر پر جو کوئی بھی تھا، فی الحال ساکت تھا۔ وہ شور و غل سن کر اٹھ جاتا اور ہمارے ساتھ ساتھ باقر بھائی کے بیوی بچے بھی خطرے میں پڑ جاتے گویا ہم دونوں ہی کو کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور ہمیں بھی کیا، صرف مجھے ہی کچھ کرنا تھا کیونکہ باقر بھائی تو یوں لرز رہے تھے، جیسے ان کا وجود کسی طاقت ور زلزلے کا مرکز بن گیا ہو، میرے بھی دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ لیکن میں نے ہمت کر کے ایک ڈنڈا سنبھالا اور لرزتی ہوئی سرگوشی میں باقر بھائی سے کہا کہ وہ لحاف الٹ دیں، لیکن وہ تو بس کھڑے لرزتے ہی رہے۔ ناچار میں نے ہی اپنے ایک کیکپاتے ہوئے ہاتھ سے ڈنڈا بلند کیا اور دوسرے ہاتھ کی مدد سے، ایک جھٹکے کے ساتھ لحاف کھینچ لیا۔ ساتھ ہی میرا ڈنڈا والا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور ڈنڈا پوری قوت سے اس ٹھوس جسم پر پڑا، جس نے باقر بھائی کے ساتھ خواہ مخواہ احت ہونے کی جسارت کی تھی۔

معاذ اللہ! منہ سے بے ساختہ آواز بلند احوال نکل گئی اور باقر بھائی کے حلق سے ایک تند چیخ برآمد ہوئی۔ اس کا خطرناک رد عمل یہ نکلا کہ مسز باقر کی آنکھ کھل گئی۔ ڈنڈا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پہلے پہل تو مسز باقر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ بس خالی خالی نظروں سے کبھی مجھے دیکھیں اور کبھی باقر بھائی کو..... اور کبھی گاؤں تک پہنچنے پر پڑے ڈنڈے کو گھورنے لگیں..... پھر اس سے پہلے کہ وہ سب کچھ سمجھتیں، میں نے پاؤں سر پر رکھے اور بھاگ اٹھا۔ اب جو کچھ وہاں شروع ہونے والا تھا، اس کی روداد میں اپنے گھر سے بھی سن سکتا تھا اور آئے دن سنتا ہی رہتا تھا۔

امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں کہ باقر بھائی کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ پھر بھی میں سمجھائے دیتا ہوں۔ باقر بھائی جاگتے وقت اس گاؤں تک پہنچنے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، جوان کی بیوی کے برتاؤ

کی بہ نسبت قدرے کم سخت تھا..... پھر وہ اسی طرح سو گئے۔ رات میں سردی کا احساس ہوا تو انہوں نے نیند کے عالم میں لحاف کھینچ لیا۔ یوں گاؤں تک پہنچ گیا، حتیٰ کہ سوتے میں باقر بھائی کا ہاتھ اس سے چھو گیا اور ان کی فطری برادری نے انہیں بستر چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس رات میں چار بجے تک نہ سو سکا کیونکہ مسز باقر اور باقر بھائی کے درمیان ہمیشہ کی طرح ایک طرف ذہنی اسٹائل شروع ہو گئی تھی۔

تو یہ تھے باقر بھائی..... ستم بالا ستم یہ کہ انہیں بہت ہی تند خو بیوی ملی جو ان کی مرمت کرنے سے بھی نہیں بچکتی تھی۔ تقریباً ہر روز یہ پروگرام ہوتا، وہ لمبلاتے ہوئے میرے پاس آتے اور فریادیں کیا کرتے تھے۔ میں سننے پر مجبور تھا، کیونکہ پڑوسیوں کے حقوق باقر بھائی کے پاس تھے اور فرائض میرے ذمے بہر حال، بہادری کی دوا آزمانے کے لیے باقر بھائی سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ اگلے روز وہ حسب معمول لمبلاتے اور فریادیں کرتے نازل ہوئے تو میں نے شربت جانفزا میں ملا کر، دوائے دلیری کی ایک خوراک انہیں پلا دی۔

”بڑا عجیب سا ذائقہ ہے شربت کا۔“ پورا گلاس ڈکارنے کے بعد باقر بھائی نے تبصرہ کیا۔ ”شربت ٹھیک ٹھاک ہے۔ منہ کا ذائقہ ہی کچھ خراب ہو رہا ہوگا۔“ میں نے سادگی سے کہا اور وہ جھینپ کر چپ ہو گئے۔

اگلی شام گلی کے موڑ پر باقر بھائی سے ملاقات ہوئی تو وہ حسب معمول سہمے سہمے سے ایک طرف چلے جا رہے تھے۔ میں نے آواز دے کر روک لیا اور مزاج پر سی کی۔ مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ ان کے چہرے پر اب بھی کسی شیر خوار بچے جیسی بے بسی نظر آرہی تھی۔

”جج..... جی..... بل..... بالکل ٹھیک ہوں، میاں۔“ انہوں نے کن آنکھوں سے ایک مرغی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مرغابے حد کھنکھاتا تھا اور خود مجھے بھی اس سے خوف آتا تھا۔ بہر حال، مرغی نے ایک طویل انگڑائی لے کر بانگ دی اور پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا تو میری بھی جان میں جان آئی اور باقر بھائی کے چہرے پر بھی ہلاکت کی لہر دوڑ گئی۔

اچانک محلے کا غنڈہ برکت ٹہلتا ہوا آ گیا۔ لوگ اس سے کچھ کتراتے تھے۔ زیادہ اس لیے نہیں کتراتے تھے کہ گریز کو کہیں لاگ تصور نہ کر لیا جائے۔ ”کیا حال ہے، جو روکے غلام؟“ اس نے حسب عادت باقر بھائی کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

مجھے پہلی بار، باقر بھائی کے چہرے پر دبا دبا سا احتجاج نظر آیا لیکن وہ خاموش رہے۔

”ابے..... وہ میری بیوی ہوئی نا تو میں.....“

”بکواس مت کرو۔“ باقر بھائی نے اچانک ہی اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

برکت بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ پھر حیرت کی جگہ خونخواری نے لے لی۔ ”اے، کیا دماغ خراب ہو گیا۔“ برکت نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

اس بار باقر بھائی نے بے حد غیر متوقع حرکت کی۔ انہوں نے برکت کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر روکا اور دائیں ہاتھ سے اس کی تھوڑی پر ایک زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ برکت کو ایسی کسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑاکر ز میں بوس ہو گیا۔ باقر بھائی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں اور سر پر کئی ٹھوکریں رسید کر دیں۔ برکت نے شاید بے ہوش ہونے میں عافیت سمجھی۔ باقر بھائی اب پنجابی فلموں کے کسی ولن کی طرح بڑکیں لگا رہے تھے۔ سارا مغلہ جمع ہو گیا۔ اچانک باقر بھائی چیختے دھاڑتے اپنے گھر کی طرف دوڑے اور کچھ ہی دیر بعد ان کے گھر سے بیوی کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ میں نے تیزی سے اپنے گھر کا رخ کیا۔ دوا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مؤثر ثابت ہوئی تھی۔ ایک ہی خوراک میں بزدل باقر بھائی نے دلیری کی سرحدیں پار کر کے غنڈہ گردی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے بیوی کے بعد محلے کے تین چار آدمیوں کو بھی زخمی کر دیا تھا اور بات تھانے تک پہنچ گئی تھی۔

ایک شام میں گہری سوچ میں ڈوبا، اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے دروازے پر کوئی ہاتھی بغرض ملاقات تشریف لایا ہو اور وہ اپنے بھاری بھر کم پاؤں کی ٹھوکروں سے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ میں چونک پڑا اور اچھل کر باہر دوڑا۔ دیکھا تو اس نامعلوم دستک پر احتجاج کرتے ہوئے کواڑ اپنے قبضوں پر جھولنے لگے تھے۔ میں نے جلدی سے کنڈی کھول دی۔

سامنے باقر بھائی کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور بھوؤں نے قوسی حالت میں اوپر اٹھ کر پیشانی پر دو محرابیں بنا دی تھیں۔ ان کے ہونٹوں کے پائیں گوشے میں ایک بجھی ہوئی سگریٹ، پھانسی کے پھندے پر لٹکی کسی لاش کی مانند جھول رہی تھی۔ تیور بے حد خطرناک تھے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

”بب..... بابا..... قمر..... بھائی.....“ میں نے بولنا چاہا لیکن بھلا کر رہ گیا۔ انہوں نے اپنا پھاؤڑے جیسا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر پیچھے دھکیلا اور اندر آ گئے۔

میں نے لرزاتے ہاتھوں سے دروازہ بند کیا اور ان کے پیچھے لپک لیا۔

وہ کمرے میں پہنچ کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

”کہاں ہے، وہ بوتل؟“ انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

”بب..... بوتل؟“ میں نے چونک کر وضاحت چاہی۔

”سنو یار۔“ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سب سمجھ گیا

ہوں۔“ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ”یہ اسی شربت کا کرشمہ ہے، نا؟“

میں ہکا بکا کھڑا ان کی صورت تکٹا رہا۔

”لاؤ..... میں اس شربت کا ایک گلاس اور پینا چاہتا ہوں۔“ مجھے تذبذب میں دیکھ کر ان کا لہجہ تحکم آمیز ہو گیا۔

”لیکن وہ تو..... وہ تو ختم ہو گیا۔“ میں نے جلدی سے بہانہ کر دیا..... اور پھر چیختا ہوا چارپائی پر جاگرا۔ باقر بھائی نے اٹنے ہاتھ کا کمال دکھایا تھا اور جہاں چوٹ لگی تھی وہاں سے میں خود کو ٹوٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ”آپ اس شربت کے بارے میں کیا فرما رہے تھے، باقر بھائی۔“

”اس نے میری کایا پلٹ دی ہے۔ مجھ میں دلیری آ گئی ہے۔“

”اس سلسلے میں تو آپ کو میرا احسان مند ہونا چاہئے تھا۔“ میں نے کراہ کر کہا۔ ”لیکن آپ ہیں کہ مجھے ہی تختہ مشق بنا رہے ہیں۔“

”زیادہ بک بک کی تو بیسی نکال کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔“ وہ گرج اٹھے۔

”میں آپ کو وہ شربت نہیں دوں گا۔“ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

”اوہ، تمہاری یہ مجال.....“ انہوں نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ ”نکالتے ہو بوتل یا دوں ایک اور ہاتھ۔“

میں لرزتا ہوا الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری میں دوائے دلیری اور اس کا تریاق، دونوں شیشیاں قریب قریب پڑی تھیں۔ میرا ہاتھ دلیری کی دوا کی طرف بڑھتے بڑھتے کانپ گیا۔ ایک خوراک کے بعد وہ ہر کسی پر ہاتھ چھوڑنے لگے تھے، دوسری خوراک کہیں قتل و غارت گری ہی شروع نہ کروادے۔ میں نے خوفزدہ ہو کر سوچا اور میرا ہاتھ بے اختیار تریاق کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کے چند قطرے شربت میں ملائے اور گلاس باقر بھائی کی طرف بڑھا دیا۔

ایک ہی سانس میں گلاس خالی کرنے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا، مسکرائے میں نے انہیں بٹھایا اور دنیا کی کارآمد ترین راہ اختیار کی..... چالپوسی..... وہ رام ہوتے چلے گئے۔ شروع شروع میں تو ان کی حالت کسی غصیلے، بلڈ ہاؤنڈ جیسی تھی لیکن رفتہ رفتہ کسی بے ضرر پلے کی حالت اختیار کر گئے۔ حتیٰ کہ جب میں انہیں دروازے تک چھوڑنے لگا کہ ایک دو ٹکڑے سے ہاتھ رسید کر کے ہی رخصت کروں گا..... لیکن میرا ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ کچھ تو اخلاقی تقاضے تھے اور کچھ یہ خیال دامن گیر رہا کہ بے چارے باقر بھائی ملک بار پھر اپنی بیگم کے لیے تختہ مشق بن جائیں گے اور اس بار محترمہ کے دست کمال میں انتقام کا جذبہ بھی شامل ہو گا۔ اس بے چارے کو تو چند روزہ بادشاہت ملی تھی۔ گویا اس نے محض ایک خواب دیکھا تھا..... اور آنکھ

کھلتے ہی سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلے تھا۔
بہر حال، میں اپنے تجربے کی کامیابی پر خوش تھا اور اب میں دوسری دوائیں بھی آزمانا چاہتا تھا۔

پہلے میں نے سچائی کی دوا تیار کرنے کا بیڑہ اٹھایا میں نے مزید چھٹی کے لیے درخواست کے ساتھ میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی دفتر بھیجا اور خود کو اپنی تجربہ گاہ تک محدود کر لیا۔ اس بار دوا کی تیاری میں نسبتاً کم وقت لگا۔ دوا تیار ہو گئی تو میں نے خود پر تجربہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ظاہر ہے، سچائی ایک بہت بڑی اور پسندیدہ صفت ہے۔ دلیری میں تو بہر حال جان کا خطرہ بھی تھا۔ لیکن سچائی میں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے دوا اور اس کا توڑ تیار کر کے دوا لگ الگ شیشیوں میں بھر لیا اور پھر ایک خوراک دوائے صداقت حلق سے اتار لی۔
دوا میں نے صبح کے وقت چلی تھی۔ شام تک اس کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ شام کو میں گھر سے نکل گیا۔ شد و حلوائی کی طرف جاتے ہوئے مجھے گلی میں بھیڑ دکھائی دی۔ میں جس کے تحت رک گیا۔ محلے کے چند نوجوان کسی اجنبی کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ اجنبی نے ملک صاحب کی صاحبزادی نو شاہ کو چھیڑ دیا تھا اور اب سزا جھگڑ رہا ہے۔
”معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے، صاحب۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”نو شاہ نے ان صاحب کو چھیڑا ہوگا۔“
مارنے والوں کے ہاتھ اس مشین کی طرح رک گئے جس کا سوئچ اچانک ہی آف کر دیا گیا ہو۔

”کک..... کیا بکواس ہے، یہ؟“ محلے کا نوجوان عسکری غرا کر بولا۔
”یار عسکری، تم تو خوب جانتے ہو۔ کئی مرتبہ میں نے آدھی رات کو تمہیں نو شاہ کا ہاتھ تھامے سرگوشیاں کرتے دیکھا ہے۔ ارے بھائی، تمہاری تو خطوط بازی.....“
”پاگل ہو گئے ہو، کیا؟“ انور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔
”تم چپ رہو، ورنہ میں تمہارے اور فرزانہ کے متعلق بتا دوں گا۔“ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ انور کا رنگ اڑ گیا۔
مارکھانے والا اجنبی اس دوران میں چپکے سے کھسک جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سب لوگ اب میری طرف متوجہ تھے۔

”تم نے میری بیٹی کا نام کیسے لیا؟“ فرزانہ کے والد منھیاں بھیج کر میری طرف لپکے۔
”جی..... میں بھول گیا تھا۔ مجھے پہلے بڑی والی کا تذکرہ کرنا چاہئے تھا۔ شاہنہ ساجد کے ساتھ اکثر کلشن گھومنے جاتی ہے۔“
بڑے میاں آپے سے باہر ہو گئے اور دباڑتے ہوئے مجھ پر پل پڑے۔

”بھئیے قبلہ، آپ ہٹ جائیے۔ میں اسے بتاتا ہوں۔“ شاہد نامی لڑکے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”تم..... تم وہی ہو، نا جس نے شد و حلوائی کی سائیکل چرائی تھی۔“ میں نے شاہد کو لکڑا کر۔ شد و حلوائی بھی دکان چھوڑ کر یہ تماشہ دیکھنے آکھڑا ہوا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس نے شاہد کا گریبان تھام لیا۔ لیکن اسی اثنا میں ملک صاحب، شاہنہ فرزانہ کے والد، ساجد انور اور عسکری وغیرہ نے میری مرمت شروع کر دی تھی۔ ٹھوکروں اور گھونسلوں کے باوجود میری زبان چلتی رہی اور سچ اگلتی رہی۔ ساٹھ سیکنڈ کے اندر اندر میں نے سچ بول کر کوئی درجن بھر دشمن بنا لیے تھے۔ دھیرے دھیرے میرے ہوش دھواں جواب دینے لگے۔
ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں تھا۔ سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کپڑے تار تار ہو رہے تھے اور ان پر جا بجا خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ پڑ دس کے میر صاحب میرے پاس بیٹھے، فکر مندی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

”شکر ہے، تمہیں ہوش تو آیا۔“ انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہاں رہنا اب تمہارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ سب تمہاری جان کے گامک ہو گئے ہیں۔ بہتر تو ہے کہ یہ مکان بچ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ تم نے جو کچھ کہا، وہ لاکھ سچ سہی لیکن تمہیں سر عام ایسی باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے تھا۔“

”کیا کہہ رہے ہیں، آپ!“ میں نے دردناک لہجے میں کہا۔ ”مجھے یہ علاقہ چھوڑنا پڑے گا! یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نصرت کو حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا ہوا جو وہ شبن خاں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں اس کے دل میں اپنی محبت کی جوت جگا کر رہوں گا۔“

میر صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ نصرت ان کی صاحبزادی کا نام تھا۔ ”تم پر شاید سچ کا دورہ پڑ گیا ہے۔“ وہ دباڑنے لگے۔ ”اور اب تمہیں یہ محلہ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ میں بھی محلے والوں کا ساتھ دوں گا۔“ وہ پاؤں جھٹکتے ہوئے چلے گئے۔
ان کی ایک بات میرے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔ ”تم پر شاید سچ کا دورہ پڑ گیا ہے۔“ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں دوائے صداقت کا شکار ہوا ہوں۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو میری چیخیں نکل گئیں۔ دوا بے حد خطرناک ثابت ہوئی تھی۔

جیسے تیسے کراہتا ہوا اٹھا اور دوا کا توڑ استعمال کیا۔ اس رات میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا۔ پورا جسم درد کی لہروں میں لینا ہوا تھا۔

صبح اٹھ کر میں نے اپنے سچ کے متاثرین سے معافی تلافی کی کوشش کی۔ لیکن کوئی بھی شخص میری صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ یوں مجھے دوسری مرتبہ نقل مکانی کرنے میں ہی عافیت دکھادی۔

نیا محلہ بہت اچھا تھا۔ بڑے خلیق اور جلد بے تکلف ہو جانے والے لوگ تھے۔ بس ایک دشواری پیش آئی کہ وہاں میں ابو العمران کی بجائے ابو میاں، ابو بھائی اور ابو انکل ہو کر رہ گیا۔ مجھ میں مزید نقل مکانی کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے یہ سب برداشت کرنا ہی پڑا۔ گزشتہ تجربے کی وجہ سے میرے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، بلکہ اب تو میرا شوق مزید بڑھ گیا تھا۔ لیکن محلہ تبدیل کرنے کے فوراً بعد ہی دفتر سے نوٹس آ گیا۔ جس کے مطابق، مجھے میڈیکل شیفٹ کی تصدیق و تائید کے لیے سول سرجن کے حضور پیش ہونا تھا۔ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ سرکاری ملازمین و ایسی صورت حال کا سامنا اکثر کرنا پڑتا ہے۔

نوٹس منے کے اگلے روز میں دفتر چلا گیا۔ مجھ سے نوٹس کے بارے میں پوچھا گیا، لیکن میں نے لاشی ظاہر کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا کہ اب میری طبیعت کچھ بہتر ہے۔ اس لیے میں ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا ہوں۔ نوٹس کا چکر خود بخود ہی ختم ہو گیا۔ میں روزانہ دفتر جاتا اور واپس آنے کے بعد اپنی تجربہ گاہ میں مصروف ہو جاتا۔ اب میں کتاب میں دیے گئے نسخے پر عمل کرنے کے معاملے میں خاصا رواں ہو گیا تھا۔ لہذا دفتر سے چھٹی لینے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

ان دنوں میں دوائے دیانت کی تیاری میں مصروف تھا۔ دھیرے دھیرے میں منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ویسے دفتر میں بھی کام کرنے کی بجائے میں، ان دواؤں کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا۔

دوائے دیانت تیار ہوگئی تو میں نے دوا اور اس کا تریاق علیحدہ علیحدہ شیشیوں میں بند کر کے انہیں اسٹیل کی الماری میں رکھ دیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ یہ دوا میں خود ہی استعمال کروں یا کسی اور پر آزماؤں؟ دوائے صداقت کا تجربہ مجھے روکتا تھا، لیکن ذہن مختلف تاویلیں پیش کرتا۔ ویسے میں جانتا تھا کہ گزشتہ تجربے میں غلطی خود میری ہی تھی۔ میں جس دور میں سانس لے رہا تھا، اس میں سچ بولنے کا رواج بہت کم ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سچ سننے والوں میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آئینے ابھی تک زیر استعمال ہیں حالانکہ وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں..... لیکن انسان بڑا ذہن ہے۔ خاص طور پر خواتین..... انہوں نے بالآخر آئینے کو بھی دھوکا دینا شروع کر دیا ہے۔ میک اپ کی گہری تمہیں، آئینے کو بھی جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ بہر حال، وہ دوا استعمال کرتے وقت میں بھول گیا تھا کہ سچ سننے کے معاملے میں انسان، ازل سے ہی کم ظرف ہے۔ ہزاروں سال پہلے سقراط کوچ کی پاداش میں ہی زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔ غرض میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ میری حماقت تھی۔

رات بھر میں اسی الجھن میں رہا اور ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو سکا۔ صبح تک میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوائے دیانت میں خود ہی استعمال کروں گا۔ فیصلے پر پہنچتے ہی رات بھر کی منتظر نیند نے میرے دماغ اور آنکھوں پر بلبل بول دیا، لیکن اسی وقت مجھے یاد آیا کہ آج پہلی تاریخ ہے۔ میری نیند اڑ گئی۔ یہ بات کوئی سرکاری ملازم ہی بتا سکتا ہے کہ پہلی تاریخ کی کیا اہمیت ہے۔ عام طور پر کلرک کی زندگی اسی تاریخ کے انتظار میں گزر جاتی ہے۔ میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا اور جلدی جلدی دفتر جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد دوائے دیانت کی ایک خوراک لی اور دفتر جانے کے ارادے سے نکل کھڑا ہوا۔

بس میں بیٹھ کر میں اسی دوا اور اسکے متوقع اثرات کے بارے میں سوچتا رہا، جس کی ایک خوراک میں نے گھر سے نکلتے ہوئے لی تھی۔ بس میں کافی ہجوم تھا۔ کنڈیکٹر بے چارہ باؤلا ہوا جارہا تھا۔ وہ مجھے ٹکٹ دینا بھول گیا، چنانچہ میں بھی ٹکٹ لینا بھول گیا۔ اس دن کا آغاز بہت ہی اچھا تھا کیونکہ صبح ہی صبح ڈیڑھ روپے کا فائدہ ہوا تھا۔

دفتر پہنچا تو ابھی صرف نو بجے تھے اور ایک چیز اسی کے سوا کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ ویسے دفتر کا وقت ساڑھے سات بجے شروع ہو چکا تھا لیکن ملازمین کے آنے کا وقت ساڑھے نو بجے سے دو بجے تک تھا۔ چھٹی کے اوقات پر البتہ سرکار اور سرکاری ملازمین دونوں ہی متفق تھے۔ یعنی چھٹی ڈھائی بجے ہوتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کو کوئی کام پڑ جائے تو وہ دس بجے ہی چھٹی کر جائے۔ دفتر میں تنہائی بڑی ہی بے زار گن ہوتی ہے میں کسی کئی ہوئی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولتا رہا..... پھر میں نے کچھ سوچ کر حاضری کارجرٹ اٹھالیا۔ میں مہینے میں تین دن غیر حاضر رہا تھا۔ حاضری کے وہ تین خانے اب بھی خالی پڑے تھے، میں نے اطمینان سے ان خانوں پر اپنے دستخط کر کے حاضری لگا دی۔ پھر میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ کوئی دس منٹ بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سینے میں دھڑکتا ہوا بیت کے اعتبار سے ٹھوس دل ایک لخت سیال میں تبدیل ہو گیا ہو..... میں نے دیواری گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے نو بج رہی تھی۔ دفتری اوقات شروع ہوئے دو گھنٹے ہو رہے تھے۔ لیکن میں نے ابھی ایک سطر کام بھی نہیں کیا تھا۔ اس پرستم یہ کہ پورے سیکشن میں الو بول رہے تھے۔ وہ دفتر کم اور نائٹ کلب زیادہ معلوم ہو رہا تھا۔ جودن میں اجڑا اجڑا سا نظر آتا ہے۔ اچانک مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔

اسی وقت سپرنٹنڈنٹ صاحب وارد ہوئے۔ انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ”خیریت تو ہے، میاں اتنے سویرے سویرے.....!“

میں تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ ان کے جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میرے سینے میں کچھل کر ٹھانیں مارتا ہوا دل، آنسوؤں کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے راستے بہہ نکلا۔ میں دھڑکیں مار مار کر کروٹ لگا۔

مجھے نگاہوں سے تولتا رہا۔ پھر اپنی سیٹ پر چلا گیا۔
 ساڑھے بارہ بجے کیشیز صاحب نے تنخواہ شروع کی تو میں بدستور کام میں مصروف تھا۔
 پھر چڑا ہی فضل نے آکر کہا کہ میں اپنی تنخواہ وصول کر لوں۔
 ”تنخواہ! کیسی تنخواہ، کس بات کی تنخواہ؟“ میں نے خاصی بلند آواز میں کہا۔ ”میں نے
 آج تک اس دفتر میں کبھی حلال کی تنخواہ نہیں لی۔ کبھی کام نہیں کیا۔ اللہ نے مجھے سچائی کا راستہ
 دکھایا ہے۔ اب میں اس وقت تنخواہ لوں گا جب محنت کر کے اس کا حق ادا بن جاؤں گا۔“
 سپرنٹنڈنٹ صاحب کی سیٹ میرے قریب ہی تھی۔ وہ اٹھ کر آئے اور مجھے سمجھانے
 لگے۔

”نہیں صاحب، میں تنخواہ نہیں لوں گا۔“ میں نے چیخ کر کہا اور حاضری کے رجسٹر کی
 طرف جھپٹ پڑا۔
 اس شور و غل کی وجہ سے تمام سیکشن میری میز کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ میں نے رجسٹر اپنی میز
 پر رکھ کر کھولا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔ ”یہ دیکھو..... دیکھو میں کتنا بے ایمان
 ہوں۔ میں ان تین دنوں میں غیر حاضر تھا لیکن میں نے آج ان دنوں کی بھی حاضری لگا دی
 ہے۔“

ہمارے اے سی صاحب جو اتفاقاً وہاں سے گزر رہے تھے، مجمع دیکھ کر چپکے سے وہاں
 آکر کھڑے ہو گئے تھے، میرا آخری جملہ سن کر وہ آگے بڑھ آئے۔ ”کیا تم جج کہہ رہے ہو؟“
 انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں، میں سے کہہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور اسی لیے میں آج تنخواہ وصول نہیں
 کر رہا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ہمیشہ محنت اور دیانت داری سے کام کروں گا تاکہ
 تنخواہ کا مستحق بن سکوں۔“

اے سی صاحب نے حاضری کا رجسٹر اپنی طرف کھینچا اور جیب سے قلم نکال کر ان تینوں
 تاریخوں کے گرد سرخ دائرہ بنا دیا۔ اے سی صاحب کو دیکھ کر تمام اسٹاف وہاں سے کھسک گیا
 تھا۔ البتہ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہاتھ باندھے وہیں کھڑے رہے تھے۔

”تو تم نے یہ تینوں دستخط آج ہی کیے ہیں؟“ اے سی صاحب نے مجھ سے پھر پوچھا۔
 ”جی ہاں۔“ میں نے بے حد پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

”سن رہے ہیں اشتیاق صاحب۔“ اے سی صاحب، سپرنٹنڈنٹ پر گر جنے لگے۔ ”یہ
 دس دن پہلے کی تاریخیں ہیں، یہ غیر حاضر تھا اور آپ نے یہاں کراس نہیں بنائے تھے۔“
 ”جج..... سس..... سر..... کام کی ز..... زیادتی.....“ اشتیاق صاحب

”ارے..... ہائیں..... ہائیں..... اوبھائی، کیوں روتے ہو؟ خدا خواستہ کوئی مر گیا ہے
 کیا؟“ وہ بے چارے بوکھلا کر مجھے چمکارنے پچکارنے لگے۔
 ”جی ہاں، میں مر گیا ہوں..... میری روح مر گئی ہے۔“ میں نے ہچکیوں کے درمیان
 کہا۔

”ہوا کیا ہے؟“ سپرنٹنڈنٹ صاحب جھلا گئے۔
 اس اثنا میں کچھ اور کلرک بھی آگئے اور میرے گرد جمع ہو گئے۔
 اچانک غصے کی ایک تیز لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے ہاتھ کی پشت سے آنسو
 پونچھے اور زور سے چلایا۔ ”لعت ہے..... تف ہے، میرے وجود پر..... ساڑھے آٹھ بجے کا
 دفتر ہے۔ میں نو بجے کا دفتر آیا ہوا ہوں اور دس بجے تک میں نے ایک پیسے کا بھی کام نہیں
 کیا.....“

”تت..... تم..... تم مجھ پر چوٹ کر رہے ہو؟“ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے غصے میں بولا
 بھی نہیں جا رہا تھا۔

”جی نہیں، جناب۔ میں واقعی خود پر لعنت بھیج رہا ہوں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔
 پھر الماری سے فائلیں نکال کر کام میں جت گیا۔ میں نے کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا
 نہیں کیا..... سب لوگ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی اپنی سیٹ پر جا بیٹھے۔
 لیکن میں ان کی طرف سے بے نیاز، انتہائی دیانت داری سے کام میں مصروف رہا۔

کچھ دیر بعد یاسین نے مجھے چونکا دیا۔ وہ بھی کلرک ہی تھا اور ہمارے درمیان خاصی بے
 تکلفی تھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے گیارہ
 بجے تھے۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے خشک لہجے میں دریافت کیا۔

”کیا بات ہو سکتی ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”چھوڑو یا رکام وام، بیٹھ کر گپ
 شپ کرتے ہیں۔“ اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔

”نہیں، دفتری اوقات میں مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے بے حد تند لہجے میں
 کہا۔ ”چھٹی کے بعد بات کرنا۔“

”بس کرو یا رابو الہول۔“ اس نے مجھے چھیڑا۔ ”وہی تم اداکاری غضب کی کرتے ہو۔
 اس بہانے تم نے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی خوب کھینچائی کر ڈالی۔“

”ابے بھائی زیادہ وعظ کرنے کی کوشش مت کر، لے چائے پی۔“
 ”اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے..... اور اب تم نے چائے میری

طرف بڑھائی تو ہاتھ مار دوں گا۔“ میں نے بے حد تنبیہ کی سے کہا۔
 یاسین کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ پہلے میں نے اسے اس طرح کبھی نہیں جھڑکا تھا۔ چند لمحے تو وہ

ہکا کر رہ گئے۔

”نہیں..... یہ کھلا ہوا کرپشن ہے۔ میں اپنے سیکشن میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔“
اسے سی صاحب نے کہا۔ پھر وہ میری طرف مڑے۔ ”صاحبزادے جذبہ قابل تعریف سہی
لیکن یہ ڈسپلن کا معاملہ ہے۔ میں تمہیں شوکا ضرور دوں گا اور اشتیاق صاحب، آپ بھی تیار
رہیے۔“ یہ کہہ کر وہ پاؤں جھٹکتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اشتیاق صاحب دونوں ہاتھوں سے سر تھامے یوں کھڑے تھے جیسے انہیں خود اپنی وفات
پر افسوس کا ناقابل قیاس موقع مل گیا ہو۔ کچھ دیر سیکشن میں سناٹا رہا پھر اچانک ہی سرگوشیاں
ہونے لگیں۔ کچھ دیر بعد اشتیاق صاحب چونکے تو میں بدستور کھڑا تھا اور میری آنکھوں سے
پیشانی کے آنسو بہہ رہے تھے۔

”ابے تم نے مجھے بھی مروادیا۔“ وہ میری میز پر ہاتھ مار کر دباڑے۔ ”ایمان دار کی
اولاد۔“

”سشرمندہ ہوں صاحب لیکن میں نے تو صرف اپنی بددیانتی کا اعتراف کیا تھا۔“
”نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔“ انہوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ارے،
میں تم لوگوں کے ساتھ نرمی کر کے پچھتا رہا ہوں۔ کان کھول کر سن لو.....“ وہ دیگر کھڑکوں سے
مخاطب ہوئے۔ ”کل سے ہر شخص وقت پر آئے گا، وقت پر آئے گا..... پورا دن کام کرے گا
اور چھٹی کے اگلے دن درخواست لازمی طور پر سمٹ کرے گا۔ ذرا سی خلاف ورزی ہوئی او
رمیں نے شوکا زودیا.....“

”بہت خوب..... یہ تو آپ کا فرض ہے اشتیاق صاحب۔“ میں نے بے حد مخلصانہ لہجے
میں کہا۔

”دلیل..... لیکن سر..... ہمارا کیا قصور ہے۔“ یاسین ہکھلایا۔

”بکواس مت کرو۔ یاد رکھو، ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔“ اشتیاق
صاحب دباڑے۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ جب تک میں گندی مچھلی تھا کسی نے مجھے گندی مچھلی نہیں کہا تھا۔
اب جب کہ میں سدھر رہا ہوں تو مجھے گندی مچھلی کہا جا رہا ہے۔

”سر، اس پردیانت داری کا دورہ پڑ گیا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ کل تک ٹھیک ہو جائے
گا۔“ یاسین نے صفائی پیش کی۔

”میں کہتا ہوں بکواس مت کرو۔“ اشتیاق صاحب پھر چیخے۔ ”بائے، میری بائیس سال
کی بے داغ سروں..... آج تک ایک بھی ایکسپلے نیشن نہیں ہوا تھا..... آج شوکا زمل رہا

ہے..... اور وہ بھی اس ابوالبلبل کی وجہ سے۔“ وہ غصے کی شدت سے دانت پیسنے لگے

میں سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

اس روز، میں نے تنخواہ نہیں لی اور مجھے ایک شوکا ز نوٹس بھی مل گیا۔ اشتیاق صاحب کو
البتہ شوکا ز کے علاوہ تنخواہ بھی ملی۔ اس روز ایک غیر معمولی بات یہ ہوئی کہ ڈھائی بجے تک ہر
شخص دفتر میں موجود رہا۔

ڈھائی بجے میں نے میز صاف کی اور فائلیں الماری میں رکھ دیں۔ پھر میں یاسین کے
پاس گیا۔ ”آؤ چلیں۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”کیفہ جمشید میں چائے پیس گے۔“

یاسین بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دفتر سے نکلے اور کیفہ جمشید پہنچ گئے، جو دفتر سے
تھوڑے ہی فاصلے پر، بس اسٹاپ کے سامنے واقع تھا۔ ہم نے بڑی خاموشی سے چائے پی۔

پھر یاسین ہی نے خاموشی کا بت پاش پاش کیا۔ ”دیکھو یا راہو ابولہول، مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے
سر میں کیا سودا سما یا ہے، لیکن میری ایک بات سن لو۔ بیچ میں مت ٹوکنہ۔ یہ حقیقت ہے کہ آج تم

نے بلا وجہ اشتیاق صاحب کو ذلیل کر لیا ہے۔ میرے یار..... یہ تو بتا کہ سرکاری نوکری میں اس
کے سوا چارم ہی کیا ہے کہ جب جی چاہے آؤ، جب جی چاہے چلے جاؤ..... چھٹیاں کرو اور

حاضری لگاؤ۔ یہاں جتنی تنخواہ اشتیاق صاحب کو ملتی ہے، اتنی تنخواہ تو پرائیویٹ کمپنی اپنے
چیز اسی کو دے دیتی ہے۔ اب ذرا سوچو تو..... یہ بددیانتی نہیں ہے کیا؟“

”بھائی یاسین..... اگر ایسا ہے تو تم نے..... ہم سب نے اس تنخواہ پر ملازمت کیوں
قبول کی۔ قبول کر لی ہے تو ہمیں اپنے کام کے ساتھ انصاف کرنا پڑے گا۔“

”ملازمت قبول نہ کرتے تو کیا بھوکے مرتے۔“ یاسین جھگلا گیا۔ ”یاد رکھو ایک فلاحی
مملکت میں روزگاری فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔“

”ہوتی ہوگی لیکن میرے نزدیک یہ بددیانتی کا کوئی معقول جواز نہیں..... بلکہ بددیانتی کا
کوئی جواز سرے سے ہوتا ہی نہیں۔“

”دیکھو یار..... یہ جو لوگ تنخواہوں کا تعین کرتے ہیں نا..... اگر ہماری تنخواہ میں صرف
ایک مہینہ گزاریں..... گھر یلو اخراجات، بچوں کے تعلیمی اخراجات، بیوی، بچوں کی دیگر

ضروریات اور ذاتی اخراجات..... سب کچھ ہماری تنخواہوں میں پورا کرنے کی کوشش کریں تو
یقین، کرو، پاگل ہو جائیں..... اور پاگل نہ ہوں تو بقدر انصاف تنخواہیں متعین کر لیں۔ لیکن

یہاں تو ہر شخص صرف دوسروں کو نصیحت کرتا ہے، خود کو اس کی جگہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسے میں
اصلاح کیسے ہو سکتی ہے۔“ یاسین کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا۔ ”نہیں کچھ مت کہو۔“ میں نے بولنا چاہا

تو اس نے مجھے ٹوک دیا۔ ”اس وقت کچھ نہ کہو گھر جا کر میری باتوں پر غور کرنا۔ مجھے یقین ہے

کہ کل صبح تک دیانت کا یہ بخارا تر جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے چائے کا بل بھی نہیں دینے دیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم نے تنخواہ نہیں لی ہے۔“

اس کی بات بس میں بیٹھنے کے بعد میری سمجھ میں آئی۔ میری جیب میں صرف تین روپے تھے۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ یہ تین روپے بھی کیوں ہیں۔ صبح میں نے بے ایمانی کی تھی۔ بس کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساس جرم نے بری طرح جکڑ لیا۔ کنڈیکٹر نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ وہی کنڈیکٹر تھا، جس کی بس میں صبح سفر کیا تھا۔ میں نے تین روپے اس کی طرف بڑھادیے..... پھر میں نے وضاحت کی، اسے سمجھایا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے صرف ڈیڑھ روپیہ لینے پر اسرار کرتا رہا، لیکن میں بے ایمانی کے پیسے اپنی جیب میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا، گھر پہنچتے ہی سو گیا۔ جاگا تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ گھڑی دیکھی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ دراصل مجھے بھوک کے احساس نے جگایا تھا، میں نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا تا کہ کھانے کے لیے ہوٹل کا رخ کروں۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ وہاں شوکا زونٹس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ادھر بھوک بہت زور سے لگتی تھی۔

میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ تنخواہ تو میں نے وصول نہیں کی تھی۔ گویا کھانے کی چھٹی ہوئی۔ شوکا زونٹس کھانے سے پیٹ کی آگ تو نہیں بجھ سکتی۔ دس بج گئے۔ بھوک تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ مجھے یاسین کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس وقت تو اس کی باتیں میرے دل کو نہیں لگی تھیں، لیکن اس وقت میرے دل و دماغ پر بھرپور تاثر چھوڑ رہی تھیں۔ شاید بھوک نے میری دیانت داری کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

دیانت، اچانک میں چونک پڑا۔ یاسین نے کہا تھا۔ کل صبح تک دیانت کا یہ بخارا تر جائے گا، دیانت کا بخارا! اچانک مجھے یاد آیا کہ یہ دوائے دیانت کی ایک خوراک کا کرشمہ ہے۔ یاسین کی باتیں مزید تیزی سے میرے ذہن میں گھومنے لگیں۔ میں الماری کی طرف بڑھا تا کہ دوائے دیانت کا توڑ نکال کر استعمال کر سکوں۔

میں نے تریاق کی شیشی نکالی۔ شروع ہی سے میری نظر الماری میں لگے ہوئے قد آدم آئینے پر رہی تھی، لیکن میں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کر سکا تھا، لیکن شیشی ہاتھ میں لیتے ہوئے میں اس بات کو نظر انداز نہ کر سکا۔ آئینے میں شیشی کا عکس نظر آ رہا تھا لیکن وہ عکس معلق تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، لیکن آئینے میں میرا ہاتھ نظر نہیں آ رہا تھا..... بلکہ آئینے میں میرے جسم کا عکس بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے بوکھلا کر خود کو ٹٹولا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا برقی

روشنی میں ہر چیز کا سایہ تھا لیکن باوجود کوشش کے مجھے اپنا سایہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں سائے سے محروم ہو گیا تھا..... بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں غائب ہو چکا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا لیکن ٹھٹک کر رہ گیا۔ دروازہ کھولنا بے حد احمقانہ حرکت ہوتی۔ جو کوئی بھی ملنے آیا تھا وہ دروازہ کھولنے والے کو ناموجود پا کر دبل جاتا۔ پھر اسے گھر میں بھی کوئی موجود نہ ملتا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر پورے محلے میں خبر پھیل جاتی کہ میرا گھر آ سیب زدہ ہے۔

میں دروازے کے قریب دم سادھے کھڑا تھا۔ دستک اب بھی ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرا نامعلوم ملاقاتی یہ سوچ کر لوٹ جائے گا کہ میں سوچکا ہوں۔ اس وقت مجھے بھوک کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔ میں انتہائی سنسنی خیز صورت حال سے دوچار تھا۔ انہی چند لمحوں میں مجھ پر اس واقعے کی اہمیت منکشف ہوئی۔ میں غائب ہو چکا تھا..... سچ مچ غائب..... اور شاید جب جی چاہے غائب ہو سکتا تھا۔ ان چند لمحوں میں مجھ پر اس خصوصیت کے بہت سے فائدے کھلے۔ میں کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ اب یہ سوال میرے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دستک دینے والا واپس چلا گیا تو میں الماری کی طرف لوٹ آیا۔ دوائے دیانت کے توڑ والی شیشی اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں الماری میں نصب آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ میں کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن آئینے جھوٹ نہیں بولتے۔ آئینہ اب بھی شیشی کا عکس پیش کر رہا تھا۔ لیکن وہ میرا عکس دکھانے سے قاصر تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہریں گردش کرنے لگیں۔

میں نے شیشی کا ڈھکنا کھولا اور دوا کے چند قطرے اپنے حلق میں ٹپکا لیے اس دوران میں آئینے کی طرف متوجہ بھی رہا تھا۔ آئینے میں یہ سب ایک خود کار عمل معلوم ہو رہا تھا۔ شیشی کا ڈھکنا خود بخود گھوما، کھلا، علیحدہ ہوا..... پھر شیشی جھکی..... یہ سب کچھ بے حد ہیجان خیز تھا۔ میں زمین پر نظریں جمائے اس خصوصیت کے فوائد پر نہ جانے کتنی دیر غور کرتا رہا..... اچانک مجھے احساس ہوا کہ فرش پر ایک سائے کا احساس ہو گیا ہے اور وہ سایہ خود میرا ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے آئینے کی طرف دیکھا وہاں اب میرا عکس موجود تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ صبح میں نے دوائے دیانت پی تھی۔ رات کو اچانک میں نے خود کو غائب پایا اور پھر اچانک ہی کسی جن کی طرح ظاہر ہو گیا..... پھر مجھے خیال آیا یہ تو اچھی خاصی علامتی کہانی بن گئی۔ گویا یہ عہد ایسا تھا کہ آدمی دیانت دار ہو تو اس کا وجود یا عدم وجود برابر ہے۔ وہ اس وقت تک صاحب وجود نہیں ہو سکتا جب تک وہ ایمان داری کو

خیر باد نہ کہہ دے۔ پھر مجھے اپنی اس سوچ پر ہنسی آگئی۔

بستر پر لیٹ کر میں سوچتا رہا۔ جو کچھ بھی ہوا، اس میں بہر حال دوائے دیانت کی کارگزاری شامل ہے۔ شاید اس میں کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔ میں نے بوسیدہ قلمی نسخہ سنبھالا۔ کتاب نامکمل تھی اور دوائے دیانت کا نسخہ اس نامکمل کتاب کے آخری صفحے پر درج تھا۔ میں نے نسخے کا بغور مطالعہ کیا۔ پہلے تو میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ میری عربی کی استعداد بس واجبی سی ہے۔ عربی اور دو لغات کی مدد سے کام چلاتا ہوں۔ پھر میں نے لغات سنبھالی اور نسخے میں سرکھپانے بیٹھ گیا۔

اور جب وہ راز میری سمجھ میں آیا تو میرے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ جوش کے عالم میں بس ایک غلطی سرزد ہوگئی تھی..... لیکن یہ ایک بے حد کارآمد غلطی تھی۔ آخری صفحے کے نصف اول تک، دوائے دیانت کا نسخہ ختم ہو گیا تھا اور نصف آخر میں ایک اور نسخہ درج تھا..... غائب ہونے والی دوا کا نسخہ..... لیکن..... وہ نسخہ..... نامکمل تھا۔

چند لمحوں تک میں شدید مایوسی میں ڈوبا رہا۔ جانے نسخے کا کتنا بڑا حصہ اگلے صفحے پر درج ہو..... اور وہ صفحہ میرے پاس نہیں تھا۔ کتاب کا نام بھی مجھے معلوم نہیں تھا کیونکہ اس کے ابتدائی صفحات پھٹے ہوئے تھے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ نامکمل نسخے پر کام کروں گا، لیکن اس دوران میں کباڑیوں کی دکانوں اور ٹھیلوں پر اس کتاب کی تلاش بھی جاری رکھوں گا۔ ملازمت میں میری دلچسپی یکسر ختم ہوگئی تھی۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا منفرد طریقہ میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اگر میں غائب کردینے والی دوا بنا لیتا ہوں تو مجھے دنیا کا کوئی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

لیکن سب سے پہلے کام جو مجھے کرنا تھا، وہ صبح دفتر جا کر تنخواہ وصول کرنا تھا، تریاق استعمال کرنے کے بعد میں خود کو جس کا مستحق سمجھنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں نے خدا کا نام لے کر اس کتاب کی مدد سے اپنے کام کا آغاز کر دیا، لیکن کام شروع کرنے سے پہلے، میں نے اپنے گھر میں پندرہ بیس دنوں کا مکمل راشن اور وہ تمام ضروری کیمیکل جمع کر لیے تھے جن کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ پھر میں نے اپنے گھر کے دروازے پر تالا لگا دیا اور کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہو کر کھڑکی بند کی اور کام شروع کر دیا۔

میری حالت جنونیوں جیسی ہوگئی تھی۔ جب بھوک سے نڈھال ہونے لگتا تو تھوڑا بہت کھا لیتا۔ اس کے بعد پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔ میں نے خود پر نیندیں حرام کر لی تھیں۔ رات دن کام میں لگا رہتا۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے، لیکن مجھے کسی بات کی پروا

نہیں تھی۔ میرا تجربہ مکمل ہونے والا تھا۔

بالآخر پندرہ دنوں کی مسلسل محنت کے بعد میں نے وہ دوا ایجاد کر لی، جس کی ایک خوراک کھا کر میں لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو سکتا تھا۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ روئے زمین پر مجھ سے پہلے کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ میرا سینہ خوشی سے جیسے پھٹنے لگا تھا۔ میں نے اس دوا کی خاصی مقدار ایک بڑی سی بوتل میں بھری۔ تمام نشانات ہٹائے اور تمام چیزیں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔

نشام ہو چکی تھی اور مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ کامیابی حاصل کرنے کے بعد دوسرے جذبے جاگ اٹھے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے ہوش ہی کہاں تھا۔ میں نے آزمائش کی خاطر ایک خوراک کھائی اور کھڑکی کے راستے گھر سے باہر آ گیا۔ میں ایک عرصے بعد گھر سے نکلا تھا۔ اس لیے پوری دنیا بہت خوبصورت اور اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میرا رخ سوہنے حلوائی کی دکان کی طرف تھا۔ اس محلے میں سوہنا حلوائی ایک ایسا آدمی تھا جو کبھی کسی سے مروت نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے کئی بار مجھے بھی ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا، بلکہ جھڑک دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی کو نشانہ بنانے کا ارادہ کر لیا۔

حلوائی کی دکان پر زیادہ رش نہیں تھا۔ صرف دو آدمی کھڑے تھے۔ جو میرے پہنچتے ہی مٹھائی لے کر چلے گئے۔ میں نے اک شان بے نیازی سے پیراٹھا کر بیچ پر رکھا اور اطمینان سے ہاتھ بڑھا کر ایک گداڑی گلاب جامن اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لی۔ اس گلاب جامن کے بعد میں نے دوسری گلاب جامن اٹھائی اور اسی وقت حلوائی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اوبابو۔ تیرا کیا دماغ خراب ہو گیا ہے، جو مٹھائی اٹھا اٹھا کر کھائے جا رہا ہے؟“ میرا جی چاہا کہ اس سے کہہ دوں، میں تو غائب ہوں، پھر اس نے میرا ہاتھ کیسے پکڑ رکھا ہے۔ معاً خیال آیا کہ اگر میں غائب ہوتا تو یہ میرا ہاتھ کیسے پکڑ سکتا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کیا ماجرا ہے۔ یقیناً کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

”کیوں بھی؟ کیا میں غائب نہیں ہوں؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھ ہی لیا۔ ”ابھی تو نہیں..... لیکن دو چار ہاتھ پڑ گئے تو ضرور غائب ہو جاؤ گے۔“ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ مروڑ دیا۔

ہاتھ میں تکلیف ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں غائب نہیں ہو سکا ہوں۔ بلکہ حاضر ہوں۔ میں اپنی موجودہ حالت بر غور کرنے لگا کیونکہ ناکامی پر ماتم بعد میں بھی کیا جاسکتا تھا۔ فی الحال تو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اس شخص سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ ”میں تو تمہاری گلاب جامن چکھ رہا تھا، بھائی۔“ میں خون کے گھونٹ پیتا لیکن مسکراتا

”کتنی لوگے؟“ سوہنے نے جلدی سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”ایک کلو گلاب دو سوہنے بھائی۔“ میں نے مریل سی آواز میں کہا۔

اس نے ایک کلو گلاب جامنیں تول دیں تو میں نے ادائیگی کر کے لفافہ اٹھالیا اور بسورتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تجربہ ناکام کیوں ہو گیا؟ لیکن پھر گھر آ کر فوراً پتہ چل گیا کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی تھی؟ تجربے میں کوئی غامی نہیں تھی۔ بس میں نے ہی غلطی سے بجائے اس دوا کے ایک دوسری دوا کھا لی تھی۔ اس دوا کی بوتل بھی اس دوا جیسی تھی۔ اس مغالطے میں بجائے غائب ہونے کی دوا پینے کے، کھانسی کا شربت پی کر باہر آ گیا تھا۔

اس بار میں نے بہت سوچ سمجھ کر وہی دوا استعمال کیا اور دوسری تمام بوتلوں کو اس بوتل کے قریب سے ہٹا دیا اور ایک بار پھر اسی حلوائی کی دکان پر پہنچ گیا، لیکن احتیاطاً میں نے ایک کلو گلاب جامن کے پیسے جیب میں رکھ لیے تھے۔ اب بار میرا تجربہ حیرت انگیز حد تک کامیاب رہا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی گلاب جامنیں اس کے تھال سے اٹھا اٹھا کر کھالیں، لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ مارے خوشی کے میرے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ یہ کتنی بڑی کامیابی تھی۔ انسان نے اب تک ایسی کامیابی کا صرف تصور ہی کیا ہوگا، جب کہ میں نے حقیقت میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب میرے سامنے پوری دنیا بچھی ہوئی تھی۔ گلاب جامن کھانے کے بعد میں نے فاتحانہ انداز سے چاروں دیکھا اور دکان سے اتر کر نیچے آ گیا، لیکن ابھی میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ ایک کرخت آواز میرے کانوں سے نکلا۔

”اوئے بابو پیسے تو دیتا جا۔“

بہت ممکن تھا کہ یہ آواز کسی اور کو دی گئی ہو کیونکہ میں تو سرے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے کوئی دھیان نہیں دیا، لیکن جب سوہنے حلوائی نے پیچھے سے آ کر میری گردن پکڑی، تب اندازہ ہوا کہ دراصل مجھے ہی پکارا گیا تھا۔

”پانچ گلاب جامنیں کھائی ہیں، تم نے۔“ سوہنا دباڑا۔ ”میں سب دیکھ رہا تھا۔ پیسے نکالو۔“

مرتاکیانہ کرتا۔ نہ صرف ان پانچ گلاب جامنوں کے پیسے ادا کیے بلکہ اسے خوش کرنے کے لیے ایک کلو گلاب جامنیں اور بھی خرید لیں اور لدا پھندا اپنے گھر واپس آ گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دیواروں سے سر نکلا کر رونا شروع کر دوں۔ خدا کی پناہ، کیسی ناکامی

ہوئی تھی۔ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ اور پندرہ دنوں کی مسلسل محنت کا نتیجہ کیا ملا؟ دو کلو گلاب جامنیں..... اور وہ بھی خریدی ہوئی..... نہ جانے اس فارمولے میں کہاں پر غامی رہ گئی تھی۔ کون سا جزو کم رہ گیا تھا۔ آخرا کیا کیوں ہو رہا ہے؟

میں ایک بار پھر اس فارمولے میں ڈوب گیا۔ اس بار میں نے اسے بہت دھیان سے پڑھا۔ پھر میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ کہاں پر غامی رہ گئی تھی۔ حالاں کہ میں نے ہر ممکن احتیاط برتی تھی۔ لیکن انسان سے غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔ لہذا مجھ سے بھی غلطی ہو گئی تھی۔ میں اس فارمولے میں ایک اہم جزو شامل کرنا ہی بھول گیا تھا۔ یہ بات پتہ چلی تو میرا دل پھر امیدوں سے بھر گیا۔

میں ایک بار پھر پاگلوں کی طرح کام میں مصروف ہو گیا پہلے سے زیادہ محنت اور توجہ سے کام لیا۔ پھر بھی پندرہ دن لگ گئے اور پندرہ دنوں بعد میں نے وہ دوا تیار کر لی۔ اس بار میں نے بہت احتیاط برتی تھی۔ کوشش کی تھی کہ کسی قسم کی کوئی حقیقت نہ ہونے پائے۔ اس لیے یقین تھا کہ اس بار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ دوا تیار ہوئی اور میں پہلے کی طرح اس دوا کی ایک خوراک کھا کر گھر سے باہر آ گیا۔

اس بار مجھ سے کوئی بوکھلاہٹ سرزد نہیں ہوئی تھی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کے باوجود میں نے جیب میں ایک کلو گلاب جامن کے پیسے ڈال لیے تھے تاکہ تجربہ ناکام ہونے کی صورت میں سوہنے حلوائی کو گلاب جامنوں کی ادائیگی کر کے پیچھا چھڑا سکوں۔

آج بھی حلوائی کی دکان خالی تھی۔ میں نے پہلے کی طرح ایک پیڑ بیچ کے اوپر رکھا اور ہاتھ بڑھ کر تھال میں رکھی ہوئی ایک گلاب جامن اٹھالی۔ اس وقت میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے سوہنا، ابھی میری کلائی تھام لے گا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ تاہم میں مطمئن نہیں تھا کیونکہ ایسا تو پہلے بھی ہو چکا تھا۔ دو تین گلاب جامن نگلنے کے بعد میں چبوترے سے اتر ا اور دھیرے دھیرے ایک طرف چل پڑا۔ اس وقت مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اب حلوائی مجھے پکارے گا..... لیکن جب اس کی آواز سنائی نہ دی تو میں جیسے خوشی سے پاگل ہو گیا۔

میرا تجربہ صد فی صد کامیاب رہا تھا۔ سوہنا حلوائی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنے پیسے کسی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق تھا۔ کیا خدا نے میری سن لی تھی؟ میں جاتے جاتے مڑا اور آزمائشی طور پر ایک بالوشا ہی اٹھا کر کھانی شروع کر دی، لیکن اس بار بھی سوہنا حلوائی انجان ہی رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں وجد کے عالم میں رقص کرتا ہوا حلوائی کے چبوترے سے اتر آیا۔ میں نے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ پھر میں نے تجربے کے طور پر نگلی سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کے

شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا..... پھر سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا، جیسے وہ خوفزدہ ہو گیا ہو۔ اب میں اس شہر کا بادشاہ تھا، شہنشاہ تھا۔

اس رات میں سو نہیں سکا۔ میرے ذہن میں منصوبوں کی یلغار ہو رہی تھی اور ان میں سے ہر منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ میں بنیادی طور پر ایک شریف آدمی ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس ایجاد سے نہ جانے کیسے کیسے فائدے اٹھانے کا ارادہ کر لیتا لیکن میرا سب سے بڑا مقصد معاشرے کی اصلاح تھا۔ میں چاہتا تھا کہ لوگوں کو برائی سے روکا جائے۔ میں اس سلسلے میں اپنے غائب ہونے کی صلاحیت کو استعمال کر سکتا تھا لیکن مجھے اپنی حالت بھی بہتر کرنی تھی۔ اس صلاحیت کی مدد سے اپنے لیے چھوٹے موٹے فائدے حاصل کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا..... لیکن جلد ہی سماج سدھار اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ میں ایک اور ہی چکر میں الجھ کر رہ گیا۔ یہ چکر بہت ہی خوبصورت اور حسین تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے خدا نے اس کی تخلیق کے بعد دوسری تمام لڑکیوں کی طرف سے منہ موڑ لیا ہو۔ میں نے جس وقت اسے دیکھا تو دوا کے اثر سے آزاد ہو چکا تھا۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا تو اس طرح ناک بھوں چڑھانے لگی، جیسے میرے منہ پر کالک لگی ہوئی ہو۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس لڑکی کو ہر حال میں اپنا بناؤں گا۔

وہ مجھے راہ چلتے ہوئے ملتی تھی۔ میں از خود رفتہ ہو کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ دوا کی ایک خوراک پی کر اس کے قریب تر ہو جاؤں۔ لیکن یہ بات میری شرافت کو گوارا نہ ہوئی۔ میں نے خلوص نیت سے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے عام انسانوں کی طرح تعاقب کر کے اس کا گھر معلوم کرنا تھا، تاکہ اس کے گھر پیغام بھجو سکوں۔ اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔ یہ ایک شرعی اور قانونی طریقہ کار تھا۔ پیغام بھجوانے کے لیے اس وقت میرے دل میں پڑوسی کی بیوی کا خیال آ گیا تھا۔ وہ میرا یہ کام کر سکتی تھی۔

لڑکی چلتی رہی اور میں بھی اس کے پیچھے چلتا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدرت مجھے اس کے تعاقب کا موقع فراہم کر رہی ہو۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ رشتے آسمانوں پر طے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہ لڑکی پیدل چل رہی تھی۔ چلتے چلتے ہم لوگ بہت دور نکل آئے۔ حتیٰ کہ جگا پہلوان کے اکھاڑے تک پہنچ گئے۔ میں نے جگا پہلوان کی بہت شہرت سن رکھی تھی۔ لیکن اسے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔ لڑکی نے اس کے اکھاڑے کا رخ کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اکھاڑے سے ملحق ایک دروازے میں داخل ہو گئی اور میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حینہ کا جگہ کے اکھاڑے میں کیا کام ہے؟ کس سے

پوچھوں، کیا کروں؟ جلد ہی میری الجھن دور ہو گئی۔ اچانک اکھاڑے سے تین چار پہلوان تن تائے ہوئے نکلے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں بوکھلا کر رہ گیا۔ میں نے بڑا زور لگایا لیکن ان کی گرفت سے نہ نکل سکا۔ ”چل بے اندر۔“ ان میں سے ایک نے میری گردن تھام کر مجھے اکھاڑے کی طرف دھکیلا۔

میں جیسے اڑتا ہوا اکھاڑے کے دروازے پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا اور میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ دوسرے پہلوان نے مجھے کسی کٹھری کی طرح اٹھایا اور اکھاڑے کے اندر دے پنجا۔ میری تکلیف کا دائرہ کچھ اور بڑا ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے تر مرے ناپنے لگے۔ اکھاڑا گردش کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے اٹھنا نہ گیا۔ مجھے جس آدمی کے سامنے لاپہینکا گیا تھا، وہ ان سب سے زیادہ خطرناک معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لنگوٹی باندھ رکھی تھی اور دو پہلوان اس کی پشت پر مالش کر رہے تھے۔ وہ مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ”کیوں بے پدی۔“ وہ پہلوان دباڑا۔ ”تو نے ریشماں کا پیچھا کیوں کیا۔ جانتا نہیں، وہ جگا پہلوان کی بہن ہے۔“

اب میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ خدا نے کنول کا وہ پھول، کچھڑ میں کھلا دیا تھا۔ بہر حال، اس کے باوجود میرا حوصلہ پست نہ ہوا۔ عشق صادق شاید اسی کو کہتے ہیں۔ ”بولتا کیوں نہیں۔“ ساتھ کھڑے ہوئے ایک پہلوان نے مجھے جھٹھوڑ دیا۔ ”میں نے کسی لڑکی کا پیچھا نہیں کیا۔“ میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔ ”میں تو تمہارے پاس آ رہا تھا۔“

”میرے پاس؟“ جگہ نے حیرت سے کہا۔ ”میرے پاس تیرا کیا کام؟“

”میں تمہارا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔“ میں نے جی کڑا کر کے کہا اور بدقت تمام اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”میرا شاگرد بننے گا۔“ جگا ہنس پڑا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے پہلوان بھی ہنسنے لگے۔ مجھے شدت سے غصہ آیا لیکن میں ان کے خاموش ہونے کا منتظر تھا۔ ”کسی کی ظاہری حالت پر نہیں ہنسنا چاہئے، پہلوان۔“ ان کے چپ ہونے کے بعد میں نے کہا۔ ”یہ میرا ظرف ہے کہ میں تمہارا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔ ورنہ میں جب چاہوں تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دوں۔“ اب میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ مجھے ہوش نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

”کیا بکتا ہے؟“ جگا بہت زور سے دباڑا۔ اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ دوسرے پہلوانوں کے تیور بھی بدل گئے تھے۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ہاتھ پاؤں پر نہ جاؤ۔ جب چاہوں، تمہیں رگڑ کر رکھ دوں گا۔“

”اچھا؟“ جگا تلملا کر رہ گیا۔ ”تو مجھے ہرائے گا۔“

”آزما کر دیکھ لو۔“ میں نے کہا۔ معاً مجھے احساس ہوا کہ میں نے زبان کو بے لگام کر کے کتنی بڑی مصیبت مول لے لی ہے لیکن اب میں پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ جگا نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔ ”اگر تو نے مجھے ہرا دیا تو جو مانگے گا دوں گا۔“

”سچ استاد۔“ خوشی سے اچھل پڑا۔ ”دیکھو..... اپنی زبان سے پھرنا نہیں۔“

”ابے..... میں زبان سے پھروں گا۔“ جگا دباڑا۔ ”کسی کو ساتھ لے کر آنا کہ وہ تیری ہڈیاں سمیٹ کر لے جاسکے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں آج رات بھر ریاضت کروں گا۔ مقابلہ کل رات ہوگا۔“

”بھول نہ جانا۔ ویسے اگر مرد کا بچہ ہے تو ضرور آئے گا۔“

”میں ضرور آؤں گا استاد۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے۔“

”استاد، تم اس پدی سے کیا مقابلہ کرتے ہو؟“ جگے کا ایک پٹھا بولا۔ ”مجھے حکم دو۔“

”نہیں۔“ جگے نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”اس نے مجھے لکارا ہے۔ میں خود اس سے مقابلہ کروں گا۔“

میں جگے کو خدا حافظ کہہ کر دھیرے دھیرے کراہتا ہوا اکھاڑے سے نکل آیا۔ میرا بدن کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، لیکن میں خوش تھا کہ مجھے اپنی منزل اتنی آسانی سے ملنے والی تھی۔ جگے سے مقابلے کے بعد میں ریشماں کو حاصل کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے قول سے نہیں پھرے گا۔ جہاں تک جنات مقابلے کا تعلق تھا تو وہ میرے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ جگا نہیں جانتا تھا کہ میرے بار بار سنے مہلک ہتھیار موجود ہیں۔ میں اکھاڑے ہی میں اپنا لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اکھاڑے میں اترنے سے پہلے خود تو دوائے دلیری کی ایک خوراک لے لوں گا اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو جگے کو دوائے بزدلی کی ایک خوراک دے دوں گا۔

اگلے روز میں نے دوائے دلیری کی ایک خوراک پی اور دوائے بزدلی ساتھ لے کر کوچہ جانان کی طرف چل پڑا۔ وہاں جگے کے تمام شاگردوں کے علاوہ اکھاڑے میں ورزش کرنے والوں کا بھی جھوم تھا۔ سب مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ بہر حال دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے والا تھا۔

جگا پہلوان پوری طرح تیار تھا۔ وہ بہت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے نہایت ادب سے اسے سلام کیا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی بجائے اس نے نخوت سے مجھے تیار ہونے کا اشارہ کیا۔

”ایسے نہیں پہلوان۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”پہلے مہمان نوازی کرو۔ میرے، اپنے اور سب کے لیے دودھ منگواؤ۔ ورنہ میں نہیں لڑوں گا۔“

”میں تیری آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔“ جگے نے کہا اور اپنے پٹھے کو دودھ لانے کے لیے کہہ دیا۔

چند لمحے بعد تمام حاضرین کے سامنے دودھ کے بڑے بڑے پیالے دھرے ہوئے تھے۔ کام دشوار تھا لیکن قسمت میرے ساتھ تھی۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا میں نے جگے کے سامنے والے پیالے میں دوائے بزدلی انڈیل دی..... پھر میں نے اپنا پیالہ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اس کے بعد میں نے آنکھ اٹھا کر جگے کی طرف نہیں دیکھا۔

دودھ پی کر میں نے لنگوٹ کسا اور اکھاڑے میں اتر آیا۔ اب میں بے حد مطمئن تھا۔ ”آؤ پہلوان۔“ میں نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ اکھاڑے میں ہر طرف قہقہے گونجنے لگے۔ شاید میری پسلیاں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو گئی تھیں۔

جگا غصے سے پھنکارتا ہوا اکھاڑے میں اتر آیا۔ اس نے اپنے بدن پر اکھاڑے کی مٹی مل لی اور ایک نعرہ لگا کر میرے مقابل آ گیا۔ میری کوشش یہی تھی کہ کچھ دیر خود کو اس سے بچاتا رہوں۔ دوا کا اثر کسی بھی وقت شروع ہو سکتا تھا۔ لیکن اسی چکر میں میرا پیر پٹ گیا اور میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی جگا بدست ہاتھی کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس نے ایک زوردار ٹھوکر ماری چاہی تھی لیکن میں پھسلتا ہوا اس کی پہنچ سے دور ہو گیا۔ مجھے اپنے سارے وجود میں جوش اور ولولے کی ایک تیز لہر گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ابھی میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ جگے نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب گویا وہ مجھ سے معافتہ کر رہا تھا۔ میرا بڑا حال تھا..... تمام ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ اس عالم میں بھی میرے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے اس کے کئی ہاتھ مارے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ شاید اس پر دوا کا اثر ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ پھر اچانک جگے نے مجھے چھوڑ دیا اور میں کسی مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر گر گیا۔

اس وقت بلنا بھی میرے لیے دو بھر تھا لیکن میں سوچ سکتا تھا میرے حوصلے میں کمی نہیں آئی تھی، بلکہ وہ پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اٹھوں اور جگے پر ٹوٹ پڑوں، لیکن میرا جسم میری خواہش کے مطابق عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ خصل حوصلے اور

دلیری سے کچھ نہیں ہوتا۔ جسم میں جان بھی ہونی چاہئے اور آدمی کو داؤ پیچ سے بھی آگاہ ہونا چاہئے۔ بہر حال، جیسے ہی جگے پر بزدلی حملہ آور ہوگی تو یقیناً صورت حال میرے حق میں ہو جائے گی۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔

میں بے جان سامٹی پر پڑا تھا اور وہ مجھے چزار ہا تھا۔ چیلنج دے رہا تھا۔ جسم میں جان نہ ہونے کے باوجود میرے حوصلے اور دلیری نے مجھے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔ لیکن میرا اٹھنا قیامت ہو گیا۔ اس مرتبہ جگے نے مجھے اپنی گرفت میں لیے بغیر ہی میری مرمت شروع کر دی۔ جب تک جسم میں جان رہی، میں اپنے قدموں پر کھڑا رہا، بالآخر ڈھیر ہو گیا۔

میرے حواس اور بالخصوص سماعت بہت اچھی طرح کام کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب تماشا نیوں اور جگا کے پٹھوں کی نظروں میں میرے لیے احترام ہے۔ شاید وہ میری قوت برداشت اور حوصلے کے معترف ہو گئے تھے۔ لیکن میں اس بات کا منتظر تھا کہ دوائے بزدلی جگے پر کب اثر دکھاتی ہے..... پھر اچانک ہی میری سماعت سے وہ مکالمے ٹکرائے اور امید کی واحد ٹکرن بھی اندھیرے میں ڈوب گئی۔

جگے کے کسی پٹھے نے اس کے شاگرد خاص کو مخاطب کیا تھا۔ ”کیوں شابو، تو اس سے مقابلہ کرے گا؟“

”نن..... نہیں..... مم..... میں..... کک..... کسی..... سس..... سے..... سمجھ..... بھی..... نن..... نہیں..... لال..... لال..... لڑ سکتا.....“ وہ ہکلائے لگا۔

”ابے شابو تجھے کیا ہو گیا۔ تو تو کانپ رہا ہے۔ کیا بخار ہو گیا تجھے؟“ پٹھے کی آواز سنائی دی۔ پھر شاید اس نے شابو کا ہاتھ تھام کر دیکھا تھا۔ ”ابے بخار کیسا، تیرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔“

”مم..... میں..... گھگ..... گھر جاؤں گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ شابو پھر ہکلا یا۔ یہ مکالمے جگتے نے بھی سنے اور دھاڑا تھا۔ ”شابو..... بزدل..... دفع ہو جا، یہاں سے..... اور دوبارہ صورت مت دکھانا مجھے۔“

اس کے ساتھ ہی سارا چکر میری سمجھ میں آ گیا۔ میں جگے کے سامنے والے پیالے میں دوائے بزدلی ملا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اس طرف سے نظریں ہی پھیر لی تھیں۔ اس دوران میں غالباً جگے نے اپنا پیالہ اپنے شاگرد خاص کی طرف بڑھادیا تھا۔ یوں اس ہونہار کا پہلوانی میں مستقبل تاریک ہو گیا تھا اور ساتھ ہی میرا منصوبہ بھی برباد ہو گیا تھا۔ گلو خلاصی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ مجھے اپنی مرمت کا تو غم نہیں تھا۔ البتہ یہ دکھ ضرور تھا کہ میں، ریشماں سے محروم رہ جاؤں گا۔

ان سب باتوں کے باوجود میری دلیری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چنانچہ جب جگے نے طنز یہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”ابے، کب تک یہاں بیٹھا اینڈ تار ہے گا۔ یہ تیرے دادا کے گھر کا بستر نہیں ہے۔“ تو میں نے جانے کیسے اٹھا اور جگے پر جھپٹ پڑا۔ وہ تیار نہیں تھا۔ اس کے سنبھلتے سنبھلتے میں نے کئی کرارے ہاتھ جھاڑ دیے۔ وہاں موجود ہر شخص سنائے میں آ گیا۔ خود جگا بھی بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھر دفعتاً میں نے اس کے چہرے پر غصے کی سرخی ابھرتے دیکھی۔ اس کے بعد میری وہ ٹھکانی ہوئی کہ الامان..... لیکن میں پٹھے کے باوجود ڈنار ہا۔ ہر بار وہ مجھ سے پوچھتا، کہا مانتا ہے، اور میں انکار کر دیتا۔ میری جان اس وقت چھوٹی جب میں بے ہوش ہو گیا۔ ظاہر ہے آدمی بے ہوشی کی حالت میں بارمانے سے انکار نہیں کر سکتا۔

ہوش آیا تو میں اکھاڑے کے باہر نالے کے پاس پڑا تھا۔ میں اپنے گھر کس طرح پہنچا؟، یہ داستان طولانی ہونے کے ساتھ بے حد دردناک بھی ہے۔ گھر پہنچ کر میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا تو خود پر اس وقت کے ہیروشیما کا گمان ہوا، جس پر ایٹم بم گرے صرف چند منٹ ہوئے ہوں۔

میں نے کراہتے ہوئے..... آپس بھرتے ہوئے اپنی مرہم پٹی شروع کی لیکن متاثرہ علاقہ اتنا وسیع تھا کہ مرہم اور پٹی دونوں ہی کم پڑ گئے۔ اس کے باوجود اس بری طرح پٹی زدہ ہوا کہ خود میں بھی اپنے آپ کو کسی تابوت سے نکلی ہوئی حنوط شدہ لاش تصور کرنے لگا۔ بہ ہزار دقت میں اپنے بستر پر لیٹا تو لیٹتے وقت میری چیخیں نکل گئیں۔

دوسری صبح میں ابھی بستر پر ہی تھا کہ میرے ایک شناسا آدھمکے۔ دستک کے ساتھ ساتھ وہ حلق پھاڑ کر چلا بھی رہے تھے۔ مجھے اٹھ کر دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ حالاں کہ اس دوران مجھ پر قیامت ہی گزر گئی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس آئے۔ خدشہ تھا کہ مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ لیکن انہوں نے مجھے دیکھ کر زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

”بھئی مان گئے تمہیں۔“ انہوں نے اپنی ہنسی میں بریک لگا کر کہا۔ ”کیا بہروپ بھرا ہے۔“

”کیسا بہروپ متین صاحب۔“ میں برا مان گیا۔ ”میں شدید زخمی ہوں۔“ ”چھوڑو بھی یار۔“ انہوں نے میرے کاندھے پر ایک زوردار ہاتھ رسید کر دیا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آج کیم اپریل ہے۔“

مجھے بھی یاد آ گیا کہ آج کیم اپریل ہے۔ میری روایت تھی کہ اس روز اپنے دوستوں سے مذاق کیا کرتا تھا۔ لیکن اس دن وہ روایت میرے گلے پڑ گئی۔ میں ابھی متین صاحب کا پہلا حملہ

آدھم کا۔ معلوم ہوا کہ وہ جھوٹ بول کر میں نے خود اپنے پیروں پر کلباڑی ماری ہے۔ پولیس والوں کو دیکھ کر ہمیشہ میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ میں ٹکر ٹکرتا تھا نیدار کی طرف دیکھنے لگا۔

”بتائیے۔ کیا واقعہ پیش آیا تھا، آپ کے ساتھ؟“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”جی..... وہ ایک ترک باشندہ تھا۔“ میں نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

”ترک! مجھے تو پتہ چلا ہے کہ وہ کوئی جاپانی تھا.....“ تھا نیدار نے لڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”جی ہاں..... جی ہاں..... جاپانی ہی تھا۔ دراصل میں ترکوں اور جاپانیوں میں تمیز نہیں کر پاتا۔“

”بہر حال..... ہمیں اس کا حلیہ لکھوا دیجئے۔ ایسی وارداتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔“

”جی..... ایسی وارداتیں.....“

”جی ہاں..... ایسی وارداتوں میں ایک جاپانی ہی ملوث ہے، لیکن کوئی بھی اس کا حلیہ نہیں بتا سکا۔ آپ نے اس سے خانگی دیر مقابلہ کیا تھا۔ لہذا اس سلسلے میں یقیناً ہماری مدد کر سکتے ہیں۔“

خدا کی پناہ! میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کیسا خوفناک اتفاق تھا۔ میں بلاوجہ چکر میں پھنس گیا تھا۔ بہر حال، میں نے تصور کو کام میں لاتے ہوئے اس غریب جاپانی کا حلیہ بیان کر دیا، جسے میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ محرر نے میرا بیان لکھا اور پھر مجھے اس پر دستخط کرنا پڑے۔ ان کے جاتے ہی میں نے سوچا کہ یہ مکان چھوڑ کر بھاگ نکلوں۔ میں نے عجیب مصیبت مول لے لی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زندگی کا پہلا جھوٹ اس قدر مہنگا پڑے گا۔ لیکن مکان چھوڑنے کا تصور بھی تکلیف دہ تھا۔ میں پہلے ہی نقل مکانی کے بہت عذاب سہہ چکا تھا۔ بھاگنا یوں بھی نقصان دہ تھا کہ پولیس مجھ پر دروغ گوئی کا الزام لگا کر حوالات میں ڈال دیتی۔ اب تو اپنے جھوٹ کو بہر حال نبھانا تھا۔ پھر یہ اطمینان بھی تھا کہ تمام جاپانی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں..... لیکن بلی ایک دفعہ رستہ دیکھ لیں تو پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ تیسرے ہی دن تھانے سے بلاوا آ گیا۔ انہوں نے کسی جاپانی کو دھرایا تھا۔ اب مجھے اس کی شناخت کرنا تھی۔ جی تو چاہا کہ یہ شہر ہی چھوڑ دوں، لیکن کانسٹیبل سر پر سوار تھا۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات! مجھے تھانے جانا ہی پڑا..... لیکن میں یوں ہی نہیں چلا گیا بلکہ پہلے محلے کے ایک کرم فرما، چوہدری صاحب کے پاس جا پہنچا۔

چوہدری صاحب کی واحد خوبی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر شخص کی مدد کے لیے توند بستہ رہتے ہیں۔ توند بستہ یوں کہ بے پناہ تحقیق کے باوجود یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی توند کہاں سے شروع

برداشت نہیں کر پایا تھا کہ انہوں نے دوسرا ہاتھ رسید کر دیا۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ ادھر متین صاحب کو اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا۔ میں جتنی منت سماجت کرتا وہ اتنے ہی زور سے ہاتھ مارتے۔ نوبت باقاعدہ کشتی تک پہنچی۔ جب کہ میں جگا پہلوان کے بعد کسی مجھ سے ہاتھ پائی کرنے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ متین صاحب کا خیال تھا کہ میں نے زندگی کا کامیاب ترین عملی مذاق پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے فلم اور ٹی وی والوں سے رجوع کرنا چاہئے۔

بالآخر میرے زخموں سے پھر خون رسنے لگا اور میں بے ہوش ہو گیا۔

مجھے بے ہوش دیکھ کر متین صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر تمام محلے والوں کو اکٹھا کر لیا۔ بہر حال، جب مجھے ہوش آیا تو میرے گرد خاصا مجمع لگا ہوا تھا۔

”ارے صاحب، میں تو انہیں دیکھتے ہی بھانپ گیا تھا کہ یہ بری طرح زخمی ہیں۔“ متین صاحب محلے والوں سے کہہ رہے تھے۔

میرا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر بتا دوں کہ اس شخص نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ لیکن منہ کھولنے کی کوشش میں مجھے اپنا جگر اچختا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے بوکھلا کر منہ بند کر لیا اور ہونٹ بھیجنے لے۔ بہر حال، مجھے ٹھیک ہونے میں پندرہ دن لگ گئے۔ اس دوران میں محلے والوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ حالت کچھ بہتر ہوئی تو یار لوگ یہ جانے پر مصر ہو گئے کہ مجھے کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ عجیب افتاد تھی۔ سچ بول نہیں سکتا تھا اور انہیں مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ چار دن چار میں نے ایک کہانی گھڑ کر سنا دی۔

”اس رات میں نے بروس لی کی فلم کا پہلا شو دیکھا۔“ میں نے انہیں بتایا۔ ”فلم دیکھ کر نکلا تو ایک اندھیری گلی سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک شخص ایک لڑکی سے دست درازی کر رہا ہے۔ میں نے فوراً مداخلت کی کیونکہ میں ہر لڑکی کو اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ لڑکی تو کھسک گئی لیکن وہ شخص میرے گلے پڑ گیا۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ جاپانی ہے۔ میں نے بھی بروس لی کی فلموں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ چنانچہ میں بھڑ گیا۔ داؤ بیچ تو مجھے بہت آتے ہیں لیکن انہیں استعمال کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں بہت زخمی ہو گیا لیکن ڈنار ہا۔ تنگ آ کر وہ بھاگ اٹھا۔ میں کافی دیر تک اس کے پیچھے بھاگا۔ پھر زخموں کی تکلیف نے مجھے نڈھال کر دیا، ورنہ وہ بد بخت مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتا تھا۔“

محلے والے سب میری اس داستان سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے احترام تھا۔ کچھ لوگ تو باقاعدہ عش عش کرنے لگے تھے۔ وہ میری زندگی کی پہلی گپ تھی جو بہت متاثر کن ثابت ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا..... لیکن اس گپ کے شدید نتائج کا اندازہ مجھے شام کو ہوا جب تھانے کا ایس ایچ او دو کانسٹیبلوں کے ساتھ میرے گھر

ہوتی ہے اور کمر کہاں ختم ہوتی ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں کچھ لوگ تو یہ مصرعہ بھی پڑھتے ہیں۔
چودہری صاحب کا دعویٰ ہے کہ شہر کا ہر تھانے داران کا لنگوٹیا یا ہے۔ اسی لیے میں نے تھانے
جانے سے پہلے چودہری صاحب کو ساتھ لینا ضروری سمجھا۔ خوش قسمتی سے چودہری صاحب
گھر پر ہی مل گئے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”کیسے ابو میاں..... کیا خدمت
کر سکتا ہوں، میں، آپ کی؟“ انہوں نے حسبِ عادت پوچھا۔
”سنا ہے، شہر کے ہر تھانے میں آپ کی بڑی بات ہے۔“

”ہاں ہاں بھئی۔“ چودہری صاحب نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ”خون ہے، جو
مجھے نہیں جانتا۔ ابھی پرسوں ہی میرے ایک دوست کا لڑکا بند ہو گیا تھا۔ اس بے چارے نے
بہت کوشش کی لیکن بات نہیں بنی۔ خاکسار کے پاس آئے میں متعلقہ تھانے میں گیا اور تھانے
دار کے خوب کان کھینچے۔ بے چارہ گریہ وزاری کرنے لگا، تب کہیں میں نے اسے چھوڑا اور اس
نے میرے دوست کے لڑکے کو چھوڑ دیا۔“

”بہت خوب چودہری صاحب۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”بس تو پھر میرے ساتھ بھی
تھانے چلیے۔“

”تمہارے ساتھ تھانے۔“ اچانک چودہری صاحب کا چہرہ فق ہو گیا۔ ”لیکن کک.....
کیوں؟“

”تھانے دار نے مجھے کسی کی شناخت کے سلسلے میں بلایا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اکیلے
جاتے ہوئے ڈر رہا ہوں۔“

چودہری صاحب کا تو جیسے خون خشک ہو گیا۔ انہوں نے مری مری سی آواز میں مجھ سے
انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود کوٹ پہننے کا کہہ کر گھر میں چلے گئے۔ بہت دیر ہو گئی چودہری
صاحب گھر سے نہیں نکلے۔ کچھ دیر میں نے انتظار کیا، پھر دروازے پر دستک دی..... کئی
دستکوں کے جواب میں دروازہ کھلا اور ان کی بیگم نے مجھے آگاہ کیا کہ چودہری صاحب کی
طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ چودہری صاحب کی طبیعت کیوں خراب
ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں سرد آہیں بھرتا اکیلا ہی تھانے کی طرف چلا دیا۔ تھانے تک تو میں ٹھیک
ٹھاک ہی پہنچا تھا لیکن تھانے کی عمارت پر نظر پڑتے ہی میری حالت غیر ہو گئی۔ ٹانگیں لرزنے
لگیں اور غنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔ خدا جانتا ہے کہ میں کس طرح تھانے میں داخل ہوا تھا۔

ایک کانسٹبل نے مجھے ایس ایچ او کا کمرہ دکھایا۔ میں اس کمرے میں یوں داخل ہوا جیسے
پندرہ بیس آدمی مجھے پیچھے سے دھکیل رہے ہوں۔ ایس۔ ایچ۔ او نے غالباً ایک نظر میں ہی مجھے
پہچان لیا۔ ”اچھا ہوا تم خود ہی آ گئے۔“ اس نے غراتے ہوئے کہا۔ ”چوری کرنے والے کو تو

میں بخشتا ہی نہیں ہوں۔“ مولا بخش ذرا دکھانا تو دو چار ہاتھ۔“

اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا، مولا بخش نے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر کئی زوردار ہاتھ
میری گدی پر رسید کر دیے۔ جگا پہلوان کی یاد تازہ ہو گئی تھی اور میری نگاہوں میں نیلے پیلے
دارے سے لہرانے لگے۔ ”کیوں بے..... چوری؟ اور ہمارے علاقے میں۔“ مولا بخش نے
ایک اور ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔

”خدا کی قسم، میں چور نہیں ہوں۔“ میں گڑ گڑانے لگا۔ ”میں نے زندگی میں کبھی چوری
نہیں کی۔“

”سب یہی کہتے ہیں۔“ تھانے دار نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”کیوں مولا بخش، کیا
خیال ہے؟“

”یہ تو جناب، بھکاریوں کا ٹھیکیدار معلوم ہوتا ہے۔“ مولا بخش نے بغور میری طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ تھانے دار نے مسکرا کر کہا۔ ”تو ہو جائے کچھ اور خاطر مدارت۔“
”جناب میں چور نہیں ہوں۔“ میں نے احتجاج کیا۔ ”میں تو وہ ہوں..... وہ جاپانی
والا۔“

”جاپانی والا۔“ تھانے دار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر شاید اسے، میں پوری
طرح یاد آ گیا۔ ”اچھا..... اچھا..... تم اس کی شناخت کے لیے آئے ہو۔ یہی بات ہے نا؟ کیسا
پہچانا میں نے تمہیں! ارے صاحب، میں تو آدمی کو پہلی ہی نظر میں پہچان جاتا ہوں۔“
”جی ہاں، جناب۔“ میں نے تھوک نکل کر ہمنوائی کی۔

”بیٹھ جاؤ..... بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں تقریباً کرسی پر گر ہی گیا۔ چکر آرہے تھے، بری طرح۔
”ہم نے آدمی کو پکڑ لیا ہے۔“ تھانے دار بولا۔ ”وہ جاپانی تو نہیں لیکن اس کے نقوش
جاپانیوں جیسے ہیں۔ ویسے بھی وہ تمہارے بیان کردہ حلیے پر پورا اترتا ہے۔“

”میرا خیال ہے جناب کہ آپ سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔“ میں نے خوشامدانہ لہجے میں
کہا۔ ”شناخت کی کیا ضرورت ہے؟“

”ہاں..... یہ تو ہے لیکن رسی کا ردوائی بھی ضرورت ہے۔“ تھانے دار بولا۔ ”یہ کیس
میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کا حلیہ آپ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکا۔ اسے شناخت بھی
آپ ہی کریں گے۔“ پھر وہ مولا بخش کی طرف مڑا۔ ”جاؤ، اسے لے آؤ۔“
میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس مصیبت کا میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔

اب میری گواہی سے نہ جانے کس کی شامت آنے والی تھی۔
 ”وہ دقت بھی کر چکا ہے۔“ تھانے دار نے انکشاف کیا۔

میں مزید دہل گیا۔ کس مصیبت میں پھنس گیا..... پھر میں نے سوچ لیا کہ اس شخص کو دیکھتے ہی انکار کردوں گا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ میں بلاوجہ کسی قاتل کی دشمن کیوں مول لیتا پھروں۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ شخص میرے بیان کردہ حلیے پر واقعی پورا اترتا تھا۔ اس نے کمرے میں آتے ہی خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ مجھ میں اس سے نظریں چار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

”کیوں، یہی ہے نا، وہ شخص۔“ تھانے دار نے اس کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔
 ”نہیں جناب، یہ وہ شخص نہیں ہے۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔
 کاش میں نے وہ بات زور سے کہی ہوئی! میرے بولنے کے فوراً بعد ہی تھانیدار نے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ ”ٹھیک ہے، شناخت ہو گئی۔“ اس نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ ”مولا بخش واپس لے جاؤ اسے اور گواہ رہنا کہ ہمارے گواہ نے اسے پہچان لیا ہے۔“
 ”لیکن جناب.....“ میں نے تردید کرنا چاہی۔

”بس خاموش رہو۔“ تھانے دار نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تم نے اسے پہچان لیا ہے اور اب تم منحرف نہیں ہو سکتے۔“ اس اثناء میں مولا بخش اس بے چارے کو ہنکاتا ہوا باہر لے گیا۔
 ”لیکن جناب، یہ وہ شخص نہیں ہے۔“ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
 ”یاد رکھو..... یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں اس کا سناھی سمجھ لیا جائے گا۔“ تھانے دار نے دھمکی دی۔ ”بس اب گھر جاؤ اور آرام کرو۔“

میں گھر لوٹ آیا لیکن بے حد پریشان تھا۔ نہ جانے وہ اس بے چارے کا کیا حشر کریں گے۔ اس کے علاوہ اس بے چارے نے مجھ بے چارے کو جن نظروں سے دیکھا تھا، انہیں میں بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ نہیں تو اس کے متعلقین میرے پیچھے پڑ سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے میرے دماغ کی رگیں کھینچنے لگیں۔ میں خوف زدہ تھا۔ اب نجات کی صورت یہی تھی کہ غائب ہونے والی دوا کے ذریعے ساری دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں، لیکن وہ دوا ابھی تاحال نامکمل ہی تھی۔

میں نے پھر اس دوا پر کام شروع کر دیا۔ اس بار میں نسبتاً زیادہ پر یقین تھا۔
 لیکن اگلی ہی شام میں امتحان میں پڑ گیا۔ مجھے اپنے گھر کے باہر کسی گاڑی کے رکنے

کی آواز سنائی دی۔ مجھ سے ملنے والا کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس کے پاس گاڑی ہو۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو میرا دم نکل گیا۔ وہ لوگ خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کسی بڑی دشواری میں پڑنے والا ہوں۔ یہ سب اسی جھوٹ کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے اور ان میں سے نصف آدمی بھی میرے لیے بہت کافی تھا۔ پھر دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں کہیں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب یہی ایک صورت تھی کہ میں غائب ہونے والی دوا استعمال کر لوں۔ اس صورت میں ممکن تھا کہ وہ میرے گھر کو آسیب زدہ سمجھ کر بھاگ اٹھتے۔

میں نے دوا کی خوراک پی اور لائٹ آف کر دی..... پھر میں دبے قدموں سے آگے بڑھا اور دروازے کو دھیرے دھیرے پر اسرار انداز میں کھول دیا۔ میں معاملے کو پوری طرح آسیبی رنگ دینے کے موڈ میں تھا۔ پھر میں دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ احتیاطاً میں نے اپنے سائے کی طرف دیکھا، وہ غائب تھا اور اس کا مطلب تھا کہ میں بھی غائب ہوں۔
 وہ چاروں اندر آ گئے۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر میری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن وہ چاروں مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں بوکھلا کر رہ گیا۔ میرے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی، میں حیران تھا کہ وہ لوگ ایک غائب آدمی کو اس قدر پنے تلے انداز میں کیسے مار رہے ہیں۔
 ”ارے، پہلے اس سے پوچھ تولو۔“ ان میں سے ایک بولا۔ پھر اس نے لائٹ آن کر دی۔

روشنی ہوتے ہی مجھے پتہ چلا کہ میں غائب نہیں ہو سکا تھا۔ اندھیرے میں سایہ نظر آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اسی لیے میں خود فریبی میں مبتلا ہوا تھا۔ غرض میں سوچتا رہا اور پٹپٹا رہا۔ انہوں نے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ شور مچانا چاہئے۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے واویلا شروع کر دیا۔ وہ دھمکیاں دیتے رہے لیکن میں کہاں چپ ہونے والا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ میرے پیہم شور مچانے کے نتیجے میں وہ مجھے چھوڑ بھاگے۔ لیکن میں اس سے پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا۔

دوسرے دن میں پھر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ جب سے ان دواؤں کا چکر چلا تھا، میرا بدن عجیب عذاب میں مبتلا تھا، لیکن اب مجھے بھی ضد ہو چکی تھی کہ دوائے غیب کے ذریعے اپنا اور قوم کا مستقبل سنوار کر رہوں گا۔ اب تو وہ دوا اور بھی اہم ہو گئی تھی، کیونکہ ایک جھوٹ کے نتیجے میں، میں نہ جانے کتنے دشمن بنا چکا تھا۔

میں نے اس دوا پر پھر کام شروع کر دیا۔
 اس دفعہ میں بہت زیادہ احتیاط برت رہا تھا۔ ہر چیز صحیح مقدار میں استعمال کر رہا تھا۔ اس

دوران میں، میں نے گھر کے دروازے پر تالا ڈال دیا تاکہ ڈسٹرپ ہونے سے محفوظ رہوں۔ میں چار دن تک مصروف رہا۔ دوا کی تیاری کے بعد اس کی آزمائش کا مرحلہ آ گیا۔ میں نے کھڑکی کے راستے باہر جا کر دروازے کا تالا کھولا اور اسے اندر سے بند کرتے ہوئے دواؤں کی الماری کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے دوا کی ایک خوراک لی اور اپنے سائے پر نظریں جمادیں۔ کچھ ہی دیر بعد میرا سایہ غائب ہو گیا۔ میں نے کئی بار بلب جلا یا لیکن سایہ دکھائی نہ دیا۔ پھر میں نے کھڑکی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ دس منٹ گزرے..... پھر آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ لیکن میرا سایہ نمودار نہ ہوا۔ گویا میں نے دوا کی خامی دور کر دی تھی۔ مارے خوشی کے بے اختیار میرا جی تو چاہا کہ چیخ چیخ کر سب کو اپنے اس کارنامے کے بارے میں بتا دوں۔

مگر ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پڑوس کا ایک بچہ دروازے پر کھڑا تھا۔ میں دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا لیکن پھر ٹھنک کر رہ گیا۔ میں اس وقت غائب تھا۔ ایسی صورت میں دروازہ کھولنا تو بچہ ڈر جاتا۔ لیکن پھر سوچا، تجربہ تو کر کے دیکھوں کہ کہیں آواز بھی تو غائب نہیں ہو جاتی۔ یہ سوچ کر میں نے بچے کو پکارا۔ ”کیا بات ہے، بیٹے؟“

”ابو انکل، آپ کا فون آیا ہے۔“ بچے نے جواب دیا۔

مجھے شراقت ہو گئی۔ وہ بچہ محلے کے شریر ترین بچوں میں سے ایک تھا۔ میں نے اسے ڈرانے کے لیے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی بچہ اندر آ گیا۔

”جلدی چلیے انکل، آپ کا فون آیا ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بچہ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ کسی واحد غائب سے کوئی کیسے گفتگو کر سکتا ہے، لیکن پھر بوکھلا کر رہ گیا۔ بچے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ ”بیٹے..... کیا میں غائب نہیں ہوں؟“..... میں نے پوچھا۔

بچہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔ ”انکل ایسے کون غائب ہوتا ہے۔ آپ کو تو اللہ میاں ہی غائب کریں گے۔“

جی تو چاہا کہ اس گستاخ کے ایک رپٹ رسید کر دوں۔ لیکن فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ میں غائب نہیں ہو سکا تھا۔ ”اچھا، بیٹے، یہ بتاؤ۔“ میں نے گلوگیر ہو کر پوچھا۔ ”تمہیں میرا سایہ دکھائی دے رہا ہے؟“

”جی ہاں، انکل۔ وہ رہا آپ کے پیچھے۔“

بے اختیار میرا جی چاہا کہ دیوار سے سر ٹکرائنا شروع کر دوں۔ مجھے کمرے کے دونوں بلب

جلا کر چپک کرنا چاہئے تھا، لیکن میں نے صرف سامنے والا بلب جلا یا تھا۔ چند لمحوں میں ذہنی حالت سنبھلی تو میں بچے کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ اس بچے کا گھر مجھے بے حد پسند تھا کیونکہ وہاں پر نہ صرف ٹیلی فون تھا بلکہ ایک حسین اور طرح دار لڑکی بھی تھی۔ میں جب بھی کوئی ٹیلی فون ریسرو کرنے وہاں جاتا تھا، اسے دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ وہ میرے لیے ہمیشہ واحد غائب قسم کی کوئی چیز ثابت ہوتی۔ مدت سے میری خواہش تھی کہ اس کی رفاقت میسر آئے لیکن آج تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

بچہ مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر خود اندر چلا گیا۔ فون سن کر میں زندگی سے اور زیادہ بیزار ہو گیا۔ وہ میرے ایک قرض خواہ کا فون تھا۔ میں نے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کی اور فون رکھ دیا۔ میں باہر نکلنے ہی والا تھا کہ بچہ ڈرائنگ روم میں واپس آ گیا۔ ”ابو انکل..... ابھی جاییے گا نہیں۔“ بچے نے کہا۔ ”باجی آپ سے سائنس کا ایک سوال پوچھنے آ رہی ہیں۔“

میں خوشی سے سرشار ہو گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب تو دوا کی ناکامی کا افسوس بھی زائل ہو گیا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بت طناز کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر میری سانسیں فی الفور بے ترتیب ہو گئیں۔ کمرے میں آ کر لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا، پھر بچے کو آواز دی۔ ”خالد..... خالد.....“

”کیا بات ہے باجی؟“ بچہ اس کی آواز سن کر آ گیا۔

”ابو بھائی کہاں چلے گئے؟“ اس نے پوچھا۔

میرا غصے کی شدت سے برا حال ہو گیا۔ ابو ہی کیا کم تھا کہ بھائی کا دم چھلا بھی لگ گیا۔

”پتہ نہیں باجی۔ ابھی تو یہیں بیٹھے تھے۔“ بچے نے جواب دیا۔

اب مجھے صحیح صورت حال کا احساس ہوا۔ میں غائب ہو چکا تھا۔

کیسی ستم ظریفی تھی کہ میں حسب خواہش تو غائب نہ ہو سکا، لیکن اب جب کہ میرا حاضر ہونا ضروری تھا..... میں غائب ہو گیا تھا۔ میں انہیں پکار کر اپنی موجودگی کا احساس بھی نہیں دلا سکتا تھا اور نہ وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلتے میں دانت جھینچے دم خود کھڑا رہا۔ مجھے دوا پر غصہ آ رہا تھا۔

”کہیں وہ کھڑکی کے راستے نہ بھاگ گئے ہوں۔“ بچے نے کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”ممکن ہے۔“ لڑکی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”صورت ہی سے سنی معلوم ہوتے ہیں۔“

تھی اور پانچہ کتے کے منہ میں تھا۔ میرے جسم سے الگ ہوتے ہی وہ پانچہ سب کو نظر آنے لگا۔
بھوت..... بھوت..... بہت سے لوگ بیک آواز چلانے لگے۔

عجیب صورت حال تھی۔ وہ صاحب کتے کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے اور نامعقول کتا مجھ پر چھپنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میرے بدن پر لرزہ طاری تھا اور مارے خوف کے کھانسی بندھ گئی تھی۔ ادھر لوگوں کا بھی برا حال تھا۔ ان کی دانست میں، میں کوئی نو وارد بھوت تھا۔ کسی کو یہ خیال تک نہ آیا کہ بھوت، پتلون نہیں پہنتے۔ بہر حال..... میری نظروں کے سامنے اس وقت باؤلے پن میں استعمال ہونے والے چودہ بڑے بڑے انجکشن رقص کر رہے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ اپنی جان بچانے کا تھا۔ کتا غالباً خون کی بو پا کر مجھ پر لپکا تھا۔

کتے نے ایک بار پھر زنجیر چڑائی۔ اسے آزاد دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی۔ مجھے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کرنا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر لپک کر حلوائی کی دکھائی پر پڑا ہوا کر چھا اٹھالیا، کر چھے کو دیکھ کر لوگ اور بھی بوکھلا گئے۔ ہر طرف سے بھوت..... بھوت..... کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”نامعقول..... تم کیوں چلا رہے ہو؟“ میں نے دھاڑ کر کہا۔ ”میں تو اس کتے سے اپنی ٹانگ بچا رہا ہوں۔“

”سنو..... سنو..... بھوت بول رہا ہے۔“ مجھے میں سے کوئی چیخا۔
”ماروا سے..... پتھر مارو۔“ کسی نے مشورہ دیا۔

اب میں دو اطراف سے گھیر گیا تھا۔ ادھر وہ خبیث کتا میرے پیچھے پڑا ہوا تھا، ادھر لوگوں نے سنگ زنی شروع کر دی تھی۔ قیس کے بعد شاید ہی کسی نے اتنے پتھر کھائے ہوں گے، جو اس تھوڑی سی دیر میں، میں نے کھائے تھے۔ بالآخر میں نے کر چھالے کر بھاگنا شروع کر دیا، لیکن نہ تو کتے نے میرا پیچھا چھوڑا اور نہ ہی پتھر مارنے والوں نے ہارمانی۔ میری تو عقل ہی خط ہو کر رہ گئی تھی۔ میں غائب تھا۔ اس کے باوجود وہ لوگ میرے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ پھر میری کچھ میں ساری بات آ گئی۔ میں تو غائب تھا لیکن کر چھا تو دوائے غیاب سے محروم تھا اور مصیبت یہ تھی کہ کتے کی وجہ سے میں کر چھے کو پھینک بھی نہیں سکتا تھا۔ کر چھا نہ پھینکنے کی صورت میں میرا حشر مجنوں سے زیادہ برا ہوتا۔ عجیب صورت حال تھی۔ بہتری اسی میں تھی کہ میں کر چھا تھا سے دوڑتا ہی رہوں۔ گھر قریب آنے پر کر چھا پھینک کر گھر میں گھس جانے میں ہی میرے لیے عافیت تھی۔

میں نے اپنی رفتار اور تیز کردی، لیکن کر چھے کی رفتار بڑھتی محسوس کر کے لوگوں نے بھی اپنی رفتار بڑھادی۔ پھر میں نے پلٹ کر دیکھا، کتے کا تو دور دور پتہ نہیں تھا، البتہ سنگ بکف جم

مجھے اس لڑکی پر بے تحاشہ غصہ آیا۔ میں اس سے کیسی کیسی امید لگائے بیٹھا تھا اور وہ میرے بارے میں کیسی رائے ظاہر کر رہی تھی۔ پھر میں نے ان دونوں کو سزا دینے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے ایک زوردار چیخ ماری۔ لڑکی کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ میری دوسری چیخ سن کر وہ دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ اٹھے۔ باہر نکلتے نکلتے دونوں ایک ساتھ دروازے سے نکلے گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ پھر میں چپکے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میں بے حد خوش تھا۔ اس نامعلوم لڑکی کی حقیقت ہی کیا تھی۔ اب تو ساری دنیا میرے قدموں میں تھی۔ میں جوجی میں آئے کر سکتا تھا۔ مجھے بھلا کون روک سکتا تھا۔

اب سب سے پہلے مجھے گھر پہنچ کر یہ چیک کرنا تھا کہ میں کتنی دیر غائب رہتا ہوں، لیکن مجھے اپنے گھر کے گرد کچھ لوگ منڈلاتے نظر آئے۔ شاید وہ میرے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میرے لیے یہ بدلہ لینے کا ایک نادر موقع تھا۔ میں نے ایک پتھر اٹھایا اور پوری قوت سے، ان میں سے ایک کے سر پر دے مارا۔ وہ چیختا چلاتا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ بھل بھل خون بہنے لگا۔ ابھی وہ حیران ہی تھے کہ میں نے دوسرے شخص کو نشانہ بنالیا۔ وہ اپنی کمر تھام کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا..... ان کی چیخیں سن کر محلے والے جمع ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ خبیث میرے گھر میں گھسنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ لہذا میں اطمینان سے ٹہکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

راستے میں، میں نے حلوائی کی دکان سے بے دھڑک مٹھائی کھائی۔ پھر تجربے کے طور پر اس کے گلے سے دس کا ایک نوٹ بھی اڑالیا۔ دکان پر خاصا رش تھا اور حلوائی بہت مصروف تھا۔ نوٹ اٹھاتے ہوئے میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کسی نازک موقع پر حاضر نہ ہو جاؤں، لیکن خوش قسمتی سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔

اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور شدید تکلیف کے ساتھ خون نکلنے کا احساس بھی ہوا۔ میں ابھی تکلیف سے دوچار ہی تھا کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔

ایک صاحب اپنے خونخوار کتے کی زنجیر تھامے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ اچانک کتا بھڑک اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کر لیا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔ وہ میری پتلون کے پانچے کو اپنے جبروں میں جھینچ کر جھٹکے دے رہا تھا۔ اچانک ہی وہاں مچھلی بازار بن گیا۔ میں نے ایک زوردار چیخ ماری جو اس شور و غل میں دب کر رہ گئی۔ اس کتے کو کسی نادیدہ شے پر جھپٹے دیکھ کر لوگ بری طرح چیخنے لگے تھے۔

”نامی، ادھر آؤ۔“ کتے کے مالک نے زنجیر تھام کر زور لگایا۔

اس جدوجہد میں میری پتلون کا پانچہ داغ مفارقت دے گیا۔ اب پتلون میرے پاس

غیر میرے تعاقب میں بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

میں نے کرچھ کو جمع کی طرف اچھال دیا۔

لوگوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اب وہ کرچھ کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے، لیکن کوئی بھی اسے چھونے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ میں نے جیسے تیسے چابی نکالی اور گھر کے دروازے پر لگا تالا کھول دیا۔ پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو جمع میں ایک عامل صاحب کا اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید کسی نے انہیں بھوت کے متعلق اطلاع دے دی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھر میں نے دوا کا توڑ استعمال کیا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اپنا سایہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں ظاہر ہو چکا ہوں۔ لیکن میرا جوڑ جوڑ تھکن اور تکلیف سے دکھ رہا تھا۔

بستر پر لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ لوگوں کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ شاید وہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے گھر تک آپہنچے تھے۔ بے اختیار جی چاہا کہ کھڑکی کے راستے فرار ہو جاؤں، لیکن بوقت یاد آیا کہ میں واحد حاضر ہوں۔

اس دوران میں دستک کی بجائے دروازہ دھڑا دھڑ بجا یا جانے لگا۔

”اچھا بھئی..... آ رہا ہوں۔ کیا دروازہ توڑ دو گے۔“ میں نے جھلا کر کہا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

دروازے کے باہر ایک جھوم تھا۔ عامل صاحب سب سے آگے تھے۔ وہ خبیث بھی پہلی صف میں تھا جس نے مجھ پر پہلا پتھر پھینکا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”ابومیاں..... آپ کے گھر میں بھوت ٹھس گیا ہے۔“ عامل صاحب نے کہا۔

”بھوت..... میرے گھر میں..... بھائی، یہاں تو صرف میں ہی ہوں۔“

”میاں..... وہ بھوت دکھائی نہیں دیتا۔“ عامل صاحب بولے۔ ”اسے دیکھنے کے لیے

بصیرت چاہیے، بصیرت۔“

”ہاں بھیا..... بھوت تمہارے ہی گھر میں گھسا ہے۔“ نسیم صاحب بولے جو میرے پڑوسی تھے۔

”آپ کو یہ یقین کیوں ہے۔“ میں نے جھلا کر پوچھا۔ کم بخت میرے سامنے مجھے ہی بھوت کہہ رہے تھے۔

”بھائی یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔“ نسیم صاحب بولے۔ ”آج میرے گھر کچھ مہمان آئے تھے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میرا گھر کتنا چھوٹا ہے۔ تم اکیلے ہو۔ میں نے سوچا، انہیں تمہارے ہاں ٹھہرا دوں۔ میں نے انہیں تمہارا گھر دکھایا۔ دروازے پر تالا تھا۔ میں انہیں دروازے پر چھوڑ کر تمہاری تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ یہیں کھڑے تھے کہ ان پر پتھر برسے گئے۔ اس وقت دو مہمان تو اسپتال میں ہیں اور دو گاؤں واپس بھاگ گئے۔“

میرا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ نسیم صاحب کے مہمانوں کو میں اپنا دشمن سمجھ بیٹھا تھا۔ بہر حال، یہ اطمینان بھی ہوا کہ آئندہ ان کے مہمانوں کے عذاب سے محفوظ رہوں گا۔

”بھائی..... یہ گھر چھوڑ دو۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“ کسی نے مجھے مشورہ دیا۔

”ارے نہیں صاحب۔ میرے ساتھ بزرگوں کی وعائیں ہیں۔ وہ بھوت میرا بال بھی بیک نہیں کر سکتا۔“ میں نے سینہ تان کر جواب دیا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ نسیم صاحب نے کہا۔ ”ہم تو تمہیں صرف سمجھا ہی سکتے ہیں۔“

لوگ واپس چلے گئے تو میں دروازہ بند کر کے اندر آیا۔ اچانک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا، جس پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے گھر آ کر کپڑے نہیں بدلے تھے..... اور محلے والوں کے سامنے اسی پتلون میں چلا گیا تھا، جس کا پانچہ کتے نے نوچ لیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس پتلون سے نجات حاصل کر لی..... ہمیشہ کے لیے۔ اسے تیلی دکھا کر جلا ڈالا۔

ایک بات اچھی تھی کہ اب لوگ میرے آسیب زدہ مکان سے دور ہی رہیں گے۔ یعنی میں اپنا کام سکون کے ساتھ کر سکوں گا۔

میں نے دوا پر مزید دو دن کام کیا۔ دوا کی ایک خامی دور ہو گئی۔ یعنی، دوا استعمال کرنے کے بعد غائب ہونا یقینی تھا، لیکن مجھے حاضر ہونے کی خصوصیت پر کنٹرول نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے باوجود میں اس دوا کی مدد سے بہت سے کام کر سکتا تھا۔

دو دن بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ اس روز میں دوا استعمال کر کے، غائب حالت میں مڑگشت کر رہا تھا کہ شور و غل سنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص ہاتھ میں بریف کیس لیے بھاگا چلا جا رہا ہے اور بہت سے لوگ اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی چور یا ڈاکو ہے۔

میں نے سوچا کہ اڑنگا لگا کر اسے گرا دوں لیکن پھر میں نے اس کے ساتھ ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میں نے بھی اس کے ساتھ دوڑ لگا دی۔ گلی ختم ہوتے ہی وہ شخص ایک کار کی طرف لپکا، جو اس کی منتظر تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست کا دروازہ کھلا ہوا تھا، بھاگنے والے نے بریف کیس گاڑی میں اچھالا، پھر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے

فٹ بال کے پیشہ ور کھلاڑی رہے ہوں۔ انہیں شاید یہ خیال بھی نہیں تھا کہ میں آدمی ہوں، کوئی فٹ بال نہیں..... پھر اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے بری طرح چیخا چلانا شروع کر دیا۔ میری چیخیں ان کے لیے غیر متوقع تھیں۔ جب تک وہ مجھے روکتے، میں ایک طوفان اٹھا چکا تھا۔ میرا ہچھلا تجربہ اس بار بھی کامیاب ثابت ہوا۔ انہوں نے چندا ور کرارے ہاتھ رسید کیے اور فرار ہو گئے۔

شور و غل کے باوجود پاس پڑوس کا کوئی آدمی میرے گھر کے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔ دوسری صبح میں نے چوراہے پر کھڑے ہو کر محلے والوں کو لتاڑنا شروع کر دیا۔ ”کیسی بے حسی ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”اسلام نے پڑوسی کا خیال رکھنے کا حکم دیا ہے، میں چیخ رہا لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رہیگی۔“

”رہیگی تھی، میرے بھائی۔“ نسیم صاحب نے جواب دیا۔ ”لیکن بھوتوں سے کون دشمنی مول لیتا ہے۔“

”کیسے بھوت..... کہاں کے بھوت!“ میں نے دہاڑ کر کہا۔ ”چور گھس آئے تھے۔ انہوں نے مار مار کر میرا بھر کس نکال دیا۔“

”چور نہیں، بھوت ہی ہوں گے۔“ ایک صاحب بولے۔ ”کیا خبر، کب کس بھیس میں چلے آئیں۔ کوئی اعتبار ہے، ان کا۔“

میں سر پیٹ کر رہ گیا۔ جی میں آیا کہ بھوتوں کا پول کھول دوں لیکن اس میں بھی خود میرا ہی نقصان تھا، چنانچہ خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا وہ دو مجھ پر..... میرے جسم پر بڑا وبال لے کر آئی تھی۔ کتنی مرمت ہو چکی تھی، میری..... کتنے خطرناک لوگ بلا وجہ میرے دشمن بن گئے تھے۔ اور فائدہ ایک دھیلے کا بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو بہلا لیا کہ سارا قصور خود میرا ہی ہے۔ حماقت مجھ ہی سے سرزد ہوئی ہے۔

کچھ دن سکون سے گزرے۔ پھر اخبار کی ایک خبر نے میری زندگی کو دوبارہ متلاطم کر دیا۔ اس شخص نے، جسے تھانیدار نے زبردستی مجھ سے شناخت کروایا تھا، اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا۔ لڑکیوں کا چکر تو ثانوی تھا، درحقیقت وہ شخص اسمگلروں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی نشاندہی پر گروہ کے کئی اور افراد بھی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اخبار میں میری تصویر بھی شائع ہوئی، کیونکہ اس کی شناخت میں نے ہی کی تھی۔ میری بہادری کی بھی بہت تعریف کی گئی۔ بیٹھے بٹھائے میری بہادری کی شہرت ہو گئی۔ میرا جھوٹ وسعت اختیار کر رہا تھا۔ لیکن اس واقعے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں دو کی مدد سے قانون کے ہاتھ مضبوط کر سکتا

بھی بیٹھنے کی کوشش کی لیکن گاڑی چل پڑی۔ میں دروازے کا ہینڈل تھام چکا تھا اور گاڑی شروع ہی سے تیز رفتاری سے بڑھی تھی۔ اب میں دروازہ چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں حاضر غائب کا چکر بھول گیا اور بری طرح چیخنے لگا لیکن ٹریفک کے شور میں مجھے خود اپنی ہی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سڑک پر گھسٹ رہا تھا۔ میرے دونوں گھٹنے ادھر کر رہ گئے تھے، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں آج بچ نہیں سکوں گا۔ لیکن مجھے اس کے بعد بھی برا وقت دیکھنا تھا۔ اس لیے ایک اسپید بریکر کی وجہ سے کار کی رفتار کم ہوئی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر دروازے کا ہینڈل چھوڑ دیا اور اسپید بریکر کے قریب لمبا لٹ گیا۔

میں ابھی خدا کا شکر ادا کر رہی رہا تھا کہ ایک سائیکل سوار میرے اوپر سے گزر گیا۔ ظاہر ہے، سائیکل سمیت ہی گزرا ہوگا۔ مجھ پر سے گزرتے ہوئے وہ سائیکل سمیت الٹ کر گرا۔ وہ حیران نظر آ رہا تھا۔ شاید اسے اسپید بریکر معمول سے کچھ زیادہ اونچا اور نرم بھی محسوس ہوا ہوگا۔ حالانکہ دیکھنے میں ایسا نہیں تھا۔ بہر حال اس کے گرنے سے میری جان بچ گئی۔ کیونکہ آنے والی گاڑیاں رک گئی تھیں۔ مجھ پر سے صرف سائیکل ہی گزری تھی تو جسم ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اگر خدا نخواستہ کوئی کار گزر جاتی تو شاید میں قالین کی صورت بچھائے جانے کے کام ہی کا رہ جاتا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے گھسٹتے ہوئے سڑک پار کر لی۔ اب میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے بریف کیس والے کا پیچھا کرنے کے متعلق سوچا تھا۔

گھر واپسی کی داستان الم سنا کر میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دوائے غیاب کی زخموں سے رشتہ داری ہے۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ اپنی حماقتوں کا الزام دو کو دینا مزید بڑی حماقت ہے۔ گھنٹوں کے زخم بھرنے میں کچھ دن لگ گئے۔ محلے والے شاید مجھ پر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ شاید ان پر بھوت کی دہشت سوار ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ میرے لیے بہتر ہی ہوا تھا، لیکن ایک رات مجھے پتہ چلا کہ میرا خیال کس قدر غلط تھا۔

اس رات دو بجے نہ جانے کس طرح دو آدمی میرے گھر میں گھس آئے۔ میرے لیے بچت کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ظاہر ہے میں دو اکھا کر تو سوا نہیں تھا میرے پوری طرح جاگنے سے پہلے ہی وہ مجھے چھاپ بیٹھے۔ ”بتاؤ رقم کہاں ہے؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”بھائی، میرے پاس صرف اٹھارہ روپے ہیں۔ وہ پتلون کھوٹی پر لٹک رہی ہے نا، اس کی جیب میں ہیں۔“

دوسرے نے مجھے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ”بکو اس مت کرو۔ رقم کہاں ہے؟“ میں نے قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین دلانا چاہا لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کام ناممکن ہے۔ وہ بڑی بے دردی سے میری ٹھکانی کر رہے تھے۔ تھوکر یں تو وہ ایسے مار رہے تھے، جیسے

ہوں۔ میں مجرموں کو پکڑنے کے سلسلے میں، پولیس کی معاونت کر سکتا ہوں۔ ویسے بھی میں کوئی قانون شکن تو نہیں تھا۔ مجرم عام طور پر ہاتھ پیر کے مضبوط ہوتے ہیں، جب کہ میں کمزور سا آدمی ہوں اور لڑائی جھگڑے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اب مجھے قوت میسر آ گئی تھی..... انسانی آنکھ سے اوجھل ہونے کی قوت..... اب میں جرائم کی دنیا میں کھلبلی مچا سکتا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے میری دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ میں خود کو شہرت کی بلند یوں پر محسوس کرنے لگا۔ میں تصور میں تمام معاشرے کو اپنا احسان مند دیکھ رہا تھا۔ میں ان دل خوش کن تصورات میں کھویا ہوا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے احتیاطاً کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی میرے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ خاصی بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ سامنے ہی مجھے ایک کار بھی کھڑی دکھائی دی۔ میں نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ وہ شریف اور معزز آدمی مجھے کسی بھی طرح خطرناک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

”فرمائیے جناب۔“ میں نے اسے نہایت احترام سے مخاطب کیا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”ابوالعمر ان آپ ہی ہیں.....؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے اپنی انگلیاں ٹوٹی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کا ہاتھ بہت سخت تھا اور گرفت سخت تر تھی۔ ”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ برخودار۔ میں نے اخبار والوں کے دفتر سے تمہارا پتہ معلوم کیا۔ مجھے تمہاری بہادری نے بہت متاثر کیا ہے۔“

”بس جی ذرہ نوازی ہے آپ کی۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ میرا پہلا قدردان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ ”آئیے تشریف لائیے۔“

وہ اندر آ گیا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ آپ نے دلبر سے اتنا سخت مقابلہ کیسے کیا ہوگا!“

”کوئی بڑی بات نہیں جناب۔“ میں نے سینہ پھلا کر کہا۔ ”میں بروس لی کا پرستار ہوں اور مجھے مارشل آرٹ پر پوری دسترس ہے۔“

”کمال ہے۔ تو کیا آپ کسی بھی وقت اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں؟“

”جی..... دلبر جیسے چار آدمیوں سے میں اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں اور مجھے زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔“ میں ہانکتا چلا گیا۔ بھلا اپنے پرستار کو مایوس کیسے کر سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیے۔“ اس شخص نے کہا۔ ”میں آپ کو بھرپور موقع دوں گا کہ آپ اپنے فن کا مظاہرہ کر سکیں۔“

”جی.....“ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ ”ارے نہیں..... رہنے دیجئے۔ شاید آپ مذاق کر

رہے ہیں۔“

”جی نہیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں خاصے خطرناک لوگوں سے آپ کا مقابلہ کراؤں گا۔“

”ارے نہیں قبلہ..... آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔“ میں بوکھلا گیا۔ ”آپ میرے مہمان ہیں۔ بتائیے ٹھنڈا پیس گئے یا گرم؟“

”بکواس مت کرو۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکال کر میرے سامنے کر دی۔

”یہ کیا چیز ہے، جناب؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اسے پستول کہتے ہیں بیٹے! کیا تم نے بھی پستول نہیں دیکھا؟“

”ارے جناب، بہت دیکھے ہیں۔ عمر گزاری ہے، اسی دشت کی سیاحی میں..... لیکن اس وقت ذرا جلدی میں پہچان نہیں سکا۔ خیر یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔ میں بخوشی اسے قبول کروں گا۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے پستول کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ حالانکہ میرے ہوش اڑنے ہوئے تھے۔

”پیچھے ہٹو۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”پاگل معلوم ہوتے ہو۔ بہر حال، تمہیں ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔“

”ارے صاحب، میں کیا میری اوقات کیا۔ آپ بلاوجہ مجھے اہمیت دے رہے ہیں۔ آپ نیلو کو لے جائیں، اپنے ساتھ۔ قریب ہی رہتی ہے۔“

”میں کہتا ہوں، چلو میرے ساتھ۔“ وہ دہاڑ کر بولا۔

”اچھا..... اچھا..... سچ..... چل رہا ہوں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”لیکن میں اپنی دوا تو لے لوں۔ بغیر دوا کے مجھے کچھ نہیں سو جھتا۔“

”لے لو۔“ اس نے پستول والا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ”اور جلدی کرو۔“

میں نے گویا پالا مار لیا تھا۔ دوا کی ایک خوراک لینے کے بعد میں غائب ہو جاتا اور وہ بال نوچتا رہ جاتا۔ خدا جانے، وہ کون تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ بہر حال، نجات کا ذریعہ میرے ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے دوا کی شیشی اٹھالی۔ ڈھکنا کھول ہی رہا تھا کہ اس نے مجھے ٹوک دیا۔

”بس بس، اسے ساتھ لے چلو۔ یہیں پینے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا فرما رہے ہیں، جناب۔ دوا پینے میں دیر ہی کتنی لگے گی۔ یہ دیکھیے.....“ یہ کہتے کہتے میں نے دوا کا ایک لمبا گھونٹ لے لیا۔ ڈھکنا بند کر کے شیشی میں نے واپس الماری میں رکھ دی۔ وہ بدستور پستول تھامے کھڑا تھا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ احمق مجھے..... یعنی ایک غیبی آدمی کو اغوا کرنے آیا تھا۔

”جلدی چلو“ اس نے پھر پستول لہرایا۔

میں نے بوکھلا کر اپنے سائے پر نظر ڈالی۔ سایہ ابھی تک معدوم نہیں ہوا تھا۔ گویا دوپھر ضرورت کے وقت دغا دے گئی تھی۔ ”ٹھیک ہے، چلیے۔“ میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، کوئی پڑوسی مل جائے تو یہ ظاہر نہ کرنا کہ میں تمہیں زبردستی لے جا رہا ہوں، ورنہ گولی مار دوں گا۔“

میں اپنی تقدیر کو کوستا اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس نے پستول والا ہاتھ جیب کے اندر کر لیا مگر میں جانتا تھا کہ وہ چوکس ہے۔ ہم باہر نکلے ہی تھے کہ نسیم صاحبہ مع اپنے چار مہمانوں کے نازل ہو گئے۔ ان کے مہمان اب صحت یاب ہو گئے تھے لیکن میرے گھر کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے بکرا قصائی کو دیکھتا ہے۔ ”ارے بھائی، میں تو آپ ہی کے پاس آ رہا تھا۔“ نسیم صاحبہ نے آگے بڑھ کر مجھے دبوچ لیا۔

وہ پانچوں میرے اور بن بلائے مہمان کے درمیان حائل ہو گئے تھے۔ بن بلا یا مہمان خاصا گڑ بڑایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ”جی فرمائیے۔“ میں نے نسیم صاحبہ سے پوچھا۔

”آپ ذرا میرے ساتھ تو آئیے۔“ انہوں نے کہا۔ پھر وہ میرے بن بلائے مہمان کی طرف مڑے۔ ”معافی چاہتا ہوں، جناب۔ بس میں ایک منٹ لوں گا۔“

وہ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ نسیم صاحبہ ہاتھ تھام کر مجھے ایک طرف لے گئے۔ ان کے مہمان اور میرا بلائے جان، پانچوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ ”یار ابو بھائی، یہ مہمان تو میری جان کو آ گئے ہیں۔“ وہ گڑ گڑانے لگے۔

”تو بتائیے، میں کیا کروں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بتائیے کہ آپ کے گھر میں واقعی آسیب ہے؟“ انہوں نے سوال کیا۔

اس بے تکے سوال پر مجھے غصہ آ گیا۔ ”میں کیا جانوں۔“ میں نے چڑ کر کہا۔

”میرا مطلب ہے، میرے مہمانوں کو اپنے گھر ٹھہرا لیجیے۔ اگر آسیب کو میرے گھر بھیج سکیں تو کیا کہنا۔ بس کسی نہ کسی طرح ان کم بختوں کو ذرا دبیجیے۔“

”کیسی بات کر رہے ہیں! میں انہیں کیسے ڈرا سکتا ہوں۔ کیا میں آپ کو آسیب نظر آتا ہوں یا آسیب میرے رشتے دار ہیں۔“ میں بھنا گیا۔

”معاف کرنا بھائی۔ میری تو عقل ہی خبط ہو کر رہ گئی ہے۔“ نسیم صاحبہ مایوس لہجے میں بولے۔ ”آپ کو بلا وجہ زحمت دی۔ آئیے چلیں۔“

ہم دونوں واپس آئے تو میرے اور نسیم صاحبہ کے مہمان وہیں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ

کر اس شخص کی آنکھیں چمکنے لگیں، جو مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پھر نسیم صاحبہ اپنے مہمانوں کے ساتھ چلے گئے اور میں اس شخص کے ساتھ تہارہ گیا۔ اچانک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ بھاگنے کا اتنا اچھا موقع میں نے ضائع کر دیا تھا۔

”چلو.....“ بن بلا یا مہمان غرایا۔

ہم کار کی طرف بڑھ گئے۔ اس نے کار کی عقبی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھولا تو میری روح فنا ہو گئی۔ عقبی نشست پر دو خونخوار کتے بیٹھے تھے۔ ڈرائیور بھی کم خوفناک نہیں تھا۔ ”چلو بیٹھو۔ جلدی کرو۔“

میں دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرتا ہوا کچھل نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ گاڑی چلتے ہی دونوں کتوں نے اپنے اپنے اگلے پنجے میرے سینے پر رکھ دیے۔ مجھے یوں لگتا جیسے میرے سینے پر کئی کئی من وزنی پتھر رکھ دیے گئے ہوں۔ میں خوف سے لرزنے لگا اور میری کھنکھی بند گئی۔ ان کم بختوں نے اسی پر اتکنا نہیں کیا بلکہ سوکھنے بھی لگے۔ جیسے میں آدمی نہیں بلکہ ان کا راتب ہوں۔ ان کی گرم گرم سانسیں مجھے بہت ناگوار محسوس ہو رہی تھیں، لیکن موت کے تصور کے مقابلے میں تو انہیں خوش گوار ہی کہا جاسکتا تھا۔ پھر نوبت سوکھنے سے یا کٹنے تک پہنچ گئی۔

”بھائی صاحب، انہیں ہٹائیں نا۔“ میں نے اپنی سانس روک کر فریاد کی۔ ”یہ بدتمیزی کر رہے ہیں۔“

”اچھا.....“ وہ ہنس پڑا۔ ”لیکن تم تو بڑے تیس مار خان ہو۔“

”ارے صاحب، کتے سے تو میں اتنا ڈرتا ہوں کہ اس طرز کا آدمی بھی نظر آ جائے تو پیشاب خطاب ہونے لگتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر بھی ڈر لگتا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ وہ دہاڑا۔ ”میرے ایک اشارے پر یہ تمہیں پھاڑ کھائیں گے۔“ میں دم بخود رہ گیا۔ اب میں صرف یہی دعا کر سکتا تھا کہ یہ سفر جلد از جلد تمام ہو جائے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر انہیں اس وقت کھولا جب کار رک گئی۔ ”چلو اترو نیچے۔“ اس شخص نے دروازہ کھولتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

گاڑی کسی بڑی سی عمارت کے احاطے میں رکی تھی۔ عمارت کا بیرونی گیٹ دوبارہ بند ہو گیا۔ گاڑی رکتے ہی کچھ اور لوگ نظر آئے جو خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ میں اترا، پھر وہ کتے اتارے اور احاطے میں دوڑیں لگانے لگے۔ میں اس شخص کے پیچھے چل دیا۔

”آپ نے بیکار زحمت کی جناب۔ آپ کہاں تک میری مہمان داری فرمائیں گے۔ کھانے کے معاملے میں میرا ذوق آپ کے لیے پریشان کن ہوگا۔“

”بس خاموش رہو۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔

میں خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک آراستہ اور پیراستہ کمرے میں پہنچا۔ اس کمرے کا فرنیچر بے حد قیمتی تھا۔ کم از کم میں نے اتنا خوبصورت فرنیچر اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں تعمیل کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ”یہ صوفیٹ تو بہت خوبصورت ہے جناب۔“ میں نے صوفے کو ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔ ”لا جواب فوم ہے، کہاں سے خریدا آپ نے؟“

”بکومت۔ بالکل ڈفر معلوم ہوتے ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے؟“

”آپ کا خیال درست ہے۔ میں بھلا ڈفر کیسے ہو سکتا ہوں۔“ میں نے برامانتے ہوئے کہا۔

”دلدار خان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”بڑا پرانا تعلق ہے جناب۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں تین مرتبہ نقل مکانی کر چکا ہوں۔ میرا ہر مکان اسی کے ذریعے بکا اور میں نے ہر مکان اسی کے ذریعے خریدا۔ ارے جناب، وہ تو فرشتہ ہے فرشتہ..... اب تک کمیشن کے سلسلے میں میرے ساتھ تین سو روپے کی رعایت کر چکا ہے۔ جب کہ اس زمانے میں تین روپے کی خاطر.....“

”کیا بکواس ہے۔“ وہ اس بری طرح دہاڑا کہ میں ہل کر رہ گیا۔ ”یہ کس دلدار خان کی بات کر رہے ہو تم؟“

”اسٹیٹ ایجنٹ ہے، عالی جاہ۔“ میں نے لرزتے ہوئے کہا۔

اس بار اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”یاد تم کہیں کریک تو نہیں ہو۔“ وہ رو ہانسا ہو گیا۔ اس بار مجھ پر برامانتے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ ”میں تمہارے سرغنہ دلدار خان کی بات کر رہا ہوں۔ وہی جس کے اشارے پر تم نے میرے آدمی دلبر کو پھنسا دیا ہے۔ تمہیں بتانا ہو گا کہ دلدار خان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”بخدا، میں اسٹیٹ ایجنسی والے کے سوا کسی دلدار خان کو نہیں جانتا۔“ میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ”میں تو سیدھا سادا آدمی ہوں۔ میں نے اپنے محلے کے لوگوں سے ایک جھوٹ بولا تھا، جس کی سزا اب تک بھگت رہا ہوں۔ ارے جناب، مجھے کسی گروہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس جاپانی نمپا پاستانی کی تو بڑی قدر ہے، میرے دل میں تو تھانے

میں اسے دیکھتے ہی بے چین ہو گیا تھا، دل بھر آیا تھا میرا..... وہ تو بہت شریف آدمی ہے۔“

”تم پھر ادھر ادھر کی باتیں لگے۔“ وہ بھنا گیا۔ ”تم یوں نہیں مانو گے۔ کچھ دن قید رہو گے تو خود بخود دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔“

”مجھ پر رحم کریں جناب۔ ہونے والے بچوں کی قسم، میں نے سچ بولا ہے۔“

لیکن اس نے میری بات نہیں سنی اور اپنے آدمیوں کو پکارنے لگا۔ فوراً ہی دو پستول بردار کمرے میں آ گئے۔

”اسے سب سے اوپر والے کمرے میں لے جا کر بند کر دو۔“ اس نے میری طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔

”چلو.....“ انہوں نے ریوالور لہراتے ہوئے بیک آوازاں کیا۔

مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میں نے ان کے کہنے پر عمل نہ کیا تو یقیناً میری مرمت ہوگی اور اب میں مزید مرمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے اوپری منزل پر لے آئے۔ ہر قدم پر میں آس لگا تا تھا کہ شاید غائب ہو جاؤں گا، لیکن دوا دغا دے گئی تھی۔ مجھے جس کمرے میں بند کیا گیا، اس میں صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ روشن دان تھا تو سہی لیکن بہت بلندی پر تھا۔ اس میں بھی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کئی بلب روشن تھے..... لیکن بیڈ کے سوا فرنیچر نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔ نہ جانے میں کن لوگوں کی قید میں آ پھنسا تھا۔ نہ جانے وہ دلدار خان کون تھا، جسے میرا سرغنہ قرار دیا جا رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کس بات کا اعتراف کرانا چاہتے ہیں۔ ورنہ میں فوراً اعتراف کر لیتا۔ میں دیر تک ٹھٹھکتا رہا، لیکن کوئی ترکیب نہ سوجھی۔ اس کے برعکس میرے پاؤں میں اینٹھن شروع ہو گئی۔ میں تھک کر بیڈ پر لیٹ گیا اور اسی عالم میں مجھے نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ وہ بدمعاش شاید مجھے بند کر کے بھول ہی گئے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ پینٹنا شروع کر دیا۔ لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ میرے ہاتھ دکھ گئے تو میں بیڈ کی طرف پلٹ آیا۔ اسی لمحے مکان میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہنگامے کی ابتدا گولیاں چلنے سے ہوئی تھی۔ پھر لوگوں کے شور مچانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اجانک نیچے سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ”دلدار خان نے حملہ کر دیا ہے۔“

یہ سن ہو کر رہ گیا۔ یہ تو میرے اس مفروضہ سرغنہ کا نام تھا۔ گویا وہ کوئی ایسا ہی جی دار بدمعاش تھا جو بھرے شہر میں کسی کے گھر پر دھاوا بول سکتا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا سایہ ندارد ہے۔ یعنی میں غائب ہو چکا ہوں۔ مجھے پھر دوا پر غصہ آ گیا۔ شاید یہ طے ہو چکا تھا

اس بھیڑ میں شامل تھا۔ کسی شخص کو اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ ایک ایسے جسم سے ٹکرا رہے ہیں جو غیر مرئی ہے۔ کسی کے پاس سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔

پہلا آدمی جال پر گرا اور کئی بار اچھلا..... پھر فائر بریگیڈ والوں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتار لیا۔ اس کے بعد دوسرے آدمی نے چھلانگ لگائی۔ اس سے پہلے میں خوف زدہ تھا، لیکن انہیں بحفاظت نیچے پہنچتا دیکھ کر میرے ہوصلے بھی بلند ہو گئے۔ میں بھی منڈیر کی طرف لپکا لیکن قسمت مجھ سے مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ دفعتاً کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گر پڑا۔ بڑے زور کی چوٹ لگی تھی۔ اٹھنے کے متعلق سوچا ہی تھا کہ ایک مونسا آدمی مجھ پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے منڈیر پر چڑھ کر چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد میرا اٹھنا ممکن نہ رہا۔ ہر شخص مجھے روندتا ہوا جال پر چھلانگ لگا رہا تھا۔ چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا۔ لیکن میں تو غائب تھا۔ لوگوں کو کیا پتا چلتا کہ ان کے پیروں کے نیچے قالین نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا آدمی ہے۔ کوئی میری چیخ و پکار پر دھیان ہی نہیں دے رہا تھا۔

بالآخر چھت پر سناٹا چھا گیا۔

اٹھنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے سوا چھت پر موجود ہر شخص نیچے کود چکا ہے۔ میری حالت اتنی خراب تھی کہ مجھ سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ لگتا تھا ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے، میرے جسم میں موجود ہڈیوں کی تعداد، اصل کے مقابلے میں چار گنا ہو گئی ہے۔ بمشکل تمام میں کراہتا ہوا اٹھا اور منڈیر تک پہنچا..... لیکن نیچے دیکھ کر مجھے چکر آ گیا۔ فائر بریگیڈ والوں نے جال سمیٹ لیا تھا۔ ان کے خیال میں اب چھت پر کوئی ذی روح نہیں تھا۔ میں تھر تھرا کر پینے لگا۔ مار خوف کے میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلنے لگی..... ادھر آگ کے شعلے بہت قریب..... بہت زیادہ قریب آ پہنچے تھے۔

☆.....☆.....☆

چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر شخص بہرا ہو گیا ہو۔ تھک ہار کر میں نے چیخا موقوف کر دیا میں بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور افتاد آن پڑی پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ بس یہ احساس ہوا کہ میں فضا میں نہ صرف معلق ہوں بلکہ کسی گولے کی طرح چکر بھی رہا ہوں۔ نہ جانے کسی چیز نے مجھے اٹھالیا تھا مجھے تو وہ بھی اپنی ہی طرح کوئی غیر مرئی اور ٹھوس سی چیز محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس چیز نے مجھے آزاد کیا۔ تو ایک اور بڑی مصیبت سامنے آ گئی۔ میں پوری قوت سے چھت کی منڈیر نما دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا اور کسی مردہ چھپکلی کی طرح گر پڑا۔ میرے اوسان جواب دے گئے کچھ دیر بعد ذہن قابو میں آیا تو سوچوں کے گھوڑے دوڑ پڑے۔ تب مجھ پر منکشف ہوا کہ اس مرتبہ بھی مجھ پر یہ ستم

کہ دوامیری خواہش کے برعکس ہی اپنا اثر دکھایا کرے گی۔

”پہلے قیدی کو کمرے سے نکالو۔“ مجھے اپنے اغوا کنندہ کی آواز سنائی دی۔

میں خوشی سے بے حال ہو گیا۔ مجھے آزادی ملنے والی تھی۔ میں دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، میں کسی جھونکے کی طرح باہر نکل گیا۔ مجھے نکالنے کے لیے وہی دونوں آئے تھے۔ جو مجھے اس کمرے میں پہنچا گئے تھے۔ انہوں نے کمرہ خالی دیکھ کر شور مچا دیا۔ ”وہ بھاگ گیا۔ وہ بھاگ گیا۔“ وہ چیختے ہوئے نیچے کی طرف بھاگ اٹھے۔

میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے وہاں سے نکلنے سے کون روک سکتا تھا۔ میں تو انہیں ڈراڈرا کر بے حال کر دیتا۔ لیکن باہر آتے ہی مجھے بھونچکا رہ جانا پڑا۔ مکان چاروں طرف سے شعلوں میں گھرا ہوا تھا..... پھر یہ پتہ چلا کہ اس مکان میں بہت سارے لوگ موجود تھے۔ افراتفری کا عالم تھا ہر شخص بوکھلا ہٹ میں ادھر ادھر بھاگتا پھرتا تھا۔ میں نیچے جانے والے زینوں کی طرف لپکا لیکن وہ بھی آگ کی زد میں آ چکے تھے۔ راستہ بند تھا۔ میں چھت پر چڑھ گیا۔ وہاں بھی کہرام مچا ہوا تھا۔ میں لوگوں کی نگاہوں سے تو اوجھل تھا لیکن اس صورت حال میں اوجھل ہونا بے حد خطرناک تھا۔ آگ حاضر اور غائب میں تمیز نہیں کرتی۔ وہ سامنے آنے والی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

چھت پر بہت سارے لوگ تھے اور ان میں سے ہر ایک گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں بھی بے ساختہ چلانے لگا۔ لیکن کسے آنا ہوش تھا کہ کسی واحد غائب کی سنتایا محسوس کرتا۔ وہ سب اپنی جان بچانے کے چکر میں تھے، جس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مکان تیزی سے بڑھتی ہوئی آگ میں پوری طرح گھر چکا تھا۔

اچانک فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن کی دل خوش کن آواز سنائی دی لیکن افراتفری اور زیادہ ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اچانک ہی موت کے منہ سے نکل آیا ہوں۔ میں نے منڈیر سے جھانک کر دیکھا۔ پانیپ کھولے جا رہے تھے، اس کے علاوہ نیچے ایک بڑا جال تان دیا گیا تھا۔ نیچے بھی خاصی بھیڑ تھی۔ لیکن اکثریت تماشا نیوں کی تھی۔ میں منڈیر سے جھانک ہی رہا تھا کہ ایک بدحواس شخص کا دھکا لگا۔ ”یار، دھکے کیوں دے رہے ہو۔“ میں جھلا گیا۔ ”دیکھ کر چلونا۔“

اس نے پلیٹ کر دیکھا تو مزید بدحواس نظر آنے لگا۔ تب مجھے یاد آیا کہ وہ بے چارہ تو مجھے دیکھنے سے ہی قاصر تھا۔

فائر بریگیڈ والوں نے ہدایت کی کہ چھت پر موجود لوگ باری باری جال پر کود جائیں۔ لیکن یہ سنتے ہی وہاں موجود ہر شخص تیزی سے اس طرف لپکا، جہاں جال تانا گیا تھا۔ میں بھی

فائر بریگیڈ والوں نے ڈھایا تھا۔ اب وہ عمارت کی آگ بجھانے کے لیے پانی پھینک رہے تھے۔ میں پانی کی ایک موٹی دھار کی زد میں آ گیا تھا جس نے مجھے اچھا لکھ دیا۔ وہ تو خدا نے خیر کی، اگر پانی کی دھار منڈیر سے بلند ہوتی تو میں اس عمارت سے نیچے جا گرتا اور یقیناً میری ہڈیاں اور ہونیاں، شیر و شکر ہو گئی ہوتیں۔

میں نے خود کو سنبھالا اور زینے کی طرف لپک پڑا۔ لیکن آگ نے پوری طرح زینے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مجھ پر مایوسی طاری ہو گئی۔ اس مایوسی کے عالم میں مجھے ایک خوش گوار خیال سوچا کہ میں تو غائب ہوں۔ آگ مجھے بھلا کیسے جلا سکتی ہے؟ میرا وجود تحلیل ہو چکا ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس خیال سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ لیکن ماضی میں دوا کی نا معقولیت کے بہت ہی تلخ تجربات ہو چکے تھے۔ دودھ کا جلا چھا چھ بھی پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ لہذا میں نے پہلے انگلی پر تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے جیسے ہی انگلی آگ کی طرف بڑھائی، غضب ہو گیا، میری ایک آستین، ہٹن نہ ہونے کی وجہ سے کسی کتے کے کانوں میں طرح لٹک رہی تھی۔ انگلی جلی جولی، آستین نے بھی آگ پکڑ لی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے کی آگ تو بجھائی لیکن اس دوران میں میری کلائی جھلس چکی تھی۔

موت اب مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ موت..... آگ کی صورت میں بہت ہی بھیانک ہوتی ہے۔ خدا ہر شخص کو ایسی موت سے محفوظ رکھے، شعلے اب زینوں پر چڑھتے چڑھتے اوپر آ پہنچے تھے۔ ایک مرتبہ پھر میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا لیکن کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ یوں لگتا تھا جیسے جسم کے ساتھ ساتھ میری آواز بھی غائب ہو گئی ہو۔ دفعتاً میری نظر چھت پر موجود پتھروں پر جم گئی۔ میں یہ پتھر پھینک کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ میں منڈیر کی طرف بڑھا اور ایک پتھر اٹھالیا۔ میں نے وہ پتھر مجھے کی طرف اچھالا۔ فائر بریگیڈ والوں نے چھت کی منڈیر سے سیڑھی لگا رکھی تھی اور ایک آدمی چڑھ کر چھت کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہوز پائپ تھا، پتھر سنسناتا ہوا میرے ہاتھ سے نکلا اور فائر بریگیڈ کے جوان کی کھوپڑی پر بیٹھا۔ اس نے ایک دردناک چیخ ماری اور سیڑھی کو ساتھ لیتا ہوا الٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ زمین پر لمبا لمبا لیٹا نظر آ رہا تھا۔ میں نے جلد بازی سے کام لے کر اپنے پیروں پر خود کھباڑی ماری تھی۔

میری سبجہ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ آگ تیزی سے بڑھتی آ رہی تھی۔ میری موت یقیناً تھی لیکن ابھی میرے پاس انتخاب کا ایک موقع باقی تھا۔ مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ جل کر مروں یا نیچے کود کر جان دے دوں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ نیچے کود کر ہڈیوں اور گوشت سے بھرے ہوئے تھیلے کی شکل میں پایا جانا، کونسلہ بن جانے سے بہتر ہوگا۔ یہی سوچ کر

میں منڈیر کی طرف بڑھا۔ اسی وقت اچانک مجھے امید کی ایک کرن سمجھائی دے گئی۔ نیچے ریت سے بھرا ہوا ایک ٹرک کھڑا تھا۔ وہ ریت شاید آگے بجھانے کے لیے لائی گئی تھی۔ اگر میں ٹھیک انداز سے چھلانگ لگا تو میرے نیچے کے امکانات روشن تھے ریت پر گرنے کی صورت میں صرف معمولی سا ایک جھٹکا لگتا۔ اس کے علاوہ کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں اللہ کا نام لے کر منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کھولوں لیکن اس طرح مجھے ٹرک کا پتہ بھی نہ چلتا اور اندازے کی غلطی مہلک ثابت ہوتی۔ چنانچہ میں نے آنکھیں کھلی رکھیں۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور سانسیں رکی جا رہی تھیں۔ بہر حال جیسے تیسے میں نے چھلانگ لگا ہی دی۔

فضا میں لڑکھنیاں کھانے کا وہ تجربہ بے حد خوفناک تھا۔ اپنی دانست میں میں ایک محفوظ مقام پر پہنچنے والا تھا۔ لیکن عین موقع پر قسمت پھر دھوکا دے گئی۔ اچانک ہی ٹرک اسٹارٹ ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ لیکن نہیں میرے پیروں تلے تو زمین تھی ہی نہیں۔ بہر حال، اب موت سامنے تھی اور آنکھیں کھلی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں ایک دھماکے سے زمین کے ساتھ ٹکرایا۔ لیکن شاید وہ دھماکہ میں ہی سن سکا تھا کیونکہ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ اپنی دردناک چیخ سن کر خود میرا دل پھٹنے لگا۔ یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ کون کون سی ہڈیاں ٹوٹی ہوں گی۔ مجھے تو بس اتنا ہی اندازہ تھا کہ جسم کی تمام ہڈیوں کا باہمی تبادلہ اس طرح ہوا تھا جیسے سرکاری دفتر میں کلرکوں کا ہوتا ہے۔

کچھ دیر میں بے سدھ پڑا رہا۔ زور سے سانس لیتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ نہ جانے اور کیا کیا ٹوٹ جائے۔ یار دگر دو کیسی ہی گہما گہمی تھی۔ کسی کو میرے وجود کا..... بلکہ چیخوں کا بھی احساس تک نہ ہوا۔ کافی دیر بعد میری سمجھ میں آیا کہ اس بار میں پوری طرح غائب ہو چکا ہوں۔ یعنی اپنا جسم ہی نہیں آواز بھی کھو بیٹھا تھا۔ اس کم بخت دوا کے مزاج کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ میں نے گھسٹ کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی تو جوڑ جوڑ چیخنے لگا۔ ناچار میں وہیں جم کر رہ گیا۔ اسی لمحے ایک اور آفت نازل ہوئی۔ موٹی ٹکڑی کوئی دوسو پونڈ وزنی آفت..... یہ کوئی فائر مین تھا اور اطمینان سے ٹھہلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے میرے جسم پر ایک پاؤں رکھا اور پھر دوسرا بھی رکھ دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ہاتھی مجھ پر کھڑا ہو گیا ہو۔ شاید ہڑ بونگ کی وجہ سے اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ کسی ٹیلے پر نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان پر چڑھا ہوا ہے۔ میں نے چیخ چیخ کر اسے برا بھلا کہا لیکن اسے بھی کچھ سنانی نہ دیا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ غائب ہونے کے بعد میری آواز سنانی دیتی تھی لیکن اس دفعہ نہ جانے کیا معاملہ تھا۔

میں خاموش ہو گیا اور کروٹ بدل کر اسے گرانے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے ہل بھی نہ سکا۔ اٹا میری ہڈیاں اس کوشش کی وجہ سے کڑکڑا کر رہ گئیں۔ چند ہی لمحوں میں میری سانسیں رکنے لگیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

پھر خدا نے مجھ پر رحم کیا۔ فار آفیسر نے اس جلا دفا زمین کو پکارا اور وہ اپنی توند گھماتا ہوا اس کی طرف چلا گیا۔ میری جان میں جان آئی اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں بچ سڑک سے اپنے شکستہ وجود کو ہٹاؤں اور نہ لوگ مجھے روند ڈالتے..... بلکہ ممکن تھا کہ کوئی گاڑی مجھے چل ہی دیتی میں آہستہ آہستہ گھسنے لگا۔ ہر قدم پر میری چیخیں نکلتیں۔ اب میں اطمینان سے چیخ رہا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری چیخیں کسی کو بھی سنائی نہیں دیں گی۔ ارادہ تھا کہ میں فٹ پاتھ پر پہنچ کر لیٹ جاؤں گا۔ کچھ دیر بعد حالت بہتر ہو جائے گی تو جیسے تیسے اٹھ کر گھر چلا جاؤں گا۔ تم ظریفی تو دیکھیے کہ اب میں ظاہر ہونے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اسی میں میری نجات تھی۔ میں عجیب گورکھ دھندے میں پھنس گیا تھا۔ غائب ہونا چاہتا تو حاضر رہتا اور حاضر ہونا چاہتا تو غائب ہو جاتا۔ ایسا لگتا تھا کہ لفظ دوا میں مونث ہونے کی وجہ سے عورت پن بلکہ بیوی پن بہت شدید ہے۔ وہ ہمیشہ میری خواہش کے برعکس اثر دکھاتی ہے۔ فٹ پاتھ پر پہنچ کر میں نے دیوار سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اس وقت میں انسان کی بجائے انسان کا ملبہ بن کر رہ گیا تھا۔ ارد گرد ان لوگوں کا ہجوم تھا۔ جو تماشا دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ آگ اب آہستہ آہستہ بجھنے لگی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر مجھے اپنے اغوا کنندگان میں سے کوئی ایک بھی دکھائی نہ دیا۔

مجھے آنکھیں موندے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ بہت قریب سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں بیٹے..... بس یہیں کرلو۔“

میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے چہرے کے عین اوپر ایک چار سالہ نا معقول بچہ وہ قبیح حرکت کرنے کی تیاری کر رہا تھا، جو صرف بیت الخلا ہی میں مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کم از کم میرا چہرہ اس عزت افزائی کا سزاوار ہرگز نہیں تھا۔ ”اے کیا کرتا ہے؟“ میں نے دہاڑ کر کہا۔ بچے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی تیاریوں میں لگا رہا۔

مجھے یاد آیا کہ میری تو آواز ہی غائب ہو چکی ہے۔ ادھر پانی بس سر سے گزرنے ہی والا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر کروٹ بدلی۔ میں چیخا..... میری ہڈیاں چیخیں۔ لیکن خدا کا شکر کہ میں بروقت آبخار کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے اپنا ہاتھ نظر آیا تو میں چونک پڑا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید اس طرح میرے نمودار ہونے پر وہاں بھگدڑ مچ جاتی۔ لیکن

وہاں پہلے ہی سے ہڑبڑنگ مچی ہوئی تھی۔ میری طرف کسی نے توجہ ہی نہیں دی لیکن جیسے ہی میں نے کراہنا اور چیخنا شروع کیا لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”ارے ارے..... یہ بے چارہ تو زخمی معلوم ہوتا ہے.....،“ نامعقول بچے کی مٹاں نے تبصرہ کیا۔

بہت سے لوگ میرے قریب آ گئے۔ وہ طرح طرح کے سوال کر رہے تھے۔ ان کا رویہ بہر حال ہمدردانہ تھا۔

”خدا کے لیے مجھے میرے گھر پہنچا دیں۔“ میں نے فریاد کی۔ ”آپ لوگوں کا احسان ہوگا۔“

لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ کسی نے ایک ٹیکسی روکی..... پھر بہت سے لوگوں نے سہارا دے کر مجھے ٹیکسی میں بٹھادیا۔ میں نے ٹیکسی والے کو اپنا پتا بتایا اور ٹیکسی چل پڑی۔ ٹیکسی والے نے بڑی مہربانی کی کہ مجھے میرے گھر کے دروازے پر اتارا۔ لیکن کرایہ وصول کرنے کے معاملے میں بڑا اصول پرست ثابت ہوا۔ اس نے ساری انسانی ہمدردی بالائے طاق رکھ دی۔ میں نے رحم کی اپیل کی تو وہ بولا۔ ”صاب، گھوڑا گھاس نے دوستی نہیں کر سکتا۔“

مجھے گھوڑے پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ گھاس کی ہڈیاں نہیں ہوتیں لیکن برامانے کا بھی موقع نہیں تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا خدا کا شکر ہے کہ پیسے موجود تھے، ورنہ مجھے یقین تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور میری کئی ہڈیاں لے کر ہی رخصت ہوتا۔

گھر آ کر میں نے اپنی ایک ایک ہڈی ٹٹولی اور ان کی عافیت کا جائزہ لیا تو مجھے یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ میری ہڈیاں اور پسلیاں سب کی سب پوری تھیں۔ البتہ جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ مجھے تو یہ کوئی معجزہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ اتنی بلندی سے گرنے کے باوجود کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ غائب ہونے کی وجہ سے میراون کم ہو جاتا ہو بہر حال میں اسے ثابت کرنے کے لئے مزید تجربات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی اس دوا کا کمال تھا کہ وہ کچھ ثابت کرنے ہی نہیں دیتی تھی..... اور میں جان لیوا تجربات کرنے والا سامنڈاں نہیں تھا۔

میں نے نیم گرم پانی سے سارے جسم کی نلکوں کی اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

اگلی صبح جسم کا درد بڑی حد تک کم ہو گیا تھا..... مزید افاقہ ہوتے ہی میں پھر دوا سازی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ بات طے تھی کہ مکمل نسخہ مجھے نہیں مل سکے گا..... جب کہ میں ہر حال میں اس کی خرابیاں دور کر دینا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دوا کسی سچے عاشق کی طرح ثابت قدم اور مستقل مزاج ہو جائے۔

سارا دن دوا پر کام کرنے کے بعد شام تک میں اس کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن

ہو گیا۔ میرے خیال میں اس کی خرابیاں دور ہو چکی تھیں۔ اب مجھے ان لوگوں کو کھونچ لگانا تھا، جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ مجھے نہ صرف ان سے بدلہ لینا تھا بلکہ ان کی اصلیت بھی معلوم کرنا تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی تفتیش کا آغاز اس آتش زدہ کوٹھی سے کروں گا۔ جہاں مجھے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔

اگلی صبح میں نے دوا کی ایک خوراک استعمال کی۔ اس بار فوری رد عمل ہوا۔ یہ کافی حوصلہ افزا بات تھی۔ میں مطمئن انداز میں گھر سے نکل آیا۔ محلے میں بڑی رونق تھی لیکن کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں مرکزی سڑک کی طرف چل دیا۔ اب مجھے کسی رکشہ یا ٹیکسی کا انتظار تھا۔ دیر تک میں رکشہ اور ٹیکسی والوں کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کسی نے بھی درخواست نہ جانا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں تو انہیں نظر ہی نہیں آ رہا ہوں۔ مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں غائب ہوں۔ شاید دوا کبھی کبھی میری یادداشت کو بھی غائب کر دیتی ہوگی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اتنی دور میں پیدل نہیں جاسکتا تھا۔ بس میں سفر کرنا خطرناک تھا اور رکشہ ٹیکسی مجھے اس صورت میں نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے خود بر غصہ آنے لگا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں دوا کو ساتھ لے کر گھر سے نکلتا اور اپنی منزل پر پہنچ کر اسے استعمال کرتا۔ لیکن اس صورت میں واپسی مسئلہ بن جاتی۔ بہر حال اب تو میں گھر سے نکل ہی آیا تھا، اس لیے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک چوراہے پر پہنچ گیا۔ اس وقت سرخ بتی کی وجہ سے ٹریفک رکا ہوا تھا۔

ایک خالی رکشہ دیکھا تو میں تیزی سے لپکا اور رکشہ میں بیٹھ گیا۔ رکشے کو جھٹکا لگا تو ڈرائیور نے حیرت سے مڑ کر دیکھا، پھر مطمئن ہو کر مسئلہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بتی سبز ہوئی تو رکشہ چل پڑا۔ سواری کا مسئلہ حل تو ہو گیا تھا لیکن ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ضروری نہیں کہ رکشہ اسی طرف جاتا، جدھر مجھے جانا تھا۔ اب یہی ایک صورت تھی کہ میں سواریاں بدلتا ہوں۔ اس میں یقیناً دیر لگتی لیکن کوئی اور حل بھی تو نہیں تھا۔ اچانک دو موٹی موٹی عورتوں نے رکشہ روکا اور اسی جگہ چلنے کے لیے کہا جہاں مجھے جانا تھا۔ میں بہت خوش ہوا کہ قسمت میرا ساتھ دے رہی ہے پہلی عورت رکشہ میں بیٹھنے کے لئے میری طرف کھسکی۔ اس کی دانست میں رکشہ خالی تھا۔ مجھ سے نکراتے ہی وہ چیخ مار کر دوسری طرف لپکی۔ ”اس میں تو پہلے سے کوئی بیٹھا ہوا ہے۔“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

رکشہ والے نے چونک کر اسے گھورا۔ ”خو..... مائی، تمہارا دماغ کھرا ب ہے۔“ وہ غرایا۔

دوسری عورت نے بھی اپنی ساتھی کو گھورا۔ ”واقعی کیا ہے، تمہیں۔ رکشہ تو خالی ہے۔“ ”تم خود بیٹھ کر دیکھ لو۔“ پہلی عورت نے بھنا کر کہا۔

میں اس صورت حال سے بوکھلا کر رہ گیا۔ دوسری عورت رکشہ میں بیٹھنے لگی تو میں دوسری طرف سے اتر گیا۔ ظاہر ہے دوسری عورت کو رکشہ خالی لگا۔ اس نے پہلی عورت کو برا بھلا کہتے ہوئے رکشہ میں بیٹھنے کیلئے کہا۔ پہلی عورت کے بیٹھنے ہی رکشہ چل پڑا اور میں سڑک پر کھڑا ہاتھ ملتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد میں پھر چوراہے کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران میں اس مسئلے کا حل بھی سوچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چوراہے سے میں پھر ایک خالی رکشہ میں بیٹھ گیا۔ اس بار میں نے یہ احتیاط کی کہ سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے سیٹ کے اوپر بیٹھا تھا اور پاؤں رکشے کے پیچھے ٹکا لیے تھے۔ کافی دیر رکشہ یوپی چلتا رہا۔ پھر ایک سواری مل گئی۔ وہ ایک دبلا پتلا مرد تھا جو ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے باوجود میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ شخص شادمان کالونی اتر گیا۔ وہاں سے میری منزل صرف ایک میل دور تھی۔ رکشہ والے کو اسی طرف جاتے دیکھ کر مجھے لالچ آ گیا۔ میں رکشہ ہی میں بیٹھا رہا پھر میری منزل گزر گئی۔ رکشہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا جی میں آئی کہ اسے رکشہ روکنے کے لیے کہوں لیکن اس ڈر سے بھی خاموش رہا کہ وہ بوکھلا کر رکشہ کسی چیز سے نہ ٹکرا دے۔ میں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھا رہا اور رکشہ چلتا رہا۔ کافی آگے جا کر پھر ایک شخص نے اشارے سے رکشہ روک دیا تو مجھے اترنے کا موقع ملا۔ لیکن اس وقت تک میں اپنی منزل سے دو میل آگے آچکا تھا۔

دھوپ بہت تیز تھی اور مجھے دو میل پیدل چلنا تھا۔ میں زیر لب نہ جانے کس کو برا بھلا کہتا ہوا پیدل چل پڑا۔ مطلوبہ عمارت تک پہنچتے پہنچتے میری حالت تباہ ہو گئی۔ میں پسینے سے شرابور تھا۔ عمارت کے سامنے ایک درخت تھا۔ میں کچھ آرام کرنے کے ارادے سے اس کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے عمارت کا جائزہ لیا۔ نچلی منزل آگ سے بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ البتہ اوپری منزلیں قدرے بہتر حالت میں تھیں۔ عمارت پر ایسا سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ ہو۔

کچھ دیر بعد، میں بلا جھجک کوٹھی میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں سے مجھے ان لوگوں کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔ نچلی منزل کے کمروں کی حالت تباہ تھی۔ ہر چیز جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ نچلی منزل کی تلاشی کے دوران میں نے سوچا کہ معلوم نہیں، یہ عمارت کس کی ملکیت ہے۔ اصولاً مجھے سب سے پہلے یہی معلوم کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا، لیکن وہاں تلاشی کے سلسلے میں کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ میں اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ رینگ کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ سیڑھیاں بھی سیاہ ہو چکی تھیں۔ میں ان پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ پہلی منزل بالکل خالی تھی۔ اب تک اس کوٹھی میں مجھے ایک بھی شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔ معاً میں نے پہلی بار آواز سنی۔ آواز بہت ہی مدہم تھی اور اوپر سے

آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں دوسری منزل پر جا پہنچا۔ اس دفعہ اس آواز نے واضح نشان دہی کی تھی۔ میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا، جہاں سے آواز آتی محسوس ہوئی تھی۔ اندر کوئی دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں نے دروازے کے لٹو پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ غیر متغفل تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ یہ کمرہ آگ سے محفوظ رہا تھا لیکن اس میں فرنیچر نام کی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور دیوار کے پاس ایک شخص بندھا پڑا تھا۔ وہی کراہ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون تھا اور اسے اس طرح باندھ کر وہاں کیوں ڈال دیا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ آگ کی افراتفری میں اسے قید کرنے والے، اسے بھول گئے تھے۔ اس کی حالت خاصی خراب تھی۔

”تم کون ہو بھائی؟“ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

میری آواز سن کر اس نے پہلو بدلا لیکن کمرہ خالی دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ اس بار میری آواز غائب نہیں ہوئی ہے۔ اب الجھن یہ تھی کہ اسے وہاں سے کس طرح نکالا جائے۔ اگر میں بندشیں کھول کر اسے آزاد کرتا تو خود بخود رسیاں کھلنے کا منظر دیکھ کر اس کی حرکت قلب بھی بند ہو سکتی تھی۔ یوں بھی وہ کچھ اچھی حالت میں نہیں تھا۔ میں اسے اٹھا کر باہر نکالتا تو وہ بے چارہ خود کو خلا میں متحرک پا کر خوف ہے مر جاتا۔ ویسے بھی میں ہر کوئی تو تھا نہیں، جب کہ وہ خستہ حال شخص خاصا بھاری بھر کم تھا۔ اتنی وزنی مصیبت سے مجھے پہلے کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کسی مرئی شخص کو اس بے چارے کی مدد پر مجبور کرنا چاہئے۔

کمرے سے نکل کر میں عمارت سے باہر آ گیا۔

سامنے والے درخت کے قریب مجھے ایک ہٹا کٹا آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ اس کی نگاہیں عمارت پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا جشہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری آواز سن کر بے ہوش نہیں ہوگا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور نہایت اطمینان سے اس کا کندھا تھپ تھپایا۔ اس نے بوکھا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر خوف سے اس کے ہونٹ کاپنے لگے۔ میں نے دوسری چھکی دی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے بھاگنا چاہا لیکن میں نے اڑنگا مار کر اسے وہیں گرا دیا۔ وہ مزید بوکھا گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ یہ میری آواز نہیں ہے۔ آواز بہت بھاری تھی۔ میں خود بھی خوفزدہ ہو گیا۔ ”میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ میں نے اپنے ہونٹوں کو انگلیوں سے مٹولتے ہوئے کہا۔ آواز تو اجنبی تھی لیکن ہونٹ میرے ہی متحرک تھے۔ دوانے اس بار شاید کچھ اور ہی رنگ دکھایا تھا۔ ”کھڑے ہو جاؤ!“ میں نے اس سے کہا۔

وہ اٹھا اور اس نے فوراً ہی بھاگنے کی کوشش بھی کر ڈالی۔ لیکن میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ مارے خوف کے اس کا رنگ سپید پڑ گیا۔ لیکن آدمی جی دار تھا، بے ہوش نہیں ہوا۔

”اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو گردن توڑ دوں گا۔“ میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ اس کی گردن جسم کی مناسبت سے موٹی تھی اگر میں حاضر ہوتا تو اس کے ہاتھوں میری چٹنی بن گئی ہوتی۔

”مم..... مم..... میں نہیں بھاگوں گا۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے زور زور سے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔

”احمق..... آیت الکرسی پڑھنے سے میں بھاگ نہیں جاؤں گا۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔

”اب چپ ہو جاؤ، ورنہ گلا گھونٹ دوں گا۔“

وہ بوکھا کر چپ ہو گیا، لیکن اس کے ہونٹ اب بھی لرز رہے تھے۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آنے لگا۔

”تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی گردن چھوڑ دی۔ ”یاد رکھو..... اگر تم نے بھاگنے یا بے ہوش ہونے کی کوشش کی تو جان سے مار ڈالوں گا۔“

”نہیں..... نہیں..... میں بالکل نہیں بھاگوں گا۔“ اس نے جلدی سے وعدہ کیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے اس کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”جلدی بتاؤ۔“

”میرا نام سلطان احمد ہے، جی۔“

”تمہارے خیال میں، میں کون ہو سکتا ہوں؟“

”آپ تو..... آپ جن ہیں، جی۔“ وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ ”بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ آپ جنوں کے شہنشاہ ہیں۔ کیا شان ہے، آپ کی جناب! آپ تو جوجی چاہے، کر سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو بنا دیں، آپ چاہیں تو بگاڑ دیں۔ آپ کی طاقت بے مثال ہے۔ آپ یقیناً حسین بھی ہوں گے..... جمیل بھی ہوں گے..... شکیل بھی ہوں گے..... قاتل بھی ہوں گے..... بانٹے اور.....“

”بس بس، خاموش رہو۔“ میں نے اسے جھڑک دیا۔ وہ مشینی انداز میں بولے جا رہا تھا۔ ”وہ سامنے والی عمارت دیکھ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جی، بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں۔“

”اس کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں، ایک آدمی بندھا پڑا ہے۔ جاؤ، جا کر اسے

وہ حیران نظر آنے لگا اور اس کے منہ سے یعنی آوازیں نکلنے لگیں۔
 ”اب کے کیا کوئی منتر پڑھنے لگے؟“ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہیں جی..... میں تو صرف حیران ہو رہا ہوں، عالی جناب کی بصیرت پر۔ سبحان اللہ..... کیا نظر پائی ہے۔“

”حیران ہونا چھوڑو اور میرے حکم کی تعمیل کرو۔“ میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔
 وہ کپکپاتا ہوا عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ میں وہیں کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔
 کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو کوٹھی والا قیدی اس کے ساتھ تھا۔ وہ بے حد کمزور معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا سر، سلطان نامی شخص کے شانے پر ٹکا رکھا تھا۔ سلطان کے چہرے پر بیک وقت حیرت اور خوشی کے تاثرات تھے۔ وہ قیدی کو لیے ہوئے اس درخت کے پاس آ گیا۔ ”جن صاحب.....!“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔ ”میں اسے لے آیا ہوں جی..... اب میری بھی ایک التجا ہے۔“

”کیسی التجا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“
 میں اسے یہاں بٹھا کر جا رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بس ابھی واپس آؤں گا۔ اب مجھے آپ سے ڈر نہیں لگ رہا بلکہ عقیدت محسوس ہو رہی ہے۔ آپ جیسوں کی قربت تو مقدر والوں کو ملتی ہے، جن صاحب! آپ نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔“
 میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے پہلے ہی بھاگ لیا..... میں قیدی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی حالت تباہ تھی۔ اس پر غشی طاری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر بہت زیادہ تشدد کیا گیا ہو۔ اس کے چہرے سے نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ ابھی میں اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سلطان واپس آ گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا گیا تھا اور بھاگتا ہوا ہی واپس آیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور دوسرے میں اگر بتی کا پیکٹ اور ماچس دبی ہوئی تھی۔ ”یہ تم کیا اٹھالائے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں آپ کی فاتحہ کا بندوبست کرنے گیا تھا۔“
 ”کیوں.....؟“ میں بھنا گیا۔ ”کیوں فاتحہ پڑھو گے؟“
 ”میری اماں بھی پتیل والے جن کی فاتحہ دلاتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب کوئی جن مہربان ہو جائے تو فوراً اس کے نام کی فاتحہ دلوادینی چاہئے..... ویسے عالی مرتبت، آپ کا نام کیا ہے؟“
 ”طمطر اقل۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”ماشا اللہ..... کیا زبردست نام ہے۔ ایسے نام صرف شہنشاہوں کے ہی ہو سکتے ہیں۔“
 ”بکواس مت کرو۔ میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنے دوں گا۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔
 ”بس شاہ طمطر..... نہیں..... نہیں نکلتا۔“ اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”خیر، جن بادشاہ، میرا دل نہ توڑ دو، یہ میرا فرض ہے۔ میں اسے ضرور پورا کروں گا۔“

غصے کی شدت سے میری زبان بند ہو کر رہ گئی۔ وہ نامعقول میری فاتحہ خوانی پر تلا ہوا تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ کچھ دیر پہلے کیسا سہا ہوا تھا اور اب بے تکلف ہوا جا رہا تھا۔ اتنی دیر میں اس نے اگر بتیاں سلگالی تھیں۔ مجھے بے ساختہ چھینک آ گئی۔
 ”اگر بتی سے الرجی ہے، شاید آپ کو۔“ وہ بے حد خلوص سے بولا۔
 ”میں کہتا ہوں، بند کرو پے بکواس۔“ میں نے دہاڑ کر کہا۔

وہ اطمینان سے فاتحہ خوانی میں مصروف ہو گیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے خود ہی مٹھائی بھی کھانا شروع کر دی۔ ”غ..... غاپ تو دینا تو قیقار ہو غا۔“ وہ کھاتے ہوئے بولا۔ ”غاپ قھائی قہاں خاں غ۔“

اسے مٹھائی کھاتے دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں مٹھائی کھانے لگا تو اس کا ہاتھ رک گیا اور وہ حیرت سے ڈبے میں سے غائب ہوئی ہوئی مٹھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں، میں نے ساری مٹھائی صاف کر دی۔

”تنت..... تب تو آپ بیت الخلا بھی جاتے ہوں گے۔“ اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”غاں..... غاں۔“ میں نے مٹھائی کھاتے ہوئے کہا۔ ”غوز غاتا غوں۔“ پھر اچانک مجھے اس کے سوال میں گستاخی کا احساس ہوا۔ ”کیا بکواس ہے!“ میں نے مٹھائی کھاتے ہوئے اسے ڈانٹا اور اس کے منہ پر ایک ہاتھ جڑ دیا۔

”جزاک اللہ..... جزاک اللہ۔“ اس نے نہایت احترام سے کہا۔ ”اب تو میرا بیڑا ہی پار ہے۔“ پھر وہ بڑی محبت سے قیدی کے پاس جا بیٹھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ اس کا گمشدہ بیٹا تھا۔ جواب اچانک ہی اسے مل گیا ہے۔

”تم اسے آزاد کرانے اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”کیا بتاؤں جن بادشاہ!“ اس نے بے حد متودب ہو کر کہا۔ ”آپ پر تو سب کچھ روشن ہے۔ کیا میں سورج کو چراغ دکھا سکتا ہوں!“

”دکھا سکتے ہو..... میں جو کہہ رہا ہوں، دکھاؤ..... ورنہ میں تمہارا چراغ گل کر دوں گا۔“
 ”جی..... میں بہت دنوں سے اس کے پیچھے تھا۔ دراصل یہ اسمگلروں کے گروہ کا آدمی

ہے۔ لیکن جی..... آپ کیا جانیں کہ اسمگلر کیا چیز ہوتے ہیں؟ آپ کو تو اسمگلنگ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہوگی۔“

”پوری بات بتاؤ!“ میں جھلا گیا۔

”بات یہ ہے جن بادشاہ کے میں ایک پولیس افسر ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ سامنے والی عمارت اسمگلروں کی ملکیت ہے یہ آدمی کافی دنوں سے غائب تھا۔ ہمیں شبہ تھا کہ اسے اس عمارت میں قید کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جن بادشاہ! آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ ہر جمعرات کو آپ کی فاتحہ دلوا کر دوں گا۔ تو اب تو یقیناً دلچسپی ہوگی، آپ کو؟“

”اچھا اچھا..... بند کرو، یہ کہو اس اور میری بات سنو! تم اپنے کام سے فارغ ہو کر ابو العبران کے پاس جاؤ گے۔“

”یہ ابو العبران کون ہے، جن بادشاہ؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے اسے اپنا پتہ بتاتے ہوئے کہا۔ ”اس آدمی کو اپنے ہاتھ میں رکھنا۔ اس کے کہے پر عمل کرنا۔ اگر مجھے خوش رکھنا ہے تو اس کی یہی ایک صورت ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں جن بادشاہ..... میں تو اس پر اپنی جان بھی نبھاد کر دوں گا۔ کیسا گھبرو ہو گا وہ بھی جو آپ کا منظور نظر ہے۔ ارے، وہ تو.....“

وہ نہ جانے کیا کیا بکتا رہا، لیکن میں وہاں سے چل دیا تھا۔ ہنسی کے ساتھ ساتھ مجھے غصہ بھی آرہا تھا۔ اچھا خاصا انسان تھا اور بیٹھے بٹھائے جن بن گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بات میرے حق میں اچھی ہے یا بری.....

واپسی میں اور بھی دشواری پیش آئی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا، لہذا واپسی میں پیدل ہی چلتا رہا۔ گرتا پڑتا گھر پہنچا تو اس قدر تھک چکا تھا کہ جسم بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دوا کا توڑ استعمال کیا اور آپے میں آ گیا۔

رات کے کھانے کے لیے میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ عام طور پر تو میں گھر پر ہی کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہوں، لیکن کبھی مصروفیت یا بوریت کی وجہ سے نہ پکاؤں تو ہوٹل کا رخ کرتا ہوں۔ ہوٹل کا مالک رحیم مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ کبھی کبھی میں اس کے خط بھی پڑھ دیتا ہوں۔ اس وجہ سے وہ میرا اور بھی احترام کرتا ہے..... لیکن اس رات ہوٹل کے نوکروں بلکہ خود رحیم کا رویہ بھی بدلا بدلا سا تھا۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے..... پھر ان کے انداز سے برہمی جھلکنے لگی۔ محلے کے کچھ لوگ بھی وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے تاثرات بھی خاصے عجیب تھے۔ میں نے جیسے ہی ہوٹل میں قدم رکھا، وہاں کی فضا کشیدہ ہو گئی۔ لوگوں کے درمیان سرگوشیاں بھی ہونے لگیں۔ سب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں لوگوں کے اس رویے کی

وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بہر حال، میں ان کی پروا کیے بغیر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور ٹیبل میں کوہلانے کے لیے میز کو گلاس سے بجانے لگا۔ ٹیبل میں نے میری طرف دیکھا تو وہ برا سامنے بنا کر دوسری میز کی طرف بڑھ گیا۔ یہ سب کچھ میرے لیے بے حد تشویش ناک تھا..... پھر لوگوں کے اس معاندانہ رویے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میرا جی چاہا کہ ہوٹل پر لعنت بھیج کر اٹھ جاؤں اور میری سے ڈبل روٹی مکھن لے کر کام چلا لوں..... لیکن بحسب آڑے آ گیا۔ اچانک محلے کا بدنام نوجوان فضلہ بھی ایک لفنگا تھا..... اور کوئی شریف آدمی اس سے تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہم دونوں بھی بس صورت شناسا ہی تھے۔ اس کا اس طرح بلا جھجک قریب آ بیٹھنا یقیناً کسی مصیبت کا پیش خیمہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی اسی بات کی گواہی دے رہی تھی۔ میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا تو اس نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”یہ کیا حرکت ہے! چھوڑو میرا ہاتھ۔“ میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے اس لڑکی کی رسید تو دے دو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کہاں رکھا ہے۔“

”لڑکی..... کیا کہو اس ہے..... کیسی لڑکی؟“ میں سناتے میں رہ گیا۔

”مشکور صاحب کی بیٹی، بانو..... اور کون..... جس کے ہاں تم فون کرنے کے بہانے جایا کرتے تھے۔“

”باگل ہو گئے ہو کیا؟“

”مجھے تو تمہاری دلیری پر حیرت ہو رہی ہے۔ ہم بہت شریف سمجھتے تھے، تمہیں..... لیکن تم تو استادوں کے بھی کان کاٹ گئے۔ کیا ہاتھ کی صفائی ہے..... کیا ہمت ہے! واہ استاد، واہ..... نظر تو اپنی بھی تھی لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ یہ تم واپس کیوں آ گئے استاد؟“

میں گم صم بیٹھا اس کی خرافات سنتا رہا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا۔ معاملہ بے حد سنگین تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ لوگ مجھ سے اکھڑے اکھڑے سے کیوں ہیں۔ لیکن عجیب بات تھی..... آخر وہ سب مجھ پر ہی کیوں شبہ کر رہے تھے؟ میرے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا، حالاں کہ بے اختیار میرا دل چاہتا تھا کہ اے کاش یہ خبر درست ہی ہوتی۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو میری عافیت اسی میں ہے کہ محلہ چھوڑ بھاگوں کیا پتہ کب محلے والوں کو جوش آ جائے اور میری درگت بن جائے۔ اس کے علاوہ یہ معاملہ قابل دست اندازی پولیس بھی تھا۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فضلہ نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں اس کا ہاتھ جھٹک کر تیزی سے نکل آیا۔ مجھے جاتے دیکھ کر ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے مجھ پر آوازے بکسے۔ مجھے اتنی ذلت کا سامنا پہلے بھی نہیں کرنا

انہوں نے پھر مجھے گھور کر دیکھا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میاں..... کاش..... کاش میں بھی رنگیلا ہوتا۔“ انہوں نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔
پھر جمشید صاحب ملے۔ ان سے بھی کچھ اسی قسم کی گفتگو ہوئی۔
”میں یہ بہتان برداشت نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی جا کر مشکور صاحب سے ملوں گا۔“

”ایسا غضب نہ کرنا۔“ وہ جلدی سے بولے۔ ”وہ لوگ بہت غصے میں ہیں، نہ جانے کیا کر گزریں۔“

”پھر میں کیا کروں؟ خاموشی سے یہ بدنامی برداشت کر لوں؟“

”میری مانو تو کسی اور کو لے بھاگو۔ مفت کی بدنامی سے کیا فائدہ!“

میں پاؤں پٹختا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا تھا..... لیکن میں بہت محتاط تھا۔ مجھے صورت حال کا احساس تھا۔ محلے والے مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔ پولیس کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ ان لوگوں نے یقیناً رپورٹ درج کرادی ہوگی۔ گھر کے قریب ہی مجھے وردی کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے فوراً غائب کر دینے والی دوا کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ لیکن چہرہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ وہ سلطان احمد تھا۔ وہی پولیس افسر جس کی مدد سے میں نے آج ہی ایک قیدی شخص کو آتش زدہ کوٹھی سے نکلوایا تھا۔ وہ یقیناً شہنشاہ جنات طمطر اقل کی ہدایت کے مطابق مجھ سے ملنے آیا ہوگا۔ اسے پہچان کر میری پریشانی ختم ہوگئی۔ میں اطمینان سے اس کی طرف بڑھ گیا۔ ”فرمائیے جناب، کس سے ملنا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”آپ اہل..... بل عمران ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن وہ ایک پولیس افسر تھا۔ طمطر اقل جن کا مرید سی..... بہر حال اس کی اپنی بھی کوئی حیثیت تھی۔ میں نے گردن اکڑاتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔ ”جی ہاں، میں ابوالعمران ہوں۔ فرمائیے کیا کام ہے؟“

”میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”جی!“ میں شٹا کر رہ گیا۔ یہ بات خلاف توقع تھی۔

”جی جناب..... ویسے تو آپ میرے بزرگ..... میرا مطلب ہے جن بادشاہ کی وجہ سے لائق صدا احترام ہیں۔“ اس نے بڑے انکسار سے کہا۔ پھر اچانک ہی اس کے تیور بدل گئے۔ ”لیکن آپ نے ایک لڑکی کو اغوا کیا ہے۔ میں تمہارا دماغ درست کر دوں گا۔ چلو میرے ساتھ۔“ وہ غرایا۔

پڑا تھا۔ میرا شمار محلے کے نیک اور شریف نوجوانوں میں ہوتا تھا۔ نہ جانے کس کی بلا میرے گلے پڑ گئی تھی میں نے تو کئی دنوں سے بانو کو خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

اب کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو مجھے حقیقت بتا سکے۔ کچھ دور چلا تھا کہ عبدالودود مل گئے۔ محلے بھر میں وہ جو رو کا غلام کہلاتے تھے۔ انہوں نے پہلے تو مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دکھا..... پھر باقاعدہ شرمنا شروع کر دیا۔ ”کیا بات ہے دودو صاحب!“ میں نے پوچھا۔ ”آپ مجھ سے شرمایوں رہے ہیں؟“

”آپ سے نہیں میں تو خود سے شرمایا ہوں۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔

”بھلا ایسی کون سی بات ہوگئی؟“

”بات یہ ہے میاں کہ ایک مرتبہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی لیکن میں اسے اغوا نہیں کر سکا۔ اللہ، آپ نے تو کمال کر دیا۔ ہر شخص حیران ہے، آپ کے اس کارنامے پر۔“
”کیسی بات کرتے ہیں۔ آپ؟“ میں نے براماتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ مجھے احق سمجھتے ہیں۔ کسی لڑکی کو اغوا کر کے میں یہاں نظر آؤں گا۔ یقین کیجیے، میرے فرشتوں کو بھی اس واردات کا علم نہیں۔ اگر میں ایسا کرتا تو یہاں لوٹ کر کیوں آتا؟“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ انہوں نے شدت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تاہم لوگوں نے یہ کیونکر فرض کر لیا کہ یہ حرکت میری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بانو نے الوداعی خط میں آپ ہی کا نام لکھا ہے۔“ انہوں نے دھکا کیا۔ ”اس نے آپ کی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ فلم اسٹار رنگیلے کے ہم شکل ہیں اور وہ آپ کو پسند کرتی ہے اور آپ کے ساتھ فرار ہو رہی ہے۔“

میں فریاد غضب سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ اس بد بخت لڑکی نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے اپنے سر کے گھنے بالوں کو چھوتے ہوئے سوچا آہ، میں نے اسے کس قدر چاہا تھا۔ شاید دنیا میں محبت کا صلہ یہی ملتا ہے!

”وہ واقعی رنگیلے کے کسی ہم شکل کے ساتھ بھاگی ہوگی۔“ میں نے غصے سے لرزاتے ہوئے کہا۔ ”بھلا بتائیے تو..... کیا میری شکل رنگیلے سے ملتی ہے؟“

دودو صاحب نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے رنگیلے کو تصور میں بسا کر اس سے میرا موازنہ کر رہے ہوں پھر بولے۔ ”ہوں..... بالوں کا فرق ہے۔ البتہ آپ نتھنے پھڑکاتے ہوئے ایسے ہی لگتے ہیں۔“

تب مجھے احساس ہوا کہ غصے میں میرے نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھئے۔“

”میں نے کسی لڑکی کو اغوا نہیں کیا۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ چاہیں تو آپ طمطراقیل سے پوچھ لیں۔“

”ہائیں... تم جن بادشاہ کا نام لیتے ہو؟“ وہ دہل گیا۔

”میری ان سے بے تکلفی ہے۔“ میں نے اکثر کر کہا۔

”اچھا بکواس مت کرو۔“ اس نے مجھے ڈپٹ دیا۔ ”ابھی تھانے چل کر پھینٹی لگاؤں گا تو

عشق کا بخارا تر جائے گا۔“

”کیسا عشق؟ کیسا بخار؟“ میں نے فریاد کی۔ ”میں جن بادشاہ.....“

”کیا بات ہے جن بادشاہ کی۔“ اس نے لہک کر کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم ان کے چہیتے

ہو..... لیکن تمہاری ایسی کی تہیسی۔ تم نے میرے علاقے میں یہ جرات کیسے کی؟“

وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ اس کا مزاج سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ جن بادشاہ کے حوالے

سے آپ جناب سے مخاطب کرتا اور فوراً ہی اغوا کے حوالے سے تو تراخ کرنے لگتا۔ دھمکیاں

اس کے علاوہ نہیں۔ ”ٹھیک ہے صاحب، جو آپ کی مرضی۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”میں ذرا

باتھ روم ہواؤں۔“

”جاؤ.....“ اس نے بڑے شاہانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن یاد رکھنا میں ملزموں کو پاتال میں

بھی نہیں چھوڑتا۔“

یہ اجازت میرے لیے کافی تھی۔ اب اس کے فرشتے بھی مجھے نہیں پکڑ سکتے تھے۔ میں

غائب ہو کر کسی اور شہر کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہاں تو مصیبتیں گلے پڑنے لگی تھیں۔ اس

سے اجازت لے کر میں گھر میں داخل ہوا، اور دو کی ایک خوراک لے لی پھر اطمینان سے باہر

نکل آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اب جن بادشاہ کے انداز میں مخاطب کروں گا اور ابوالعمران کی بے

گناہی ثابت کروں گا۔

”کیا بات ہے؟ کیوں آئے ہو یہاں؟“ میں نے آواز کو بارعب بنانے کی کوشش

کرتے ہوئے کہا۔

اس نے اچھل کر میری گردن پکڑ لی اور دہانڑا۔ ”میں فرض کی راہ میں کوئی رکاوٹ

برداشت نہیں کرتا۔ چلو میرے ساتھ..... کیا تم سمجھتے ہو کہ اس ڈرامائی انداز سے متاثر ہو کر میں

تمہیں بخش دوں گا؟“

میں نے سر پٹینے کا ارادہ کیا لیکن فوراً ہی ملتوی کر دیا۔ اب حیران بھی نہیں ہوا جاتا تھا

کیونکہ وہ دوا شروع ہی سے ایسے دھوکے دیتی آئی تھی۔

”ٹھیک ہے صاحب۔ لے چلیے مجھے۔“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”جناب عالی۔“ اس نے پھر پینٹر بدلا۔ ”آپ جن بادشاہ کے دوست ہیں۔ ان سے

میری سفارش کرتے رہیں گے۔ اگر مجھ پر ان کی نظر کرم رہی تو میں بہت کامیاب رہوں گا۔“

”میں تو انہیں پوری تفصیل بتاؤں گا۔“ میں نے خفا ہو کر کہا۔ ”آپ مجھے جھوٹے الزام

میں گرفتار کر رہے ہیں۔“

”اب..... سیدھی طرح چلتا ہے کہ نہیں۔“ اس نے مجھے جھڑک دیا۔

محلے کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔

میری اس قدر تو بین پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی..... محلے والوں کی طنزیہ نگاہیں میرا سینہ چھلنی

کر رہی تھیں۔ وہ سب کے سب میرے خلاف بری طرح بھڑکے ہوئے تھے۔ اس نامعقول

لڑکی نے میری ساکھ ذرا سی دیر میں تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نے

مجھ سے دشمنی کیوں کی تھی۔ سلطان احمد نے ٹیکسی روکی اور مجھے اس میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ محلے

والے تماشا دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان میں اکثریت محلے کے لفنگوں کی تھی، جو خود بھی بانو کے چکر

میں رہا کرتے تھے۔ شاید وہ لوگ مجھ سے حسد محسوس کر رہے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی

مجھے بھی خود سے حسد محسوس ہونے لگتا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میں اب بھی بانو سے محروم ہوں۔

میرے جیسے میں تو صرف تہمت اور رسوائی آئی تھی۔ بانو خدا جانے کس خوش نصیب کے ساتھ گئی

تھی۔ سلطان بھی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اس نے ٹیکسی والے کو تھانے کی طرف چلنے کی ہدایت کی۔

پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”جناب..... حضرت..... میں نے آپ کے دوست جن بادشاہ

کی مدد سے ایک بہت بڑے مجرم کو گرفتار کیا ہے۔“ اس نے بے حد تپاک سے کہا۔

”کون سا مجرم؟“ میں نے اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر پوچھا۔

”ارے جناب..... اس شہر میں اسمگلروں کے دو گروہ ہیں۔“ اس نے مؤدبانہ لہجے میں

کہا۔ ”ایک چائنا مین کا گروہ ہے اور دوسرا دلدار کا..... یہ دونوں گروہ آپس میں لڑتے بھڑتے

رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں چائنا مین کا ایک گرگا اس سے ٹوٹ گیا تھا۔ اسنے ہم سے تعاون کر لیا۔

وہ ہمارے لیے کام کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ کہیں غائب ہو گیا۔ ہم اسے تلاش کرتے

رہے۔ اچانک جن بادشاہ نے اس کی نشاندہی کر دی۔“

”اب کیا ارادے ہیں تم لوگوں کے؟“

”میں اس آدمی کو ہیڈ کوارٹر لے گیا تھا۔ اس نے جلد ہی زبان کھول دی..... لوگوں کے

نام بتائے اور اوڑوں کی نشاندہی کر دی۔ ہم نے کامیاب چھاپے مار کر ایک گروہ کا قلع قمع

کر دیا۔ کل کے اخبارات دیکھ لینا۔“

”چلو مبارک ہو۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”میرے بارے میں کیا خیال

افسر اور کھوپڑی پر سوار ہو گیا۔“

میں اسے بڑبڑاتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اب مجھے مشکور صاحب کے گھر جا کر اس منحوس لڑکی کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھیں۔ دشواری یہ تھی کہ مجھے پھر پیدل چلنا تھا۔ کاش اڑنے کا کوئی نسخہ بھی ہاتھ آ گیا ہوتا۔ اب تو پیدل چل چل کر میری ہڈیاں تک کڑکڑانے لگی تھیں۔ مجھے وہ کہانیاں اور فلمیں یاد آنے لگیں، جن کے ہیرو کے ہاتھ ایسا کوئی نسخہ لگ جاتا تھا تو اس کے عیش ہو جاتے تھے۔ مجھے ان پر غصہ آنے لگا۔ کم بخت کیسے فرضی قسم کے لگتے تھے۔ میرا تو یہ حال تھا کہ زندگی کی بساط پر فرزیز کا کردار ادا کرتے کرتے پیدل ہو کر رہ گیا تھا۔ بہر حال، جلتا کڑھتا، جیسے تیسے میں اپنے محلے میں پہنچ گیا۔ میں نے مشکور صاحب کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے، جو غالباً اظہارِ تعزیت..... میرا مطلب ہے اظہارِ ہمدردی کی غرض سے آئے تھے۔ میں ان کے درمیان کھڑا ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ بانو اس وقت کہاں ہو سکتی ہے۔ انہیں حیرت بھی تھی کہ میں اتنی بڑی واردات کے بعد اس قدر دلیری سے واپس کیسے چلا آیا تھا۔

”ارے صاحب، مجھے تو بہت ہی ڈھیٹ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بردہ فروش ہے، شاید۔“

ایک نے کہا۔

”کہاں کی ہانک رہے ہیں، جناب۔“ مشکور صاحب نے احتجاج کیا۔

اب تو وہ غالباً یہی ایک اچھی امید کر سکتے تھے کہ میں نے ان کی دختر بد اختر سے نکاح کر کے جہنم میں اپنی نشست محفوظ کرالی ہوگی۔ بردہ فروش کے ہتھے چڑھنے کا تصور ہی ان کے لیے جان لیوا تھا۔ جی تو چاہا کہ تبصرہ کرنے والے کی مرمت شروع کر دوں۔ اس شخص کو تو میرا احترام لرننا چاہیے تھا۔ کچھ عرصے پہلے اس نے مجھ سے پچاس روپے لیے اور آج تک واپس نہیں کیے۔ تھے۔ ہمیشہ مجھے دیکھ کر فرشتی..... بلکہ پاتالی سلام کرتا لیکن اس وقت..... خیر میں خون کے کئی گھونٹ پی کر رہ گیا۔

میں بانو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں جب کبھی یہاں فون کرنے آیا کرتا تھا تو وہ عموماً اسی کمرے سے نمودار ہوتی تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کی تائید اس کی متعدد تصویروں نے کی جو دیواروں پر آویزاں تھیں۔ ہر تصویر میں اس کا انداز مختلف تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ فلموں میں کام کرنے کی شوقین رہی ہو۔ لیکن اس منحوس لڑکی نے خط کے ذریعے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ خط کے مطابق عمل کر لیتی۔ میں نے سوچا کہ پہلے وہ خط تلاش کر کے پڑھوں۔ کچھ پتہ تو چلے کہ آخر چکر کیا ہے۔ وہ خط کس کے پاس ہو سکتا ہے..... مشکور صاحب کے پاس یا پولیس والوں کے پاس؟ میں غور کرنے لگا کہ مشکور صاحب

ہے؟“

”اوئے، سیدھی طرح بیٹھو، اغوا کے مجرم۔“ وہ دہاڑا۔ ”یہ معاملہ جن بادشاہ کے معاملے سے الگ ہے۔ تمہیں سزا ضرور ملے گی۔“

”یقین کرو، میرا اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ میں نے فریاد کی۔

”چلو..... چلو اترو۔“ اس نے اشارہ کیا۔ ٹیکسی تھانے کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

”اب اندر چل کر بات ہوگی۔“ اس نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

لیکن تھانے کی عمارت میں داخل ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ٹیکسی سے اترتے ہی میں غائب ہو گیا تھا۔ سلطان ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں۔ چل سکا تھا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کی سٹیلم ہو گئی اور وہ پھر بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”ارے بھائی..... او بھائی جان، کہاں چلے گئے؟“ اس نے زور سے پکارا۔

”میں تے.....“ پہلے میں نے یہ چیک کیا کہ میری آواز دوبارہ بھاری ہو گئی ہے یا نہیں۔ پھر مطمئن ہو کر بولا۔ ”میں نے اسے غائب کر دیا ہے۔“

”کون؟“ پہلے تو وہ نٹپٹایا پھر جیسے کھل اٹھا۔ ”اوہ جن بادشاہ..... آداب عرض ہے، جناب۔“

”تم نے اسے کیوں پکڑا تھا؟“ میں نے اسے ڈانٹا۔

”لڑکی کے اغوا کا معاملہ ہے، جن بادشاہ۔“

”میں حقیقت جانتا ہوں۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔“

”بے شک..... بے شک“ سلطان نے بے حد سعادتمندی سے سر ہلایا۔ ”آپ کیا نہیں جانتے۔ یقیناً ہم سے ہی غلطی ہوئی ہوگی۔ اچھا، یہ تو بتائیے کہ اس وقت وہ لڑکی کہاں ہوگی۔ آپ تو جن بادشاہ ہیں۔ بتا دیجئے، نا، میں ہر جمعرات کو آپ کی قوالی کرایا کروں گا۔“

پہلے تو مجھے بہت غصہ آیا پھر میں سنائے میں آ گیا۔ گویا اب گلو خلاصی کی یہی ایک صورت تھی کہ میں اس نامراد لڑکی اور اس کے بامراد چاہنے والے کو تلاش کروں..... اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کیونکہ میں واقعی جن تو تھا نہیں۔

”بعض معاملات میں ہم زبان بند رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔“ میں نے گرج کر کہا۔

”بس میں اتنا جانتا ہوں کہ ابو العمران بے قصور ہے۔ اب میں جا رہا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم آئندہ اسے تنگ نہ کرو۔“

وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر میری خاموشی سے اس نے اندازہ لگایا کہ میں جا چکا ہوں تو اپنے سر پر دو ہتھڑے مارتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”پہلے ہی کچھ کم افسر تو نہیں تھے میری جان کو کہ ایک نادیدہ

نے اسے کہاں رکھا ہوگا؟ ایسی چیزیں عام طور پر جیب ہی میں ٹٹولنے کا فیصلہ کر لیا۔

مشکور صاحب ڈرائنگ روم میں سوگوار بیٹھے تھے۔ ان کا چھوٹا بچہ ان کے برابر ہی بیٹھا تھا۔ میں دبے پاؤں صوفے کے پیچھے پہنچا۔ پھر میں نے مشکور صاحب کی اوپر والی جیب میں جھانکا۔ اسمیں کچھ کاغذات اور کرنسی نوٹ رکھے نظر آ رہے تھے۔ میں نے دھیرے دھیرے دو انگلیاں پیچنی کے انداز میں، ان کی جیب میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن انٹری پین کے باعث میرا ہاتھ ان کے سینے سے ٹکرا گیا۔ وہ بری طرح اچھل پڑے۔ شاید انہیں گدگدی کا احساس ہوا تھا۔ پھر میں نے دوسری کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔

کاغذ کا وہ ٹکڑا میں نے ان کی جیب سے تو نکال لیا، لیکن آخری لمحوں میں مجھ سے چوک ہو گئی اور انگلیاں جیب سے باہر آتے ہوئے پھر ان کے سینے سے ٹکرا گئیں۔ انہوں نے اپنے بچے کے ایک جھانپڑ سید کیا۔ بچہ روتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا تاکہ سکون سے وہ منحوس تحریر پڑھ سکوں۔ میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں تو میری باجھیں کھل گئیں۔ واقعی وہ بانو ہی کا خط تھا۔ میں نے بے تابی سے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ لکھا تھا۔

”پیاری امی! میں اس گھر اور اس گھن سے تنگ آ گئی ہوں۔ یہاں مجھے

اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اسی لیے میں ابو العمران کے ساتھ جاری

ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔۔۔۔۔ آپ کی بانو۔“

میں پھر الجھ کر رہ گیا۔ خط میں صاف صاف میرا ہی نام لکھا تھا۔ میں نے خط جیب میں ٹھونسا اور پھر کچھ سوچ کر بانو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس قسم کی لڑکیاں عموماً ڈائری بھی لکھا کرتی ہیں۔ اب وہ ڈائری ہی میری آخری امید تھی۔ ایسی ڈائریوں میں عموماً اشعار بھی ہوتے ہیں، کہیں کہیں آنکھیں اور ہونٹ بھی نقش ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ہر طرح کی سہیلیوں کے پتے اور فون نمبر بھی درج ہوتے ہیں۔ مجھے ایسی ہی کسی ڈائری کی تلاش تھی۔ کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد مجھے ایک ڈائری مل گئی۔

میں نے بستر پر نیم دراز ہو کر ڈائری کے مندرجات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ شروع کے کئی صفحات تو احقانہ اشعار سے بھرے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ پھر مجھے ایک صفحے پر اپنے مطلب کی تحریر نظر آئی۔ اسنے جمیل نامی ایک شخص کے بارے میں لکھا تھا جو اس کا بیوٹا تھا۔ میں صفحے پر صفحے پلٹا رہا اور جمیل کی تعریفوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہائے اللہ وہ کتنے ہینڈسم ہیں، ان سے تو فزکس کی بجائے بالوجی پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ مزید آگے کے صفحات گواہی دے رہے تھے کہ ان کے روابط سنگین ہوتے چلے گئے تھے۔۔۔۔۔ اور بھی بہت کچھ لکھا تھا لیکن جو کچھ میں پڑھ چکا تھا، وہی کافی تھا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ بانو کس کے ساتھ فرار ہوئی ہے۔ اب مجھے جمیل کا

پتہ چلانا تھا۔۔۔۔۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

میں نے ڈائری دوبارہ بستر کے نیچے رکھ دی اور وہاں سے نکل کر ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ اس بار وہاں مقامی تھانے کا اے، ایس، آئی بھی موجود تھا۔ جو مشکور صاحب سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اس کا انداز تفتیش کچھ ایسا تھا جیسے مشکور صاحب نے خود اپنی بیٹی کو اغوا کر لیا ہو۔ مشکور صاحب بہت جربزد کھائی دے رہے تھے۔

”میرا خیال ہے، آج کل لڑکیوں کا بھاگ جانا ان کے والدین کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے۔“ اے۔ ایس۔ آئی کہہ رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں، جناب۔“ مشکور صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”میری تو ناک کٹ گئی۔“

ان کے ساتھ بیٹھا ہوا بچہ چونک پڑا۔ ”نہیں ابا۔“ وہ مشکور صاحب کی ناک چھوتے ہوئے بولا۔ ”یہ رہی آپ کی ناک۔“

مشکور صاحب نے اے۔ ایس۔ آئی کا غصہ بھی بچے پر اتار دیا۔ پھر وہ اے، ایس، آئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”آپ اس اہل۔۔۔۔۔ بل۔۔۔۔۔ کیا نام ہے، اس کا۔۔۔۔۔ اس خبیث کو کیوں نہیں پکڑتے۔“

”ہم نے تحقیق کر لی ہے۔ اس کے ہاتھ صاف ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بانو نے اپنے خط میں اسی کا تذکرہ کیا ہے۔“

”اس کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ لکھ دیتی کہ انھونی کوئن کے ساتھ فرار ہو رہی ہے تو کیا میں امریکہ جا کر انھونی کوئن کو پکڑ لیتا؟“ اے، ایس، آئی نے بھنا کر کہا۔

اس کے استدلال نے میرا دل خوش کر دیا۔ مجھے یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ سلطان نے یقیناً میری پوزیشن صاف کر دی ہے۔ آخر میں جن بادشاہ کا چہیتا بھی تو تھا۔

”لیکن اسے جھوٹ لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟“ مشکور صاحب نے اصرار کیا۔

”یہ تو وہی بتائے گی۔“ میں بے خیالی میں آواز بلند بول پڑا۔

سب بڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کمرے پر سناٹا طاری تھا۔ ہر شخص خوف زدہ دکھائی دینے لگا۔

”یہ کون بولا تھا، مشکور صاحب۔“ پولیس والے نے بوکھلا کر پوچھا۔

”جی میں تو خود حیران ہوں۔“ مشکور صاحب خوفزدہ لہجے میں بولے۔ ”آپ پولیس والے ہیں، آپ ہی پتہ چلائیں۔“

”اس وقت تو میں چاربا ہوں۔“ پولیس والا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پھر آؤں گا۔“

مجھے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا۔ میں نے ان کا سلسلہ کلام قطع کر کے خود کو بہت ساری معلومات سے محروم کر لیا تھا۔ پولیس افسر چلا گیا تو دوسرے لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ مشکور صاحب بھی اندر چلے گئے۔ میں وہاں اکیلا رہ گیا۔ امید افزا بات یہ تھی کہ پولیس افسر میری پوزیشن صاف کر گیا تھا۔ اب میں مشکور صاحب سے مل سکتا تھا۔ اب ان کے بھڑکنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے، جیل کا پتہ میں انہی سے معلوم کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے اپنے گھر آ گیا۔

دوائے غیاب کا توڑ استعمال کر کے میں گھر سے نکلا اور واپس مشکور صاحب کے گھر کی طرف چل دیا۔ اب مجھے محلے والوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ پولیس نے مجھے بے گناہ قرار دے دیا تھا۔ محلے کے لوگوں نے مجھے گھوڑ کر دیکھا۔ لیکن میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک مکان کے دروازے سے پھینکا گیا پتھر میرے قدموں میں آگرا۔ میں نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن دروازے کا پردہ ہل رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس گھر میں ایک تنہا آدمی رہتا تھا۔ میں نے پتھر دیکھا تو اس پر ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ شاید وہ میرے لیے کوئی پیغام تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ پتھر اٹھالیا اور پرچہ کھول کر پڑنے لگا۔ پرچہ پڑھ کر میرا خون کھول گیا۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے اس کے اندازِ مخاطب پر آیا۔ لکھا تھا۔

”ابو، جان! اگر آپ مجھے بھی ساتھ لے چلیں تو آپ کا احسان ہوگا۔“

میں بانو سے ہرگز حسد نہیں کروں گی۔ آپ کی زیتون۔“

یہ بے تکا خط پڑھ کر میں نے ہلٹے ہوئے پردے کی طرف دیکھا۔ پھر دل ہی دل میں خود پر لعنت بھیجتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بانو نے میرا کبڑا ہی کر دیا تھا۔

مشکور صاحب کے گھر پر پھر مجمع لگا ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو حاضرین پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میری آمد ان کے لیے غیر متوقع تھی۔ پھر ایسا لگا کہ وہ سب کے سب مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ میں نے مشکور صاحب کو ایک زوردار سلام سے نوازا تو وہ میرے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے دھاڑے۔ ”تمہاری یہ ہمت..... کہاں ہے میری نورِ نظر؟“

”آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ پولیس مجھے بے گناہ قرار دے چکی ہے۔ میرے خلاف سازش ہوئی ہے۔“ مشکور صاحب، ورنہ آپ کی نورِ نظر میری بھی منظورِ نظر..... مم..... میرا مطلب ہے، میری بھی نورِ نظر ہے۔“

”اس نے خط میں تمہارا نام کیوں لکھا؟“

”مجھے دکھائیے وہ خط۔“ میں نے بھی سخت لہجہ اختیار کر لیا۔

”وہ خط میری جیب سے غائب ہو گیا ہے۔“ مشکور صاحب بے بسی سے بولے۔ ”خط

کے ساتھ سو روپے کا ایک نوٹ بھی میری جیب سے غائب ہے۔“

مجھے بڑی شدت سے غصہ آیا۔ ”کیا زمانہ ہے لوگ منہ پر بہتان گھڑ لیتے ہیں، مشکور صاحب۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”بٹی بھی شاید جھوٹ گھڑنے میں آپ پر گئی ہے۔“

”کیا بکواس ہے۔“ مشکور صاحب بھنا گئے۔ ”کون جھوٹ بول رہا ہے؟“

یہ ایک مجھے اپنی نازک پوزیشن کا احساس ہو گیا۔ ”کچھ نہیں مشکور صاحب۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ دراصل یہ حادثہ میرے دماغ پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔“ میں نے جلدی جلدی صفائی پیش کی۔ ”سوچتا کچھ ہوں، بولتا کچھ ہوں۔ کاش وہ میرے ساتھ ہی گئی ہوتی۔ ہے..... پھول سی لڑکی..... اور بھاگ جائے، پاؤں دکھ گئے ہوں گے، بے چاری کے۔ میں تو اسے سہارا دے کر لے جاتا۔ سوچا تو میں نے کئی بار تھا لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ بالآخر کوئی اور ہی ہاتھ صاف کر گیا۔ ویسے آفرین ہے اس پر.....“

”ابے، تو پاگل ہو گیا ہے، کیا۔“ مشکور صاحب آپ سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

مجھے احساس ہوا کہ زبان پھر کوئی گڑبڑ کر گئی ہے۔ ”آپ مجھے پاگل ہی سمجھیں مشکور صاحب۔“ میں نے مزید بوکھلا کر کہا۔ ”لڑکی آپ کی گئی ہے، لیکن صدمہ مجھے آپ سے زیادہ ہوا ہے۔“

”اچھا اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ انہوں نے میرا گریبان چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم آئے کیوں ہو، یہاں؟“

”میں تو صورتِ حال جاننے آیا تھا کیونکہ میں بھی اس معاملے میں ملوث ہوں، لہذا اس کی تحقیق مجھ پر فرض ہے۔“

”تم تحقیق کرو گے! ہنہ.....“ مشکور صاحب نے حقارت سے کہا۔

”میں نے جاسوسی ناول بہت پڑھے ہیں، جناب۔“ میں نے اکڑ کر کہا۔ ”بس آپ مجھے جیل صاحب کا پتہ بتادیں۔“

”وہ کیوں؟“ مشکور صاحب نے چونک کر کہا۔

”میں وہیں سے تحقیقات کا آغاز کروں گا۔“

”وہ نیلے میدان کے پاس، یونیٹنی اسٹور کے برابر میں رہتے ہیں۔“

میں نورِ ہی چل دیا۔ کیونکہ مجھے جیل کی تلاش تھی۔

نیلے میدان پہنچ کر میں نے ایک صاحب سے جمیل کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے یونیٹنی اسٹور کے برابر والے مکان کی طرف اشارہ کر دیا۔ دروازہ ایک باریش صاحب نے کھولا۔ اس

کی عمر ستر کے لگ بھگ ہوگی۔“ مجھے جمیل صاحب سے ملنا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”تشریف رکھتے ہیں؟“

”جی فرمائیے۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”تو..... تو کیا آپ ہی جمیل صاحب ہیں؟“ میں اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ ”آپ ہی ٹیوشن پڑھاتے ہیں؟“

”جی ہاں..... آپ خود پڑھنا چاہتے ہیں یا کسی کو پڑھوانا ہے؟“

”جی..... میں پھر کبھی حاضر ہوں گا۔“ میں نے بوکھلا کر کہا اور وہاں سے کھسک

لیا۔ وہ صاحب حیرت سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔

میرے لیے وہ لمحہ فکر یہ تھا۔ کیا بانو کے خوابوں کا بینڈ سم شہزادہ یہی دادا ابا تھے! کیا بانو پاگل ہو گئی تھی؟ ان بزرگوار سے یہ امید تو نہیں کی جاسکتی تھی لیکن اس زمانے میں سبھی کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔ بانو کی ڈائری بھی غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا مطلب ہے، کوئی نہ کوئی گھپلا ضرور ہوا ہے۔ کچھ سوچ کر میں نے ایک دکاندار سے رجوع کیا۔ ”ٹیوشن پڑھانے والے جمیل صاحب کا گھر کون سا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”باؤ جی، یہاں دو جمیل رہتے ہیں اور دونوں ہی ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔“ دکاندار نے انکشاف کیا۔ ”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”وہ جو راجوان سے ہیں۔“ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”اچھا اچھا، جمیل اصغر صاحب۔“ دکاندار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔“

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

”ان سے مت کہیے گا۔“ دکاندار نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”ان کا یہاں ادھار چلتا ہے۔ کچھ دنوں سے انہوں نے مجھ سے ادھار نہیں لیا۔“

”وہ اکیلے ہی رہتے ہیں؟“

”جی ہاں، بالکل اکیلے۔“

میں نے دکاندار سے پیچھا چھڑایا اور جمیل اصغر کے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دروازے پر تالا دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہی میرا مطلوبہ آدمی ہے اس کا غائب ہو جانا اسی بات کا ثبوت تھا۔ کچھ دیر کھڑا میں دروازے کو دیکھتا رہا، پھر واپس چل دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ رات کو میں اس کے گھر کی تلاش لوں گا۔

گھر واپس آ کر میں نے آرام کیا۔ مغرب کے بعد میں نے دوائے غیاب کی ایک

خوراک استعمال کی اور باہر آ گیا۔ اس بار میں فوراً ہی غائب ہو گیا تھا۔ اب مجھے اس دوا کے کسی بھی رد عمل پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ایسی قتلون مزاج دوا سے بھی کسی کا پالا نہیں پڑا ہوگا۔ میں نے پیدل ہی جمیل اصغر کے مکان کا رخ کیا۔ میں وہاں پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا اور اوپر سے علاقے کی لائٹ بھی گئی ہوئی تھی۔ میں نے تالے کو چھو کر دیکھا لیکن وہ بہت مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ غشی دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہو جاؤں گا۔ لیکن گلی میں پہنچتے ہی میں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔

اس گلی میں گندگی کوٹھکانے لگانے کے لیے ایک بہت بڑا گڑھا کھودا گیا تھا۔ اندھیرے میں وہ مجھے دکھائی نہ دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ میں اس میں گرنا چلا گیا۔ گڑھے میں پانی تو نہیں تھا، البتہ بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ گرنے کا جھٹکا اور اس پر روڑے..... یوں لگا جیسے میرا پورا بدن ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ میں نے اتنی بھیاں تک چیخ ماری کہ کچھ دیر تو چیخ مارنے کی اس صلاحیت پر عیش عیش ہی کرتا رہ گیا۔

میری چیخ پورے محلے میں گونج گئی تھی۔ جلد ہی گڑھے کے دہانے کی طرف سے آوازیں سنائی دینے لگی۔ ”معلوم ہوتا ہے کوئی گڑھے میں گر گیا ہے۔“ کسی نے کہا۔

”خدا کے لیے مجھے گڑھے سے باہر نکالو۔“ میں نے دردناک لہجے میں فریاد کی۔

اچانک ہی روشنی کے کئی دائرے گڑھے میں ریگ آئے۔ لوگ یقیناً اپنے ساتھ ٹارچیں بھی لائے تھے اور ان روشن دائروں کی مدد سے مجھے تلاش کر رہے تھے۔

”ارے نکالو مجھے۔“ میں پھر چیخا۔

اچانک اوپر سناٹا طاری ہو گیا۔ لوگوں نے ٹارچیں بجھا دیں۔ پھر بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ تب مجھے حقیقی صورت حال کا ادراک ہوا۔ میں انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی سراسیمگی بھی برحق تھی۔ اس نامعقول دوا نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ میں از خود اس گڑھے سے نہیں نکل سکتا تھا۔

بہت دیر گزر گئی، کوئی اس گڑھے کی طرف نہیں آیا۔ میں حسب توفیق اور حتی المقدور چیخ و پکار کرتا رہا، لیکن محلے والوں کو تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔ کافی دیر بعد قدموں کی آہٹیں پھر ابھریں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ میری آواز کے ساتھ ہی آہٹیں پھر دور ہونے لگیں۔ البتہ ایک ٹارچ کی روشنی گڑھے میں در آئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کرخت آواز گونجی۔ ”کون ہے، مردود..... کیوں خلق خدا کو پریشان کرتا ہے۔“

”ارے صاحب، میں تو خلق خدا سے زیادہ خود پریشان ہوں۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

”مجھے باہر نکال لے، میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“

میں مجھ لیا۔ نو ارسطاطالیس ہے۔“ اسی آواز نے جواب دیا۔ ”مجھے تو میں کئی بار شکست دے چکا ہوں۔“

”کون ارسطاطالیس!“ میں بوکھلا گیا۔ ”بھائی صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری تو دس پشتوں میں کوئی اتنا ثقیل آدمی نہیں گزرا۔“

”تو مجھ سے مکاری نہیں کر سکتا۔ تجھے یاد نہیں، میں تیرے بھائی ہمالیس کو جلا کر خاک کر چکا ہوں۔“

”بھائی صاحب۔“ میں گڑ گڑانے لگا۔ میرا کوئی بھائی کہاں سے آ گیا۔ میں تو اپنے مرحوم والد کی اکلوتی اولاد ہوں، مجھ پر رحم کریں بھائی صاحب!“

”بکواس مت کر..... میں تجھے پھونک ڈالوں گا، ورنہ دفع ہو جا یہاں سے۔“

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں، آپ مجھے یہاں سے نکالیں تاکہ میں دفع ہو سکوں۔“

”کچھ پتہ چلا جناب۔“ کسی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں، ارسطاطالیس ہے۔ اس کے بھائی کو میں نے ہی ہلاک کیا تھا۔ بہت خطرناک جن ہے۔“

”اسے بھی ہلاک کر دیجئے۔“ کئی لوگوں نے بیک آواز کہا۔ پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ کم بخت مجھے جن سمجھ رہے تھے اور میں تردید بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ پھر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اچانک ہی مجھ پر پتھر برسنے لگے۔ پہلا پتھر میرے کندھے پر پڑا۔ میں نے بمشکل اپنی پیچ روکی۔ اب تو میری آواز بھی میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی..... دوسرا پتھر کمر پر لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں دراڑیں پڑ گئی ہوں۔ پتھر کے ساتھ ساتھ وہ شخص کچھ عجیب الفاظ بھی بول رہا تھا۔ شاید وہ کوئی عامل تھا اور مجھ سے نمٹنے کے لیے وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ میں دم سادھے گڑھے کی ایک دیوار سے چپکا کھڑا رہا۔

”بول..... تو موجود ہے یا چلا گیا۔“ عامل نے دباڑتے ہوئے کہا۔

میں خاموش رہا۔ میں نے تو سانس تک روک لی تھی۔

”ایسا لگتا ہے کہ بھاگ گیا ہے۔“ کسی نے تبصرہ کیا۔

”اجی، میں تو بڑے بڑوں کو دیکھ چکا ہوں۔“

”کیا بات ہے آپ کی حضرت..... آپ کے سامنے بھلا کون ٹھہرے گا۔“ کسی نے عامل صاحب کو مکھن رسید کیا۔

”اب بہتر یہی ہے کہ اس گڑھے کو بھروادیا جائے۔“ کسی نے مشورہ دیا۔

میرے روٹ گئے کھڑے ہو گئے۔ زندہ درگور ہونے کا تصور ہی میرے لیے بھیانک تھا..... لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہاں اس اختلاف کرنے والے بھی موجود تھے۔ بہر حال، سب اس بر متفق ہو گئے کہ یہ کام صبح کیا جائے گا..... پھر وہ سب چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میری جان میں جان آئی۔ میں نے گڑھے سے نکلنے کی بے سود کوشش شروع کر دی۔ گڑھا کافی گہرا تھا اور پھر اس کی دیواروں پر پلاسٹر بھی کیا جا چکا تھا لہذا قدم جمائے گا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مہلت صرف رات بھر کی تھی اور غائب حالت میں کوئی میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں بانو کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

وہ رات میری زندگی کی سب سے خوفناک رات تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا تار کی تھی۔ دور ایک کتار رو رہا تھا۔ ادھر گڑھے میں، میں قسمت کو کوس رہا تھا۔ سنا ہے نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بیٹھے بیٹھے پلکیں جھپک گئیں، لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ سکی۔ اچانک ہی کوئی چیز میرے سر پر آ گری۔ غنودگی کے عالم میں تکلیف کا احساس بھی شدید ہوا۔ ابھی میں سمجھ رہا تھا کہ ایک اور چیز نازل ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ اس پر ٹوٹنے والی وہ دونوں قیامتیں، ایک تو سوٹ کیس تھا اور دوسری کپڑوں کی گٹھری تھی۔ اوپر سے سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دیں، لگیں، پھر کوئی انانی جسم نازل ہوا۔ کودنے والا مجھ سے کچھ فاصلے پر گرا تھا۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوا کہ گرنے والی کوئی عورت ہے۔ میں آٹھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بلا کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

”گھبرانا نہیں بانو۔“ اوپر سے کسی نے کہا۔ ”میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔“

بانو کا نام سنتے ہی میں اپنی ہر اذیت بھول گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب تک جمیل اصغر کے مکان میں تھی اور اب وہ دونوں فرار ہونے کے چکر میں ہیں۔ جی تو چاہا کہ اسی وقت اس کی مرمت شروع کر دوں، لیکن خود پر قابو رکھنا پڑا۔ بانو خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے فرار نہیں ہونے دوں گا۔ اگر وہ ایک مرتبہ نکل گئی تو اس کا ملنا ممکن نہیں رہے گا۔ میں نے منہ اوپر اٹھایا اور پھر واویلا شروع کر دیا۔ ”بچاؤ..... بچاؤ، میں جمیل ہوں۔ گڑھے میں گر گیا ہوں۔ میں جن نہیں۔“ میں بری طرح چیخنے لگا۔

ردعمل فوری طور پر ظاہر ہوا۔ اوپر سے پھر قدموں کی آٹھیں اور محلے والوں کی آوازیں سنائی دیں لگیں۔

”وہی جن نہ ہو۔“ کسی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ارے وہ..... اسے عامل صاحب نے بھگا دیا تھا۔“ کسی نے حقارت سے کہا۔ ”چلو، تارچ دکھاؤ۔“

نار چھیں روشن ہوئیں..... پھر ان لوگوں کو بانو دکھائی دے گئی جو ایک کونے میں سہمی کٹی بیٹھی تھی۔ ”ارے، یہ تو لڑکی معلوم ہوتی ہے۔“ کسی نے حیرت سے کہا۔
”لیکن آواز مردانہ تھی۔“ کوئی اور بولا۔

”خدا جانے، کیا چکر ہے۔ ہو سکتا ہے، خوف کے مارے آواز بدل گئی ہو۔“

”کچھ بھی ہو، ہمیں لڑکی کو نکالنا چاہئے۔“ ایک اور صاحب بولے۔ ”ارے..... یہ تو شاید بے ہوش ہو گئی ہے۔“

بانو واقعی بے ہوش ہو گئی تھی۔ میری آواز سن کر اسے کسی نادیدہ شخص کی موجودگی کا احساس ہوا ہوگا۔ بلکہ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں اسکی حرکت قبل ہی بند نہ ہو گئی ہو۔ بہت سے لوگ جھانک کر نیچے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ صبح تک وہ گڑھا اتنا مشہور ہو چکا ہوگا کہ لوگ اسے دیکھنے کے لیے آئیں گے۔ ”چلورسی لٹکاؤ۔“ کسی نے کہا۔

میں نے جلدی سے اوپر دیکھا۔ ایک موٹی سی رسی گڑھے میں پھنسی جا رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اس رسی کی مدد سے نیچے اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے ہی رسی تھامی اور اوپر چڑھنے لگا۔ میرے بوجھ سے رسی پکڑنے والے پریشان ہونے لگے۔

”ارے، یہ رسی تو زنی ہو گئی ہے۔“ کسی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”ایسا لگتا ہے، اس کے ساتھ کوئی وزنی چیز بندھی ہوئی ہے۔“

لیکن اتنی دیر میں میں بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اوپر چڑھ گیا، پھر منڈیر تھام کر خود کو اوپر پہنچا دیا۔ میرے چاروں طرف لوگوں کا مجمع تھا۔ اتنی جگہ بھی نہیں تھی کہ میں حرکت ہی کر سکتا۔ اگر ان میں سے کوئی مجھ سے ٹکراتا تو یقیناً بھگدڑ مچ جاتی۔ بھگدڑ میں یہ بھی ممکن تھا کہ میں دوبارہ گڑھے میں گر جاتا۔ میں نے مٹی بھر ریت اٹھائی اور لوگوں کی طرف اچھال دی۔ لوگ چیختے ہوئے گڑھے سے دور بھاگ گئے۔ میں ان کے حصار سے نکل کر ایک قریبی دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا جسم چوٹوں کی وجہ سے ٹڈھال ہو رہا تھا اور اعصاب بھی شکستہ ہو گئے تھے۔ لیکن مجھ سے زیادہ برا حال محلے والوں کا تھا۔ میری پھنسی ہوئی ریت نے انہیں یقین دلادیا تھا کہ جن گڑھے سے نکل چکا ہے۔ وہ سب کے سب دور ہٹ گئے اور سہمے ہوئے تھے۔ بعض تو آیات بھی پڑھ رہے تھے۔

”میرا خیال ہے، اب صبح کا انتظار فضول ہے۔“ ایک بڑے میاں نے مشورہ دیا۔
”گڑھے کو ابھی پاٹ دینا چاہئے۔“

مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ وہ لوگ بانو کو بھی جن کا کوئی روپ سمجھ کر اسے زندہ دفن کر سکتے

تھے۔ ادھر وہ مردود جمیل اصغر ابھی تک ٹیکسی لے کر نہیں لوٹا تھا۔ بہت سارے لوگوں نے بڑے میاں کی تائید کر ڈالی۔ اب میرے لیے مداخلت کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”ٹھہر جاؤ۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”کوئی پتھر نہیں پھینکے گا۔“

پورے مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ چنانچہ میں نے تنبیہ کی۔ ”خبردار، کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔“
اب تو وہاں موجود ہر شخص نے با آواز بلند وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ خوف زدہ تھے اور اب بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔

”بے دقو! میں جن بادشاہ ہوں۔“ میں پھر چیخا۔ ”میں یہاں جمیل اصغر کو سزا دینے آیا ہوں۔ وہ اس لڑکی کو بھاگ کر لایا ہے، جو اس گڑھے میں موجود ہے۔ جاؤ اس لڑکی کو مشکور صاحب کے گھر پہنچا دو۔“ میں نے انہیں مشکور صاحب کا پتہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں اتنے زور سے چیخا تھا کہ میرے حلق میں خراشیں تو کیا دراڑیں پڑ گئی ہوں گی۔ میں کچھ اور نہ کہہ سکا..... کیونکہ کھانستے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ لوگ جنوں کے بادشاہ کو کھانسان کر کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ بہر حال، مجھے کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ میں کھانستے کھانستے نڈھال ہو کر ایک دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس دوران محلے والوں کا خوف قدرے کم ہو گیا۔ انہوں نے بانو کو سامان سمیت باہر نکال لیا۔ اب اسے اس کے گھر پہنچانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میری حالت قدرے سنبھلی تو میں ان لوگوں کی طرف بڑھا۔ بانو ہوش میں آ چکی تھی اور اب پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔ ”اس سے پوچھو کہ اس نے ایک بے گناہ کو پھنسانے کی کوشش کیوں کی تھی؟“ میں نے با آواز بلند کہا۔

میری آواز سن کر لوگ پھر شپٹا گئے۔ لیکن اب وہ پہلے کی طرح خوفزدہ نہیں تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ اب میں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں ان کے نزدیک ایک شریف جن تھا جو معاشرتی برائیاں دور کرنے کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔

میری بات سن کر ایک بوڑھا آدمی، بانو سے مخاطب ہوا۔ ”لڑکی، جن بادشاہ کے سوال کا جواب دے۔“

بانو شدت خوف سے لرز رہی تھی۔ ”ہاں، میں نے ابو العمران پر بلا وجہ الزام لگایا تھا۔“ وہ گڑ گڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیوں؟“ اس بوڑھے نے سوال کیا۔

”اس بے چارے سے زیادہ بیوقوف کوئی اور محلے میں تھا ہی نہیں۔“ بانو نے جواب دیا۔ میں بھنا گیا۔ مجھے اس کے لڑکی ہونے کا احساس ہی نہیں رہا۔ میں نے اس کے بال

افسوس ہے جناب کہ میں نے ناحق آپ پر شک کیا۔“ اس نے بڑے احترام سے کہا۔ ”ویسے جن بادشاہ کا فرمان ہی کافی تھا۔ لیکن اب بانو نے بھی آپ کی پوزیشن صاف کر دی ہے۔ جمیل اصغر کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔ اس کے سر سے محبت کا بھوت ایسے اتر ا ہے، جیسے پانی سے صابن کے جھاگ فنا ہو جاتے ہیں۔“

”بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”لیکن تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ تم نے اس معاملے میں میرا نام ہی نہیں آنے دیا۔“

”میں جانتا ہوں کہ آپ جیسے لوگ شہرت سے یوں بھاگتے ہیں جیسے گیڈر شہر سے۔“ مجھے اس مثال پر غصہ تو بہت آیا لیکن بہر حال، وہ بھی شہر کا بادشاہ تھا۔ چنانچہ میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو! میں نے تو تمہارے جن بادشاہ سے دوستی ہی ختم کر دی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، جناب۔ میں تو آپ کو اس قوالی میں شرکت کی دعوت دینے آیا ہوں، جو میں جن بادشاہ کے اعزاز میں اپنے گھر پر کر رہا ہوں۔ قوال بھی ایسے بلوائے ہیں کہ لوگ سردھننے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”لیکن قوالی میں میرا کیا کام؟“ میں نے چڑ کر کہا۔

”اے صاحب، بس..... آپ صرف بیٹھے رہیے گا۔ آپ کی حیثیت جن بادشاہ کے قائم مقام کی ہوگی۔ میں خود آ کر آپ کو لے جاؤں گا۔ قوال بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ انہوں نے آپ جیسا کوئی شخص کہاں دیکھا ہوگا.....؟“

میں غصے سے لرز کر رہ گیا۔ عجیب اونڈھی سیدھی باتیں کر رہا تھا، وہ بد بخت..... لیکن پولیس کا آدمی تھا۔ بلکہ ہاتھ پیروں کا بھی مضبوط تھا۔ ورنہ میں اس کا دماغ ضرور درست کر دیتا۔ ”ٹھیک ہے، میں چلوں گا۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ ایک زندہ شخص کی فاتحہ پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اب قوالی بھی کر رہا ہے اور وہ زندہ شخص بھی میں خود ہی ہوں۔ عجیب بات تھی کہ میں نے ایک تہلکہ خیز دوا ایجاد کر لی تھی۔ لیکن وہ میرے حق میں حماقت انگیز ثابت ہو رہی تھی۔ اب تک تو مجھے اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچا تھا، لیکن اب میں اسے ترک کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے پھر دوا پر کام شروع کر دیا۔

میرا ارادہ تھا کہ دو ایک دن دوا پر کام کروں گا اور پھر ادھر ادھر کھسک لوں گا تاکہ سلطان احمد اور اس کے قوالوں سے محفوظ رہوں۔ ابھی میں اپنے ارادے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ گھر کے باہر سے ڈھول تاشے کی آوازیں سنائی دیں۔ لگیں۔ اس کے ساتھ ہی

تھام کر اس کے سر کو بری طرح جھٹکا دیا۔ انتہائے خوف سے بانو کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکل رہی تھیں..... پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ وہاں موجود تمام لوگ یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ ”اب اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچا دو۔“ میں نے رعب دار آواز میں کہا۔

وہاں موجود ہر شخص نے سر جھکا لیا۔ میں انہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ آیا۔ اب یہاں میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ مجھے پیدل چلنا تھا اور اس ٹوٹی پھوٹی حالت میں پیدل چلنے کا تصور بھی گراں گزر رہا تھا۔ اب تو اس سلسلے میں مجھے کوئی ترکیب لازماً سوچنا تھی۔ ورنہ پیدل چل چل کر میرا کباڑہ بھی ہو سکتا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے دوا کا توڑ استعمال کیا اور دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ نیلے میدان والے، بانو کو اس کے گھر پہنچا گئے ہیں۔ مشکور صاحب اپنی کھوئی ہوئی نور نظر کے استقبال میں کچھ زیادہ ہی گرم، جوشی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں اطمینان سے بستر پر آ لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ ٹھنکن اور بدن کی شکستگی اتنی زیادہ تھی کہ صبح میری آنکھ بہت دیر سے کھلی۔

اگلے روز کے اخبارات جن بادشاہ کے تذکرے سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر اخبار نے جن بادشاہ کا تذکرہ اس قدر وثوق سے کیا تھا کہ خود مجھے بھی اپنے آپ پر جن ہونے کا شبہ ہونے لگا، اس پر مستزاد سلطان کا بیان تھا۔ اخبارات کے مطابق جن بادشاہ کا وجود شہر کے لیے باعث رحمت ہے۔ ایک طرف وہ اسمگلروں کے ایک گروہ کی تباہی کا ذمے دار تھا تو دوسری طرف گھر سے فرار ہونے والی لڑکی کی زندگی برباد ہونے سے بچ گئی تھی۔ ایک اخبار نے تو مبالغہ آرائی کی حد کر دی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ بانو جمیل اصغر کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔ لیکن جن بادشاہ نے لڑکی کو اٹھا کر گڑھے میں پھینک دیا..... کاش میں اس رپورٹر سے پوچھ سکتا کہ جن بادشاہ نے جمیل اصغر کو بھلا کیوں چھوڑ دیا تھا؟

اخبارات میں ابو العمران کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ خود سلطان نے بھی میرا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ میں بھی خوش تھا کیونکہ میں جانتا تھا، شہرت میرے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اب میرے لیے بہتر یہی تھا کہ کچھ دن آرام کروں، کوئی فوری مسئلہ بھی سامنے نہیں تھا۔ چنانچہ ”بے کار مباحث کچھ کیا کر“ کے مصداق میں پھر دوا کے سلسلے میں مصروف ہو گیا۔ میں بار بار اسی ادھورے فارمولے پر عمل کرتا تھا لیکن ہر مرتبہ اجزائے ترکیبی میں کچھ رد و بدل کرتا یا پھر اشیاء کے اوزان میں کمی بیشی کر دیتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مجھے ہر بار دوا کوئی نیا ہی رنگ عطا کر دیتی تھی۔ اگلے روز سلطان احمد نازل ہو گیا۔ وہ بہت پر جوش دکھائی دے رہا تھا۔ ”مجھے

دروازے پر اس زور کی دستک ہوئی، جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ میں نے ہڑ بڑا کر دروازہ کھول دیا۔ باہر کھڑے ہوئے تمام لوگ میرے لیے اجنبی تھے۔ ایک آدمی کے گلے میں ڈھول تھا باقی تمام لوگوں کے ہاتھوں میں ہار تھے۔ میں جیسے ہی باہر نکلا ڈھول والا ڈھول پر پل پڑا اور باقی تمام لوگوں نے میرے گلے میں ہار ڈالنے شروع کر دیے۔ میرے گلے میں اتنے ہار ڈالے گئے کہ میرا چہرہ ان ہاروں میں چھپ کر رہ گیا اور سر اٹھانا دو بھر ہو گیا۔ میں ہونق بن کر رہ گیا تھا..... پھر مجھے سلطان احمد کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے گاڑی قریب لانے کو کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے سلطان صاحب۔“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ہم لوگ جناب کو لینے آئے ہیں۔“ سلطان نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”اب آپ ہی ہمارے مرشد ہیں۔“

میری کھوپڑی گھوم گئی۔ کم بختوں نے مجھے تماشہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے ہار سامنے کھڑے ہوئے ایک نامعقول شخص کی گردن میں ڈال دیے..... پھر میں نے سلطان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ارادے کی چنگلی دیکھ کر میں گڑبڑائے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تم لوگ یہیں رکو۔ میں اپنی تسبیح لے آؤں۔“ میں نے بارعب لہجے میں کہا۔ درحقیقت میں اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

سلطان نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس وقت تین ڈر۔ اپنے ہی لہجے کی گھن گھرن پر حیران رہ گیا تھا۔ میں جلدی سے گھر میں داخل ہوا اور دووا کی ایک خوراک، ایک چھوٹی شیشی میں انڈیل لی۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ دیر قوالی میں شرکت کروں گا..... پھر غائب ہو کر سلطان کو معقول قسم کی سزا دوں گا..... اتنا خوفزدہ کروں گا کہ وہ میرا پچھپھا چھوڑ دے گا۔ شیشی جیب میں رکھ کر میں گھر سے باہر آ گیا۔ اب میں پوری طرح مطمئن تھا۔

لوگوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گاڑی دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ محلے والے جمع ہو کر اس جلوس کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میری اس قدر عزت افزائی ان کی سمجھ سے بالاتھی۔ سلطان نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے عقبی نشست پر بٹھادیا، پھر خود بھی میرے برابر بیٹھ گیا۔ دوسرے لوگ ان ویکنوں میں بیٹھ گئے جو ساتھ آئی تھیں۔ یوں یہ جلوس روانہ ہو گیا۔

”اس اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے سلطان سے پوچھا۔

”یہ اہتمام تو بہت کم ہے۔ آپ اس ہستی کے دوست ہیں جو کایا پلٹ سکتی ہے۔ آپ کا اور جن بادشاہ کا تعلق ایسا ہے کہ جن بادشاہ بپتہ ہوئے دریا کی طرح ہیں اور آپ کنارے پر اگے ہوئے گھاس پونس.....“

اس بے تکی مثال نے میرا نمود پھر خراب کر دیا، لیکن میں فی الوقت کچھ کر بھی نہیں سکتا

تھا۔ سارے راستے وہ ادھر ادھر کی ہانکتا رہا۔ اس نے مجھے نہ جانے کیا کیا بنا ڈالا تھا۔ اس کی باتیں سن سن کر مجھ پر بزرگی طاری ہو گئی۔ میری گردن فخر سے تن گئی۔ اسی وقت گاڑی کو دھکا لگا اور میری تھوکتی اتنے زور سے سامنے کی نشست سے ٹکرائی کہ میری گردن کافی عرصے کے لیے اکڑ کر رہ گئی۔ میں درد کی شدت سے تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے جھلا کر ڈرائیور کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا لیکن وہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔ کم بخت کو میری بزرگی کا ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ ادھر سلطان میری تکلیف کی پروا کیے بغیر میری شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ میں نے زندگی میں اتنا جن پرست پولیس والا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

خدا خدا کر کے سفر ختم ہوا اور گاڑی سلطان کے گھر کے پاس رک گئی۔ مکان کے باہر بھی خاص بھیر تھی۔ ممکن ہے جن بادشاہ کے معتقدین کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے کھڑے ہوں۔ ڈھول والا نیچے اتر کر پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ڈھول پینے لگا۔ گاڑی سے اترتے ہی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا..... پھر ایک شامیانے میں پہنچا دیا گیا، جس کے تین اطراف قتا قتا لگی ہوئی تھیں۔ پنڈال کے کنارے، ایک تخت پر سفید چاندنی بچھائی گئی تھی اور گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ مجھے نہایت احترام کے ساتھ تخت پر بٹھا کر گاؤ تکیوں کے درمیان یوں پھنسا دیا گیا کہ میرے لیے ہلنا جلنا بھی محال ہو گیا۔ میں وہ سب کچھ صرف اسی لمحے کی خاطر برداشت کر رہا تھا، جس میں مجھے سلطان کو سزا دینے کا موقع ملنے والا تھا۔ سامنے در یوں پر شاید میرے معتقدین بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے، جیسے میرے رخ روشن سے ان کی آنکھیں چندھیائی جا رہی ہوں۔ پھر قوال نمودار ہوئے۔

”اگر حضور کی اجازت ہو تو محفل کا آغاز کیا جائے۔“ سلطان نے بے حد انکسار سے

پوچھا۔

میں نے تندنگاہوں سے اسے گھورا..... پھر مجبوراً سر ہلا دیا۔ فوراً ہی قوالوں نے سر ملانا شروع کر دیے۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد ان کی آوازیں بھی نکلنے لگیں۔ ان کے بے سرے پن کے باوجود سامعین کا جھومنا میرے لیے باعث حیرت تھا۔ سلطان نے تو حد ہی کر دی۔ اس پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور بڑے احترام سے دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر میرے سامنے کر دیا۔ میں اس رسم سے واقف تھا۔ جواباً مجھے بھی اپنی جیب سے نوٹ نکالنا تھا۔ کم بخت سلطان نے دس روپے سے اشارت کر کے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ محفل نہ جانے کب تک جمی رہتی، جب کہ میرے پاس بمشکل پچاس روپے تھے۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے سلطان کی واسکٹ کی

گئے کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ اصلیت پتہ چلنے تک تم قید ہی رہو گے۔
 ”یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں بھائی کہ میں کتنے پانی میں ہوں البتہ یہ احساس ہو رہا ہے کہ
 میں گردن گردن کسی دلدل میں پھنس گیا ہوں۔“
 ”سوچ لو..... زبان کھولنے کا فیصلہ کر کے فائدے میں رہو گے ورنہ موت تمہارا مقدر
 ہوگی۔“ تیسرا آدمی غرایا۔

..... پھر وہ دروازہ باہر سے بند کر کے چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے جیب نٹولی۔
 دوا کی شیشی موجود نہ پا کر میرے رے سبے حواس بھی رخصت ہو گئے اب تک میں اسی کے
 بھروسے پر حوصلہ پکڑے ہوئے تھا۔ لیکن انہوں نے شاید بے ہوشی کے عالم میں میری جامہ
 تلاشی بھی کر لی تھی..... پھر میں یہ سوچ سوچ کر ہولنے لگا کہ اگر وہ دوا اور کسی نے استعمال کر لی
 تو کیا ہوگا۔ ہر شخص میری طرح شریف تو نہیں ہوتا۔ ہر شخص اگر غائب ہونے لگے تو نہ جانے
 کیسے کیسے گل کھلانے۔ اس دوا کے بارے میں معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔ میں بستر سے اٹھا تو
 کمزوری کی وجہ سے مجھے چکر آ گیا۔ میں نے سر کے عقبی حصے کو چھو کر دیکھا۔ خون تو نہیں نکلا تھا
 لیکن مجھے یقین تھا کہ میری کھوپڑی پر ایک ننھا سا جزوی سر نظر آ رہا ہوگا۔ کم بختوں نے بہت بے
 دردی سے وار کیا تھا۔ جیسے تیسے میں دروازے تک پہنچا اور دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا وہی شخص تھا جو کچھ دیر قبل میرے رخساروں
 پر مشق ستم کر رہا تھا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے تند لہجے میں پوچھا۔
 ”بھائی..... میں تمہیں ہر بات بتا دوں گا، لیکن تم میری دوا تو واپس کر دو۔ اس کے بغیر تو
 میں بغیر کچھ بتائے ہی مر جاؤں گا۔“

”یہ کوئی بڑی بات نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ہی تمہاری جیب سے
 دوا کی وہ شیشی نکالی تھی۔ ابھی لایا۔“ یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے واپس چلا گیا۔

اب مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ غائب ہو کر تو میں ان ان سب کا دماغ بھی درست کر سکتا
 تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دوا کی شیشی لے آیا۔ ”یہ لو“ اس نے شیشی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”طبیعت سنبھل جائے تو بتا دینا، پھر تم سے پوچھ گچھ کریں گے۔“

میں نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں طبیعت سنبھل جانے کے
 بعد خود ان سے کس قسم کی پوچھ گچھ کا ارادہ رکھتا ہوں۔

وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ میں نے فوراً ہی دوا حلق میں اندلی اور ایک فاتحانہ قہقہہ
 لگاتے ہوئے شیشی ایک طرف پھینک دی۔ کافی دیر ہوگئی، لیکن میں غائب نہیں ہو سکا۔ تاہم
 مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ کبھی کبھی دوا کا اثر کافی دیر بعد بھی ہوتا ہے۔ میں اطمینان

دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں بھی کچھ نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دس کا ایک
 نوٹ نکال کر اس کی پتیلی پر رکھ دیا۔ سلطان کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے بعد اسے نذر گزارنے
 کی ہمت نہ پڑی۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب کو حال آ گیا اور مجھے وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع
 مل گیا۔

شامیانے کے باہر کچھ زیادہ ہی اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں روشنی سے
 اٹھ کر آیا تھا۔ اچانک کسی نے میری کھوپڑی کو نفاہ سمجھ کر پیٹ ڈالا۔ اس کے بعد نہ جانے کتنی
 دیر تک میرے ہوش و حواس رخصت ہو رہے۔

میری آنکھ خود بخود نہیں کھلی بلکہ کھلوائی گئی تھی۔ رخساروں پر اتنی کثرت سے طمانچے برس
 رہے تھے کہ میں نے ہوش میں آنے ہی میں عافیت جانی۔ سر کی چوٹ اور نقاہت کی وجہ سے
 مجھے ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ نگاہ قدرے بہتر ہوئی تو مجھے وہ تینوں خبیث بھی نظر
 آ گئے۔ ان میں سے ایک اس انہماک سے منہ پر تھپڑ برسا رہا تھا، جیسے ڈاک خانے والے ٹکٹوں
 پر ٹھپا لگاتے ہیں۔

”بس بھائی بس، مجھے ہوش آ گیا ہے۔“ میں نے بلبلا تے ہوئے کہا۔

اس کا ہاتھ رک گیا اور وہ سب دیکھتی سے میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”میں کہاں ہوں، بھائی..... اور کیوں ہوں؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کیونکہ
 مجھے وہ عذاب کے فرشتے معلوم ہو رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ دونیں بلکہ تین تھے۔
 میں نے سوچا کہ ممکن ہے، میرے اعمال کے پیش نظر دو فرشتوں کو ناکافی سمجھ لیا گیا ہو۔

”اپنی اصلیت بتا دو تو آزاد کر دیے جاؤ گے۔“ تھپڑ مارنے والے نے کہا۔

میں نے لرزتی آواز میں انہیں کلمہ طیبہ سنا دیا..... وہ پھر بھی مطمئن نہ ہوئے تو میں نے
 یقین دلانے کی کوشش کی کہ الحمد للہ میں مسلمان ہوں۔ وہ ہنسنے لگے۔

”بن رہے ہو۔“ تھپڑ مارنے والے نے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ تم گامے شاہ سے نکل لینا
 چاہتے ہو۔“

”کون گامے شاہ اور کہاں کی نکر۔“ میں نے فریاد کی۔ ”اس پلپلے سر کے ساتھ میں کسی
 سے کیا نکل لوں گا۔“

”جھوٹ مت بولو۔ اسی لیے وہ تمہیں مقابلے پر لایا ہے۔“

”کون لایا ہے، مجھے..... شاہ جی کی کوئی کمزوری ہے کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔“

”وہی تمہارا سلطان احمد..... بہت چالاک سمجھتا ہے، خود کو..... لیکن اسے معلوم نہیں کہ
 شاہ جی سے جاں نثار کیسے جی دار ہیں۔“ اس نے اپنا سیدہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم دیکھیں

تھی۔ لیکن اب بھوک لگ رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ میں باہر نکل آیا۔ برآمدے میں کچھ لوگ کھڑے تھے۔ وہ سب مسلح تھے اور صورت ہی سے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن مجھے ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا ہوا نکل آیا۔ اب مجھے کچن کی تلاش تھی۔ کچن تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، لیکن اندر داخل ہوتے ہی فرط حیرت سے اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ سلطان احمد وہاں باورچی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ طوعاً کرہاً یہ کام کر رہا ہے۔ حیرت کے پہلے جھٹکے کے بعد مجھے اس کی حالت زار پر خوشی کا احساس بھی ہوا۔ اس نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی اور اب خود بھی بھگت رہا تھا۔

اس نے کسی ماہر باورچی کی طرح میز آراستہ کر دی اس دوران میں ایک آدمی کچن میں داخل ہوا۔ مجھے اس کی آمد کا احساس نہیں ہو سکا تھا، چنانچہ میں اس کے راستے سے نہ ہٹ سکا۔ وہ مجھ سے ٹکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے پلٹ کر حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں میں ڈاکٹر تھا، لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں سر جھٹکا اور آراستہ میز کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور سلطان سے کہا۔ ”تم بھی چلو، باس نے بلایا ہے۔“

سلطان کے چہرے پر غصے کا تاثر نمودار ہوا۔ لیکن وہ بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ چل دیا۔ میں اس سے پہلے ہی دروازے سے ہٹ گیا تھا۔ مجھے ناشتہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں نے صبر کرنا مناسب سمجھا اور ان کے پیچھے چل دیا۔ وہ دونوں ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے صوفے پر ایک عظیم آدی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ صورت ہی سے کوئی سفاک قاتل معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے گرد کئی مسلح افراد مودب کھڑے تھے۔ ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے رکھ دی گئی۔ سلطان ایک طرف کھڑا تھا۔

”کیوں تھانے دار صاحب۔“ صوفے پر بیٹھے ہوئے آدمی نے بے حد زہریلے لہجے میں سلطان کو مخاطب کیا۔ ”کچھ ہوش ٹھکانے آئے۔ ابھی تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا ہوگا کہ ہمارے پاس تشدد کے کیسے کیسے طریقے موجود ہیں۔ تم کسی پاگل کتے سے بدتر بھی ہو سکتے ہو۔ پھر ہم تمہیں سڑک پر پھینکوا دیں گے۔“

”میں تمہیں خوب سمجھ گیا ہوں۔“ سلطان نے جواب دیا۔ ”لیکن میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے، رسی کے بل ابھی باقی ہیں۔ ٹھیک ہے، دو پہر کا کھانا بھی تم ہی تیار کرو گے۔“ عظیم آدی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے ہمیں سب کچھ بتادو۔ تم نے اس احمق کو

سے بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر اور گزر گئی۔ میں غائب تو نہیں ہوا البتہ۔۔۔۔۔ البتہ میرے پیٹ میں بھونچال سا آگیا، زبردست مروڑ اٹھنے لگے۔ میں پیٹ دبا کر اوندھا لیٹ گیا لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔۔۔۔۔ پھر تکلیف بڑھ گئی تو میں بوکھلا کر اٹھا۔ کمرے میں دو دروازے تھے۔ دوسرا دروازہ کھولتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ وہ۔۔۔۔۔ بیت الخلا کا دروازہ تھا۔ بیت الخلا کا پہلا دورہ مکمل کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ پھر حاجت محسوس ہونے لگی۔ پندرہ منٹ میں، میں نے بیت الخلا کے کوئی پانچ پھیرے لیے۔ اب نقاہت بہت بڑھ گئی تھی، بلکہ غشی طاری ہونے لگی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دوانے اس باکچھ اور ہی گل کھلا دیا ہے۔ غالباً اس مرتبہ بالاقساط بالکل ہی غائب کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ گھبرا کر میں نے پھر دروازہ پیٹ ڈالا۔

وہ لوگ میری حالت دیکھ کر خود بھی گھبرا گئے۔ پھر میں نے انہیں وہیں چھوڑ کر بیت الخلا کی طرف دوڑ لگائی۔ واپس آیا تو وہ سب حیران و پریشان کھڑے تھے۔ اتنے میں طمانچے مارنے والا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ”یار معاف کرنا۔“ اس نے ایک شیشی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں غلطی سے کسٹر اکل دے گیا تھا۔ یہ رہی تمہاری دوا۔“

جی تو جا ہا کہ شیشی مار کر اس کی کھوپڑی توڑ دوں۔ لیکن شیشی بہت چھوٹی تھی۔ چنانچہ میں نے جبرا منسکراتے ہوئے اپنی دوالے لی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے دوا حلق میں انڈیل لی۔ اس بار وہ لوگ دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے۔ میری نقاہت کے پیش نظر انہیں یقین تھا کہ میں بھاگ نہیں سکتا۔ دوا پیتے ہی میں غائب ہو گیا۔ پھر میں ہمت کر کے اٹھا اور دھیرے دھیرے کھلے دروازے سے باہر نکل آیا نقاہت شدید تھی۔ میں زیادہ دور نہ جا سکا اور ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب مجھے گامے شاہ کے متعلق معلوم کرنا تھا۔ میں گھر بھی جا سکتا تھا لیکن میں نے کام ادا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے یہ پتہ چلانا تھا کہ سلطان نے مجھے کس چکر میں اور کیوں پھنسا یا تھا؟

کچھ دیر بعد مجھے دوا آدمی اس کمرے کی طرف جاتے دکھائی دیے، جس میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ فوراً ہی وہ گھبرائے ہوئے واپس آ گئے۔ ان کے چہروں سے پریشانی ہو رہی تھی۔ ”وہ ابھی یہیں کہیں ہوگا۔“ ایک نے کہا۔ ”چلو تلاش کرو اسے۔“

وہ دونوں مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی میں پھر اٹھا اور دھیرے دھیرے اسی کمرے میں واپس چلا آیا۔ اب میں محفوظ تھا۔ جسمانی تھکان اور نقاہت مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں نیند پوری کر لوں۔ میں نے سوچا کہ تازہ ہو کر ان لوگوں کی خبر لوں گا۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ سو کر اٹھا تو صبح ہو چکی تھی۔ نقاہت بڑی حد تک دور ہو چکی

”یہ صوفے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، شاہ جی!“ گامے شاہ کے ایک گرگے نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

”چلو..... یہ اور بھی اچھا ہوا۔“ گامے شاہ نے سکون کی سانس لی۔ سلطان پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اب بھی سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ لیکن مجھے یہ احساس تھا کہ گامے شاہ کو سزا دینا، میرے حق میں بہتر ہی ہوا ہے۔ اگر ظاہر ہونے سے پہلے میں اس کے ایک آدھ ہاتھ جڑچکا ہوتا تو اب تک میری چٹنی بن گئی ہوتی۔ اس کے علاوہ صوفے کے پیچھے پہنچنے کے بعد ظاہر ہونا یوں بھی بہتر تھا کہ وہ سب یہی سمجھے کہ میں صوفے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ دوسری صورت میں خود سلطان بھی میری طرف سے مشکوک ہو جاتا۔ اسے یہ اندازہ ہو جاتا کہ میں غائب ہو سکتا ہوں تو میری پوزیشن بے حد خراب ہو جاتی۔

”یہ لو..... تمہارا پیر بھائی بھی آ گیا۔“ گامے شاہ نے خوش ہو کر سلطان کو مخاطب کیا۔ ”اب میں دیکھوں گا کہ تمہارا جن بادشاہ تمہیں کیسے آزاد کرتا ہے۔“ پھر وہ اپنے گرگوں سے مخاطب ہوا۔ ”لے جاؤ انہیں اور بند کر دو۔“

اس کے گرگے ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے گئے۔ میری حالت بے حد خراب تھی، لیکن سلطان بے حد خوش دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ لوگ ہمیں ایک کمرے میں بند کر کے چلے گئے۔ سلطان فوراً ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ ”واہ صاحب، واہ۔“ اس نے مجھے بھینچتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت بور ہو رہا تھا۔ آپ کو دیکھ کر یوں جی اٹھا ہوں جیسے کوئی بے ہوش آدمی گٹھنے سے ہوش میں آ جاتا ہے۔“

”اچھا، ہٹو ایک طرف۔“ میں نے اسے دھککا دیا۔ ”تم نے بلاوجہ مجھے مروادیا۔“ ”ارے صاحب، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بیٹھیں تو..... میں، آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“

”کہاں بیٹھوں۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”اس کمرے میں ہے، کوئی بیٹھنے کی چیز!“ ”زمین پر بیٹھ جائیں۔ آپ تو بزرگ ہیں۔ بزرگ زمین سے بہت محبت کرتے ہیں۔ شاید ان کی مثال اس بیج کی سی ہوتی ہے جو مٹی میں نمویا جاتا ہے۔“ ”اب تم نے کوئی بے تکلی مثال دی تو میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔“ غصے کی شدت سے میں لرزنے لگا۔

”ٹھیک ہے صاحب، میں خاموش ہو جاتا ہوں۔“ میں فرش پر بیٹھ گیا اور بھلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے میں نے انگاروں پر

کیسے فرار کروایا ہے۔“ ”مجھے کیا معلوم۔“ سلطان بھنا گیا۔ ”مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا..... کہ وہ یہاں قید ہے۔“

”اچھا۔“ وہ شخص طنز یہ انداز میں مسکرایا۔ ”تب تو شاید تم اسے جانتے بھی نہیں ہو گے۔“ ”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ ”تو پھر بتاؤ کہ وہ کون ہے؟“ ”وہ میرا پیر بھائی ہے۔“

”تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے تھانے دار تم جانتے تھے کہ میں پیروں فقیروں کا قائل ہوں۔ تم بہت چالاک آدمی ہو۔ تم نے اسی لیے یہ پیری فقیری کا ڈھونگ رچایا ہے۔ ورنہ تم کہاں اور تو والی کہاں..... تم چاہتے تھے کہ میں بھی اس کا معتقد ہو جاؤں۔ اس طرح وہ میرے قریب آ کر تمہارے لیے جاسوسی کر سکے گا۔ تم نے اسے فرار کر دیا ہے۔ لیکن مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔“

اس کی تقریر نے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ وہی گامے شاہ ہے۔ میں یہ بھی سمجھ گیا کہ سلطان نے مجھے بطور چارہ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

”میرا منصوبہ تو یہی تھا لیکن یقین کرو کہ وہ میرا پیر بھائی ہے۔ یہ حقیقت ہے۔“ سلطان نے صفائی پیش کی۔

”اچھا..... یہ بتاؤ، پیر کون ہے، تمہارا۔“ گامے شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں جن بادشاہ کہتا ہوں۔ نام کا مجھے پتہ نہیں۔“ سلطان نے بے حد عقیدت سے کہا۔

گامے شاہ نے چائے کی پیالی اٹھا کر ایک طویل گھونٹ لیا۔ اسے فوراً ہی اچھو ہو گیا۔ پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ کچھ دیر تو وہ کھانستا رہا۔ پھر اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے دہاڑا۔ ”لغت ہو تم پر، چائے بنانا بھی نہیں جانتے۔“

اس کی پھینکی ہوئی پیالی میرے پاس آ کر گری اور گرم گرم چائے نے میرا پیر چھلسا دیا۔ کچھ دیر تو میں ایک پاؤں پر پھدکتا رہا۔ سوزش کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ میں گامے شاہ کو اس بے ہودگی کی سزا دینے کے لیے صوفے کے پیچھے پہنچ گیا۔ اسی لمحے مجھے دوادعا دے گئی اور میں ظاہر ہو گیا۔

عجیب صورت تھی۔ کچھ دیر تو وہاں سناٹا رہا۔ اوروں کا تو ذکر کیا، خود میں بھی سکتے کے عالم میں کھڑا رہا، پھر اچانک کئی پستول میری طرف اٹھ گئے۔ ادھر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

کی۔

”وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔“ میں نے بھنا کر کہا۔
 ”تم کوشش تو کرو۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”کہو تو ان لوگوں سے کہہ کر اگر بتیاں
 منگوادیں۔ اس طرح گامے شاہ پر رعب بھی پڑے گا۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”وہ میرے بلانے سے نہیں
 آئیں گے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ سلطان نے کسی نئی نویلی بیوہ کے سے دردناک لہجے میں کہا اور
 سر جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ گامے شاہ کے بلاوے
 پر مجھے لینے آیا تھا۔ ”جاؤ پیر بھائی۔“ سلطان نے سرگوشی کی۔ پھر بلند آواز میں بولا۔ ”لیکن
 کچھ بھی ہو، اپنا راز ظاہر مت کرنا۔“

یوں گویا اس نے میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ میرا راز ہی کیا تھا۔ میرا
 تو کسی سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ لیکن اس نے راز کا تذکرہ کر کے مجھے بالکل ہی مروا دیا تھا۔
 بہر حال، میں اس شخص کے ساتھ گامے شاہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ وہاں بالکل اکیلا بیٹھا
 تھا۔ لانے والا بھی مجھے وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ”آؤ بھئی آؤ۔“ گامے شاہ نے لہک کر
 کہا۔ ”یہاں..... میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ اس کا یہ انداز میری سمجھ سے باہر تھا۔ تاہم میں اس
 کے پاس جا بیٹھا۔ ”تم نے شاید ناشتہ نہیں کیا۔“ اس نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”پہلے کچھ
 کھا پی لو، پھر باتیں ہوں گی۔“

اس نے اپنے ایک گرو کے کو بلا کر ناشتہ لانے کا حکم دیا۔ ناشتہ بے حد پر تکلیف تھا۔ اس
 دوران میں وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ناشتہ کرتے کرتے میری ساری کلفت دور ہو گئی اور زندگی
 خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ ناشتے کے بعد گامے شاہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں بھئی، اب
 بتاؤ تم ان پولیس والوں کے چکر میں کیسے پڑ گئے۔ میاں ان کی دوستی بہت خطرناک ہوتی ہے۔
 تم تو صورت ہی سے اللہ والے معلوم ہوتے ہو۔“

”بس دھوکے میں آ گیا۔“ میں نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ”ایک کیس کے سلسلے میں
 سلطان صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ زبردستی میرے پیر بھائی بن بیٹھے۔“
 ”تو تم دونوں پیر بھائی نہیں ہو۔“

”ہرگز نہیں، لیکن میں پولیس والے کی دشمنی بھی تو مول نہیں لے سکتا۔ سلطان صاحب
 نے قوالی میں بلوایا تھا۔ مجھے بادل خواستہ جانا پڑا۔ پھر آپ لوگ مجھے اٹھا کر لائے۔“
 ”کاش ہمیں یہ سب پہلے معلوم ہو جاتا۔“ گامے شاہ ہاتھ ملتے ہوئے گلوگیر لہجے میں

تشریف رکھ لی ہو۔ اگلے ہی لمحے میں چیختا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”لگتا ہے جناب سرخ چیونٹیوں کے جھگڑے پر بیٹھ گئے تھے۔“ سلطان نے تبصرہ کیا۔
 حقیقت بھی یہی تھی لیکن مشورہ اسی کا تھا چیونٹیوں نے ذرا دیر میں مجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیا
 تھا۔

”تم..... تم..... اول درجے کے نالائق ہو۔“ غصے کی شدت سے میں ہکلانے لگا۔
 ”چیونٹیوں پر ناراض نہ ہوں، جناب۔“ سلطان نے بے حد انکسار سے کہا۔ ”آخر یہ بھی
 خدا کی مخلوق ہیں۔ آپ دوسری طرف بیٹھ جائیں۔“ مجھے بیٹھنا تو تھا۔ میں اپنے آپ کو، کوستا
 ہوا ایک صاف جگہ پر بیٹھ گیا۔ سلطان بھی میرے پاس ہی آ بیٹھا۔ ”مسئلہ یہ ہے گامے شاہ
 بد معاشوں کا سرغنہ ہے۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”اس کے بے شماراڈے ہیں۔ کئی شراب
 خانے اور جوئے کے اڈے چلاتا ہے۔ اس کے کارندے پورے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن
 اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ البتہ اس کی ایک کمزوری ہے۔ میں نے اس
 کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ اس طرح اس کے راز معلوم کیے جاسکتے تھے۔ لیکن بد قسمتی
 سے میری اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔“

”نا کامی کی وجہ؟“ میں نے پوچھا۔
 ”جناب میں نے ایک قوال سے مدد لینا چاہی تھی۔ لیکن وہ گامے شاہ کا قرب حاصل نہ
 کر سکا۔ پھر مجھے جن بادشاہ کے حوالے سے آپ کا خیال آیا۔ یقین کیجیے میری نیت بالکل
 صاف تھی۔ لیکن گامے شاہ چونکا ہو گیا۔ اس نے ہم دونوں کو اٹھوا لیا۔“
 ”اب یہاں سے نکلنے کی کیا تدبیر ہوگی؟“

”تدبیر کی ضرورت نہیں۔“ اس نے بے فکری سے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”میں
 تو خیر بے حیثیت ہوں، لیکن جن بادشاہ کے نزدیک آپ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہی مثال ہے
 لیلیٰ کے کتے والی۔“

”بکواس مت کرو۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”ہر وقت بے تکی مثالیں دیتے رہتے ہو۔“
 ”معاف کیجیے، جناب۔ عادت سی پڑ گئی ہے میرا مطلب تھا کہ آپ کی وجہ سے جن
 بادشاہ مداخلت کریں گے اسی لیے تو میں اب مطمئن ہو گیا ہوں۔ آپ کو دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈ
 پڑ گئی ہے۔“

میں اسے کس طرح سمجھاتا کہ جس کے آسرے پر وہ بیٹھا ہے، وہ تو خود ہی بے آسرا
 ہو گیا ہے۔ چنانچہ میں بھی سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس کم از کم جن بادشاہ کی امید تھی، لیکن
 میں تو اس سے بھی محروم تھا۔ ”پیر بھائی، جن بادشاہ کو بلاؤ نا۔“ کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے اپیل

بولاً۔ ”مجھے کیا پتہ تھا کہ پولیس والے تم جیسے اللہ والوں کو بھی نہیں بخشے۔“
 ”دیکھیے شاہ جی، میں بہت گناہگار آدمی ہوں۔“ میں نے احتجاج کیا۔ ”آپ اللہ والے
 کہہ کر مجھے اور گناہگار نہ کریں۔“

”ایسا نہ کہو، میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔“ گامے شاہ جلدی سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ
 تم لوگ اپنی اصلیت خود ظاہر نہیں کرتے۔ لیکن تمہارا مرتبہ تمہارے چہرے سے ظاہر ہے۔ میں
 نے ایسا نورانی اور جلالی چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا شان ہے تمہاری۔“

میں اندر ہی اندر پھول گیا۔ ظاہر ہے، اسے کیا پڑی تھی جو مجھے مکھن لگاتا۔ وہ ٹھیک ہی
 کہہ رہا ہوگا۔ پھر اس جیسا آدمی میرا معتقد ہو جاتا تو فائدہ ہی فائدہ تھا۔ بلاوجہ انکسار دکھانا
 فضول تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی بزرگی کا اعتراف کر ہی لیا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے ایک
 گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب اوپر والے کا کرم ہے۔ اسی نے مجھے فرش سے اٹھا کر
 عرش تک پہنچا دیا ہے۔“

”میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔“ گامے شاہ نے کہا اور میرے ہاتھ دبانے لگا۔ ”ارے آپ
 جیسے لوگ کیا نہیں کر سکتے، آپ کی آنکھ کا ایک اشارہ ہی کافی ہے۔“

”ہاں..... لیکن کچھ دنوں سے میری آنکھوں میں کھٹک سی ہو رہی ہے۔ آج کل کوئی
 خاص کام نہیں کر سکتا۔“ میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”واہ..... خاص درویشوں والا لہجہ ہے۔“ اس نے لہک کر کہا۔ ”آپ لوگوں کی تو ہر
 بات میں کوئی نہ کوئی رمز پوشیدہ ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں آپ سے ایک کام لینا چاہتا
 ہوں۔“ اب وہ تم سے آپ جناب پر آ گیا تھا۔ میں اس کے انداز سے خوفزدہ ہو گیا۔ ”مجھے
 یقین ہے، اے مرد بزرگ و جوان رعنا کہ آپ میرا یہ حقیر کام ضرور کریں گے۔“
 ”ہاں ہاں، کہو کہو۔“ میں پھر پھول گیا۔

”بات یہ ہے جناب کہ میں نے بڑی محنت سے اور تکلیفیں اٹھا کر یہ گروہ قائم کیا ہے۔
 آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پیٹ بڑا پانی ہوتا ہے۔ پھر اسی وجہ سے سینکڑوں لوگوں کو روزی مل رہی
 ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم برے لوگوں کو منشیات فراہم نہ کریں تو وہ شریف لوگوں کا جینا دو بھر
 کر دیں! اب سوچیں میں کتنا تعمیری کام کر رہا ہوں، لیکن پولیس میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔
 میں ہمیشہ پیروں فقیروں کی خدمت کرتا ہوں، لیکن یہ پولیس والے..... ہے نازیادتی؟“
 ”واقعی، یہ تو زیادتی ہے۔“ میں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے پولیس والوں سے
 اختلاف ہے۔“

”شکریہ..... شکریہ۔“ اس نے بے حد خوش ہو کر کہا اور میرے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت

ہو گئی۔

”اچھا..... تم یہ ہاتھ دباننا بند کرو، میں کچھ سوچتا ہوں۔“ میں نے تکلیف سے منہ بناتے
 ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اپنے ہاتھوں سے سوچتے ہیں۔“ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔
 ”میں چاہتا ہوں کہ آپ رستم کا دماغ درست کر دیں۔ وہ میرے لیے درد سر بنتا چلا جا
 رہا ہے۔“

”کون ہے یہ رستم؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں آپ کو دکھا دوں گا۔ اتنی محنت سے میں نے یہ گروہ بنایا ہے۔ ہر گروہ میں یہ
 ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دغا بازی اور بے وفائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سبق دینے کے
 لیے میں نے رستم کو خصوصی تربیت دی ہے۔ وہ ان کی ہڈی پکلی برابر کر دیتا ہے۔ لیکن اب اس
 کا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کے غرور کو خاک میں ملا دیں۔ تاکہ
 وہ میرا احترام کرنے پر مجبور ہو جائے۔“

عجب بے ڈھنگی فرمائش تھی۔ میں نے رستم کا تصور کیا اور لرز کر رہ گیا۔ ”میاں، ہم جیسے
 دگ لڑائی بھڑائی سے پرہیز کرتے ہیں۔“

”اور صرف آنکھوں سے کام لے کر سرکشوں کا دماغ درست کر دیتے ہیں۔“ اس نے
 غلڑا لگایا۔

”تمہیں یہ کام کسی اور سے لینا ہوگا۔“

”یہ کام آپ کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میرا ہر کارندہ
 رستم سے ڈرتا ہے۔ وہ کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ لیکن آپ کی بات دوسری ہے۔ آپ تو دو
 منٹ میں اس کا دماغ درست کر سکتے ہیں۔ اگر آپ نے میری بات رد کر دی تو میں سمجھوں گا
 کہ آپ فراڈ ہیں اور ایسے لوگوں کو ہم ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ آپ رستم کو درست کر دیں، اس
 کے بعد آپ مجھے جوتے بھی ماریں گے تو اف نہیں کروں گا۔“

میں سمجھ گیا کہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ جس رستم سے اس کے خوفناک
 کارندے ڈرتے ہیں، اس کے سامنے میری کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ انکار کی صورت میں میرا
 بڑے ہی صاف ہو جاتا۔ مقابلے میں البتہ ہجرت کا امکان تھا۔

”کیا خیال ہے، آپ کا۔“ گامے شاہ نے مجھے چونکا دیا۔ ”یہ آپ کی بزرگی کا امتحان
 ہے۔“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے ہمت لے کر کہا۔

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو طلب کیا اور بولا۔ ”جاؤ، جلدی سے رستم کو لان میں لے آؤ۔ شاہ جی اس سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ جاؤ جلدی کرو، آج زبردست مقابلہ ہوگا۔“

پھر وہ میرا ہاتھ تھام کر لان کی طرف چل دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ رستم میرے تصور میں دندنا رہا تھا اور میری توجہ پر بن گئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کرنا شروع کر دیا اور آنے والے وقت کے تصور سے ہولے ہولے کانپنے لگا۔

☆.....☆.....☆

ذرا سی دیر میں لان میں میلے کا سامان پیدا ہو گیا۔ گامے شاہ میرا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ اس کی زبان میری قصیدہ خوانی میں مصروف تھی۔ لیکن وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا۔ مجھے بہر حال مرثیہ خوانی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے تو یلکھت وہ دن عید قربان کا دن معلوم ہونے لگا تھا۔ میری حالت قربانی کے بکرے کی سی تھی۔ جب کہ ابھی تک میں قصائی کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ ”میں تو آپ کو پہلی نظر میں پہچان گیا تھا، عالی مرتبت۔“ گامے شاہ نے کہا۔ ”آپ سے آنکھیں ملاتے ہی مجھے ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا، جیسے اندر کی ساری کثافت وھل گئی ہو۔“

میں نے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا کم بخت کیسی عقیدت افروز باتیں کر رہا تھا۔ حالاں کہ تیاری میرا جھٹکا کرنے کی کر رکھی تھی۔ اس کی نظروں میں مجھے واضح طور پر متنسخر نظر آیا۔ میں بری طرح جھلا گیا اور دل ہی دل میں سوچا کہ اگر مرنا ہی ہے تو کیوں نہ آن بان سے مرا جائے۔

اچانک گامے شاہ نے اپنے آدمیوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ ”ابے اوشمو، فضلو..... ابے رستم کہاں ہے؟ جلدی لاؤ اسے۔“

میں پھر بوکھلا گیا۔ جس شخص کا نام ہی اتنا زوردار تھا، وہ شخص بھلا خود کیسا ہوگا؟ میں نے سوچا اور دہل کر رہ گیا۔ پھر سوچا کہ شاید وہ شخص اسم نامسمی نہ ہو، میں نے حسینہ نام کی کریہہ انظر لڑکی اور شگفتہ نام کی چڑچڑی اور بد مزاج عورت بھی دیکھی تھی۔ یہ سوچنے کے بعد مجھے کچھ تقویت کا احساس ہوا۔

”آیا..... پیر بھائی۔“ سلطان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ لوگ اسے بھی باہر نکال لائے تھے۔

میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے تمام مصائب کا ذمہ دار وہی تھی۔ ”واہ پیر بھائی..... واہ..... کیا خوب نظر پائی ہے۔ واللہ آپ تو صرف ایک نگاہ ناز سے

آدمی کا دھڑن تختہ کر سکتے ہیں بلکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں آنکھ کا، کا جل چرا سکتے ہیں۔“ ”بکو اس مت کرو۔“ میں نے اسے ٹوک دیا ورنہ وہ اور بھی بہت کچھ کہنے والا تھا۔ ”سنا ہے..... آپ کا رستم سے مقابلہ ہونے والا ہے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں..... اور بھی تمہاری پول کھل جائے گی۔“ گامے شاہ نے جواب دیا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تو مجھے فراڈ سمجھتا رہا ہے۔

”ابھی دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا.....“ سلطان نے اکثر جواب دیا۔ ”چلو میاں.....“ گامے شاہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے میں بیزار تھی۔ ”یہ

قیص..... یہ بنیان اتار دو اور کشتی کے لیے میدان میں اترو۔“ کچھ دیر بعد میرے بدن پر صرف شلوار تھی۔ میں نے قیص اور بنیان اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

”واہ پیر بھائی واہ..... کیا باڈی ہے۔“ سلطان نے زوردار نعرہ لگایا۔ میں نے بے ساختہ سینہ بھٹا لیا۔ اسی وقت گامے شاہ کا زوردار قہقہہ سنائی دیا..... پھر اس کے گڑ گے بھی اس کا ساتھ دینے لگے وہ سب پیٹ پکڑے بری طرح ہنس رہے تھے۔ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے، یہ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں؟“ میں نے سلطان سے پوچھا۔

”عالی جناب کی باڈی دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔“ سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”پیر بھائی..... آپ کی باڈی ہے کہ زعفران کا کھیت..... اجازت ہو تو میں بھی خوش ہوں۔“

جی تو چاہا کہ اس بد بخت کو دو ہتھڑا رسید کر دوں لیکن موقع شناسی کا تقاضا تھا کہ فی الحال خون کے گھونٹ پی کر رہ جاؤں..... پھر میں نے اپنے پھولے ہوئے سینے پر نظر ڈالی۔

”واہ بھائی..... ویسے تو تمہاری پسلیاں ہی نظر آتی تھیں۔“ سلطان اب بھی سنجیدہ تھا۔ ”اب سینہ بھٹا یا ہے تو ایک ایک پسلی صاف نظر آ رہی ہے۔“

گامے شاہ اور اس کے گڑ گے ہنسی کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے۔ دفعتاً شور بلند ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے دیوتا کوچ کر گئے۔ مجھے کسی سے

پوچھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ رستم تھا اور رستم ہی نظر آتا تھا۔ چھٹ سے بھی نکلتا ہوا قد..... بے انتہا نومند۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ اس نے صرف ایک لنگوٹ کسا

ہوا تھا اور کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتا چلا آ رہا تھا۔ مجھے اپنی موت کا اتنا پختہ یقین پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے دل میں انا للہ کا ورد شروع کر دیا۔

”کیوں بھئی..... یہ تنے ہوئے تار کی طرح بجنا کیوں شروع کر دیا؟“ گامے شاہ نے مجھ پر چوٹ کی۔

اس کی بات سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں بری طرح کانپ رہا ہوں۔ مجھ پر لرزہ طاری ہے، لیکن اس پر قابو پانا میرے اختیار میں نہیں ہے۔
”پیر بھائی کو اس وقت شدید غصہ آ رہا ہے۔“ سلطان نے میری طرف سے جواب دیا۔
”غصے میں ان کا ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے۔“

”تب تو مزہ آ جائے گا۔“ گامے شاہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

رستم قریب آچکا تھا اور مجھے نظروں ہی نظروں میں تول رہا تھا۔ پھر اس کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ نظر آئی لیکن اب مجھے غصہ بھی نہیں آ سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے رستم ہونے کے ناتے اس طرح مسکرانے کا حق تھا۔

”بس۔ اب مقابلہ شروع کیا جائے۔“ گامے شاہ نے کہا اور رستم کی طرف متوجہ ہو گیا۔
’اگر تم نے شاہ صاحب کو شکست دے دی تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے آزاد کر دوں گا، ورنہ تمہیں میری غلامی قبول کرنا پڑے گی۔“

رستم نے اثبات میں سر ہلادیا اور مسکرانے لگا۔ وہ اسم بسمی تھا۔ خیالی رستم کی میں نے آج تک جتنی تصاویر بچوں کے ماہناموں میں دیکھی تھیں، وہ ان سے کہیں طاقتور تھا۔ میں کیا، اس کے پاؤں کی دھمک سے زمین کانپ رہی تھی، درود یوار کانپ رہے تھے۔ منظر اس وقت میرے سامنے کسی تھر تھراتی ہوئی فلم کی طرح چل رہا تھا۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے، کسی گیلیے کپڑے کی طرح نچوڑ سکتا تھا۔ میرا دل چھوٹنے لگا۔ تصور میں کفن، کافور اور لوبان جھلکنے لگا۔

اس مقابلہ آرائی کے لیے رستم نے ہنگامی طور پر، اپنے جسم پر سون کا تیل ملوایا تھا۔ ہنگامی طور پر میں نے یوں کہا ہے کہ اس کے جسم کے بہت سے علاقوں سے تیل ٹپک رہا تھا۔ یقیناً اب میں اسے گرفت میں نہیں لے سکتا تھا۔

وہ سب دائرے میں کھڑے تھے اور لون کا ایک وسیع حصہ میرے اور رستم کے مابین ہونے والی اٹھا خنج کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے سے قبل گامے شاہ نے مجھے بھی سروس کا تیل ملوانے کی پیش کش کی تھی، مگر میں نے اسے رد کر دیا۔

”جیسی آپ کی مرضی صوفی جی۔“ گامے شاہ نے مایوسی سے کہا۔ ”ویسے آپ تیل ملوایتے تو جوڑوں میں جان پڑ جاتی اور وجود مضبوط ہو جاتا۔“

”نہیں..... میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”صوفی جی اسے اتنے رگڑ دے دیجیے کہ اس کا دماغ درست ہو جائے۔“ گامے شاہ نے

میرا شانہ تھپ تھپا کر کہا۔

”شاہ جی، یہ مجھے کیا سیدھا کرے گا، میں اس کے سارے کس بل نکال دوں گا۔ رستم نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

”رستم کی آواز سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کا جسم پہاڑ کی طرح تھا مگر آواز؟ آواز کوئل کی کوک سے مشابہ تھی۔ اس کا ہیبت ناک جٹ دکھائے بغیر مجھے اس کی آواز سنائی جاتی تو میں یقیناً سو جان سے اس پر فریفتہ ہو جاتا۔

”چل آگے۔“ رستم اپنی نازک آواز میں کوکا۔ گویا وہ مجھے مصافحہ کرنے کی دعوت دے رہا تھا تاکہ مقابلے کا آغاز روایتی انداز میں کیا جاسکے، مگر میں جانتا تھا کہ اس سے مصافحہ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جب میں آگے نہ بڑھا تو اس نے اپنا سینہ پھیلا کر دونوں بازو بڑھائے جیسے پہلے ہی راؤنڈ کے آغاز میں مجھے یوں جکڑ لینا چاہتا ہو۔ جیسے مفت کی مرغیاں کھانے والے، محلے کی کسی مرغی کو آنکھ بچا کر دبوچ لیتے ہیں۔

میں اس سے ایک معقول فاصلے پر کھڑا کانپتا رہا۔ آگے بڑھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ گامے شاہ میری سماعت میں ستانکشی جملے انڈیل کر اور میری پیٹھ تھپک تھپک کر حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ مگر یہاں صرف حوصلے ہی کا تو فقدان تھا، حوصلہ ہوتا تو بڑھتا۔ رستم نے چند لمحوں تک انتظار کیا، پھر کسی مشتعل ساند کی طرح پھنکاریں مارتے ہوئے پیش قدمی کی۔ میرے قریب آ کر وہ عقاب کی طرح چھٹا، مگر میں جھکائی دے کر دوسری طرف چلا گیا۔ رستم ہوشیار ہو گیا۔ اب وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس طرح میری طرف آیا جیسے مجھے بچ نکلنے کا موقع نہ دینا چاہتا ہو۔ مقابلہ آرائی کے لیے جگہ یقیناً کشادہ تھی، مگر ہاتھ پھیلا کر اس میں سے چھٹ تو اس نے گھیر ہی لیے تھے۔ اب مجھے باقی ماندہ جگہ میں اچھل کود کر کے خود کو بچانا تھا۔ وہ کسی بگولے کی طرح میری طرف بڑھنے لگا۔

اس وقت اچانک مجھے نیم کا ایک چھتتا درخت نظر آیا۔ جس کی شاخیں کمپاؤنڈ وال سے باہر تک سایہ کیے ہوئی تھیں۔ اگر میں پھرتی سے اس پر چڑھ کر باہر کود جاتا تو وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ میرا قیاس تھا کہ گامے شاہ کے آدمی مسلح ہوں گے، مگر وہ اتنے احمق نہیں ہو سکتے تھے کہ دن دباڑے مجھ پر فائرنگ کر بیٹھیں۔

”اب تو مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتا۔“ رستم کوکا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ستون جیسی ران پر ہاتھ مارا۔

میرا خون تو پہلے ہی خشک ہو رہا تھا۔ وہ میری طرف لپکا تو میں دوسری طرف چلا گیا۔ یکبارگی میں بھاگتا ہوا بلکہ اڑتا ہوا اس کے قریب سے گزرا۔ اس نے اپنی ٹانگ بڑھا کر اڑنگا لگا دیا۔ میں کسی چھپکلی کی طرح پٹ سے گھاس پر گر گیا۔ آپ یقیناً منتظر ہوں گے کہ کیا ہوا؟

کیا آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے؟ اگر آپ کے جتنے ناتواں پر سڑک کوٹنے والا انجن گر پڑے تو کیا آپ سانس لے سکیں گے؟ بس یہی حال میرا بھی تھا۔ میں گوشت کے اس عظیم پہاڑ کے نیچے دبا ہوا تھا اور مجھ سے سانس نہیں لی جا رہی تھیں۔ ممکن تھا کہ سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ ہی منقطع ہو جاتا کہ معلوم نہیں کیسے میرا ایک ہاتھ رستم کی کمر کے بائیں پہلو میں جا لگا۔ حیرت انگیز طور پر رستم کا جسم تھر تھرا ہوا اور اس نے سریلے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ”ابے..... دیکھ..... دیکھ..... اس کی نہیں ہو رہی..... گد گدی نہ کر..... بی بی..... ایمان سے بہت..... ہو ہو ہو ہوتی ہے۔“

جب قدرت مجھے زندہ رکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیے مجھے موقع فراہم کر رہی تھی تو میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ باہر نکالا اور اس کے دائیں پہلو میں گد گدی کر دی۔ وہ متحرک پہاڑ ایک طرف ڈھلک گیا۔ میں رینگتا ہوا اس کے نیچے سے نکل آیا۔ اس کی ہابا ہو اب بھی جاری تھی۔

”فری اسٹائل دے تھ دیخا شیرے..... کچا کچھ تے ڈزا ڈز۔“ تماشا بیوں میں سے ایک نے پرجوش ہو کر ہاتھ بلایا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ گامے شاہ کا کہنا تھا کہ رستم کے ہاتھوں بانی لوگ پریشان ہیں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ میری حوصلہ افزائی کرتے اور کوئی ایسا گرتا تے کہ میں اسے چھٹی کا دودھ یا دودلا دیتا، لیکن وہ اسے اشتعال دلا رہے تھے۔

مجھ میں فوری طور پر کچھ کرنے کی ہمت تو نہیں تھی۔ کچھ کرنے سے مراد ہاتھ پاؤں ہلانا ہے۔ میں کسی قابل ہی نہیں رہ گیا تھا۔ جب وہ دیو پیکر گھاس سے اٹھنے لگا تو میں نے اس کے تلوؤں میں پھر گد گدی کر دی۔ اس بار تو وہ لوٹ لوٹ گیا۔ گھاس پر چت گر کر مچلنے لگا۔

”دیکھا.....“ انسپکٹر سلطان کی آواز گونجی۔ ”محض ایک انگلی سے اسے نچا رہا ہے۔“

میری جان میں کچھ جان آئی۔ عالم جوش میں اٹھ کر میں نے اس سے ٹکرا جانے کا ارادہ کر لیا۔ رستم اس وقت تک ہنسنے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس لیے جب میں اڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا آہنی مکافضا میں لہرایا۔ مکا میری تھوڑی پر لگا اور میں اسی طرح اڑتا ہوا دور جا کر۔ چند لمحوں کے لیے تو میری دنیا ہی اندھیری ہو گئی، کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں، کلیجہ منہ کی طرف سفر کرنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ ”بھد..... بھد..... بھد.....“ وہ اپنے بھاری قدموں سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے نہایت اطمینان سے میرے بال پکڑ کر مجھے اٹھایا۔ معلوم نہیں وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دفعتاً پھانک کی طرف سے پے در پے چھ فائر ہوئے۔ اس کے بعد ایک کتا بہت بھیا نک انداز میں

بھونکا، جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو! رستم نے گھبرا کر مجھے چھوڑ دیا اور اپنی مہین آواز میں چیختا ہوا ایک طرف بھاگا۔ پھر تو باقاعدہ بھگدڑی مچ گئی۔ میں نے گامے شاہ کو بلند آواز میں کچھ کہتے سنا۔

بروقت تمام آنکھیں کھولیں تو وہ سب کے سب گھبرائے ہوئے نظر آئے۔ انہیں سرا سیمہ دیکھ کر میں نے اپنی جان بچانے کی سوچی۔ گرد و پیش پر نگاہ دوڑائی تو وہی نیم کا درخت دکھائی دیا۔ جس کا تذکرہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ میں نے لپک کر پیڑوں کی گھڑی اٹھائی، درخت کی نچلی شاخ پر ہاتھ ڈال کر زور لگایا اور جسم کو اوپر اٹھالیا، اوپر پہنچا اور خود کو گھنی شاخوں میں چھپا کر اپنے کل پرزے ٹٹولنے لگا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے قدرے کھسک تو گئے ہیں، مگر تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوئی۔

سانس درست ہوئیں اور ساعت و بصارت نے کام کرنا شروع کیا تو ان لوگوں کے مکالمے سنائی دیے۔ دھائیں دھائیں کی آوازوں پر پہلے تو انہوں نے یہ قیاس آرائی کی کہ فائرنگ ہو رہی ہے اور یہ اس چاپانی گروہ کا کارنامہ ہے جو آئے دن غنڈہ ٹیکس وصول کرتا رہتا ہے۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے جو قدرے مضبوط دل والے تھے، وہ پھانک پر گئے تو انکشاف ہوا کہ ان کی قیاس آرائی غلط ہے۔ باہر کوئی بچہ تھا جس نے کتے کی دم پر پناخوں کی لڑی باندھ دی تھی۔ اس سے پہلے کہ ان لوگوں کو میری غیر موجودگی کا خیال آتا، مجھے وہاں سے غائب ہو جانا چاہیے تھا۔ میں آہستہ آہستہ اسی شاخ کے آخری حصے کی طرف رینگنے لگا جو دیوار سے باہر جھکی ہوئی تھی..... پھر میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور نیچے کود گیا۔

جس لمحے میں درخت سے گرا اسی لمحے سڑک پر ایک ٹرک گزر رہا تھا جس پر دوسرے سامان کے علاوہ فوم کے گدے بھی لدے ہوئے تھے۔ میں اسی پر گر کر یکبارگی زور سے اچھلا پھر واپس اسی پر گر پڑا۔ ٹرک کی رفتار تیز نہیں تھی ورنہ کچھ پیچھے گرتا تو ہڈیاں چرمر کر رہ جاتیں۔ گرتے ہی میں نے دم سادھ لیا۔

عقب میں اس بنگلے سے نئی آدمی شور مچاتے ہوئے نکلے اور بڑی شد و مد سے مجھے تلاش کرنے لگے مگر میں سڑک پر گرا ہوتا تو ان کے ہاتھ آتا۔ میں تو اس وقت ٹرک میں اطمینان سے لیٹا کسی نامعلوم منزل کی طرف سفر کر رہا تھا اور وہ مجھے اب نہیں پاسکتے تھے۔

جب حواس قدرے بحال ہوئے تو میں نے ٹرک میں لدی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا۔ ایک ڈبل بیڈ، ڈرینگ ٹیبل، ڈائننگ ٹیبل اور ایک صوفہ سیٹ تھا۔ تمام چیزیں نئی تھیں، پھر کچھ ایسا سامان بھی تھا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کسی کے سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں اور یہ سامان اسے نئی زندگی شروع کرنے کے لیے دیا جا رہا ہے۔

میں نے اپنے کپڑوں کی گھڑی کھولی اور بنیان پہن کر اوپر سے قمیص بھی پہن لی۔
جب میں اس جگہ سے کافی دور نکل آیا تو جی چاہا کہ ڈرائیو کو متوجہ کر کے ٹرک رکواؤں اور
پھر مختصر اسے اپنی دردناک کہانی سنا کر معذرت کر لوں، مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی
جب میں نے ٹرک کو اس علاقے کی طرف رواں دواں دیکھا جہاں میں رہتا تھا۔ پھر اس وقت
میری حیرت دو چند ہو گئی جب میں نے ٹرک اپنے محلے کی گلی میں مڑتے دیکھا۔ میں سر اٹھا کر
ہونقوں کی طرح محلے والوں کو دیکھ رہا تھا کہ ٹرک جا کر مشکور صاحب کے دروازے پر رک گیا۔
وہی مشکور صاحب، جن کی دختر بد اختر بانو کے سلسلے میں، میں کافی بدنام ہوا تھا۔ ڈرائیور نے
اتر کر دروازے پر دستک دی۔ مشکور صاحب فوراً باہر نکل آئے ٹرک والے نے اپنی جیب سے
ایک رسید نکال کر انہیں تھمائی اور گونج درا آواز میں بولا۔ ”اپنا سامان اتر واؤ
صاحب..... امارے کو جلدی ہے۔“

میں افراتفری کے عالم میں ٹرک سے اترتا تو مشکور صاحب سامان اتروانے کے لیے
ٹرک کے عقبی حصے کی طرف آچکے تھے۔ انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر ٹرک کے
سامان کی طرف اور اس کے بعد حیرت سے بولے۔ ”آپ بھی اس سامان کے ساتھ شامل
ہیں؟“

”مم..... میں..... وہ.....“ بولنے کی کوشش میں، میں ہکلا کر رہ گیا۔

”مگر اس کے لیے آپ کو باقاعدہ لنگوٹ باندھنا چاہیے۔ ایسے موقعوں پر کپڑے پھرتی
میں حارج ہوتے ہیں اور داؤ پیچ لگانے میں وقت ہوتی ہے۔ جمعے کی شام کو آپ نیلی ویشن پر
ریسلنگ کا پروگرام تو دیکھتے ہی ہوں گے۔ بس، کچھ ایسا ہی رنگ و روپ اختیار کرنے کی
ضرورت ہے آپ کی حالت.....“

”کک..... کیلے کا چھلکا پاؤں تلے آ گیا تھا۔“ میں نے بوکھلا کر وضاحت پیش کرنا
چاہی۔

”اچھا..... اچھا.....“ انہوں نے ہمدردی سے سر ہلایا۔ ”تو وہ ٹرک والا بکواس کر رہا
ہوگا۔ کہنے لگا، شہباز قلندر روڈ پر جو اکھاڑہ ہے، وہاں ٹرک کی رفتار کم ہوئی تو آپ درخت سے
گود کر ٹرک میں آ گئے..... خیر چھوڑیے اس موضوع کو، چائے پیجئے۔“ انہوں نے ملازم کی آمد
پر کہا جو چائے کے ساتھ لوازمات بھی لے آتا تھا۔

رستم سے زور آزمائی اور اپنی ٹھکانی کے بعد بھوک کھل گئی تھی۔ میں نے بسم اللہ کہہ کر کریم
رول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ابھی اسے اٹھا کر ہونٹوں ہی سے لگایا تھا کہ انہوں نے سرگوشی کے
لہجے میں پوچھا۔ ”یہ بتائیے، بانو بیٹا، آپ کو کیسی لگتی ہیں؟“

”غاں.....“ حیرت کی زیادتی ہے، آواز بمشکل میرے حلق سے ہو کر، کریم سمیت،
رول سے نکلی اور اڑتی ہوئی مشکور صاحب کے چہرے پر پڑی۔ وہ اچھل کر صوفے کی پشت
سے جا لگے۔ میں نے سانس روک لی۔ لیکن یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ انہوں نے اس بے
ہودگی کا برا نہیں مانا تھا۔ انہوں نے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا اور میری طرف متفہم انداز
سے دیکھنے لگے۔ میرے جسم میں ہلکی سی سنسنی دوڑ گئی۔ ضرور کوئی خاص معاملہ تھا ورنہ وہ اتنی
جلدی اپنا ٹریک نہ تبدیل کرتے اور رموز پہلوانی سے اچانک بانو بیٹا پر نہ آ جاتے۔
”ہاں، اچھی ہوگی..... میرا مطلب ہے، اچھی خاصی ہے، مگر.....“ میں نے جملہ ادھر
پھوڑ دیا۔

”مگر.....؟“ انہوں نے وضاحت چاہی۔

”اس نے جمیل کے ساتھ بھاگ کر اور مجھے اس معاملے میں ملوث کر کے اچھا نہیں کیا۔“
”جو ہو گیا، اس پر خاک ڈالیے۔“ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”اس وقت تو میری
زت آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

”میرے ہاتھ میں..... آپ کی عزت؟ میرے ہاتھ میں تو کریم رول..... میرا مطلب
ہے، صرف رول ہے۔“

”خاصی شگفتہ طبیعت پائی ہے، آپ نے۔“ وہ غار ہو جانے والے لہجے میں بولے۔
میں نے سوچا ہے کہ بانو، آپ کے ساتھ خوش رہے گی۔“

”حق..... فیوں؟ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا؟“ میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

”اس لیے کہ اس بد بخت نے انکار کر دیا ہے۔“

”کس نے؟ کس چیز سے؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”جمیل اصغر نے، شادی سے۔“ انہوں نے پہلیاں بھجوانے کے بعد وضاحت کی۔
میں نے سوچا تھا کہ پگڑی تو اچھل ہی گئی ہے، واویلا مچانے سے کیا فائدہ؟ چلو، اس خاک کو
ماکر سر میں ہی ڈال لوں مگر.....“ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور سر جھٹک لیا۔

اس ڈرامائی منظر میں انہوں نے ٹریچڈی کی مکسنگ شروع کر دی تو میرے جسم کی
سناہٹ بڑھی اور ہاتھ میں خفیف سارے پید ا ہوا۔ اس کا احساس یوں ہوا کہ پیالی نے پریج
ماجلترنگ سا بجا یا تھا۔

ان کی ”مگر“ مجھے اس وقت کسی مگر مجھ سے کم نہیں معلوم ہوئی تھی۔ ایسا مگر مجھ جو منہ
ڑسے میری طرف بڑھ رہا تھا اور مجھے نگلنے کے لیے بے تاب تھا۔

جب انہوں نے محسوس کیا کہ اپنی المناک داستان کی سوئی انہوں نے دانستہ جہاں انکائی

تھی، وہ بدستور وہیں انکی ہوئی ہے اور میں اسے آگے بڑھانے کے موڈ میں نہیں ہوں تو انہوں نے ایک اور گہری سانس لی اور پھر سوسوں کر کے بولے۔ ”میں نے جمیل سے کہلوایا تھا کہ وہ باعزت طریقے پر چار آدمیوں کو ساتھ لے آئے تو میں بانو کو اس کے ساتھ رخصت کر دوں گا۔ اس نے ہامی بھی بھری تھی۔ میں نے بانو کو دینے کے لیے جہیز کا آرڈر بھی دے دیا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ دوروز سے غائب ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ.....“

”مم..... میں..... مگر پہلے میں حج کرنے جاؤں گا۔“

”نکاح، حج اصغر سے تم نہیں ہوتا۔“ انہوں نے دلیل دی۔ ”ویسے آپ بانو کو اپنے ساتھ حج کرانے لے جائیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جی ہاں، یہ سعادت خوش نصیبوں ہی کو عطا ہوتی ہے۔“

کریم رول بلکہ صرف رول نوٹس کھا نہیں سکا، البتہ چائے کے لمبے لمبے گھونٹ لے کر میں نے خالی پیالی ٹرے میں کھ دی۔

اس کے بعد میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دور انمیں وہ کیا کچھ کہتے رہے، مجھے خبر نہیں۔ البتہ اختتامی پیرا گراف کچھ یوں تھا۔ ”میں اسی اذھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ کیا کیا جائے کیونکہ دعوت نامے بھی تقسیم کئے جا چکے ہیں۔ ممکن تھا کہ میں گھبرا کر خودکشی کر لیتا لیکن خدا بہت مسبب الاسباب ہے۔ اسے جہیز کے ساتھ ابو میاں..... میرا مطلب ہے، نوشہ میاں کا بھی انتظام کر دیا۔“

میں دروازے کی طرف چلنے لگا تو انہوں نے کہا۔ ”بس، یہ بتا دیجئے کہ پرسوں برأت لے کر کس وقت آئیے گا؟ ہاں، ایک بات کا خیال رہے کہ زیادہ آدمی نہ ہوں۔ بس آپ کی بھی عزت رہ جائے اور ہماری بھی۔“

”مگر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں شادی پر تیار ہو گیا ہوں۔“ میں نے رو ہانسا ہو کر کہا۔

”تھوڑی دیر پہلے آپ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔“ انہوں نے دلیل دی۔ ”میں ایسے نو جوانوں کی قدر کرتا ہوں جو اس حد تک صاف گو ہوتے ہیں کہ.....“

”میں بانو سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ میں نے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا۔

”تو پھر اپنی اور میری عزت کا خیال کیجیے اور.....“

”اور.....؟“

”کہیں سے جمیل کو ڈھونڈ لایے تاکہ میں بانو کے ہاتھ پیلے کر سکوں۔“ انہوں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس دل شکستہ کے ہاتھ تھام لیے اور کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں..... کوشش کروں گا کہ جمیل کو واپس لاسکوں۔“

”نجیب الطرفین لوگوں کی پیشانی پر کچھ تحریر نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیتے.....“

”بس، کانٹوں پر نہ گھسیٹے۔“ میں نے شرما کر کہا۔ ”خود کو نجیب کہلانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر وہ طرفین کے لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“

”آپ..... آپ غلط سمجھے۔ میرا اشارہ اس نجیب کی طرف نہیں..... میں تو یہ کہنا چاہتا.....“ وہ ہکلائے مگر میں الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

بارہ بجے کا عمل تھا، گلی اس وقت سنسان تھی اور آوارہ کتے سایوں میں آرام کر رہے تھے اور بھینسیں، جو ہڑپر غسل مویشیانہ سے لطف اندوز ہونے جا رہی تھیں۔ ایک کوا اوپر سے پتیل کی شاخ پر بیٹھا کامیں کائیں کر رہا تھا۔

گھر میں داخل ہونے کے بعد، میں بستر پر گر پڑا۔ قدرے سکون محسوس ہوا تو میں نے اپنی چوٹوں کا شمار کیا۔ اندرونی طور پر تو پوری ہستی ہی فریاد کر رہی تھی۔ تاہم بیرونی طور پر، چہرے کے نقش و نگار میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ میں اس وقت ابو العمران کی بجائے، اس کا تجربی ڈیزائن بن کر رہ گیا تھا۔ فائن آرٹ کے کسی دلدادہ کی نگاہ پڑ جاتی تو وہ مجھے فریم کر داکے دیوار پر لٹکا دیتا۔

میرے ایک دوست عرفی چاہتا تھا کہ اپنا ایک فوٹو کھنچوا

سرورق پر شائع کریں اور اسے ناگفتہ بہ حالانہ

اور لگائی بھی جائے۔ باور پی گیا۔ پھر اسی کو جسم کے

اس کے بعد میں دروازہ پیٹ رہا تھا۔

وقت کسی کو منہ دکھانے میر

مجھے دیکھ کر حیران ہوئی۔ ”صوفی جی! آپ..... آپ کون ہیں؟ وہ..... ابو..... بل..... العمران کہاں ہے؟“

میرے جسم پر گہرے کپڑے تو نہیں تھے۔ البتہ جسم گیر واد ہوا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کوئی صوفی سنت سمجھ رہی تھی۔

وہ ایک بڑی سی چادر میں ملفوف تھی اور اسکی بغل میں ایک چھوٹی سی گھڑی دبی تھی۔ معلوم نہیں، وہ کس کام سے نکلی تھی۔

”مجھ سے تمہیں کیا کام آ پڑا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہائے اللہ! تو یہ تم ہو؟“ وہ جیسے اچھل پڑی۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

اس سے پہلے کہ میں بھی یہی جملہ کہتا، اس نے گلی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور جھپاک سے اندر آ گئی۔ گلی کسی مفلس کی جیب کی طرح خالی اور سنسان تھی۔ وہ آنسو یا ہمتاب، میرے گھر میں آچکا تھا۔

اندر آ کر، اس نے دروازہ بند کر دیا اور نہایت بے تکلفی سے بیڈ پر بیٹھ کر بولی۔ ”آؤ چلیں..... اس سے اچھا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”اچھا موقع.....“ میں نے ہونفوں کی طرح دہرایا۔ وہ لڑکی میرے معیار حسن پر تو کیا کسی بھی معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ لمبی تاڑی، اسے دیکھ کر، ایک تاریکی سا رنگی کا تصور ابھرتا تھا..... رنگ آنسو..... ایسی آنسو جس پر پالش لگا کر چمکایا گیا ہو..... اور نقوش کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ نقوش کا تعین کرنا دشوار تھا۔ ناک کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوئی، ٹھوڑی کس جگہ تھی اور دانت کہاں، کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ سب سے نمایاں اس کے کان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی دھوبی نے انہیں اچھی طرح دھونے کے بعد کلف دیا ہو، اس کے بعد استری پھیر کر ہموار کیا ہو۔ ان پر پتکے نما کانوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی چمکا ڈر پھڑ پھڑا رہی ہو۔

اس کی موجودگی میرے اضطراب میں اضافہ کر رہی تھی..... جی چاہتا تھا کہ گھر، اس پر چھوڑ کر بھاگ نکلوں۔“ کس بات کے لیے اچھا موقع ہے؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ابا کام پر گئے ہوئے ہیں اور اماں سو رہی ہیں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی آواز میں ایک ایسا سا خوف تھا۔

”تو پھر تو کیوں لگا لگا رہی ہو؟ تم بھی جا کر سو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میں تو تمہارے ساتھ جانے کے لیے آئی ہوں۔“

”کک..... کہاں؟“ میں ہکلا کر رہ گیا۔

”بانو کی طرح میں بھی.....“ اس نے گردن ہلا کر کہا۔ ”میں اپنے کپڑے لے آئی۔ زبور، اماں نے سیف میں رکھا ہوا ہے اور اسکی چابی نہیں مل رہی ہے۔“

”ہائیں.....“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”تنت..... تو تم فرار ہونے کے ارادے سے آئی۔ لیکن میں مضروف نہیں ہونا چاہتا۔“ اس کا سنگین خیال جان کر میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

”ابھی نہیں تو پھر کب؟“ اس نے مایوسی سے پوچھا۔ ”دیکھو، میں کہتی ہوں کہ اس سے باموقع.....“

”کیسا موقع؟“ میں نے آنکھیں نکالیں۔ ”کیا بک رہی ہو؟“

”وہ میٹرک کے امتحان ہونے والے ہیں نا؟“

”تو پھر.....؟ کیا امتحان تم کہیں اور سے دینا چاہتی ہو؟“ مگر اس کے لیے فرار ہونے کی اضرورت ہے۔ میں تمہیں ویسے ہی ٹنڈ والہ یا رہنچا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں؟“ وہ ٹھکنی۔ ”میں امتحان میں نہیں بیٹھنا چاہتی۔“

”کیوں.....؟“ میں چونکا۔

”الجبرا مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔“

معاملہ پھر الجھنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ زیتون مجھ سے کیا چاہتی ہے۔

”تو کیا میں تمہیں الجبرا پڑھاؤں؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اسی الجبرے کی وجہ سے تو میں بھی کئی بار قیل ہوتے ہوتے بچا ہوں۔ میرے خیال میں وہ کورس میں رکھا اسی لیے جاتا ہے طالب علموں کو قیل کیا جاسکے۔“

”میں ”لا“ اور ”ما“ کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتی..... اور تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے آنکھوں کو نشیلا بناتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”گویا امتحان میں بیٹھنا تو درکنار، تم گھر میں بھی نہیں بیٹھنا چاہتیں؟“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”الجبرے کے خوف سے گھر سے فرار ہو کر، ایک نیا گھر بسانا چاہتی ہو؟“

”ہاں.....“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”مگر اس سلسلے میں میرا امتحان کیوں لے رہی ہو؟“ میرا الجبرا اور جیومیٹری تو پہلے ہی ”ورے“

”تو پھر کس کا امتحان لوں؟“ اس نے بھنویں چڑھا کر پوچھا۔ ”عبدالودود تو شادی شدہ پنچہنوں کا باپ ہے۔“

”عبدالودود.....“ میں نے چونک کر کہا۔ ”وہ اس قصے میں کہاں سے آچکا؟“
 ”پرسوں جب میں اسکول جا رہی تھی تو اس نے بس اسٹاپ پر، الاچکی والے پان کے
 ساتھ ایک خط دیا تھا۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”مجھے اپنے پیروں تلے سے زمین ہلکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں تو اصلاح معاشرہ کے
 چکر میں لگا ہوا تھا اور عبدالودود جیسے راسپیوٹین، دنیا کو چپٹا کرنے کی فکر میں تھے شاید بانو کی
 طرف سے مایوس ہونے کے بعد، اسے زیتون پر جال پھینکا تھا۔“

”کیا لکھا ہے، اس چگا ڈر کے بچے نے؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔
 ”یہی کہ میں کب تک چلمن سے لگی بیٹھی رہوں گی۔ مجھ میں ہمت ہے تو میں زمانے سے
 بغاوت کر لوں۔ ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لوں، وغیرہ.....“
 ”اسے یہ سب کچھ لکھتے ہوئے شرم نہیں آئی۔“ میں نے پھنکار تے ہوئے کہا۔ ”محلے کی
 بیٹیوں پر.....“

”ایسی نگاہ ڈالتا ہے اور انہیں بیوی بنانا چاہتا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو، نا؟“
 ”ہاں.....“ میں نے شدت سے سر ہلایا۔

”جب تم جیسے لوگ، رسہ تراتے رہیں گے تو یہی ہوگا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”وی۔
 سی۔ آر، ٹیلی ویژن، سری دیوی کی فلمیں اور شرح دہلی تم بند نہیں کر سکتے، عبدالودود جیسے لوگوں پر
 قابو نہیں پاتے اور موقع پر پیچھے ہٹ جاتے ہو۔“

”عبدالودود.....“ میں نے پھنکار کر کہا۔ ”اس سے تو میں اچھی طرح سے منٹ لوں گا۔“
 ”اس نے لکھا ہے کہ الگ گھر لے کر دے گا مگر میں خود نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ.....“
 ”پان بہت کھاتا ہے۔ مجھے جگالی کرنے والے مرد بالکل پسند نہیں ہیں۔“

”خیر..... خیر..... یہ تو اچھی بات ہے۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”مگر میں فرار
 ہونے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ ویسے بھی تمہیں الجبرا کے ڈر سے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں
 شام کو قاضی صاحب سے بات کروں گا۔“

”تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔“ اس نے الجھن سے کہا۔ ”کبھی کہتے ہو، فرار نہیں
 ہونا چاہتا اور کبھی کہتے ہو، قاضی صاحب سے بات کروں گا۔“
 ”قاضی سے مراد نکاح پڑھانے والے قاضی نہیں، تمہارے والد صاحب رعایت اللہ
 سے ہے۔“

”ان سے کیا کہو گے؟“ اس نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔
 ”یہی کہ تمہارے لیے کسی ٹیوٹر کا بندوبست کریں یا پھر امتحان میں نہ بٹھائیں کیونکہ تمہارا

الجبرا بہت کمزور ہے“

”تو پھر میں جاؤں؟“ اس نے مایوسی سے پوچھا۔

”ہاں، فرار ہونے کے لیے وقت سازگار نہیں ہے۔ سیاسی حالات بہت خراب ہو رہے
 ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھپ تھپ کر کہا۔

وہ جیسے آئی تھی، ویسے ہی چلی گئی۔ شکر ہے کہ گلی اس وقت بھی سنسان تھی اور اس کی اماں
 بدستور سو رہی تھی۔ میں نے حسرت سے سوچا کہ کاش لڑکیوں کی مائیں اتنی گہری نیند نہ سویا
 کریں اور اگر سوئیں تو ایک آنکھ کھلی رکھا کریں۔

اس کے رخصت ہوتے ہی میں بستر میں پھلانگ لگا دی۔ اعصاب کو قدرے سکون
 نصیب ہوا تو نیند کی دیوی نے حملہ کر دیا۔ میرے پیوٹے بھاری ہوتے چلے گئے۔

غنودگی کے عالم میں مجھے ریشماں دکھائی دی۔ جگا کی بہن ریشماں..... پھر یادوں کے
 کنون کھلتے چلے گئے اور میں جیسے کسی جہان ہفت رنگ میں پہنچ گیا۔ ہر چیز غیر واضح تھی،
 دھواں..... دھواں سی۔ طلسم کے پردے میں لپٹی ہوئی وہ پھولوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی
 بھاگ رہی تھی اور میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ راہ میں رنگ برنگی تتلیاں، جلت رنگ، آبشار اور
 نظارہ ہائے دلفریب تھے۔

..... پھر جگا اور اس کے اکھاڑے کے پہلوانوں کی آمد پر سب کچھ درہم برہم ہو گیا۔
 چارپائیاں الٹنے، تختے ٹوٹنے اور منکے پھوٹنے لگے..... ایک پہلوان مجھے پٹخنیاں دینے لگا۔
 ریشماں فیز آؤٹ ہو گئی اور اس کی جگہ بانو نے لے لی۔ مجھے معلوم تھا کہ ریشماں کو حاصل
 کرنے کے لیے مجھے آٹھ دس ورزشی جسموں کو زیر کرنا پڑے گا..... تو پھر بانو..... اس کا تو باپ
 بھی تیار ہے۔ یعنی ظالم سماج مٹھی میں بس، سہرا باندھنے کی دیر تھی..... نہیں، ریشماں..... نہیں،
 بانو..... پھر بانو، ریشماں کو اور ریشماں، بانو کو تفریق کرتی رہی اور میں گہری نیند میں ڈوبتا چلا
 گیا۔

شام کو کسی کے دروازہ پینے پر آنکھ کھلی، میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اپنے سامنے یاسین
 کو کھڑے پایا۔ اسے دیکھ کر یاد آیا کہ میں ایک ہفتے سے آفس نہیں گیا ہوں۔

”کیوں، پیارے! یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے کمرے میں داخل ہو کر بے تکلفی سے
 میرے شانے پر ہاتھ مارا۔

اس کی بے تکلفی مجھے ہنگامی پڑی۔ میں سر تا پا ہل کر رہ گیا۔ اس کا ہاتھ ٹھیک اس جگہ پڑا تھا
 جہاں صبح کے وقت رستم نے مشق ستم فرمائی تھی۔

”یار! دور رہ کر بات کیا کرو۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”ہاتھ پیر کا مذاق مجھے پسند نہیں۔“

”وہ تو مجھے بھی پسند نہیں ہے۔“ اس نے پھر میری کمر سہلائی۔ ”مگر تمہیں دیکھ کر ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔“

میں نے اسے صوفے پر دھکیل کر قیص پہنی اور منہ پر چھپا کے مار کر غنودگی کو بھگایا پھر اس کے سامنے آ بیٹھا۔

”تو تم شوکا ز نوٹس ملنے کے بعد سے اب تک آفس کیوں نہیں آئے، ابوالبول؟“ اس نے استفسار کیا۔

”بس، مقدر کا کھیل..... زمانے کی گردش۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ حقیقت کا اظہار، میں اس کے سامنے کر نہیں سکتا تھا کہ میں دوائے غیاب کے چکر میں پڑ کر گھن چکر بن چکا ہوں۔

”یار! میں تم میں کئی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے متاثر ہونے والے انداز میں کہا۔ ”پہلے تم پر دیانت و صداقت کا حملہ ہوا پھر درویشوں کی کاسہ لیس اور اس کے بعد قوالی۔“

”قوالی..... کیا مطلب؟“ میں چونکا۔

”میری بینائی میں اتنا فرق نہیں ہے کہ میں تمہیں پہچان بھی نہ سکوں۔ گزشتہ رات تین تین گاؤں کیوں سے ٹیک لگائے قوالی کون کر رہا تھا؟“

میری تو سٹی گم ہو گئی۔ اس ظالم نے اگر مجھے اس قلندر ازمال میں دیکھ لیا تھا تو پھر میری خیر نہیں تھی۔ اسے کوئی بات معلوم ہونا، روزنامہ ایلیس میں شائع ہونے کے مترادف تھا۔ اگر اس نے آفس میں سب کو سنا نہیں دیا ہوگا تو اگلے روز سنا دے گا..... پھر بات شہر میں پھیل جائے گی۔ اس سلسلے میں اس کی خوشامد کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ وہ مزید پھیل جاتا۔

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر۔

”کیسی قوالی؟ کیا بک ہے ہو؟“ میں نے تھوڑی سی مزاحمت اختیار کی۔

”تم شاید بھول گئے کہ شامیانہ میرے گھر کے سامنے ہی لگا تھا۔ مجھے بھی قوالی سے ہلکا سا شغف ہے، اس لیے میں بھی پہنچ گیا..... مگر تمہارے برابر میں سلطان احمد کو بیٹھے دیکھ کر جان جل گئی۔“

”تم معلوم نہیں کیا بکواس کیے جا رہے ہو۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”زیادہ بک بک کی تو اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“

”تم میری آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہو۔ مگر سپرنٹنڈنٹ اشتیاق صاحب سے کیا کہو گے؟ دیانت داری کا ڈھول پیٹ کر تو تم نے انہیں شوکا ز نوٹس دلوا دیا اور پھر ایک بدنام پولیس افسر سے محبت کی پیٹنگیں بڑھانے لگے۔ سچ کہو! تم اس کے شانے سے سر نکالنے نہیں جھوم

رہے تھے؟“

”مم..... مگر..... سپر صاحب کو کیسے پتہ چل گیا؟“ میں نے بدحواس ہو کر پوچھا پھر چا پلو سانہ انداز میں اس کا شانہ دبانے لگا۔ ”یار! یہ کیا گڑبگ ہو گئی؟“

”میں، ان کے ایک ذاتی کام سے آفس میں ٹھہر گیا تھا۔ رات ہو گئی تو وہ مجھے اپنی کار میں گھر چھوڑنے آئے تھے۔ قوالی جیسی لغویت سے انہیں دلچسپی نہیں ہے۔ وہ سلطان احمد کو دیکھ کر ٹھٹکے، کیونکہ اس نے انہیں ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر کافی پریشان کیا تھا..... پھر تمہیں اس کے برابر بیٹھا دیکھ کر، ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بے قابو سے ہو گئے۔ کیونکہ دور و ز پہلے، دیر سے آنے پر تم نے انہیں، اے۔ سی صاحب کے سامنے ذلیل کرایا تھا۔“

اس نے وضاحت کی۔ ”اب بولو، کیا کہتے ہو، ابوالبول؟“

”ایک اور شوکا ز نوٹس۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اور سناؤ خرچ پانی کیسے چل رہا ہے؟“ اس نے نہایت بے تکلفی سے میرے سگریٹ کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔ ”اس مہینے کی تنخواہ تو تم نے ابھی لی نہیں ہے!“

”بس اوپر والا پورا کرتا ہے؟“

”اوہ یعنی کی درویشی والا سائڈ بزنس چل پڑا۔“ اس نے بائیں آنکھ دبا کر سرگوشی میں کہا۔ ”سنا ہے، اس میں لڑکیاں وغیرہ بھی بہت ملتی ہیں۔ سچ بتایا، صوفی بننے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟“

”سب سے پہلے کسی رستم سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔“ میں نے اپنے جسم کے متاثرہ علاقوں پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد نیم کے درخت سے چھلانگ لگانا پڑتی ہے۔“

”معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے منہ بنایا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ آمدنی اچھی ہوتی ہو تو میں ایک جوڑا گیر وارنگ کرالوں۔“

”بک بک نہ کرو اور کسی اچھے سے ہوٹل میں چل کر چائے پلاؤ۔“ میں نے اس کی کمر پر دھول رسید کرتے ہوئے کہا۔

”چلو۔“ وہ کھٹکھٹا ہوا بولا۔ ”میں جانتا ہوں تمہاری مالی حالت کمزور ہو گئی۔ آٹے دال کے کنسٹر خالی ہو چکے ہوں گے اور اب اس میں چوہے پرورش پارہے ہوں گے۔“

وہ ایسی ہی ٹکٹلی کیٹلی باتیں کرتا ہوا مجھے رحیم کے ہوٹل تک لے گیا جہاں ہم نے ملائی والی چائے پی۔ وہاں سے پاسین تو اپنے گھر چلا گیا اور میں اپنے گھر کی طرف واپس آنے لگا۔

اچانک راستے میں ڈاکٹر بل از مسیح مل گیا۔

نام تو اس کا کچھ اور تھا مگر اس کے قدیم اور متروک طریقہ علاج کی بنا پر میں اسے قبل از مسیح کہتا تھا۔ ڈاکٹر مجھے چھ مہینے بعد دکھائی دیا تھا اس لیے میں نے اس سے استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ لاہور گیا ہوا تھا۔

ڈاکٹر کے ساتھ ایک دہلا پتلا اور مدقوق سا شخص بھی تھا۔ جس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور چہرہ چپک زدہ تھا۔ جسم پر لباس بھی بیکہ فضول سا تھا۔ اس کا وجود اور عدم وجود تقریباً برابر ہی تھا، اس لیے میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ ہی سلام کا جواب دیا۔

”یہ مرزا دہشت بیگ ہے۔“ ڈاکٹر قبل از مسیح نے اس شخص سے میرا تعاقب کرایا۔

”مرزا دہشت بیگ۔“ میں چونکا۔ ”وہ..... وہ..... کہیں تو نہیں؟“

”ہاں، مشہور جاسوسی ناول نگار۔ تم نے اس کے کئی سنسنی خیز، شہکار فن پارے پڑھے ہوں گے۔“

مرزا دہشت بیگ کا نام سن کر مجھ پر اتنا رعب طاری ہوا کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ اس کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ اس نے لگ بھگ پونے دو سو ناول لکھے۔ انتہائی سنسنی خیز اور ہیجان انگیز، میں نہ صرف یہ کہ ان تمام ناولوں کا مطالعہ کر چکا تھا بلکہ وہ میری ذاتی لائبریری میں بھی محفوظ تھے۔ بلکستی چھچھو ندر، افسردہ مگر مجھ، نقاب پوش حسینہ، خونی کٹار اور گرگٹ کی واپسی کا ایک ایک حرف تو مجھے آج تک یاد تھا۔ ناول خونی کٹار میں اس کی جو تصویر شائع ہوئی تھی، آج بھی فریم شدہ حالت میں، میری میز پر بچی ہوئی تھی۔

”دہشت بیگ تم؟“ میں نے اس سے گرجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم تو لاہور میں ہوتے تھے۔“

”ہاں۔ لیکن میں پبلشروں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر کراچی گیا ہوں۔“ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”کک..... کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم تو کسی زمانے میں اردو کے آرتھر کانن ڈائل کہلاتے تھے؟“

”ہاں، کسی زمانے میں لوگوں نے مجھے یہی لقب دے رکھا تھا۔ ادیب شہیر کہا جاتا تھا، لیکن آپ کو معلوم ہے آج کل میں کیا کرتا ہوں۔ چار سو بیس ہوٹل میں ہیڈ کیشیئر ہوں اور ساڑھے سات سو روپے پاتا ہوں۔“

بعض اوقات انسان اتنا تلخ ہو جاتا ہے کہ دل کی بات زبان پر لے آتا ہے..... ایسی باتیں جو بے حد ذاتی ہوتی ہیں اور کسی اجنبی کے سامنے نہیں کہنا چاہئیں۔

دہشت بیگ صاف گو تھا اس لیے اپنی مفلسی کا کھلے دل سے اعتراف کر رہا تھا۔ اس کا

یہ اعتراف سن کر میں تھوڑی دیر کے لیے بدحواس ہو گیا۔

”مگر تمہاری کتابیں تو بہت فروخت ہوتی تھیں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”اسکول کے دنوں میں میرا خیال تھا کہ تم بہت دولت مند ہوتے ہو گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ تمہاری کتابیں نہ فروخت ہوتی ہوں..... یعنی کہ ایک تو کتابیں اتنی سنسنی خیز..... دوسرے مصنف اتنا ہر دل عزیز..... پھر جلد مضبوط۔“

دہشت بیگ نے میرے جملے کا غلط مطلب اخذ کیا..... وہ بولا۔ ”نہیں، میری جلد تو مضبوط نہیں، دیکھئے چمڑا ڈھیلا پڑ چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ مجھے دانا منر کی ضرورت ہے۔ اے سے زید تک تمام دانا منر۔“

”میرا مطلب کتابوں کی جلد سے تھا۔“ میں نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔

میری جیب نوٹوں سے عاری تھی اس لیے میں اسے چائے پلانے کی پیش کش بھی نہیں کر سکا۔ البتہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ ڈاکٹر قبل از مسیح جلدی میں تھا اور اسے اپنے ایک مریض کا معائنہ کرنا تھا، اس لیے وہ آئندہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

دہشت بیگ کے جتنے میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں بے حد چمکیلی اور مضطرب تھیں، اپنے گڑھوں میں بے چینی سے گردش کرتی ہوئی وہ آکر میرے کمرے میں بیٹھ گیا مگر اس کی نگاہ سڑک پار اس پردے سے الجھتی رہی جس کے پیچھے سے زیتون کا سراپا چھلکتا رہتا تھا۔

میرے دل میں اب بھی اس کے لیے بے پایاں عقیدت و محبت تھی، اس لیے میں نے خونی کٹار کے پہلے ایڈیشن پر اس کے آٹو گراف بھی لیے۔ گفتگو کے دوران میں اس نے بتایا کہ اب وہ ناول نویسی ترک کر چکا ہے۔ اور اس نے کلر کی شروع کر دی ہے۔ مالی اعتبار سے یہ پیشہ سود مند رہا ہے۔ باتوں کے دوران اس کی توجہ ہنسی رہی۔ وہ میری طرف دیکھنے کے ساتھ ساتھ پھر پھڑپھڑاتے ہوئے پردے کو بھی تکتے لگتا تھا۔

اس دوران میں، میں نے ایک بار کچن کا چکر لگایا تو مجھے گاجر کا حلوہ رکھا دکھائی دیا۔ تین روز پہلے میں اسے حلوائی کے ہاں سے اڑا لایا تھا۔ اسے ایک طشتری میں سجا کر میں نے دہشت بیگ کو پیش کیا۔ اس نے شکرے کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔

..... دور بیٹھ کر اسے حلوہ کھاتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی..... اور میں یہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے حلوہ میرے حلق سے اتر رہا ہو۔

”کیسا ہے؟“ میں نے امید افزا لہجے میں پوچھا۔

”سراپا؟ سرودہ ہے۔“ اس نے پھر پھڑپھڑاتے پردے پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈال کر کہا۔

”شد و حلوائی کے ہاں سے لیا تھا۔“

”نمک کافی ہے۔“ وہ بولا۔

”مگر میں تو حلوے کی بات کر رہا تھا۔“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں۔“ وہ بھی چونکا۔ ”پردہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔“

وہ ناول نویسی کے قصے سناتا رہا اور کافی دیر بعد رخصت ہوا۔ میں نے اس ملاقات کو یاد گار اور انٹ بنا نے کے لیے اسے اپنی ایک ٹائی اور جرابوں کی ایک جوڑی تھنے میں دی۔

سورج غروب ہوا تو مجھ پر پھر وہی جون طاری ہو گیا۔ اس بار میں دوائے غیاب میں ایسی تبدیلی کرنا چاہتا تھا کہ اسے استعمال کر کے اپنی مرضی سے غائب ہو سکوں اور اپنی مرضی سے ظاہر ہو جاؤں۔ اب تک صرف اتنی کامیابی ہوئی تھی کہ میں دوا استعمال کرنے کے تھوڑی دیر بعد غائب ہو جاتا تھا اور کسی خاص مدت کے بعد ظاہر ہو جاتا تھا۔

آدھی رات تک میں دوا کے اجزاء کو اسی کتاب کے اندراج کے مطابق ایک پیالے میں ڈال کر الٹا پلٹا رہا۔ پھر میں نے ہدایت کے مطابق اسے دھیمی آنچ پر رکھا اور سو گیا۔

صبح آفس جانے سے پہلے میں نے اس کی خاصی مقدار پی لی۔ گھر سے نکلنے لگا تو خیال آیا کہ جیب تو خالی ہے کرایہ کہاں سے دوں گا، اور ناشتہ کہاں سے کروں گا۔ پھر وہ گولک یاد آیا، جس میں، میں آفس سے واپسی آنے کے بعد ساری ریز گاری ڈال دیتا تھا۔ اسے توڑنے پر اندر سے سترہ روپے ساٹھ پیسے نکلے۔ میں نے انہیں جیب میں ڈال لیا۔ ہر چند کہ سکے جیب میں کھنک رہے تھے اور ان کے وزن سے پتلون بار بار ہس کی جارہی تھی۔ مگر اس وقت مجبوری تھی۔

رحیم کے ہوٹل پر ناشتہ کرنے کے بعد جب میں کاؤنٹر پر گیا تو بیرے نے دور سے ہانک لگائی۔ ”نیلے کمیس والے بابو سے سات روپیہ تیس پیسہ لو۔۔۔۔۔ اس کے بعد ساٹھ پیسہ۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ تیس پیسہ۔۔۔۔۔“

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریز گاری نکالی اور کاؤنٹر پر رکھ کر اسے گنے لگا۔ رحیم نے تھوڑی دیر تک تو صبر کیا پھر جھنجھلا کر بولا۔ ”آج کل کیا کیا کرتے پھر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اپنی سطح سے آپ کو اس حد تک نہیں گر جانا چاہیے۔“ اس نے ریز گاری کی طرف اشارہ کیا۔

”تم کہنا کیا چاہتا ہو؟“

”پہلے آپ کا نام بانو والے سلسلے میں لیا جا رہا تھا۔ پھر پرسوں آپ سلطان کے ساتھ

توالی کرتے دیکھے گئے اور اب یہ۔۔۔۔۔“

”یہ کیا؟“

”گداگری۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”سچ کہتا ہوں آپ اپنے والدین کا نام خوب روشن کر رہے ہیں۔ ان کی روحیں قبروں میں تڑپ رہی ہوں گی۔“

”کیا بکتا ہے۔“ میں غرایا۔ ”یہ تو میں نے گولک توڑ کر۔۔۔۔۔“

”سب یہی کہتے ہیں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”مگر جب دل اندر سے سیاہ ہو جاتا ہے اور ضمیر پر بے غیرتی کی دھول جم جاتی ہے تو پھر اس کھیل میں مزہ آنے لگتا ہے۔ اور آدمی ہر بات کو مذاق میں ٹال دیتا ہے۔“

جی چاہتا تھا کہ گریبان پکڑ کر اسے کاؤنٹر سے کھینچ لوں اور اسکے دماغ سے غلط فہمی کی گُرد جھاڑ دوں۔ مگر یہ سوچ کر رہ گیا کہ محلے میں دنگا فساد کرنا مناسب نہیں۔ لوگ مجھ سے پہلے ہی بدظن ہیں۔ اگر انہوں نے رحیم کو درست جانا اور مجھے گداگری پر لٹکچر دینا شروع کر دیا تو میں کسی کومنڈ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔

میں تھوک کے گھونٹ پیتا ہوا اللہ توکل ریسٹوران سے باہر آ گیا۔ ابھی بس اسٹاپ سے کچھ ہی دور تھا کہ مجھے بجلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ بچکیوں کا علاج کسی حکیم، ڈاکٹر کے پاس نہیں۔ جھنجھلاہٹ میں آدمی یہی کر سکتا ہے کہ اپنے منہ پر پتھر مارنا شروع کر دے۔

میں ایک عمارت کے زیر سایہ کھڑا ہو گیا۔ بچکیوں کا ہیجان تھوڑی دیر تک طاری رہا، پھر بس نے اپنے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی محسوس کی۔ اس تبدیلی کو میں صفحہ قرطاس پر رقم نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھا سکتا ہوں کہ میرا دل بے حد نرم و ملائم ہو گیا۔ گرد و پیش میں کھڑے ہوئے لوگوں پر مجھے خواہ مخواہ ترس آنے لگا۔ میں نے سوچا یہ دوا کا اثر نہ ہو۔ اور میں غائب نہ ہو گیا ہوں۔ دھوپ میں جا کر دیکھا تو سائے کو موجود پایا۔ الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ غائب ہونے کی بجائے یہ کیفیت کیوں پیدا ہو گئی۔ کیا دوا میں پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی؟

دفعاً ایک خارش زدہ کتا کون کون کرتا دکھائی دیا۔ اسے دو تین کتے گھیرے ہوئے اور راکر دانت دکھا رہے تھے۔ مجھے اس کتے پر بہت ترس آیا۔ میں نے ڈھیلے مار کر اور گھر کیاں سے کر دوسرے فریبہ اندام کتوں کو بھگا دیا اور جھکارتے ہوئے اس خارش زدہ کتے کی طرف بھاگا۔ مگر اس نے اپنی دم ٹانگوں میں دبا کر گھوں گھوں کی اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں بوکھلا کر پیچھے ہٹا تو اس نے زقند لگائی اور ایک کباب والے کے چولہے میں جا کر بیٹھ گیا۔ چولہا بجھا ہوا تھا۔ اس کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ اندر سے کباب والا نکل آیا۔ اس کا مجرب پیٹ اور ہاتھی بے دست و بازو دیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میں ایک گہری سانس لے کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ دیر تک وہاں کھڑا دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا رہا، بسیں آتی اور جاتی رہیں۔ لوگ مجھے دھکا دے کر آگے چلے جاتے اور میں کھڑا رہ جاتا تھا۔ یہ سوچ کر شاید اس بے چارے کو مجھ سے پہلے اپنی منزل مقصود پر پہنچنا ہوگا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور کھوپڑی کا ناریل تڑخنے لگا تو میں پیدل ہی آفس کی طرف چل پڑا۔ وہ کوئی تین میل دور تھا۔ مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ راستے میں جتنے فقیر ملے، میں نے جیب سے کچھ نہ کچھ نکال کر ان کی تھیلی پر ضرور رکھا۔ ان کی بے کسی اور فاقہ مستی دیکھ کر تو جی چاہتا تھا کہ روٹی اور سالن پلانٹ لگا کر دونوں چیزیں وافر تیار کی جائیں اور ان لوگوں میں مفت تقسیم کر دی جائیں۔ اونچی اونچی فلک بوس عمارتیں تعمیر کی جائیں اور ان کی رہائش کا مسئلہ حل کر دیا جائے۔

میں ابھی آفس سے آدھ میل دور تھا کہ جیب کی تمام ریزگاری ختم ہو گئی۔ میں نے سوچا فکر کس بات کی ہے تھوڑی دیر بعد تنخواہ مل جائے گی، اپنا کام تو چلتا رہے گا۔ خیال ان مسکینوں کا رکھنا چاہیے اور ہر ممکن طریقے پر ان کی مدد کرنا چاہئے۔

میں آفس کی عمارت کے قریب پہنچا تو مسکینوں اور یتیموں کے ایک غول نے مجھے گھیر لیا۔ ”بابو دیتا جا، تیرے بچے جیوں۔“ ایک نے لرزتی آواز میں کہا۔ میرا دل کانپنے لگا، میں نے اپنی جیب ہتھپتھائی، وہ خالی ہو چکی تھی۔ ”اللہ کے نام پر مسکین کو دے، تیری ترقی ہوئے۔“

”اللہ کے نام پر..... وہ اللہ کے نام پر مانگ رہا تھا اور میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

تف ہے میری ذات پر۔

”بہت سردی ہے دل والے..... کوئی گرم کپڑا!“ ایک نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ سائل سردی میں تھر تھرا رہا تھا اور گرم کپڑے پہننے کھڑا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ مجھ سے کمزور تھا اور سردی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر اپنا کوٹ اتار کر اسے تھما دیا۔

..... میں وہاں سے بڑھنے ہی والا تھا کہ دوسرے مفلوک الحال نے پیچھے سے پکڑ لیا۔ ”دیتا جا..... دیا لو..... مجھے بھی کچھ دیتا جا..... دونوں جہان میں سکھ پائے گا۔“ ”اب تو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم چاہو تو نالی لے لو از بند کی جگہ استعمال کر لینا۔“

”دیتا جا..... میرے پاس کوئی ڈھنگ کا کپڑا نہیں ہے۔“

”اگر میں تمہیں اپنے کپڑے دے دوں گا تو خود کیا پہنوں گا؟“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”ادھر آ، اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔“ اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ کھینچتا چلا گیا، پچھلی گلی میں اس کی کھولی تھی۔ اس میں داخل ہو کر اس نے چھپاک سے ایک گٹھری کھوی اور ایک پھولدار میس شلوار میری طرف بڑھا دی۔

میں نے ایک کونے میں جا کر اپنا لباس اتار دیا اور اسے پہن لیا۔ فقیر نے مجھے ہزاروں دعاؤں سے نوازا۔ میرا سینہ فروتنی سے بھر گیا۔ اس مسکین کے لیے میں نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا مگر وہ اظہار تشکر کے طور پر بچھا جا رہا تھا۔

آفس میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ سب لوگ آچکے ہیں اور میں آدھا گھنٹہ لیٹ ہوں۔ دوائے دیانت استعمال کرنے کے بعد میں نے جو بنگامہ آرائی کی تھی، اس کی بنا پر اے سی صاحب نے مجھے ہی نہیں سپرنٹنڈنٹ اشتیاق صاحب کو بھی شوکا ز نوٹس تھما دیا تھا۔ نتیجتاً..... وہ وقت پر آنے لگے اور سارا عملہ بھی۔

میں اپنی سیٹ پر جا کر پشیمان سا بیٹھ گیا۔ پھر ٹرے میں سے اسٹیلشمنٹ کی فائل نکال رہا تھا کہ میری نگاہ اچانک ذکیہ نور پر پڑی۔ وہ دوپٹہ منہ میں دبائے ہنس رہی تھی۔ جیسے اس نے کوئی مشکل خیز چیز دیکھ لی ہو اور اپنی ہنسی ضبط نہ کر پار ہی ہو۔

وہ اے سی صاحب کی پی آرا تھی اور یاسین کی طرف ملتفت، اس لیے میں اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر لوٹن کبوتر ہوئی جا رہی تھی، مگر ہمت نہیں پڑی کہ اس سے ہنسنے کا سبب دریافت کروں۔

بائیں جانب سے ایک مسلسل قہہ قہہ بلند ہوئی تو میں نے ادھر دیکھا۔ انور محمود کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ ہنستے ہنستے خود پر قابو پالیتا تھا مگر میز پر کئے مار کر پھر ہنسنے لگتا۔

”کیا صبح تم لوگ دیوار قہقہہ کی طرف گئے تھے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا اور فائل کھولی۔ ”ہم تو کہیں نہیں گئے تھے البتہ تم.....“ ذکیہ نے کہنے کی کوشش کی مگر جملہ مکمل نہ کر سکی۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”تھوڑی دیر بعد دیوار گریہ کی طرف دھیل دیے جاؤ گے۔“

”کچھ بتاؤ تو سہی کیا معاملہ ہے؟“ میں نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔

”سپرنٹنڈنٹ صاحب بتائیں گے۔“ انور کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔ اس سے ہنسی ضبط نہیں کی جا رہی تھی۔

جب قہقہوں سے چھت اڑنے لگی اور آفس کا ماحول کانچی ہاؤس جیسا ہو گیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنے کمرے سے نکل آئے، انہیں دیکھ کر انور محمود اپنی سیٹ پر واپس آ گیا اور ذکیہ نور

نے بھی اپنی ہنسی میں بریک لگا لیے۔
وہ چند لمحوں تک اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے چاروں طرف دیکھتے رہے۔ جیسے اس طوفان بدتمیزی کا سبب جانا چاہتے ہوں۔ پھر ان کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں نے ان کے تیور بدلتے دیکھے۔ انہوں نے اپنے کمرے کی طرف مڑتے ہوئے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ”اور تم میرے کمرے میں آؤ، ابوالعمران۔“

ان کے انداز مخاطب پر میں سہم کر رہ گیا۔ کیونکہ وہ آج تک میرا صحیح نام نہیں لے سکے تھے۔ گویا اس وقت وہ از حد غصے میں تھے اور ان کی ذہنی حالت صائب تھی۔
میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے معمول کے مطابق بیٹھنے کے لیے نہیں کہا اور گھن گھرج انداز میں بولے۔ ”یہ کیا تماشہ ہے؟“

”مم..... میں معافی چاہتا ہوں۔“ میں ہکلا یا۔ ”بس نہ ملنے کی وجہ سے ذیرو ہو گئی۔ میں پپ..... پیدل یہاں تک آیا ہوں۔“

”میں دیر سے آنے کی وجہ نہیں پوچھ رہا۔“ وہ دوبارہ گرجے۔ ”اس کے بارے میں دریافت کر رہا ہوں۔“ انہوں نے میرے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔
”کس کے بارے میں؟ کیا؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔
”جہاں تک مجھے معلوم ہے..... تم نے ابھی شادی نہیں کی ہے۔“ انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جج..... جی ہاں۔“ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے دفعتاً موضوع کیوں بدل دیا۔
”تو پھر یہ لباس تمہارے جسم پر کیوں نظر آ رہا ہے؟ کیا تمہاری جنس تبدیل ہو گئی ہے۔“
”لباس؟“ میرا دماغ سنسانے لگا۔ ”لباس کو کیا ہوا؟“

”شاید رات کو تم نے آپ نشاط سے بھی شغل کیا ہے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔
اسی لیے تمہیں اب تک یہ ہوش نہیں..... کہ تمہارے جسم پر کیا ہے۔“
میں نے اپنے پیراہن کا غور سے جائزہ لیا تو انکشاف ہوا کہ اس فقیر نے مجھے ایک عدد زنانہ شلوار اور جمپر بخش دیا ہے۔ میں نے جلدی میں اسے پہن لیا ہے اور آفس کی طرف آ گیا ہوں۔

”معاف کیجئے گا وہ..... وہ ایک فقیر.....“
”بشاید اب تم کوئی کہانی سناؤ گے؟“ انہوں نے مجھے گھورا۔
”نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ راستے میں ایک فقیر مل گیا تھا۔ اس نے اللہ کا واسطہ دے کر میرے کپڑے اتروالے اور یہ..... یہ.....“

”فقیر؟“ انہوں نے جیسے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم اس فقیر کی بات تو نہیں کر رہے جو پچھلی گلی کی ایک کھولی میں رہتا ہے؟“

”جی ہاں وہی۔ مگر آپ کو کیسے معلوم.....“
”مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اس کا نام سیٹھ رمضو ہے اور وہ گھوڑا گلی میں پرانے کپڑوں کی دکان کرتا ہے۔“
”تو پھر یہاں؟“

”یہ اس کا سائنڈ بزنس ہے۔“
”لہل..... لیکن اس کی آواز سے تو یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ.....“
”یہ ان کی فنکاری ہے۔“ انہوں نے قطع کلامی کی۔ ”بہر حال اب تم جا سکتے ہو۔ اپنی سیٹ نہیں بلکہ اپنے گھر۔ اب معقول لباس پہن کر ہی آنا۔ بلکہ آج نہ ہی آنا بہتر ہے۔ کیونکہ آج تم پر مسکینیت کا بخار طاری ہے۔“

میں ان کے کمرے سے سر جھکائے نکل آیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے مجھ پر مضحکہ نگاہ ڈال کر پھر مسکرائنا شروع کر دیا۔ وہاں رہنا دودھ بھرا جا رہا تھا۔ اس لیے میں نے ان نامعقول لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا بہتر سمجھی۔ کیشیئر آچکا تھا لہذا میں اس سے تنخواہ لے کر چلا آیا۔

اس بار میں دانستہ ناداروں اور مسکینوں کی طرف نہیں گیا۔ ذلت اٹھانے کا مزید حوصلہ نہیں رہا تھا۔ مگر واپس آنے کے لیے بس میں بیٹھا تو کنڈیکٹر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ سیٹ چھوڑو۔ مائی آگے جاؤ۔“

”مم..... میں..... وہ۔“ میں ہکلا یا۔ ”آواز مردانہ تھی اس لیے کنڈیکٹر نے آنکھیں پھاڑیں۔“
”یہ تو وہ ہے..... اللہ کی مار.....“ ایک طالب علم نے شوخ لہجے میں کہا اور تالی بجا کر ناک پر انگلی رکھی۔
”اگر تم غیر جانبدار ہو تو بیچ میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔“ کنڈیکٹر نے کہا۔ ”جالی کے فریب۔“

بس میں موجود رہنا اپنا مذاق اڑوانے کے مترادف تھا۔ اسی لیے میں اگلے اسٹاپ پر تر گیا۔ گھر اب زیادہ دور نہیں تھا۔
گھر پہنچ کر میں نے تالا کھولا اور اندر پہنچا تو محسوس ہوا کہ سامنے والا پردہ بری طرح سے پھڑپھڑا رہا ہے۔ اور کوئی اس کے پیچھے مضطرب ہے۔ مجھے زیتون کا خیال آیا۔ پھر یہ سوچ کر

نہیں پڑا کہ وہ مجھے عورت سمجھ رہی ہے۔

اچانک مجھے اشتیاق صاحب کا خیال آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھ پر مسکینیت کا بخار طاری ہے۔ بخار؟ میں نے سوچا صبح میں دوائے غیاب پی کر نکلا تھا اور غائب نہیں ہوا تھا۔ یقیناً فارمولے میں پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اسی لیے میں غائب ہونے کی بجائے مسکین اور رحم دل ہو گیا تھا۔ میں نے اٹھ کر دو اکا تریاق پیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔

دل پر جو رقت سی طاری تھی، وہ دور ہو گئی اور میں نارمل ہونا چلا گیا۔ خاص طور پر اس فقیر پر بہت غصہ آیا جس نے میرے کپڑے لے لیے تھے اور اس کے بدلے میں پرانا زنا نہ لباس عطا کیا تھا۔ میں غصے میں کھولتا رہا اور بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

اسی دوران خیال آیا کہ میری شامت اعمال میں اضافہ ہو چکا ہے۔ پہلے دوائے دلیری، پھر دوائے دیانت اس کے بعد دوائے غیاب اور اب دوائے رحم دلی! خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں اور کتنے تجربات کا نشانہ بننے والا تھا۔

بھوک نے جب معدہ کھولا نا شروع کیا تو میں نے رحم کے اللہ توکل ریسٹوراں پر جا کر آلو گوشت زہر مار کیا۔ وہ بد بخت آلو پکانے کا اتنا شوقین تھا کہ مجھے آلو کھاتے کھاتے اس سے المرجی ہو گئی تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں آلو فوبیا نہ ہو جائے۔

دو پہر کو جاتا تھا تو آلو گو بھی، آلو مٹرا اور آلو پالک استقبال کرتے تھے اور شام کو جاؤ تو آلو گوشت، آلو قیمہ اور آلو بیٹنگن گلے پڑ جاتے تھے۔ میں نے رجم سے شکایت کی کہ وہ ہر چیز میں آلو کیوں ڈال دیتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ غریب پرور سبزی ہے۔ تمام چیزوں کے ساتھ کنفیڈریشن بنالیتی ہے۔ ہر موسم میں ہر جگہ دستیاب ہو جاتی ہے۔ اب تو چائے بھی اس کی زد میں ہے۔ لیجیے یہ پوٹیٹو چیس کا پیکٹ، شام کو چائے کے ساتھ ٹوٹے گا۔

اللہ توکل ریسٹوراں سے واپس آ رہا تھا کہ مجھے سلطان احمد کا خیال آیا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک سے زائد موقعوں پر اس کی وجہ سے میری درگت بن چکی تھی۔ مگر اس کے باوجود یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اسے گامے شاہ جیسے اوباشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ سلطان جیسا بھی تھا، میرے حق میں بہتر تھا۔ اس نے دانستہ ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ جس سے مجھے نقصان پہنچے۔ پھر وہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کا ایک سرگرم رکن تھا اور سماج دشمن عناصر کی سرکوبی کے لیے مستعد رہتا تھا۔ مجھے اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے تھی اور اسے مصیبت سے نکالنا چاہیے تھا۔

تو پھر اس کے لیے کیا کیا جائے؟ پولیس اسٹیشن چل کرواں سے پولیس کا ایک جتھالے کراس عمارت پر دھاوا بول دیا جائے، جہاں گامے شاہ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے، یا میں اکیلا ہی

اس کی کچھار میں گھس پڑوں۔

پولیس کی گارد لے جانے کی صورت میں یہ اندیشہ تھا کہ گامے شاہ اور اس کے ساتھی ہوشیار نہ ہو جائیں جب کہ میرے تنہا جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں ان کے گر گے رستم سے دہشت زدہ ہو کر فرار ہوا تھا۔ وہ مجھے خاطر میں کیوں لاتے؟ میں نے گامے شاہ کے ٹھکانے پر تنہا جانے کا فیصلہ کر لیا۔

دوائے غیاب مجھے بار بار دھوکا دے جاتی تھی، مگر اس کے باوجود میں اس کا سہارا لینے کے لیے مجبور تھا۔ میں نے سوچا اسے استعمال کرنے کی بجائے جیب میں رکھنا مناسب رہے گا۔ البتہ اگر میں دوائے بہادری کا ایک ڈوز لے لوں تو کام بن سکتا ہے۔ پھر رستم کو کسی بہانے سے دوائے بزدلی پلا دوں۔

میں نے دوائے بہادری کا ایک ڈوز لے کر دوائے غیاب اور دوائے بزدلی کی شیشیاں جیب میں رکھ لیں اور گامے شاہ کے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس کا ٹھکانہ قلندر روڈ کے شمال میں ہے۔ میں نے شہر کے اس حصے کے لیے بس میں سفر کرنا مناسب سمجھا۔ بس اسٹاپ پہنچا تو حسب معمول افراتفری کا منظر دیکھنے میں آیا۔ ہجوم کے ساتھ میں بھی ایک طرف کھڑا ہو کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر بعد ایک بس آئی، لوگ اس کی طرف بڑھے تو وہ زائیں سے نکل گئی۔ کافی آگے جا کر ایک لڑکی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تو وہ رک گئی۔ مجھے بس ڈرائیور کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ مگر وہ بہت دور نکل گیا تھا۔ اس لیے میں اس کا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دوسری بس آئی۔ اسٹاپ پر پہنچ کر اس کی رفتار قدرے ہلکی ہوئی تو میں نے اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ پھر دروازے پر لگے ہوئے مینڈل کو پکڑ کر اچھلا اور قلابازیاں کھاتا ہوا اندر پہنچ گیا۔

دوائے بہادری اس وقت تک میرے جسم پر تسلط جما چکی تھی۔ میں نے اپنے ہر عضو سے آگ پھوٹی محسوس کی..... ہاتھ پیرا کڑ کر سخت ہو چکے تھے اور اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کا ہلکا سا کرشمہ میں باقر بھائی پر بھی دیکھ چکا تھا۔ جب میں نے انہیں یہ دوا استعمال کرائی تھی تو انہوں نے برکت کو مار مار کر چپٹا کر دیا تھا۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ دوا مجھ سے وفانہ کرنی!

بس آندھی اور طوفان کی رفتار سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ ممکن ہے اس کا ڈرائیور ماضی قریب میں راکٹ ڈرائیور کی طرح تیار رہا ہو۔

گامے شاہ کا مکان کافی دور تھا مگر میں نے پیدل چلتے ہوئے تھکن محسوس نہیں کی، شاید

اس لیے کہ میں بہادری کی دوا پیئے ہوئے تھا۔

اس جگہ پہنچ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے ایک جگہ نیم کے بہت سے درخت لگے دکھائی دیے۔ جوش و جذبات میں عقل خبط ہوئی جا رہی تھی۔ اس لیے میں یہ سوچ کر وہاں گھس پڑا کہ وہ گامے شاہ کی حویلی ہے۔

اندر کا نقشہ بڑی حد تک تبدیل تھا۔ میں یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہ مجرموں کا اڈا ہے۔ چھوٹی موٹی تبدیلیاں خود آتی رہتی ہوں گی اور کچھ وہ کرتے رہتے ہوں گے۔

پھانک سے آگے لان تھا اسے عبور کیا تو پیش دالان نظر آیا۔ وہاں دو کتے غرارہے تھے۔ خون قدرے خشک ہو گیا اور جسم میں سنسنی دوڑنے لگی، لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دونوں موٹی زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں۔

میں پیش دالان کے بعد دالان اور اسکے بعد ایک کمرے میں پہنچ گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ گامے شاہ اور ساکے گرگے کہاں گئے؟ پھر وہ کمرہ بھی تلاش کے باوجود نہیں ملا جہاں سلطان احمد کو اور مجھے قید کیا گیا تھا۔ اس خیال نے رو ٹکٹے کھڑے کر دیے کہ کہیں میں غلط مکان میں تو نہیں آ گیا ہوں؟ نیم کا درخت تو مناسب نشانی نہیں ہے۔ میں اسے نشان منزل مان کر اندر کیوں چلا آیا۔

میں پھرتی سے پلانا مگر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کیونکہ عقب میں ایک ہاوردی شخص مجھے اشتعال آمیز نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس کی وردی سفید تھی سر پہ سرخ رنگ کا کلاہ ”فرمائیے؟“ اس نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔ ”یہاں تک آنے کی زحمت کیسے کی؟“

”وہ مجھے نواب صاحب سے ملاقات.....“

”لیکن یہ تو بیگم صاحبہ کی خواب گاہ ہے۔“ وہ بولا۔

”ملنا تو انہی سے تھا مگر نواب صاحب کے ساتھ۔“ میں نے بات بنائی۔ ”اگر وہ سو رہی ہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔“

”نہیں ملاقات کیے بغیر آپ نہیں جائیں گے۔ میں جاگ رہی ہوں۔“ برابر کے کمرے سے ایک دہنگ قسم کی آواز آئی۔ ”بلکر انہیں روکو۔“

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اب بلکر مجھے یوں گھور رہا تھا۔ جیسے میں نے لمبی سانس لی تو وہ مجھے پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ ایک طرف اور دوسری طرف دو لمبے دانتوں والے بلند ہاؤنڈ تھے۔ اس سے آگے کے مرحلے میں آکس کنگ سائز انجکشن!

”لان میں ایزی چیئر ڈال دو، میں وہاں بیٹھوں گا۔“ میں نے بلکر کی طرف مڑ کر کہا۔

”اوکے سر۔“ وہ سر ہلا کر بولا، دو قدم آگے گیا پھر ٹھٹکا اور واپس میرے قریب آ کر

بولا۔ ”آپ کا وزینگ کارڈ؟“

”کارڈ؟“ میں نے مصنوعی بوکھاہٹ کا مظاہرہ کیا، اور جیسے تھپ تھپا کر کہا۔ ”اس وقت تو میرے پاس کارڈ نہیں ہے۔ تم بیگم صاحبہ سے کہو کہ انجمن فلاح بہبود بیوگان کے منتظم اعلیٰ آئے ہیں۔“

”چندہ لینے؟“ اندر سے بیگم صاحبہ کی دہاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ”بلکر، انہیں چلتا کرو۔“

”اوکے میڈم۔“ بلکر نے مودبانہ کہا۔

”اور ہاں جیکی اور لالی کولان میں چھوڑ دو۔“ اندر سے پھر آواز آئی۔

میں جل تو جلال تو، پڑھتا ہوا، لان تک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا کہ بلکر حکم کی تعمیل میں جلالت کا مظاہرہ نہ کر بیٹھے اور دھاردار بچوں اور نوکیلے دانتوں والوں کو آزاد نہ کر دے۔

میں نے پھانک سے نکلنے کے بعد گرد و پیش کا جائزہ لیا تو سامنے ایک حویلی دکھائی دی۔ کپاؤنڈ سے ملا ہوا ایک نیم کا درخت بھی لگا تھا۔ جس کی شاخیں سڑک تک آرہی تھیں۔ یقیناً وہ گامے شاہ کی حویلی تھی۔ تاہم میں اندھا دھند اس میں گھس کر پھر کسی مصیبت کو آزاد نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس کونٹھی کے قریب سے گزر کر میں نے نیم پلیٹ تلاش کرنا چاہی تو اس میں ناکامی ہوئی۔ پھانک کے آگے سے گزرنے پر میں نے اندر ایک اچنتی سی نگاہ ڈالی تو عمارت سنسان محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے عمارت برسوں سے استعمال میں نہ لائی گئی ہو۔

پھانک پر خاردار تار لپٹے ہوئے تھے۔ میں وہاں رکا نہیں اور بڑھتا چلا گیا۔ یہ خیال دماغ میں ڈنک مارنے لگا کہ مجھ سے دوسری بار غلطی تو نہیں ہو رہی ہے؟ اندرونی تعمیر پر نگاہ پڑنے کے بعد تو احساس ہوتا تھا کہ میں پہلے یہاں آچکا ہوں۔ پھر؟

میں نے اس کے گرد گھوم کر تفصیلی جائزہ لینے کی سوچی۔ اس بار میں عمارت سے قدرے دور ہو کر چل رہا تھا۔ عقبی سڑک کے برابر ایک نالہ تھا اور اس کے بعد کونٹھی۔ میں سڑک پر ریگ رہا تھا کہ مجھے گردشی سیزھی پر ایک شخص دکھائی دیا۔ وہ اوپری کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ دوری کے باوجود میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ وہ گامے شاہ ہی تھا اور انہوں نے اپنی آمد و رفت کے لیے عقبی پھانک استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ یہ تاثر دے سکیں کہ عمارت برباد ہے۔

بلاشبہ میں صحیح جگہ پر پہنچا تھا۔ مرکزی پھانک کی طرف جا کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر پھانک پر پاؤں رکھ کر اوپر گیا اور اندر کود گیا۔ معلوم نہیں یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس حصے کی طرف کوئی نہیں تھا یا پھر گامے شاہ کے آدمی کسی مشن پر گئے ہوئے تھے۔

آپ..... آپ پیر بادشاہ؟“ وہ ہکلا یا۔ ”آپ تو.....“
 ”یہاں سے چلا گیا تھا۔“ میں نے رستم پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ میری بیڑیاں
 ایکڑ ہاسٹ ہو گئی تھیں۔ دوبارہ چارج کرا کے آیا ہوں۔“
 ”ابھی مالوم اپڑ جاوے گا۔“ رستم پھنکارا۔ ”تیری تو میں.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر
 دانت پیسے اور مجھ پر بھلانگ لگا دی۔ اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو شاید اس کی کھڑی ہتھیلی کا وار میری
 گردن چٹا دیتا۔

مگر میں پھرتی سے دائیں جانب ہو گیا۔ اس کی ہتھیلی دروازے پر پڑی۔ دروازہ جھنجھنا
 گیا۔ پھر لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اڑے اور اس کا دایاں ہاتھ کلائی تک اندر گھستا چلا
 گیا۔ وہ اپنے ہاتھ کو فوری طور پر دروازے سے نہ نکال سکا۔

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے سلطان احمد کی بندشیں کھول دیں۔ رستم نے
 دروازے سے اپنا ہاتھ..... نکال لیا اور غرا کر میری طرف پلٹا۔ اس بار میں نے اسے ہنٹروں پر
 رکھ لیا۔ وہ بری طرح سے پتار ہا اور ہنٹر کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا رہا، لیکن میں نے اس
 کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

سلطان نے بہادر بننے کی سعی نہیں کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر ہانپتا رہا۔ میں چاہتا بھی
 نہیں تھا کہ وہ اس معرکہ آرائی میں دخل دے۔

تھوڑی دیر تک پٹنے رہنے کے بعد رستم کی آنکھوں میں سرسبکی دکھائی دی۔ پہلے تو وہ
 ضبط کرتا رہا۔ پھر اس کے حلق سے سریلی چیخیں نکلنے لگیں۔ کافی دیر بعد وہ اپنے حقیقی روپ میں
 آیا۔

”بس؟ یا کھال اتار کر ہاتھ میں دے دوں؟“ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔
 وہ چند لمحوں تک ہانپتا رہا پھر پیٹھ دکھا کر بھاگا مگر زیادہ دور نہیں جا سکا۔ سامنے سے آنے
 والوں سے ٹکرایا اور انہیں لیے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ سب ہائیں ہائیں کرتے ہوئے
 اٹھے۔

ان میں سے ایک گامے شاہ، دوسرا اس کا کوئی گرگا اور تیسرا شخص جمیل اصغر تھا! میں جیسے
 حیرت سے اچھل پڑا جمیل اصغر وہاں کیا کر رہا تھا۔

میں نے اس پر تفصیلی نگاہ ڈالی تو اس کا شیو بڑھا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہونٹوں پر
 چوڑیاں تھیں اور آنکھوں میں اداسی کے سائے۔ جمیل اصغر کے ہاتھ پیچھے لے جا کر باندھ دیے
 گئے تھے اور اسے گامے شاہ نے لمبی نال والے ریو الو سے کور کور کھا تھا۔ اس ٹکراؤ کی بنا پر
 ریو الو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ جسے اس نے فوراً ہی اٹھالیا۔

لان کا حصہ میں نے دوڑ کر عبور کیا۔ برآمدے میں پہنچ کر میں نے اس کمرے کا رخ کیا
 جہاں سلطان احمد بند تھا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں
 آرہی تھیں۔ آواز سلطان احمد ہی کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اس پر تشدد کیا جا رہا ہو۔

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں نے جھنجھلاہٹ میں
 اس پر ٹھوکر ماری۔ لاک ٹوٹ گیا اور دروازہ آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر سلطان احمد دکھائی
 دیا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ رستم اس پر ہنٹروں کی بارش کر رہا تھا۔

آواز سن کر وہ مڑا۔ پھر مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا..... ”تم؟“ اس نے استعجاب سے کہا۔
 ”ہاں میں!“ میں نے گونج دار آواز میں کہا۔

”اب کیوں آئے ہو؟“ اس نے ہنٹرفرش پر مارا۔
 شاید وہ، یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب اس کے ہاتھوں میں نے ایک بار اپنی ہڈیاں نرم کرائی
 ہیں تو پھر میں کیا کرنے آیا ہوں۔

”تمہیں بدبھمی ہو گئی ہے لہذا میں تمہارے لیے ہاضمے کی گولیاں لایا ہوں۔“
 ”ہو ہا ہا۔“ رستم نے گونج دار قبضہ لگا کر اپنی دانست میں مجھے ڈرایا اور پھر میری طرف
 ہنٹر گھما دیا۔

میں نے اس ہنٹر کو اپنی کلائی پر ردکا۔ وہ مل کھا کر میری کلائی پر لپٹ گیا۔ میں نے اس کا
 اگلا سر پکڑ کر زور لگایا تو رستم اڑتا ہوا آیا اور دھڑام سے میرے قدموں میں گر پڑا۔ ہنٹر اس کے
 ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

میں نے پھرتی سے اس کے چہرے پر ٹھوکر ماری۔ وہ ایک کریہہ آواز کے ساتھ الٹ
 گیا۔ دراصل اسے یہ توقع نہیں تھی کہ میں اس پر حملہ آور ہو سکتا ہوں ورنہ وہ اتنی آسانی سے
 مار نہ کھاتا۔ اسکے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کے ہاتھوں اپنا بھرتا بنوانے کے بعد
 پھر اس شوق میں چلا آیا ہوں۔

میرے ٹھوکر کھانے پر اور کچھ اپنی کوشش سے رستم دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پھر وہ اپنے حلق
 سے ایک کریہہ آواز نکالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اتنے جسیم اشخاص میں ایسی پھرتی کم ہی
 دیکھی تھی۔ فرش سے اٹھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑو کا ایک داؤ آزمانے کے لیے
 آگے کر لیے اور انگلیاں اکڑنا شروع کر دیں۔

سلطان احمد اپنے زانوؤں میں سر دیے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔
 شروع میں اس نے ہم پر کوئی توجہ نہیں دی اور اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ مگر جب اٹھائیں شروع
 ہو گئی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

”ارے..... ارے کیا ہوا پہلوان؟“ دوسرے آدمی نے بوکھلا کر کہا۔

”وہ..... وہ.....“ رستم نے میری طرف اشارہ کیا۔

”صوفی جی آپ۔“ گامے شاہ نے میری طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ”آپ تو کل درخت پر چڑھ گئے تھے، اس کے بعد.....“

”اس کے بعد درویشوں نے مجھے اوپر اٹھالیا۔ کیونکہ میری بیڑیاں ڈاؤن ہو چکی تھیں۔ اب انہوں نے انز جی.....“

”انز جی؟“ گامے شاہ نے چونک کر قطع کلامی کی..... ”نہیں جی، انز جاکل دیا ہوگا۔ میں خود بھی استعمال کرتا ہوں۔ بہت فرحت بخش ہوتا ہے..... مگر یہ آپ نے اس کے ہاتھ سے ہنر کیسے چھینا؟“ وہ اب تک حیران تھا کہ مجھ میں ایک روز بعد اتنی حیرت انگیز طاقت کہاں سے آگئی۔

”اسی سے پوچھ لو۔“ میں نے کہا۔

”مجھی تو اس وقت یقین آئے گا جب آپ اس سے لان میں مقابلہ کریں گے۔“ پھر وہ مڑ کر رستم سے کرخت لہجے میں بولا۔ ”چل اٹھ، دفع ہو یہاں سے بلی کے بچے..... ہر وقت میاؤں میاؤں کرتا رہتا ہے۔“

جب رستم وہاں سے چلا گیا تو گامے شاہ نے میرے قریب آ کر ستائشی لہجے میں کہا۔ ”آپ نے تو اس وقت کمال ہی کر دیا۔ مرد بزرگ و جوان رعنا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کی چیخیں سنی تھیں۔“

”یہ سب درویشوں کا کرم ہے۔“

”کیا شان ہے آپ کی۔ میں نے پہلے کبھی اتنا نورانی اور جلالی چہرہ نہیں دیکھا۔“ وہ منود بانہ لہجے میں بولا۔ پھر چونک کر کہنے لگا۔ ”یہ آپ نے سلطان احمد کو کیوں کھول دیا ہے؟“

”میں اسے لینے آیا ہوں۔“

”لینے آیا ہوں کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ”اب تو آپ ہمارے ہی ساتھ رہیں گے۔ بزرگوں کا فیض ہوتا رہے گا، ہم پر۔“

”تم نے اسے کیوں پکڑا ہوا ہے؟“ میں نے گونج دار آواز میں کہا اور جمیل اصغر کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا دماغ درست کرنے کے لیے تین روز سے پھینچیاں لگا رہا ہوں، چھترائی کر رہا ہوں مگر مان کر ہی نہیں دیتا..... بڑا آیا اصلاح معاشرہ کا پتر۔“

”سیدھا سا معاملہ ہے صوفی جی۔“ اس نے قریب آ کر ریوڑ اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھر میرے ہاتھ تھام کر عقیدت سے بولا۔ ”اگر ہیروئن اور چرس وغیرہ نو جوانوں، طالب علموں میں مقبول نہ ہو تو ہمارا بزنس کیسے چلے گا..... ہم تو ساری قوم کو اس کا عادی بنا کر قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔“

”لیکن اس کا نو جوانوں اور طالب علموں سے کیا تعلق؟“

”گہرا تعلق ہے جناب عالی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ اسٹوڈنٹس یونیورسٹی گریجویٹ اسکول میں پڑھتا ہے۔ ہمارا ایک بندہ وہاں ہیروئن کی پڑیاں فروخت کرتا ہے۔ بچے پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی گن رہتے ہیں۔ لگے دم تو مئے عم..... اس بد بخت کا کیا جاتا ہے۔“

”مگر تم.....“ میں نے کوئی سخت سا جملہ کہنا چاہا مگر اس نے درمیان میں سے اچک لیا۔ ”جی ہاں کیش ویش بھی دینے کی بات کی تھی۔ یہ ہمارا خیال رکھے گا تو ہم اس کا خیال کیوں نہیں رکھیں گے..... لیکن یہ پیئڈ ومانتا ہی نہیں..... اصلاح معاشرہ میں اپنی جان گھلا رہا ہے۔“

”احق ہے۔“ میں نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم اسے میرے حوالے کر دو۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔“

”جیو مرشد۔“ اس نے مسرت سے مغلوب ہو کر پھر میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”اور اس کم عقل کو بھی ساتھ رکھیے۔“ اس نے سلطان احمد کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی مت ماری گئی ہے..... سب لے دے کر کام چلا رہے ہیں مگر یہ ہر جگہ روڑے انکار رہا ہے..... خود دکھاتا ہے نہ دوسروں کو کھانے دیتا ہے..... یہ کہاں کی عقل مندی ہے..... کوئی اچھا اصول تو نہ ہونا؟“

”ٹھیک ہے، میں اسے بھی لے جا رہا ہوں.....“ میں نے کہا۔

”لے جانے کا کیا مطلب؟“ گامے شاہ نے پلکیں جھپکائیں۔ ”یہاں آپ کو کیا تکلیف ہے مرشد؟ وہ رستم تھا، اسے بھی آپ نے ٹھیک کر دیا..... کوئی گڑبڑ کرے تو بس چڑی ادھڑ دیجئے گا۔ میں تو کہتا ہوں میرے گروہ کے تمام آدمیوں کی ٹیڑھ آپ درست کر دیں..... ہر ایک، دل سے میری اطاعت کرے۔ کاروبار میں محنت سے کام کرے..... پھر دیکھتا ہوں، ہیروئن کیسے نہیں پھلتی پھولتی۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔“

”پر آپ یہاں سے جا کر کریں گے بھی کیا؟“

”قرعہ اندازی میں نام آچکا ہے، حج پر جاؤں گا، اسی ہفتے۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”او، خیر ہوئے..... خیر ہوئے۔ جگ جگ جیو..... پھر تو آپ چار پانچ روز یہیں قیام

کریں۔“ ”بکواس مت کرو۔ ہٹو سامنے سے۔“ میں نے ہنر لہرایا۔ اس وقت میرا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔

”نہیں حضور، یہ سب نہیں چلے گا میرے ساتھ۔“ وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور بھی نکال لیا۔ ”یہ دیکھ رہے ہیں نا آپ..... بڑی کٹی شے ہے..... کلچے میں سوراخ پہلے کرتی ہے، نام بعد میں پوچھتی ہے..... سیدھی طرح اس طرف لیں..... ورنہ.....“ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور ٹرائیگر پر انگلی رکھ لی۔

سلطان احمد اور جمیل اصغر کو رہا کروانا اس وقت ٹیڑھی کھیر بن گیا تھا۔ گامے شاہ میرا عقیدت مند بن چکا تھا۔ مگر اس کے باوجود میرے حکم کی تعمیل نہیں کر رہا تھا۔ یقیناً اسے یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ میں باہر جا کر اس کے بارے میں پولیس کو نہ بتا دوں۔ میں پہلے اس کے چنگل سے چھوٹ چکا تھا وہ، یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوگا کہ میں نے باہر نکل کر کیا کیا۔ ہم لوگوں کو اس نے علیحدہ علیحدہ کمروں میں بند کر دیا۔ میں روزے بخشوانے گیا تھا مگر یہاں نمازیں گلے پڑ گئیں۔ ان لوگوں کو رہا کروانے کی کوشش مہنگی پڑی۔

وہ کمرہ جہاں مجھے قید کیا گیا تھا، کسی طرح بھی اے کلاس جیل سے کم نہیں تھا۔ اس میں تمام آسائشات موجود تھیں۔ حد یہ ہے کہ انگریزی اور اردو کے تازہ اخبارات تک تھے۔ گامے شاہ نے جاتے وقت یہ بھی کہا تھا کہ اگر رنگین ٹیلی ویژن اور وی سی آر شرعی حدود سے خارج نہ ہوتے ہوں تو ان کا بندوبست بھی کیا جاسکتا ہے۔ مجھے اپنا بھرم قائم رکھنا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

فوم کے گدوں پر لیٹے لیٹے جب کافی دیر ہو گئی اور شام کا چٹ پٹا اخبار ختم ہو گیا تو میں نے منہ پھاڑ کر جماعتی لی اور وہاں سے رہائی کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ اچانک یاد آیا کہ چلتے وقت میں نے دو شیشیوں میں دو مختلف دوائیں بھی رکھ لی تھیں۔ دوائے غیاب اور دوائے بزدلی۔ دوائے بزدلی میں نے رستم پر استعمال کرنے کے لیے رکھی تھی، لیکن اس کے استعمال کا موقع ہی نہیں ملا۔

اس کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے وقت کا اندازہ ہو پاتا، میرا اندازہ تھا کہ رات ہونے والی ہے۔ گامے شاہ نے جہاں میرے قیام کا اتنا پر تکلف انتظام کیا تھا وہاں یہ بھی ضروری تھا کہ وہ میرے کھانے کا بھی بندوبست کرتا۔

میں نے وقت کا اندازہ کر کے دوائے غیاب حلق سے اتار لی۔ نتیجہ تھوڑی دیر بعد ظاہر ہوا۔ یعنی میں غائب ہو گیا۔ اس بار میں نے سایہ نہیں دیکھا تھا، کیونکہ کمرے میں ٹیوب لائٹ

جل رہی تھی۔ اس کی بجائے میں نے پالشڈ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر جائزہ لیا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ میں غائب ہو چکا ہوں۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد دروازے کے لاک میں کسی نے چابی گھمائی اور اسے دھکا دے کر کھولا۔ آگے ایک آدمی کھانے کی ٹرے اٹھائے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں ایک ریوالور بردار۔ ٹرے والا اندر آ گیا مگر پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”یہاں..... یہ..... یہاں تو کوئی نہیں ہے نادر۔“ اس نے ریوالور والے کی طرف مڑ کر کہا۔

”کوئی نہیں ہے؟ کیا کہتے ہو؟“ نادر نے ڈپٹ کر کہا۔ ”شاہ جی نے کہا کہ اسے تین نمبر میں بند کیا گیا ہے..... وہ صوفی بڑا کالیاں ہے۔ ادھر دیکھو بیڈ کی آڑ میں نہ چھپا بیٹھا ہو اور موقع پا کر.....“

میں ان لوگوں کو زیادہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ لہذا میں نے اس شخص کو دھکا دیا جو کھانے کی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ دھکا کھا کر ایک طرف جا پڑا اور ٹرے اڑتی ہوئی ریوالور والے کے چہرے پر پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا چہرہ سالن میں لتھر گیا۔

ریوالور والا، یعنی نادر دوسرے پر برس پڑا۔ ”اندھے دیکھتا نہیں ہے؟ کیسے چلتا ہے؟“ ”مم..... میں کہاں چل رہا ہوں..... یار۔ وہ تو کسی نے دھکا دیا تھا۔“ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا اور فرش سے اٹھ گیا۔

”بکواس نہ کر..... یہاں دھکا دینے والا کون ہے؟“ نادر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”تمہارا باپ۔“ میں نے بھاری آواز میں کہا اور اسکے ریوالور پر لات ماری۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مبادا وہ دہشت زدہ ہو کر اندھا دھند فائرنگ کر بیٹھے۔

میرے اس عمل سے وہ بہت سراسیمہ ہوئے۔ ان کے چہرے فق ہو گئے اور جسموں میں کچکی دوڑ گئی۔ کک..... کون..... ہے؟“ نادر نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”میں مطمئن اقیل ہوں۔“ میں نے گرج کر کہا۔ ”اس وقت جن والا روپ دھارنا ہی مناسب تھا۔

”طط..... طط..... رام قلیل..... یہ..... یہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے زبان اینٹھا کر بڑی مشکل سے کہا۔

”میں نیم کے پیڑ کا جن ہوں۔“ میں نے گلے کی رگیں پھلا کر کہا..... نتیجتاً ہلکی سی کھانسی

بھی آئی۔ لیکن اس کا رد عمل خاطر خواہ ہوا۔ یعنی نادر اور اس کے ساتھی بری طرح سے کانپنے لگے۔ یہ تو انہیں پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ کوئی غیر مرئی چیز ان پر حملہ آور ہوئی ہے، لیکن جن کا نام سن کر ان کے پچھلے چھوٹ گئے۔

”وہ..... وہ ہم نے کچھ نہیں کیا ہے بادشاہ لوگ..... ہم کو معاف کرو۔“
”میں تمہاری سات پشتوں کو بھی معاف نہیں کروں گا۔ تم نے میرے ایک عقیدت مند کو بہت پریشان کیا ہے۔“ میں نے گرج کر کہا۔

”عقیدت مند کون؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔
”صوفی ابوالعمران..... وہ میرا نیاز مند ہے۔“

”نیاز مند تو میں بھی ہوں جی۔“ اس نے اپنے لہجے میں مکھن کا استعمال کیا۔ ”آپ حکم دے کر دیکھیے۔“

”تمہیں بعد میں حکم دوں گا۔ پہلے مجھے گانے شاہ سے نمٹنے دو۔“ میں نے کہا اور وہاں سے چل دیا۔ ان کے سامنے شاہ طمطر اقل کا ڈرامہ اس لیے رچانا پڑا تھا تا کہ وہ..... دہشت زدہ ہو جائیں اور بعد میں کسی موقع پر دخل اندازی نہ کریں۔

گامے شاہ کو میں ایک گھنٹے پہلے اوپر سے گردشی سیڑھی کے ذریعے اترتے دیکھا تھا اس لیے یہ اندازہ لگایا کہ وہ کسی اوپری کمرے میں ملے گا۔ میں اندرونی زینے سے اوپر پہنچا تو وہ ایک وسیع کمرے میں بیٹھا ملا۔ اس کے گردہ کے آدمی چاروں طرف بیٹھے تھے اور وہ آب نشاط سے شگل کر رہا تھا۔ اس کے آدمی کارکردگی کی رپورٹ دے رہے تھے اور اس سے ہدایات لے رہے تھے۔

میں نے گامے شاہ کے عقب میں پہنچ کر بوتل اٹھائی اور اس میں دوائے بزدلی کی شیشی انڈیل دی۔ ٹھیک اس وقت گامے شاہ کا گلاس خالی ہو گیا تو اس نے اندازے سے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس کا ہاتھ خالی تپائی سے جا ٹکرایا۔ بوتل وہاں ہوتی تو ملتی۔

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بوتل تپائی سے نہیں اٹھانا چاہئے تھی۔ میں اس پوزیشن میں بھی تو اس میں دوا ملا سکتا تھا۔ یقیناً بوتل فضا میں ناچتی ہوئی دکھائی دے گی اور گامے شاہ اس منظر سے خوف زدہ ہونے کے بعد بوتل کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

میں نے فوراً بوتل صوفی کے پیچھے رکھ دی تاکہ فضا میں لہراتی بوتل پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔

”یہ بوتل کون لے گیا؟“ گامے شاہ نے چونک کر اپنے آدمیوں سے پوچھا۔ اس نے چونکہ سرگھمایا تھا اس لیے میں نے فوراً ہی اسے دوبارہ تپائی پر رکھ دیا۔

”بوتل تو اپنی جگہ پر موجود ہے، شاہ جی۔“ اس کے ایک گروے نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے زیادہ پی لی ہے۔“
”کی بکواس کرنا ایس؟“ گامے نے بھوئیں سیڑ کر کہا۔ ”میں اتنے ای رکھی سی مگر مالوم نہیں کتھے.....“

اس نے تپائی کی طرف اشارہ کر کے بتانا چاہا مگر اس کا ہاتھ بوتل سے ٹکرایا۔ چند لمحوں کے لیے وہ ہکا بکا رہ گیا اور بوتل کو یوں گھورنے لگا، جیسے وہ کوئی غیر مرئی مخلوق ہو۔
”غیر آگئی..... کمال اے۔“

”یہ کہیں گئی نہیں تھی، شاہ جی۔“ اسی گروے نے کہا۔ ”بس آپ.....“
”بس میں کیا؟“ گامے شاہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”کچھ نہیں جی، میں ہی گدھا ہوں
وآپ سے منہ ماری کیے جارہا ہوں..... آپ شغل جاری رکھیں۔“

”وہ تو رکھوں گا ہی پر یہ غائب کہاں ہو گئی تھی؟“ اس نے بوتل اٹھا کر اپنی آنکھوں کے ریب گھمائی پھر پیار بھرے لہجے میں بولا۔ ”میری لال پری..... مجھے ہی ہچکے دیتی ہے۔“
اس اندیشے کے پیش نظر کہ بوتل دوبارہ غائب نہ ہو جائے۔ اس نے پانی ملائے بغیر ٹل سے منہ لگا کر پینا شروع کر دی۔ ”ہاں تو تم شروع رہو۔“ اس نے اپنے آدمی سے کہا۔
پھر اس لڑکی کا کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا جی۔ جامعد کی بس آئی تو وہ اس میں بیٹھ گئی۔ میں کھڑا منہ بکتا رہ گیا۔“
”پھر؟“ گامے شاہ نے دھاردار لہجے میں پوچھا۔ ”تم واپسی پر اس کا پیچھا نہیں کر سکتا
فے؟“

”کیوں نہیں کر سکتا تھا جناب۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”اور میں نے کہا۔ کلاس شام چھوٹی ہے..... میں بس میں بیٹھی اور واپس گھر چلی گئی۔“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں، کھوتے دے پڑ۔ گھر سے چلتی تھی تو اسے گھر ہی واپس جانا تھا
میرے تیرے گھر پر تو نہیں جاسکتی تھی؟ میں پوچھ رہا ہوں کوئی گل بات ہوئی؟“

”آج تھوڑی سی کامیابی ہوئی ہے جناب۔“ رپورٹ دینے والے نے سہمے ہوئے
از میں کہا۔ ”مگر اس سے آزادانہ بات کرتے ہوئے، لگتا ہے۔“

”کیوں؟ کیا وہ ہائی بیل پہنتی ہے۔ اس نے بوتل سے دو تین لمبے گھونٹ لیتے ہوئے
ا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ لال پری اس پر اثر دکھا رہی ہے۔“

”نہیں جی۔ وہ ایک پہلوان کی بہن ہے۔“
”پہلوان؟ کون سا پہلوان؟“ گامے شاہ چونکا۔

صرف وہی نہیں۔ میں بھی قدرے متوجہ ہوا۔ ابھی تک میں نے ان کے مکالموں میں لچپی نہیں لی تھی۔ مگر پہلوان اور اس سے منسوب کی جانے والی لڑکی کی بات سن کر چونک پڑا۔ ایسی ایک لڑکی سے تو میں واقف تھا جو ایک پہلوان کی بہن تھی۔ پھر اس وقت میرے اندیشے کی تصدیق ہو گئی، جب اس نے اپنی ناپاک زبان سے ریشماں کا نام لیا۔

”جگا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ لڑکی ریشماں، جگا کی بہن ہے۔۔۔۔۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس ڈیوٹی پر کسی اور کو لگا دیں۔۔۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلوان مار پیٹ کر میرے چہرے کا نقشہ بگاڑ دیں۔“

”بکواس نہ کر۔۔۔۔۔ کام کرنے سے پہلے ہی زنانیوں کی طرح سے ہائے ہائے کرنا شروع کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ ٹھیکر، کوئی اور ترکیب سوچنا پڑے گی۔“

اس نے بوتل سے دو گھونٹ لیے اور سوچ میں مشغول ہو گیا۔ اس کا سرور بڑھتا جا رہا تھا اس لیے اس نے گنگنا نا بھی شروع کر دیا تھا۔ گنگنا نے کے دوران وہ اپنی کھوپڑی پر انگلیوں سے تال بھی دیتا جا رہا تھا۔ جیسے واقعی دماغ سے کوئی چیز برآمد کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں تجسس میں اس کے قریب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اچانک ساکت ہو گیا اور چونک کر بولا۔ ”یہ زور زور سے سانس کون لے رہا ہے؟ کیوں بے شید ہے؟“

”نہیں، شاہ جی! میں نہیں ہوں۔ میں نے تو سانس بھی نہیں لی۔“ وہ گھگھکیا۔

”کوئی نہ کوئی تو ہے۔“ گامے شاہ نے اسے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھور کر کہا۔

”مجھے ابھی اپنی گردن پر محسوس ہوا ہے۔“

اس دوران میں نادر بانٹتا کانٹا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تقریباً یہی حال اس شخص کا بھی تھا جو مجھے کھانا دینے گیا تھا۔ نادر نے اپنا چہرہ صاف کر لیا تھا۔

”کیوں، کیا بات ہے؟“ گامے شاہ نے اس سے پوچھا۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ صوفی تو غائب ہے۔“

”کیا کہتے ہو؟“ میں نے اسے تین نمبر میں خود بند کیا ہے۔ کہاں جاسکتا ہے، وہ؟“

”آپ، کمالے سے پوچھ لیں جی۔ اس نے کھانے کی ٹرے اٹھائی ہوئی تھی۔ کسی۔

اسے میرے اوپر دھکا دے دیا۔ یہ ٹرے کے ساتھ میرے اوپر اڑام دھڑام۔۔۔۔۔“

”کیوں، کمالے؟“

”نادر صحیح کہہ رہا ہے، شاہ جی!“ کمالے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”صوفی کہاں جاسکتا ہے؟ بڑا پر اسرار ہوتا جا رہا ہے، وہ۔“

”اسے میں نے اپنی امان میں لے رکھا ہے۔“ میں نے حتی الامکان اپنی آواز تبدیل کی اور گونج دار لہجے میں کہا۔

”سک۔۔۔۔۔ کون؟“ گامے شاہ بوکھلا گیا۔

ویسے بھی وہ راجح العقیدہ تھا اور روحانیت سے شغف رکھتا تھا، اس لیے ڈر گیا۔

”میں شاہ طمطر اقل ہوں، جنوں کا بادشاہ۔۔۔۔۔ ابوالعران میرا نیا زمند ہے، اس لیے میں نے اسے رہا کر دیا۔ اب تو سلطان احمد اور جمیل اصغر کو بھی چھوڑ دے۔ وہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”اگر میں انہیں نہ چھوڑوں تو۔۔۔۔۔“ اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس کے قریب جا کر، اس کی گدی پر دوکرارے ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔

پھر ریوالور جیب سے نکال کر، فانوس پر فائرنگ کر دی۔۔۔۔۔ فانوس کے تین بلب چھنکا کے سے ٹوٹ گئے اور اب سب پر شیشے کی کرچیاں برس پڑیں۔ ریوالور چلانے کا یہ پہلا اتفاق تھا مگر اسکے باوجود میں فانوس کو نشانہ بنانے میں کامیاب رہا تھا۔

گامے شاہ اور اس کے گرگے چیختے ہوئے دور ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی آسانی آفت ہے اور وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ گامے شاہ کی حالت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ابتر تھی کیونکہ دوائے بزدلی نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

میں چاہتا تو آزاد ہونے کے بعد، جمیل اور سلطان کو بھی آزاد کر دیتا، لیکن ایسی صورت میں گامے شاہ کا کوئی گرگا، انہیں فرار ہوتے دیکھ لیتا تو آزار پہنچائے بغیر نہ رہتا۔ ممکن ہے، انہیں روکنے کے لیے فائرنگ کر بیٹھتا اور وہ زخمی ہو جاتے۔ لہذا بہتر طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگ خود ان دونوں کو آزاد کرتے اور احترام سے گوشہ کی پھانک تک چھوڑ آتے۔

”یہ گولیاں، فانوس کی بجائے تمہارے جسموں میں بھی پیوست ہو سکتی تھیں۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”نن۔۔۔۔۔ نہیں، شاہ طم۔۔۔۔۔ طم۔۔۔۔۔ قریل!“ گامے شاہ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجئے گا، یہی نام ہے نا، آپ کا؟ کوئی گستاخی تو نہیں ہوئی، اس ناچیز سے؟“

میں نے محسوس کیا کہ وہ فوراً سیدھا ہو گیا ہے۔ بہر حال، دوائے بزدلی بھی کام کر رہی تھی اس وقت میرا نام اس کے لیے مجسم سارس تھا جو کہیں سے سیدھا نہیں ہوتا۔ لہذا میں نے اس کی صحیح ادائیگی پر زور نہیں دیا۔ میرا مقصد اس کے بغیر ہی حل ہونے والا تھا۔

”ہاں کچھ اسی جیسا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر تم اس میں وقت ضائع نہیں کرو اور ان

لوگوں کو جا کر رہا کر دو، ورنہ چاند نکلنے پر ہمارا جلال بڑھ جاتا ہے۔“

”او، نہیں جی، سرکار..... ابھی لو.....“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا..... پھر وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ معلوم نہیں، میں کہاں کھڑا ہوں اور وہ میری طرف بیٹھ کر کے گستاخی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا۔ لہذا سہم کر بولا۔ ”تسی کس پاسے کھلوتے ہو، جناب! میری پوزیشن تو صحیح ہے نا؟“

دوانے بزدلی کے ساتھ ساتھ آب نشاط بھی اپنا جادو جگا رہا تھا۔ اس لیے اس کا ذہن گڈ مڈ ہونے لگا۔ وہ کبھی پنجابی میں اور کبھی اردو میں مخاطب ہو رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب وہ میرے سحر بلکہ میری دہشت میں مبتلا ہے، اس لیے میری ہدایت پر عمل کر ڈالے گا۔ لہذا مجھے وہاں سے چل دینا چاہیے۔ اس گردشی زینے کو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا جو عمارت کے عقب میں تھا۔ لہذا میں عقبی کمروں کی طرف گیا تو ایک جگہ مجھے وہ زینہ دکھائی دیا۔ میں جلدی جلدی اسے طے کرنا لگا..... کیونکہ دوائے غیاب کسی وقت بھی وغا دے سکتی تھی۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ آخری زینہ طے کرتے ہی میں ظاہر ہو گیا اور میرا سایہ زمین پر پڑنے لگا۔ سورج غروب ہو چکا تھا، اس لیے عمارت پر تار کی چھائی ہوئی تھی۔ میں عقبی پھانک سے باہر آ گیا اور نالے میں کود پڑا۔ نالا اس وقت خشک تھا۔ میں کوئی ایک فرلانگ تک اس کے اندر چلتا رہا، پھر سڑک پر آ گیا۔ نالہ پختہ تھا اور اس میں اترنے چڑھنے کے لیے جگہ جگہ زینے بنے ہوئے تھے۔

گھر آتے وقت میں نے اللہ توکل ریسٹوان میں رات کا کھانا کھایا۔ رات کے مینو میں آلو قیومہ تھا۔ میں اسے ہی زہر مار کرنے لگا.....

گامے شاہ کے ٹھکانے پر ہونے والی اٹھائیں اور بھاگ دوڑ سے میرے دست و بازو کھینچ گئے تھے۔ اس لیے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ میں گدھے، گھوڑے اور خیر بیچ کو سویا۔

صبح، آفس جانے سے پہلے سلطان احمد آ گیا۔ وہ میرا بہت احسان مند تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ سرمہ بنا کر مجھے اپنی آنکھوں میں لگا لیتا۔

”پیر بھائی! مجھے یقین تھا کہ جن بادشاہ، آپ کی وجہ سے گامے کے ٹھکانے پر ضرور آئیں گے۔ وہی ہوا۔ انہوں نے آ کر مجھے رہائی دلوا دی گامے کی تو ہوا خراب تھی۔“

”خیر..... خیر، اب جاؤ یہاں سے..... میں، اس وقت آفس جا رہا ہوں..... اور ہاں، اب تم گامے کے ٹھکانے پر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟“

”مگر کس جرم میں؟“

”ایں..... ہاں، جرم.....“ میں نے کھوپڑی کھاتے ہوئے کہا۔ ”تم اس کی حویلی پر

چھاپہ تو مار دو ہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔“

”نہیں بڑے بھائی! وہ بہت خبیث آدمی ہے۔ ایسے گرفت میں نہیں آئے گا۔ تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ آپ کا تعاون..... اور شاہ مظہر ام کا کرم شامل حال رہا تو میں اسے چھوٹی کی طرح گرڈ دوں گا..... آپ دیکھتے رہیے۔“

میں اس سے جان چھڑا کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ بس جلد ہی آ گئی۔ میں اس میں بیٹھ کر نشتر روڈ پر اترا پھر وہاں سے پیدل آفس کی طرف چل پڑا۔ دراصل آفس کے کوئی بک اسٹال نہیں تھا۔ اس لیے اخبار لینے کے لیے مجھے ایک اسٹاپ پہلے اترنا پڑتا تھا۔

میں اخبار کی سرخیوں پر، سرسری نگاہ ڈالتا ہوا، آفس کی طرف جا رہا تھا کہ کسی نے دائیں جانب سے آواز لگائی۔ ”دیتا جا..... دیتا جا، دیا لو.....“ مجھے کچھ دیتا جا۔ دونوں جہاں میں سکھ پائے گا۔“

میں نے اخبار سے نگاہ اٹھا کر دیکھا، وہ وہی بزنس مین فقیر تھا جس نے ایک روز پہلے، میری رحم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر میرے کپڑے لے لیے تھے۔

”دیتا جا، دیا لو..... میرے پاس پہننے کو کپڑا نہیں ہے۔“ اس نے گھگھکیا کر کہا۔ ”معلوم نہیں، وہ مجھے پہچان بھی سکا تھا یا نہیں یا پھر میرے جذبہ، رحم دلی کو ابھار کر، آج پھر کپڑے لینا چاہتا تھا۔“

”نی الوقت تو تمہاری خدمت کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ شام کو یہاں پہنچ جانا۔“ میں نے اخبار کا ایک کونا پھاڑ کر، اس پر سلطان احمد کا پتا لکھتے ہوئے کہا۔

ارادہ تھا کہ سلطان کو فون کر کے اس کے بارے میں ہدایت دے دوں گا اور کہہ دوں گا کہ اسے النالکارا چھی طرح خدمت کرے اور کھایا پیا اگلوائے۔

”ٹھیک ہے، دیا لو! میں ضرور آؤں گا۔“ وہ بولا۔

میں آفس میں داخل ہوا تو سب کی مسکراتی نگاہیں مجھ پر پڑیں مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ آج کسی کو محظوظ ہونے کا موقع نہیں دوں گا۔ اس روز زیادہ کام بھی نہیں تھا۔ بس چند فائلیں ہی کھسکانا پڑیں۔ تاہم دوپہر تک مستعدی سے بیٹھنا پڑا۔ کیوں کہ میری دیانت داری کے مظاہرے کے بعد، اشتیاق صاحب کا حکم تھا کہ کوئی بھی وقت سے پہلے اپنی سیٹ سے نہیں ہلے گا۔ کسی کو چاہئے کہ لئے بھی انھنے کی اجازت نہیں تھی۔

دوپہر کو یاسین کے ساتھ آفس سے نکلا تو اس نے کھانے کے بعد فلم دیکھنے کا پروگرام نالیا۔ رنگ محل میں، ڈاکو کی لڑکی، چل رہی تھی۔ اس میں ایک کتے کا کام بہت اچھا تھا اور فلم دیکھنے کی وجہ وہی بنا تھا۔

”نن..... نہیں..... معاف کرنا۔ وہ نہیں تھی۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ کیونکہ ریشماں نے گلابی پھول دار جوڑا پہن رکھا تھا اور اسی مناسبت سے سوئٹر استعمال کیا تھا۔
”تو پھر.....؟“

”وہ گلابی جوڑے والی ہے۔“
”وہ بھی مناسب رہے گی۔“ اس نے میرے انتخاب پر اطمینان کا اظہار کیا۔ ”لیکن بہتر ہوتا کہ تم پہلے تمام لڑکیوں کو دیکھ لیتے۔“
”کیا مطلب؟“

”ممکن ہے، اس کے بعد کوئی اور اچھی لڑکی نکل آئے اور تمہیں عجلت میں کئے گئے فیصلے پر ندامت ہو۔“

”کیو اس بند کرو، راسپو تین کے چچا!“ میں نے بھویں میڑھی کر کے کہا۔ ”اس کا نام ریشماں ہے اور میں اس کے لیے گزشتہ ساڑھے دو مہینے میں آہیں بھر رہا ہوں۔“
”اف..... اف..... کہاں رہتی ہے، یہ بد نصیب؟“ یاسین نے فاح پڑھنے والے انداز میں کہا۔

”وہ کہاں بد نصیب تو میں ہوں۔“ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔
”کیوں، خیریت؟ کیا کسی تھانے دار کی بہن ہے؟“
”نہیں..... پہلوان کی۔“

”بے، مارے گئے تب تو۔“ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔
”ایک بار مارا بھی کھا چکا ہوں۔“

”کس سے لڑکی سے؟ بڑے خوش قسمت ہو یا ر! ہائے گلابی نازک ہاتھوں میں چمکیلی پاپوش۔“ وہ جھومنے لگا۔

”لڑکی سے نہیں۔ اس کے بھائی سے۔“ میں نے اس کی خوش فہمی دور کی۔
”اے، نہیں، مچھر کی اولاد؟ تیرا تو پراٹھا بن گیا ہوگا؟“

”ہاں، تم میں ہمت ہے تو قسمت آزما کر دیکھ لو۔“ میں نے اسے ٹھوکا دے کر کہا۔ ”راز داں کے رقیب بننے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”لیکن سر پر تو اباندھ کر گھومنا پڑے گا اور سر بازار یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بخشو، میاں۔“
”اے! ہم اسی سرخ چمپر والی کے ساتھ بیچ رہے ہیں۔“ اس نے اپنی موٹر سائیکل اشار کی اور مجھے وہیں چھوڑ کر، سفید چمپر والی کے پیچھے چلا گیا۔ شاید اس بڑے گھر والی کو متوجہ کر کے، اور اپنی قسمت کا دھارا بدلنا چاہتا تھا۔

واپسی پر چھینچ گئے۔ یاسین کا گھر حالاں کہ مخالف سمت میں تھا مگر اس نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر گھر چھوڑنے کی پیشکش کی جو ظاہر ہے کہ میں نے بلا شکرے کے قبول کر لی۔
یاسین نے مین روڈ سے چلنے کی بجائے چھوٹی سڑکوں کو ترجیح دی۔ اس طرح سے راستہ سمٹ جاتا تھا۔ جب اس نے ٹیپو شہید روڈ کا چوراہا کر اس کر کے موٹر سائیکل بائیں جانب موڑی تو ایک بس راستہ روکے دھکائی دی۔ اگر یاسین نے فوراً ہی بریک نہ لگا دیے ہوتے تو موٹر سائیکل اس بس سے ٹکراتی۔ بس تقریباً موٹر پر ہی کھڑی تھی اور اس میں سے طالبات اتر رہی تھیں..... وہ سب کتابوں سے لدی پھندی تھیں اور ان کے چہروں سے پریشانی عیاں تھیں۔

یاسین نے موٹر سائیکل کتر کر نکالنا چاہی تو بس ڈرائیور نے بتایا کہ سڑک پر دو رتک کیلیں پڑی ہیں جس کی وجہ سے بس کے ٹائر پتھر ہو چکے ہیں۔ لہذا بہتر ہوگا کہ ہم کسی اور راستے سے چلے جائیں ورنہ ہم کو اپنی موٹر سائیکل، کاندھے پر لا کر نلے جانا پڑے گی۔
یاسین نے سر ہلا کر موٹر سائیکل موڑی۔ اس دوران میں بس سے کافی لڑکیاں اتر چکی تھیں۔ انہی میں مجھے ریشماں کی جھلک بھی دکھائی دی، چگا کی بہن ریشماں۔
وہی جو میرے دل، دماغ اور احساسات پر قابض تھی، وہی جسے قدرت نے مکمل فرصت میں میرے اور صرف مہرے لیے بنایا تھا، جو میری نیندوں میں نقب لگا کر خوابوں میں چلی آئی تھی۔

”مجھے یہیں اتار دو۔“ میں نے یاسین سے کہا۔

”کیوں.....؟“ وہ چونکا۔ ”کیا سڑک سے کیلیں چنوں گے؟“

”نہیں، یار! وہ دوسری بات ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں اسے بتایا۔

”دوسری بات؟“ اس نے موٹر سائیکل روک کر میری طرف استفہامیہ انداز سے دیکھا۔

”کیا تمہارے یہاں اترنے سے بین الاقوامی سیاست پر خوش گوار اثرات رونما ہوں گے؟“

”نہیں میرے تقفس! وہ ادھر.....“ میں نے ناچار کالج بس کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ، اچھا یہ.....“ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر میرا ہاتھ بھینچا..... ”ان میں سے

کون سی ہے؟“

”وہ، سفید سوئٹروالی۔“

”بہشت..... وہ بھی کوئی لڑکی ہے؟“ یاسین نے ناگواری سے کہا پھر اس نے لڑکیوں

کے ہجوم پر نگاہ دوڑاتے ہوئے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور سرگوشی میں بولا۔ ”میری مانو تو

سفید چمپر والی کو متوجہ کرنے کی کوشش کرو۔ کسی بڑے گھر کی دکھائی دیتی ہے۔“

ریشماں اور دوسری لڑکیوں کے لیے اب گھر جانے کا مسئلہ تھا اور انہیں بس یار کشتہ کرنے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف جاتا تھا جبکہ بس اسٹاپ وہاں سے کافی دور تھا اور راستہ سنسان تھا۔

وہاں کوارٹروں کی دورویہ قطاریں تھیں مگر آگے جا کر ایک میدان بھی پڑتا تھا۔ لڑکیوں نے اپنے تحفظ کے پیش نظر دو، دو، تین تین کے گروپ بنالے تھے۔ ریشماں کے تعاقب میں روانہ ہونے سے قبل کئی بار جگا کا سراپا میرے تصور میں کلبایا مگر میں نے کوشش کر کے اسے جھٹک دیا۔

ابھی میں نے ریشماں کے تعاقب میں گلی ہی طے کی تھی کہ احساس ہوا، دو آدمی اور بھی تعاقب میں آرہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایک پرچون کی دکان پر کھڑے سگریٹ پی رہے تھے..... اور دکان دار سے موسم پر تبصرہ کرتے دکھائی دیے تھے۔

شاید میں انہیں عام سارا نگیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتا لیکن اس وقت میرے دل میں بدگمانی کی ایک لہری پیدا ہوئی جب میں نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ کمالے تھا۔ گامے شاہ کا گرکا، وہی کمالے، جس کو غائب ہو کر میں نے تھوڑا سا پریشان کیا تھا۔

میرا قیاس تھا کہ دوسرا آدمی بھی گامے شاہ کے گروہ سے وابستہ ہوگا۔ اگر وہ اس علاقے میں آلو، پیاز خریدنے آئے تھے تو کوئی بات نہیں لیکن گامے شاہ کی ہدایت کے مطابق ریشماں کا تعاقب کر رہے تھے تو مجھے محتاط رہنا چاہیے تھا۔

کمالے نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا، دیکھ بھی لیتا تو کیا ہوتا؟ وہ مجھے خاطر میں کیوں لاتا؟ اس نے تو رستم کے ہاتھوں میری درگت بننے دیکھی تھی۔ میں اس کے لیے کوئی ہوا تھوڑا ہی تھا کہ وہ مجھ سے مرعوب ہو جاتا۔

ہمیں تعاقب میں دیکھ کر لڑکیوں پر کیا اثر ہوگا۔ اس کا اندازہ ہر شخص لگا سکتا ہے۔ ریشماں کے لیے میرے دل میں سفلی جذبات نہیں تھے مگر یہ بات میری پیشانی پر تو رقم نہیں تھی۔ وہ اس وقت تین افراد کو اپنے تعاقب میں دیکھ کر دہشت کھا رہی ہوگی۔

اس گلی کے اختتام پر میں نے ریشماں کو ٹھہرتے دیکھا..... دوسری لڑکیاں بھی اس کے ساتھ ٹھہر گئی تھیں۔ دوری کے باوجود میں نے اسے اپنے پرس سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر حلق میں کچھ انڈیلے دیکھا۔ خالی شیشی اس نے پرس میں رکھ لی اور پھر چل پڑی۔

میدان شروع ہونے سے پہلے، دونوں لڑکیاں ایک مکان میں گھس گئیں۔ شاید ان کی منزل مقصود وہی تھی..... دوسری لڑکیوں کے گروپ دائیں بائیں مڑ چکے تھے یا پھر آگے نکل چکے تھے۔ وہ اب یکہ و تنہا تھی۔

میدان شروع ہوتے ہی اس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمالے اور اس کا ساتھی بھی تیز چلنے لگے۔ میں ان سب سے پیچھے تھا اور اس ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ اگر وہ دونوں کوئی حرکت کر گزرے تو میں کیا کروں گا؟

اس ”پھر“ میں دماغ پھر کی بنا رہا اور ریشماں میدان کے وسط میں پہنچ گئی۔ دفعتاً دو رکبیں سے ایک کار، جیسی رفتار سے میدان کے دوسرے سرے پر نمودار ہوئی اور بتدریج وسطی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔

اس کار سے ان دونوں کا شاید کوئی خاص ربط تھا..... اس لیے کہ اسے دیکھتے ہی دونوں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کی اور ریشماں کے برابر پہنچ گئے۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یقیناً ان کے ارادے نیک اور نیتیں صاف نہیں تھیں۔ وہ کچھ کرنے والے تھے۔ لہذا میں بھی اضطراری حالت میں دوڑ پڑا۔

کمالے نے جیب سے ایک سفید رومال نکال کر، اس پر کچھ چھڑکا اور ریشماں کی طرف بڑھایا۔ ریشماں کسی ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ سر اسیٹگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے خود کو کمالے سے بچانے کے لیے جھکائی دی لیکن اس کوشش میں اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑی۔ کتا میں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور تک بکھرتی چلی گئیں۔

کمالے نے ایک مکروہ سا قہقہہ لگا کر اپنے کثیف دانتوں کی نمائش کی اور بولا۔ ”بچ کر کہاں جاؤ گی۔“

پھر وہ دونوں اس انداز میں جھکے جیسے اسے گرفت میں لینا چاہتے ہوں۔ سامنے سے آنے والی کار اب بے حد قریب آ گئی تھی۔ کمالے نے ریشماں کی طرف ہاتھ بڑھایا میں تیزی سے آگے بڑھا مگر اس وقت ایک حیرت انگیز بات ہوئی کہ ریشماں اچانک غائب ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

میں اپنی جگہ ٹھنک کر رہ گیا..... پھر ایک لمحے کے لیے تو مجھے اپنی اور ریشماں کی دو طرفہ محبت کا یقین آ گیا۔ یقیناً وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ ورنہ میرے دوائے غیاب کا اس پر اثر کیوں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی کلائی میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ یہ بھی محبت کا کرشمہ تھا۔ کمالے نے اس کی کلائی دبوچی تھی اور تکلیف مجھے ہو رہی تھی۔ آہ..... محبت کس قدر عظیم جذبہ ہے۔ میں سرشار سا ہو گیا..... لیکن پھر میں چونک پڑا..... اور اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پہلے ریشماں غائب ہوئی تھی اور اب کمالا، اس کا ساتھی، کار، زمین، آسمان..... پورا کا پورا منظر ہی غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کچھ دیر لگی کہ درحقیقت ہر چیز تو اپنی جگہ موجود ہے۔ البتہ میری بینائی غائب ہو گئی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں

طرف دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر میں سب کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر، جہاں تھا، وہیں اکڑوں بیٹھ گیا۔ کتنا بڑا المیہ تھا۔ میری ریشماں اغوا ہو رہی تھی اور میں اپنی پینائی کا ماتم کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تقدیر ہمیشہ کسی اہم موڑ پر ہی مجھ سے دغا کرتی تھی۔

ایک ایک مجھے دوائے غیاب کا خیال آ گیا۔ میں تقدیر کو بلاوجہ برا بھلا کہہ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اسی دوا کا کیا دھرا ہے۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ دوا میں نے استعمال کب کی تھی۔ لیکن گزشتہ دو روز میں مجھے ایسا ایک بھی موقع یاد نہ آیا۔ البتہ صبح میں نے آنکھ میں آئی ڈراپس ڈالے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈراپس کی شیشی میں کسی طرح دوائے غیاب پہنچ گئی ہو۔ یقیناً یہی بات تھی۔ دوا غائب کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ آنکھوں میں ڈالنے کی صورت میں وہ یقیناً پینائی غائب کر دیتی۔ نہ جانے کتنی دیر ہوگئی۔ میں ویسے ہی اکڑوں بیٹھا رہا۔ بار بار منہ اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا۔ ایسی ہی ایک کوشش کے دوران بالآخر مجھے آسمان کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی گئی۔ پھر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بینائی بحال ہوگئی تھی۔ لیکن میدان صاف ہو چکا تھا..... مجاورتا نہیں حقیقتاً..... یعنی میدان خالی پڑا تھا..... نہ تو وہ کار تھی اور نہ ہی میری کائنات، ریشماں تھی اور نہ وہ خبیث کملا اور اس کا سا بھی۔ میری موجودگی میں میری دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رو پڑوں، لیکن پھر مجھے اپنی مردانگی کا خیال آیا اور میں نے رونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ مجھے اس سلسلے میں تیزی سے کوئی قدم اٹھانا چاہئے تھا۔ ریشماں..... میری محبت..... میری کائنات خطرے میں تھی۔

میں پلٹا اور تیز قدم اٹھاتا مکانوں کے اس سلسلے کی طرف چل دیا۔ جو میدان کے ایک طرف نظر آ رہا تھا۔ وہاں مجھے ٹیلی فون تلاش کرنا تھا تاکہ پولیس کے اغوا کی اطلاع دے سکوں۔ ریشماں کی فوری بازیابی بے حد ضروری تھی۔ میں تیز تیز چلتا رہا۔ مجھے کیچڑ کا احساس اس وقت ہوا، جب میرا پاؤں رپٹ گیا اور میں چاروں شانے چت کیچڑ میں گر پڑا۔ اٹھنے کی کوشش میں ایک مرتبہ پھر پھسلا اور اس بار میرا منہ اور دونوں ہاتھ بری طرح کیچڑ میں لٹھڑ گئے۔ عجیب مصیبت تھی۔ جتنی جلدی تھی..... اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ جیسے تیسری میں نے ردی اخبار کے ٹکڑوں سے اپنے ہاتھوں اور منہ کو صاف کیا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے کیچڑ میں لت پت ہو رہے ہیں لیکن اس وقت یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

گلی میں آ کر میں نے کوئی ایسا مکان تلاش کرنا شروع کیا، جہاں ٹیلی فون موجود ہوتا۔ میں ہر دروازے پر نیم پلیٹ دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ نام آدمی کے بارے میں بہت کچھ

بتا دیتے ہیں۔ رستم علی کے دروازے پر دستک دینا مناسب نہیں تھا کیونکہ مجھے ایک رستم کا پہلے ہی تجربہ ہو چکا تھا۔ سمندر خان کو بھی میں نے نظر انداز کر دیا کیونکہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ بالآخر مجھے اپنے مطلب کا ایک نام نظر آ ہی گیا۔ اشک گورکھپوری۔ دراصل اس سلسلے میں میری ایک مخصوص حس کام کرتی تھی، جس پر مجھے اندھا دھند بھروسہ تھا۔

میں نے کال پر انگلی رکھ دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور دس بارہ سالہ ایک لڑکے نے دروازہ کھول کر میرا سر تاپا جائزہ لیا۔ اس کا اندازہ ایسا تھا کہ میں بوکھلا گیا۔ ”بابا معاف کرو۔“ لڑکے نے کہا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

”ٹھہرو۔“ میں نے کہا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا کہ کم بخت مجھے بھکاری سمجھ رہا ہے۔ لیکن مجھے ہر قیمت پر ٹیلی فون کرنا تھا۔

لڑکا ٹھک گیا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس کے تیرے بے حد خراب تھے۔

”کون ہے منے؟ کیا بات ہے۔“ اندر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ مخاطب لڑکے کو کیا گیا

تھا۔

”ابی جان..... کوئی فقیر ہے.....“ لڑکے نے جواب دیا۔

یہ سن کر میں آپے سے باہر ہو گیا۔ ”میں فقیر نہیں ہوں۔“ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں اشک صاحب سے ملنے آیا ہوں۔“

لڑکے کی نظروں کی سختی کچھ کم ہوگئی۔ ”بکسل لکھنوی ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر عبداللہ کا شمیری ہوں گے؟“

”نہیں، میں.....“

”اوہ اچھا..... پھر آپ یقیناً انجمن نقطا باہمی کے دفتر سے.....“

”ارے منے۔“ اندر سے وہی آواز سنائی دی۔ لہجے میں سختی تھی۔ ”تفتیش کیے جا رہا ہے۔ تجھے میں ڈاکٹر بنانا چاہتا ہوں اور تو سراغ رساں بننے کے درپے ہے۔ کہہ کیوں نہیں دیتا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔“

”نہج..... جی..... ابی جان گھر پر نہیں ہیں۔“ لڑکے نے ہکلا کر انکشاف کیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے بہ آواز بلند کہا۔ ”میں جا کر آہ بریلوی کا انٹرویو کر لیتا ہوں۔“

”ارے..... ارے منے..... او مردود۔“ اندر سے حسب توثیق پکارا گیا۔ ”ارے.....“

انہیں جلدی سے بڑی عزت کے ساتھ اندر لے آ، نام معقول۔ اگر انکی شان میں کوئی گستاخی

ہوئی تو کھال اتار دوں گا، تیری۔“

لڑکے کے چہرے کے تاثرات یک لخت تبدیل ہو گئے۔ اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور بولا۔ ”آئیے جناب..... تشریف لائیے۔“

میں اپنی کچڑ آلود تشریف سمیت دروازے سے گزرا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے ٹیلی فون انسٹرومنٹ کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا، جو صوفے کے ساتھ ایک تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ پھر میری نگاہ اس عجوبے پر پڑی جو گاؤں کے لگائے بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ ایک بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا۔ جس پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور قطار اندر قطار تین گاؤں تک رکھے تھے۔ انہی میں سے ایک کے ساتھ ٹیک لگائے وہ صاحب بیٹھے تھے ان کا قد بمشکل پانچ فٹ رہا ہوگا۔ اور چوڑائی..... اللہ جھوٹ نہ بلوائے کم از کم دوفٹ ہوگی۔ وہ ویسے بھی گول ہی ہوں گے، لیکن بیٹھے ہوئے تو گول منول لگ رہے تھے۔

”آ..... آپ ہی اشک صاحب ہیں؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ ویسے مجھے ان کے اشک ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اشک گول ہی تو ہوتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ انہیں کس کی آنکھ کا اشک سمجھا جائے۔ ہاتھی کو میں جانوروں کی دنیا کا برا عظیم ایشیا قرار دیتا ہوں۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ اس کی آنکھیں رقبے کے اعتبار سے چچو کی ملیاں کے ریلوے اسٹیشن سے بھی چھوٹی ہوتی ہیں۔ اگر اشک صاحب کو ہاتھی کی آنکھوں میں ٹھونسنے کی کوشش بھی کی جاتی تو وہ بے چارہ محض آنکھیں بھننے کی وجہ سے مر جاتا۔ ڈینوسار کے متعلق غور کیا تو یہ چلا کہ اس کی آنکھیں بھی چھوٹی ہوتی تھیں۔ خدا جانے اس میں بھی کوئی راز ہی ہوگا۔ ہر عظیم الجثہ جانور کی آنکھیں چھوٹی..... دور کیوں جائے..... خود اشک صاحب کی آنکھیں بھی ایسی تھیں کہ انتہائی مختصر آنسو بھی ان میں سے پھنس کر نکلتے ہوں گے۔

”جی ہاں..... خاکسار کو ہی اشک گورکھ پوری کہتے ہیں۔“ انہوں نے جواب دے کر مجھے چونکا دیا۔ ”آپ کس پرچے کی نمائندگی کرتے ہیں۔“

”میں ہفت روزہ خیرات کی طرف سے حاضر ہوا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ اشک صاحب مایوس نظر آنے لگے۔ ”خیر..... ٹھیک ہے۔“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”فوٹو گرافر کو لائے ہیں، آپ؟“

”جی..... فوٹو گرافر؟ جی وہ بھی آجائے گا۔“ میں نے بات بنائی۔ ”دراصل یہ یقین نہیں تھا کہ آپ گھر پر ملیں گے۔ اس لیے میں تنہا چلا آیا کہ اگر آپ موجود ہوئے تو ٹیلی فون کر کے فوٹو گرافر کو بلوالوں گا۔“

”یعنی آپ میری موجودگی کی تصدیق کرنے آئے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے انکسار سے جواب دیا۔

”مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔“

”کیا سمجھ لینا چاہیے تھا۔“

”یہی کہ آپ چیرا سی ہیں۔ حلیہ خود بتا رہا ہے۔“

”جی..... میں چیرا سی نہیں ہوں۔“ میں نے بے حد غصے سے کہا۔ ”میں رپورٹر ہوں۔ اجازت ہو تو دفتر ٹیلی فون کر کے فوٹو گرافر کو بلوالوں۔“

انہوں نے بے نیازی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ دل ہی دل میں میں نے تہیہ کر لیا کہ دوائے غیاب استعمال کر کے کسی دن ان کا دماغ ضرور درست کروں گا۔ انہوں نے میری بہت توہین کی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میری بینائی غائب ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فیصلہ کیا کہ اب دوائے غیاب آئی ڈراپس کی شیشی میں بھی ساتھ رکھوں گا تاکہ ان جیسے لوگوں کی بینائی اور سماعت وغیرہ حسب توفیق غائب کر سکوں۔

میں نے پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ ملنے پر ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

”سلطان صاحب ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”میں ابوالعمران ہوں۔ مجھے ان سے ضروری کام تھا۔“

”وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔“

دوسری طرف رابطہ منقطع ہو گیا، لیکن میں ریسور لیسے کھڑا رہا۔ ”فوٹو گرافر کو بھیج دیجیے۔“ میں نے کہا اور پھر کچھ سننے کی اداکاری کرتے ہوئے مزید کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔ پھر بھی سہی۔“ یہ کہہ کر میں نے ریسور رکھ دیا۔

اشک صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”ہمارے فوٹو گرافر نے ایک کتے کو کاٹ لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ اشک صاحب بے حد مایوس نظر آنے لگے۔ ”لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں کل کسی اور فوٹو گرافر کو لے آؤں گا۔“ میں نے ان کی اشک شوق کی۔

”ضرور تشریف لائیے گا۔“ ان کے لہجے میں بے تاب تھی۔ ”اور میری باتوں کو مانتا نہ کیجیے گا۔ غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے۔“

میں پھر چڑ گیا۔ ”جی ہاں..... میں بھی آپ کو پہلی نظر میں مزاحیہ شاعر توپ چوکودی سمجھا تھا۔“

ان کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا

دروازے کی طرف پڑھ گیا۔
”ارے ٹھہریے..... میں نے آپ کو چائے والے کو تو پوچھا ہی نہیں۔“ انہوں نے پکارا۔

”جلدی سے پوچھ لیجیے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بہت جلدی ہے۔“

”آپ چائے پیئیں گے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں شکریہ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پھر کبھی سہی۔“ یہ کہہ کر میں دروازے سے نکل آیا۔

اب میرا رخ بس اسٹاپ کی طرف تھا۔ مجھے جلد از جلد سلطان کو ریشماں کے اغوا کی اطلاع دینا تھی۔ بس اسٹاپ پر میں بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ بس آئی، اس میں رش بہت تھا، لیکن میں کسی نہ کسی طرح چڑھ ہی گیا۔ خوش قسمتی سے، جہاں میں کھڑا تھا وہیں ایک نشست خالی ہو گئی اور مجھے بیٹھنے کا موقع مل گیا۔

اگلے اسٹاپ پر ایک بام بیچنے والا بس پر چڑھا اور اس نے فوراً ہی لمبھے دار تقریر شروع کر دی۔ ”حضرات..... میں آپ کی خدمت میں پندرہ سال سے آشوب چشم بام پیش کرتا آیا ہوں۔ سر میں درد ہو، ذرا سا بام اپنے پوٹوں پر لگائیے۔ انشاء اللہ درد پانی بن کر بہہ جائے گا۔ نزلہ، زخام، دو منٹ میں کھینچ کر رکھ دے گا۔ یہ بام ہر میڈیکل اسٹور پر دروپے کا ملتا ہے، لیکن میں کمپنی کی مشہوری اور آپ کی فلاح و بہبود کی خاطر صرف ڈیڑھ روپے کا دیتا ہوں۔ آزمائش شرط ہے، لیکن پہلے میں آپ کو تجربہ کر کے دکھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

میں نے بس کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مجھے اگلے اسٹاپ پر اترنا تھا۔ پھر میں بام بیچنے والے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بھی میری طرف متوجہ تھا۔ اس نے بام کی شیشی کھولی اور انگلی پر تھوڑا سا بام لگایا۔ پھر اس نے شیشی بند کر دی۔ ”ہاں..... تو حضرات، میں جھوٹا نہیں ہوں۔ پندرہ سال سے ان بسوں میں بام بیچ رہا ہوں۔ آزمائش شرط ہے۔ ان صاحب کی طرف دیکھیے۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا اور میرے قریب آ گیا۔ ”یہ زخام اور سردرد کے دائمی مریض ہیں، ابھی میں ان کے بام لگاؤں گا اور آپ دیکھیں گے کہ درد پانی بن کر بہہ جائے گا۔“

”میں ہرگز.....“ میں تردید کرنا چاہتا تھا، لیکن اس نے نہایت پھرتی سے آگے بڑھ کر میری آنکھوں کے پوٹوں پر بام مل دیا۔ بام کا لگنا تھا کہ دنیا میری نگاہوں میں اندھیر ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے پسلی ہوئی مریضیں میری آنکھوں میں جھونک دی ہوں۔ شدید جلن ہو رہی تھی۔

”دیکھا حضرات۔“ اس مردود کی آواز سنائی دی۔ ”دیکھیے..... درد بہہ رہا ہے.....“ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا پورا وجود پانی بن کر بہہ جائے گا۔ میرے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ میں اس بد بخت کو لتاڑنا چاہتا تھا لیکن شدید جلن کی وجہ سے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

”تو حضرت..... بام کی شیشی کی قیمت ڈیڑھ روپیہ..... صرف ڈیڑھ روپیہ..... جی ہاں، ڈیڑھ روپیہ..... اور یہ ڈیڑھ روپیہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ دن بھر میں دسیوں روپے آپ پان کھا کر تھوک دیتے ہیں..... سگریٹ پی کر پھونک.....“

اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں بس اسٹاپ نہ نکل جائے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اندازے سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔ ”بھائی صاحب، مجھے اورنگ آباد اترنا ہے اور مجھے کچھ خطر نہیں آ رہا ہے۔ پلیز میری مدد کریں۔“ میں نے فریاد کی۔

”حضرات یہ آشوب چشم بام.....“ وہ خبیث بام والا اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھا۔

جیسے تیسے مجھے بس سے اتارا گیا اور بس آگے بڑھ گئی۔ اب میرے سامنے ایک اور سنگین مسئلہ تھا۔ مجھے سڑک پار کرنا تھی۔ ادھر آنکھوں کا یہ حال تھا کہ لگتا تھا، پانی بن کر بہہ جائے گی۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حد نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں کسی سمندر میں ڈوبا ہوا ہوں۔ جلدی نہ ہوتی تو میں اطمینان سے رک کر پینائی بحال ہونے کا انتظار کرتا۔ پھر مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی، جو میری طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے ہی آہٹ قریب پہنچی، میں نے ہاتھ بڑھایا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ آ گیا۔

”بھائی..... مہربانی کر کے مجھے سڑک پار کروادو۔“ میں نے گڑگڑا کر کہا۔

”بائیں مرگوگ۔“ کسی نے پوچھے منہ سے کہا اور ساتھ ہی میری کمر پر ڈنڈا پڑا۔ ”مجھ

انگھے کا مذاق اڑاتا ہے۔“

تب مجھے احساس ہوا کہ قدموں کی آہٹ کے ساتھ چھڑی کی آواز بھی تھی۔ میں کسی

اندھے بابا سے سڑک پار کرانے کی فرمائش کر بیٹھا تھا۔

”مم..... میں.....“ میں ہکا کر رہ گیا۔

”چھوڑیے باباجی..... ایسے بد بختوں سے خدا ہی سمجھے گا۔ کسی نے کہا۔ آئیے، میں آپ

کو سڑک پار کروادوں گا۔“

میں سراپا سماعت بن گیا۔ بڑے میاں کی چھڑی کی آواز کے پیچھے چلتے چلتے بالآخر میں

نے سڑک پار کر لی، لیکن اب آگے بڑھنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ذیلی سڑک پر

سائیکلس بکثرت چلتی تھیں اور سائیکل چلانے والے حد درجہ لا پرواہ ہوتے ہیں۔ اب مجھے بیہوشی

کی بحالی کا انتظار کرنا ہی تھا۔ میں کچھ ٹول ٹول کر اور کچھ اندازے سے ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ عجیب ستم ظریفی تھی، میں اپنی قسمت کو رو بھی نہیں سکتا تھا۔ آنکھیں تو ویسے ہی بندے جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اس مصیبت سے فارغ ہوتے ہوتے میرے جسم میں پانی بچے گا ہی نہیں۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا اور آنکھیں بہتی رہیں۔ آہٹوں سے پتہ چلتا کہ میرے سامنے سے لوگوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ سر جھکائے منہ چھپائے بیٹھا رہوں۔ وہ میری بستی تھی اور گزرنے والوں میں بیشتر میرے جاننے والے ہوں گے۔ مجھے اس حال میں دیکھیں تو نہ جانے کیسے کیسے افسانے تراشیں۔ کبھی کبھار بے ساختہ ایک طویل سرد آہ بھی میرے منہ سے نکل جاتی تھی۔

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ قدموں کی آہٹوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک جھکار بھی شامل ہو جاتی ہے، لیکن میں اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

ظاہر ہے، باقاعدہ اندھا تو تھا نہیں کہ میری سماعت کی خصوصی تربیت ہوئی ہو۔ پھر آتے جاتے لوگوں کے فقرے بھی پلے پڑنے لگے اور میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

”ہے ہے بے چارہ..... چیخ چیخ۔“

”اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔“

”عزت دار معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔ کیسے منہ چھپائے بیٹھا ہے۔“

”اور زار و قطار روئے جا رہا ہے۔“

”پیٹ بڑا پاپی ہے، بھائی۔“

”خدا دشمن کو بھی ایسا وقت نہ دکھائے۔“

آخر دو جملے سن کر میرے کان کھڑے ہوئے، لیکن انسان کے کان آبدوز کے رڈار تو ہوتے نہیں۔ چنانچہ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ ایک اور بڑی مصیبت میری منتظر ہے اور جب پتہ چلا تو حد ہو گئی۔

خدا ہی جانے، مجھے اس حال میں بیٹھے ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے پانی تو بند ہو گیا، لیکن اب ناک بری طرح بہہ رہی تھی اور حلق میں خراش سی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں اب بھی جلن ہو رہی تھی۔ تاہم کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا۔ اس کچھ کچھ نظر آنے میں بھی جو کچھ نظر آیا، مجھے بھونچکا کر دینے کیلئے کافی تھا۔ میں سنائے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔ میرے سامنے چھوٹے بڑے سکوں کا خاصا انبار لگ گیا تھا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اصل مصیبت تو ابھی باقی تھی۔ میں احمقوں کی طرح سکوں کو دیکھے جا رہا تھا کہ کسی نے پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”بس اک

نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا۔“ کسی نے دباڑ کر کہا اور میرا گریبان تھام کر مجھے کھڑا کر دیا۔ میں نے اس شخص کا جائزہ لیا۔ وہ بے حد تندرست و توانا اور تو ندیل تھا۔ اس کے چہرے پر کم از کم ایک ہفتے کی شیونجی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میرا گریبان اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

”کک..... مم..... مطلب۔“ میں نے گریبان چھڑانے کی کوشش کی، لیکن گریبان پر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔

”مطلب پوچھ رہا ہے، کتنی معصومیت سے۔“ وہ دھاڑا۔ ”ابے..... میں چائے پینے کے لیے گیا تھا..... کوئی مروت تو نہیں گیا تھا۔ بس ملٹ لگے ہوں گے۔ واپس آیا تو پتہ چلا کہ بیٹا نے میرے ٹھیکے پر ہاتھ صاف کر دیا۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں۔“

”ابے..... دس سال سے بیٹھ رہا ہوں یہاں۔“

اب میں نے اسے پہچانا۔ وہ منٹا فقیر تھا اور واقعی ہمیشہ یہیں بیٹھتا تھا۔ اس وقت اس نے اسی ہاتھ سے میرا گریبان تھام رکھا تھا۔

”لیکن تم تو نئے تھے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں تھا..... پھر؟ ابھی وہی ہاتھ دوں گا، تجھے۔“ اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے دھمکی دی۔

”میری..... میری بات تو سنو۔“

”بات وات چھوڑ..... میں کہتا ہوں دفع ہو جا یہاں سے..... اور آئندہ نظر مت آئیو ورنہ جان سے مار ڈالوں گا..... اور ہاں..... اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا تجھے۔“

”مجھے چاہئیں بھی نہیں۔“ میں نے کہا اور دفع ہو جانے کا ارادہ بھی کر لیا، لیکن مصیبت اتنی آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔

”خیال ہو رہا ہے یہ؟“ کوئی اور دھاڑتا ہوا بیچ میں کود پڑا۔

میں نے اور اس فقیر نے جس کا قسمت نے مجھے کاروباری حریف بنا دیا تھا۔ بیک وقت چونک کر دیکھا۔ کم از کم میری توجہ ہی فنا ہو گئی۔ ایک پولیس والا ہماری طرف بڑھا۔ ساتھ ہی میں نے ان لوگوں کو دیکھا، جو پان کی دکان پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں کئی شناسا چہرے بھی تھے۔

”وہ..... وہ سنتری بادشاہ، یہ شخص یہاں کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔“ منٹے فقیر نے شکار کی۔

”نہیں جی..... میں تو.....“ میں نے کہنا چاہا لیکن نئے فقیرے میری بات کاٹ دی۔
”سنتری جی..... یہ ثبوت دیکھ لیجیے۔“ اس نے سکوں کی طرف اشارہ کیا۔

”پر، یہ تو تیرا ٹھکانا ہے دینو۔“

”ہاں سنتری بادشاہ۔“ فقیر نے کہا۔ ”بس جی..... میں چائے پینے گیا تھا۔ بیس ملٹ

لگے ہوں گے، مجھے یہ قبضہ جما بیٹھا۔“

”میری بھی تو سیس۔“ میں نے فریادی۔

”بکوس مت کر، اوئے۔“ سنتری دباڑا۔ ”وہ پھینٹی لگے گی تھانے میں کہ یاد کرے گا۔

جانتے نہیں، بھیک مانگنا جرم ہے۔“

مجھے پسینہ آ گیا۔ ”لیکن..... لیکن میں.....“

”میں کہتا ہوں چپ کر جا۔“ پولیس والے نے کہا اور پھر سکوں کی طرف دیکھا۔ اس کی

آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”اوئے دینو..... گنتی تو کر ذرا۔“ اس نے نئے فقیر کو حکم دیا۔

نئے فقیر نے بڑی سعادت مندی سے رقم گننا شروع کر دی۔ وہ سکوں سے ایک ایک

روپے کی ڈھیری بنا کر الگ رکھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گنتی مکمل ہو گئی۔ اتنی دیر میں پانی پانی ہوتا

رہا۔ مجھے تماشاخیوں کی نگاہیں نیزوں کی طرح اپنے جسم میں جھپتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کاش،

اس وقت دوائے غیاب میرے پاس ہوتی اور میں دنیا کی نظروں سے چھپ جاتا۔ دوائے

غیاب کا اصل مصرف تو میری سمجھ میں اس وقت آ رہا تھا۔

”جو ایس روپے ساٹھ پیسے ہیں بادشاہ۔“ فقیر نے اعلان کیا۔

”ہاں میں جو ایس روپے ساٹھ پیسے۔“ پولیس والے نے حیرت سے دہرایا۔ ”اور یہ

صرف بیس منٹ کی کمائی ہے؟“

”جی ہاں جناب۔“ فقیر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

”میری بھی تو.....“ میں نے پھر کہنا چاہا۔

”ابھی چپ رہو۔ تم سے بھی بات کروں گا۔“ اس بار پولیس والے کا لہجہ نرم تھا۔ ”ہاں

دینو؟“ وہ فقیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”وہ جی سنتری بادشاہ۔“ فقیر گڑ بڑا کر بولا۔ ”یہی تو دھندے کا ٹیم ہوتا ہے۔“

”میں نہیں مانتا۔“ پولیس والے نے کہا۔ ”تو دھندے کے وقت چائے پینے والوں میں

سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے، تو بے ایمانی کرتا رہا ہے۔“

”قسم لے لو سنتری جی، میں.....“

”اچھا بس کر۔ مجھے اس سے بات کرنے دے۔“

پولیس والے نے کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہاں، اب بتا..... فل ٹائم کرے گا یا پارٹ ٹائم؟“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

”یہ غلط بات ہے سنتری جی۔“ فقیر نے احتجاج کیا۔ ”یہ میرا ٹھکانا ہے۔“

”ہاں..... اور میں نے ہی تجھے دیا ہے۔“ پولیس والے نے کہا۔

”میں پتی دیتا ہوں۔“ فقیر بولا۔

”یہ اس سے زیادہ دے گا۔ ایک..... دو..... تین..... بولی ختم۔“

اب میری سمجھ میں اس کا مقصد آیا۔ غصے اور شرمندگی سے میرے کان تک گرم ہو گئے۔

”کیا بکواس ہے؟“ میں چیخا۔

”ہاں..... بھکاری ہو کر اونچا بولتا ہے۔“ پولیس والے نے حیرت سے کہا۔ پھر ایک

لخت برہم ہو گیا۔ ”سیدھی سیدھی بات کر مجھ سے۔ پارٹ ٹائم کرے گا یا فل ٹائم..... اور دے گا

کیا؟“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔ میں فقیر نہیں ہوں۔“

”تو کیا یہ نوابی کی نشانیاں ہیں؟“ پولیس والے نے سکوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ باوا

جان کا وظیفہ ہے کیا؟“

”مم..... میں تو..... یقین کرو، میں فقیر نہیں ہوں۔“ میں جانتا تھا کہ سچی بات بتانے کا

کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

”تیری مرضی۔ میں تو تجھے موقع دے رہا تھا، بزنس کا۔ ویسے ہنر ہے تیرے پاس۔ اتنا تو

وینودن بھر میں بھی نہیں کماتا۔“

”تو میں جاؤں؟“ میں نے پوچھا۔

”جائے گا کہا۔ تجھے تو تھانے لے کر جاؤں گا اور بھیک مانگنے کے جرم میں پھینٹی لگاؤں

گا۔“

”لیکن میں نے بھیک نہیں مانگی..... میں تو.....“

”سب یہی کہتے ہیں۔“

”دیکھو بھائی سنتری صاحب۔ مجھے تھانے مت لے کر جاؤ۔“ میں نے التجا کی۔ میں

عزت دار آدمی ہوں۔“

”بس پھر ایک ہی ضرورت ہے۔ مجھ سے معاہدہ کر لے اور دھندے سے لگ جا۔ کر

بھلا، ہو بھلا۔“

”بکواس مت کرو۔“ میں ضبط کرنے کے باوجود گرج اٹھا۔

”اچھا بیٹا..... یہ تیور ہیں..... دینو..... پکڑ لے اسے۔ بھاگنے نہ پائے۔ میں ذرا پیسے سمیٹ لوں۔“ اس نے فقیر سے کہا، جو مجھے کینہ تو زنگیوں سے دیکھے جارہا تھا۔ پولیس والے کا حکم سنتے ہی اس نے مجھے دبوچ لیا۔ سپاہی نے روپے اٹھائے اور دینو کو وہیں کھڑے رہنے کی ہدایت کر کے پان کی دکان کی طرف چلا گیا۔ چند لمبے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دس دس کے چارنوٹ تھے۔ وہ نوٹ اس نے نہایت اطمینان سے اپنی جیب میں رکھ لیے۔ پھر جیب سے ایک رومال نکال کر بقیہ چار روپے ساٹھ پیسے اس میں لپیٹ لیے۔

”دیکھ، بے دینو..... تو گواہ ہے، یہ بھیک مانگ رہا تھا اور یہ ہے اس کی کمائی۔“ اس نے رومال والے پیسے ہلائے۔

”میں سمجھ گیا مائی باپ۔“ دینو گڑا لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ پھر اکڑا لیا تھا، جیسے ٹٹا ہو۔

سپاہی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پھر سوچ لے سائیں۔ فائدے میں رہے گا۔“ اس نے پیش کش کی۔

”بکواس مت کرو۔ لے چلو مجھے تھانے۔“ میں نے گرج کر کہا۔ مجھے خیال آ گیا کہ مجھے تھانے ہی تو جانا تھا۔

پولیس والے نے مجھے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ ”چلا بیٹا..... تجھے بھی پتہ تو چل جائے کہ پھینکی کیا ہوتی ہے۔“

میں نے کچھ جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ دینو بھی ساتھ ساتھ تھا۔ تھانے کے دروازے میں داخل ہوتے ہی سلطان سے سامنا ہو گیا۔ مجھ پر اس نے سرسری نگاہ ڈالی۔ اس کی توجہ کا مرکز پولیس والا تھا۔

”او، رحیم..... کیا کرتا پھر رہا ہے تو؟“ سلطان نے اسے ڈپٹ کر پوچھا۔

سپاہی نے جھٹ اسے سلیوٹ کر ڈالا۔ ”ڈیوٹی کر رہا ہوں سرجی۔ یہ اورنگ آباد کے بس اسٹاپ پر بھیک مانگ رہا تھا۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ جو دوسرا ہے، یہ گواہ ہے۔“

سلطان نے میری طرف غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”ارے پیر بھائی، تم۔“ اس نے بے ساختہ لہک کر کہا۔ سپاہی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، لیکن فوراً ہی حسب سابق سلطان کے تیور بدل گئے۔ ”تم..... بھک مانگنے..... میں تمہارے دماغ کے کیڑے یوں جھاڑوں گا جیسے بستر سے گرد جھاڑی جاتی ہے۔ سیدھے کھڑے ہو جاؤ..... ادب کے ساتھ۔“

میں بوکھلاہٹ میں بالکل الف ہو گیا۔ ”میری بات تو سنو سلطان بھائی۔“ میں نے فریاد کی۔ ”انہیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”بس، خاموش ہو جاؤ۔ ابھی ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔“ وہ دہاڑا۔ ”اندر لے چلو انہیں۔“

وہ آگے آگے چلا گیا۔ رحیم نامی وہ سپاہی مجھے دھکیلتا ہوا سلطان کے کمرے میں لے گیا۔

”ہاں، اب سناؤ کیا قصہ ہے۔“ سلطان نے اپنی آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

سپاہی نے اپنا آنکھوں دیکھا افسانہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کر دیا۔ منٹا فقیر اس کی ہر بات پر..... بے حد خشوع و خضوع سے سر ہلاتا رہا۔ جب کہ میں انٹروں سے پہلے کی کہانی سنانے کے لیے بے چین تھا، جس سے وہ سب بے خبر تھے، لیکن مجھے بولنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ بالآخر رحیم چپ ہو گیا۔ پھر اس نے رومال کھول کر وہ نامعقول ریزگاری سلطان کے سامنے رکھ دی، جو مجھے بن مانگے ملی تھی۔

”ہاں..... تو اب کیا کہتے ہو۔“ سلطان میری طرف متوجہ ہوا۔

”پہلی بات تو یہ کہ یہ رقم نامکمل ہے۔“ میں نے کہا۔

سپاہی کا رنگ فق ہو گیا۔ ”سرجی..... یہ ایویں بکواس کرتا ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”خاموش رہ..... اسے بولنے دے۔“ سلطان نے اسے ڈانٹ دیا۔

”اس میں سے چالیس روپے کی ریزگاری اس نے نکال کر فقیرے پان والے سے دس دس کے چارنوٹ لیے جواب بھی اس کی جیب میں ہیں۔“

سلطان نے گھور کر رحیم کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ”اپنی جیبیں خالی کر دے۔“ سلطان نے کہا۔ رحیم نے اپنی جیبیں خالی کر دیں۔ دس کے چارنوٹوں کے علاوہ اس کے پاس سے دو روپے پچھتر پیسے اور کچھ مڑے تڑے سے کاغذ برآمد ہوئے تھے۔

”اور.....“ سلطان نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور یہ کہ یہ جو گواہ ہے، یہ منٹا فقیر بن کر اسی جگہ بھیک مانگتا ہے اور اس رحیم کو اس میں سے پتی بھی دیتا ہے۔“

”ارے واہ۔“ سلطان نے قہقہہ لگایا۔ ”اور تم اس غریب کی جگہ پر قبضہ کر بیٹھے۔ واہ بھائی واہ۔“ میں مسکرا دیا، لیکن مجھے مسکراتا دیکھ کر سلطان کا مزاج پھر برہم ہو گیا۔ ”اوئے..... سیدھے کھڑے رہو..... سمجھ۔“ اس نے گرج کر کہا اور میں فوراً مٹین شن ہو گیا۔

”ہاں..... تم سناؤ مجھے فقیر۔“ اب وہ دینو کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیا نام ہے تیرا؟“
 ”دینو..... سرکار۔“ دینو گھگھایا کر بولا۔ ”بس صاحب میں چائے پینے کے لیے گیا تھا۔
 بیس ملٹ لگے ہوں گے۔ اس نے میری جگہ بٹھالی۔“
 ”اور ان چارنوٹوں کا کیا قصہ ہے؟“ سلطان نے پوچھا۔
 دینو نے کن آنکھوں سے رحیم سپاہی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”مائی باپ..... یہ نہ پوچھیں
 تو بہتر ہے۔“

”بکواس مت کر، اوئے..... میری بات کا جواب دے۔“ سلطان دباڑا۔
 ”جی..... وہ..... یہ..... یہ رنگروٹ فقیر ٹھیک کہتا ہے۔“ اس نے میری طرف اشارہ
 کرتے ہوئے کہا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا، لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
 سلطان کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”بیس منٹ میں چوالیس روپے ساٹھ پیسے! کمال ہے
 پیر بھائی..... تم تو چھپے رستم نکلے۔“

اس بار مجھے مسکرانے کی جرات نہ ہوئی۔ دے بے بھی اتنی ذلت کے بعد ہنسی خوشی کون
 مسکراتا ہے۔ ”امید ہے، اب میری پوزیشن صاف ہوگئی ہوگی۔ میں نے دے دے لہجے میں
 کہا۔

”صاف ہوگئی ہوگی۔“ سلطان میز پر ہاتھ مار کر دباڑا۔ ”تم پر جرم ثابت ہو چکا ہے۔“
 ”لیکن یہ رحیم چاہتا تھا کہ وہاں روز بھیک مانگوں۔“ میں نے کہا۔ ”پوچھ رہا تھا ٹائم
 کروں گا یا پارٹ ٹائم۔ میں نے انکار کیا تو بولا۔“ مجھ سے معاہدہ کر لیا تھا نے چلو۔“
 ”کیوں؟“ سلطان نے رحیم پر آنکھیں نکالیں۔

”یہ جھوٹ بولتا ہے جی۔“ رحیم منمنایا۔
 سلطان نے دینو فقیر کو گھورا تو اس نے سہم کر نظریں جھکالی۔ وہ تو اس وقت چکی کے
 دوپاٹوں کے درمیان تھا۔

”کچھ بھی ہو..... تم مجرم ہو..... اور اعتراف جرم بھی کر چکے ہو۔“ سلطان نے مجھ سے
 کہا۔

”لیکن مجھے صفائی تو پیش کرنے دو۔ میں نے بھیک نہیں مانگی۔“
 ”بکواس مت کرو۔“
 ”ٹھیک ہے طمطراقیل.....“

”ٹھہرو..... ٹھہرو۔“ سلطان چیخا۔ پھر رحیم سپاہی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تم دونوں باہر
 جاؤ، کہیں ادھر ادھر نہ ہونا۔ تمہاری تو میں اچھی طرح خبر لوں گا۔“

وہ دونوں باہر نکل گئے تو سلطان مجھ پر برس پڑا۔ ”تم اب میری برداشت سے باہر
 وتے جا رہے ہو۔ تم یوں کھلے عام..... طمطراقیل..... نہیں بننا۔“ اس نے بے بسی سے سر
 ہاتھ مارا۔ ”تم..... تم کھلے عام جن بادشاہ کا نام اتنی بدتمیزی سے لیتے ہو۔ ہاں..... تو کیا کہہ
 ہے تمہیں؟“

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم بڑے بد لحاظ آدمی ہو۔ طمطراقیل نے تمہیں گامے شاہ کے چنگل
 سے رہائی دلوائی اور تم ان کے خاص آدمی کے ساتھ بدسلوکی کر رہے ہو۔“

”میں بدسلوکی کر رہا ہوں؟“ سلطان غرایا۔ ”میں جن بادشاہ کا غلام ہوں۔ یہ بھی مانتا
 ہوں کہ تم ان کے خاص آدمی ہو، تو کیا میں تمہیں کھلے عام بھیک مانگنے کا لائسنس دے دوں۔“
 مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ سرخ ہو گیا ہوگا۔ میرے ہونٹ کانپنے لگیں آواز نہ نکل سکی۔
 ”میں جانتا ہوں کہ تمہاری ان حرکتوں پر جن بادشاہ بھی تم سے خفا ہوں گے۔ اگر نہیں تو
 ادا ان کو اپنی صفائی کے لیے۔“

میری جیب میں دوائے غیاب کی شیشی تو تھی نہیں، ورنہ مزہ چکھا دیتا اس کو، لیکن مجھے
 اندازہ ہو گیا کہ اس وقت دماغ ٹھنڈا رکھنا پڑے گا۔ بہر کیف، میں نے اپنی پوری داستان اسے
 نادی، لیکن اس کی آنکھوں سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔

”یقین نہیں آتا۔“ بالا خراس نے تبصرہ کیا۔
 میں نے شاہ طمطراقیل کی قسم کھا کر یقین دلانا چاہا تو اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔
 ”واقعی..... یا تو تم کوئی مرد بزرگ ہو یا پھر جن بادشاہ کی قوت برداشت بے پناہ ہے۔ بہر
 مال، میں اب یقین کرنے پر مجبور ہوں۔“

پھر میں نے اسے ریشماں کے اغوا کا حال سنایا۔ وہ اچھل پڑا۔ ”اور تم دیکھتے رہے!“
 اس نے مجھے طعن آمیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”تو اور کیا کرتا۔ کیا میں تمہیں ہر کوئیس دکھائی دیتا ہوں۔“ میں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔
 ”میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اسے گامے شاہ کے آدمیوں نے اغوا کیا ہے۔ چھاپہ مار کر
 آمد کر لو اسے۔“

”نہیں پیر بھائی..... یہ ممکن نہیں۔“ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”گامے شاہ خطرناک
 آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ تم جگے پہلوان کو بتا دو، وہ خود کسی سے کم نہیں۔“
 ”لیکن یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔“

”گامے شاہ سے بھڑنا میرے بس سے باہر ہے۔ ایسا کرو کہ جن بادشاہ سے مدد طلب
 کر لو۔“

”یعنی اب تمہاری ہر ذمہ داری طمطراقاً قیل شاہ پوری کریں گے۔ اپنی وردی بھی انہیں ہی پہنا دو۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”یہ میرا اور جن بادشاہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں مداخلت مت کرو۔“ وہ رکھائی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”ذرا رکو۔“ اس نے عقب سے مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ”اس بار تو میں نے چھوڑ دیا ہے، لیکن آئندہ ایسی ذلیل حرکت نہ کرنا۔ کیوں باپ دادا کا نام اچھالتے ہو۔“

”یہ میرا اور میرے باپ دادا کا ذاتی معاملہ ہے۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”اس میں مداخلت مت کرو۔“

”اور ہاں..... اس بام والے کا حلیہ بھی لکھواتے جاؤ۔“

”وہ کیوں؟“

”اگر وہ اسی طرح بام فروخت کرتا رہا تو انجمن انساں گداگری، انجمن انساں محنت کشاں میں تبدیل ہو جائے گی۔“

میں نے اسے بام فروخت کرنے والے کا حلیہ بتایا اور یہ دعا کرتا ہوا باہر نکل آیا کہ خدا کرے، وہ مردود سلطان کے ہتھے چڑھ جائے تاکہ اسے پتہ چلے کہ بام کے بغیر بھی انسان کا وجود پانی بن کر بہہ سکتا ہے..... وہاں سے نکل کر میں نے گھر کا راستہ لیا۔ مجھے جلد از جلد گھر پہنچ کر سوچ بچار کرنا تھی۔ سلطان نے ٹکا سا جواب دیا تھا، لیکن ریشماں کو اس طرح گامے شاہ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ آخر وہ میری محبت تھی۔

اللہ تو کل رستوران سے کھانا کھا کر نکلا تو ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل دیا۔ گلی میں گھپ اندھیرا تھا، لیکن راستہ جانا پہچانا ہونے کی وجہ سے میں بڑی روانی سے چلتا رہا۔ اچانک میں کسی سے ٹکرا گیا۔

”دیکھ کر نہیں چلتے۔“ کسی نے بے حد اتر کر کہا۔ آواز نسوانی تھی۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی سایہ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”کک..... کک..... کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”پہچانو نا مجھے؟، وہی آواز پھر بولی۔ لہجے میں اتراہٹ کا عنصر اور بڑھ گیا تھا۔

”کک..... کہاں ہو تم؟“

”یہیں ہوں تمہارے قریب..... بے حد قریب۔“

”کیا چاہتی ہو..... ہ..... ہو؟“

”تمہیں چاہتی ہوں۔“

میری کھٹکی بندھ گئی۔ میں نے چڑیلوں کے قصے سنے بھی تھے۔ لیکن کوئی جیتی جاگتی چڑیل آج تک نہیں دیکھی تھی۔ پتہ نہیں، آج کس کا منہ دیکھ کر گھر سے نکلا تھا کہ مصیبت پر مصیبت چل رہی تھی۔ ”بھٹھ..... بھٹھ..... بھٹھ.....“ میرے منہ سے نکلا۔ آواز خاصی بلند تھی۔ کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کیا کرتے ہو..... پاگل۔“ اسی آواز نے مجھے ڈانٹا۔

میرا تو جسم ہی بے قابو ہو گیا۔ میں بری طرح چلا تو وہ ایک طرف جا گری۔ پھر وہ کراہتی ہوئی اٹھی۔ میں نے پھر آواز کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ لیکن مجھے وہ اب بھی دکھائی نہیں دی۔ مجھ پر لرزہ چڑھ گیا۔ میں نے آیت الکرسی یاد کرنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے ہیں۔

”ابو جی۔“ اس نے قریب آتے ہوئے مجھے پکارا۔ ”تم تو پاگل ہی ہو۔ کتنے زور کا دھکا دیا ہے مجھے۔“ یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ تب پہلی مرتبہ مجھے کوئی چیز نظر آئی..... بڑے بڑے بدنما کیلے، لیکن چمکدار سفید دانت۔ پھر مجھے سیاہ پیوٹی سا نظر آیا۔ میری کھٹکی بندھ گئی۔ حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگی۔ میری زبان شل تھی۔ لیکن رواں رواں جل تو جلال تو کا ورد کر رہا تھا۔

”تم ڈرتے کیوں ہو مجھ سے ابو جی؟“

اس نے دوسری مرتبہ مجھے ابو جی کہہ کر پکارا تھا، لیکن مجھ میں تو برامانے کا بھی حوصلہ نہیں رہا تھا۔ ”تت..... تم..... آ..... آخر ہو کون؟“

”میں ہوں تمہاری زیتون۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا۔

میری کھٹکی یقیناً کھل گئی تھی کیونکہ اس بار حلق سے غراہٹ نکلی تھی۔ ”کیا مصیبت ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔“

”پہلے ڈر رہے تھے، اب خفا ہو گئے۔“ وہ پھر اٹھلائی۔ ”گٹھری لے آؤں؟“

”کپڑے اور زیور والی..... بس اب لے ہی چلو، اپنے ساتھ۔“

”لا حول ولاقوة۔“ میں نے کہا اور اسے ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ معاملہ بے حد مخدوش ہو چکا ہے۔ اس وقت اگر کوئی مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیتا تو شاید الٹی سیدھی ہر قسم کی آمنتیں گلے پڑ جاتیں۔ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا تھا، جن پر آفت از دواں اسی طرح نازل ہوئی تھی۔ میں نے بڑے خلوص سے دعا مانگی کہ اللہ مجھے ایسی بلاؤں سے محفوظ رکھے۔

اطمینان ہوا کہ مالی اعتبار سے خاصا مستحکم ہوں۔ اس کے بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ سوانو بجے تھے۔ میں نے دروازے پر تالا ڈالا اور باہر نکل آیا۔
بس اسٹاپ پر کچھ دیر کھڑا رہا۔ لیکن کوئی بس نہ آئی۔ بالآخر تنگ آ کر ایک رکشہ والے سے رجوع کیا۔ ”چلو گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
”کہاں جانا ہے؟“ اس کے لہجے میں بے زاری تھی۔
”قلندر روڈ۔“

”نہیں..... مجھے شادمان جانا ہے۔“ اس نے بے حد روکھے لہجے میں کہا۔
”تو پھر میٹر آن کرو..... اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”شادمان پہنچ کر تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارے میٹر کی رفتار کتنی زیادہ ہے۔ کبھی خود بھی کرایہ ادا کرو تو پتہ چلے۔“
”چلیے..... آپ کو لے چلتا ہوں۔“ اس نے گویا احسان کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میٹر سے پانچ روپے زیادہ لوں گا۔“
”حالانکہ میٹر تمہارا پہلے ہی تیز ہو گا۔“
”چلتا ہے تو چلیں۔“ اس نے بے زار ہو کر کہا۔

میرے جی میں تو آئی کہ اسے سیدھا سلطان کے پاس لے جاؤں، لیکن اس جن پرست پولیس افسر کے مزاج کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا، کیا خبر، الٹا میرے خلاف کیس بنا ڈالے۔ چنانچہ میں رکشہ میں بیٹھ گیا۔
قلندر روڈ پر پہنچ کر گامے شاہ کی کونھی سے کچھ دور، میں نے رکشہ رکوا دیا۔ میٹر دیکھ تو نو روپے چالیس پیسے بنے تھے۔ میں نے دکھے دل سے چند روپے نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھے، جو اس نے نہایت اطمینان سے جیب میں ڈال لیے۔ اس کے بعد چند لمحے خاموشی رہی۔

”تو کیا یہ رکشہ کی قیمت ادا کی ہے، آپ نے؟“ رکشہ والے نے پوچھا۔ ”اب اتر بھی جائیے۔“

”ساتھ پیسے واپس کرو۔“ میں نے میٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نو روپے چالیس پیسے بنے ہیں۔ پانچ روپے اوپر کے..... یہ ہوئے چودہ روپے چالیس پیسے میں نے تمہیں دیے ہیں چند روپے لہذا ساٹھ پیسے واپس کرو۔“ میں نے اس کی خدمت میں گوشوارہ پیش کیا۔

اس نے جیسے ٹو لیس اور سوکھا سامنہ بنا کر کہا۔ ”کھلے پیسے تو نہیں ہیں میرے پاس۔ آپ کھلے دے دیجئے۔“

گھر پہنچا تو تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا، لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ آرام ابھی میرے نصیب میں نہیں ہے۔ ریشماں کو مصیبت میں گرفتار چھوڑ کر میں چین کی نیند بھلا کیسے سو سکتا تھا۔
ایک صورت تو یہ تھی کہ میں جا کر جگے کو مطلع کر دیتا، لیکن اس میں قیامت یہ تھی کہ وہ مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ ویسے ہی پچھلے دنوں میں ایک ناکردہ اغوا کے چکر میں پھنس چکا تھا۔ آج گداگری کے الزام میں گرفتار ہوا تھا۔ اگر سلطان کو ایک موقع اور مل گیا تو وہ یقیناً مجھے رگڑ ڈالے گا۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جگے سے رابطہ قائم کرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ خطرہ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے خود ہی اس سلسلے میں کچھ کرنا ہو گا۔

کچھ سوچ کر میں نے دو چھوٹی شیشیوں میں دوائے غیاب اور اس کا تریاق انڈیلا اور دونوں شیشیوں کو جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں بستر پر دراز ہو کر اپنے منصوبے کی نوک پلک درست کرنے لگا۔ بے درپے تلخ تجربات نے مجھے سکھا دیا تھا کہ اندھا دھند چلنا بے حد نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کوئی کام انجام دینے سے پہلے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وقت انسان کا بہترین استاد ہوتا ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے فطری لاپلاہی پن کی جگہ پختگی لے رہی ہے اور یہ تبدیلی مجھ میں دوائے غیاب سے تعارف کے بعد ہی آئی تھی۔

یہ بات تو طے ہی کہ ٹرانسپورٹ کی مشکلات سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ میں دوائے غیاب کا ڈوز گامے شاہ کے اڈے پر پہنچ کر لوں۔ اس کے بعد اندر داخل ہونا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ خیر..... اندر داخل ہونے کے بعد مجھے ریشماں کو تلاش کرنا تھا۔ اب مسئلہ ریشماں کو تلاش کرنے کے بعد اسے باہر نکالنے کا تھا۔ وہ کوئی گلاب جامن تو تھی نہیں کہ اسے مٹھی میں دبا کر باہر نکل آتا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ اسے بھی دوائے غیاب کا ڈوز دیا جاتا۔ اس میں بھی ایک دشواری تھی۔ میں غائب حالت میں اس سے کہتا کہ چپ چاپ باہر نکل جاؤ تو وہ چیخیں مار مار کر سب کو اپنی لکیشن بتا دیتی۔ لہذا ضروری تھا کہ میں اسے دوائے غیاب میں دوائے بے ہوشی ملا کر پلاتا اور اسی عالم میں اسے باہر نکال لاتا۔ لیکن کم بخت دوائے غیاب سے بھی ڈر لگتا تھا۔ پتہ نہیں، دوائے بے ہوشی اس کو اس بھی آئے گی یا نہیں۔ بہر حال یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔ میں اس وقت خود کو ایک فلمی ہیرو محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح ریشماں کے دل میں میری محبت پیدا ہو جائے گی۔ فلموں میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔

میں نے ایک چھوٹی شیشی میں دوائے بے ہوشی کا ایک ڈوز بھی لے لیا۔ تینوں دواؤں کی شیشیوں کے سلسلے میں میں نے بڑی احتیاط برتی تھی۔ ماضی میں میں اس سلسلے میں بھی تلخ تجربات سے دوچار ہو چکا تھا۔ میں نے دوائے غیاب سفید شیشی میں..... اس کا تریاق لال شیشی میں اور دوائے بے ہوشی سبز شیشی میں رکھی تھی۔ پھر میں نے جیب کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر

”میرے پاس بھی نہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر رہنے دیجئے۔ ساتھ پیسے کی بات ہی کیا ہے۔“

”ایسا کرو، مجھے ایک روپیہ واپس کر دو۔“ میں نے تجویز پیش کی۔ ”چالیس پیسے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔“

”ناممکن۔ میں کم پیسے نہیں لے سکتا۔“

مجھے غصہ آ گیا۔ ”اور میں زیادہ پیسے نہیں دے سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”خاص طور پر اس صورت میں کہ تم میٹر سے پانچ روپے زیادہ لے رہے ہو۔“

دیر تک بحث ہوتی رہی۔ میں بھی رکشہ میں ڈٹا رہا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس بے اصول شخص کو ایک پیسہ بھی زائد نہیں دوں گا۔ دوسری طرف اس مسئلے کا کوئی حل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر کچھ دیر بعد مجھے سوجھ بوجھ ہی گئی۔

”ٹھیک ہے، تم رکشہ چلاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”جب تک میٹر میں دس روپے نہیں بنیں گے، میں نہیں اتروں گا۔“

رکشہ والا کسی ناقابل فہم زبان میں بڑبڑایا۔ غالباً مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ تاہم اس نے رکشہ اشارت کر دیا۔ کچھ دور جا کر جب میٹر میں مجھے دس روپے نظر آنے لگے تو میں نے رکشہ رکوا دیا اور نیچے اتر آیا۔

رکشہ والے نے مجھے خوں خوار نگاہوں سے دیکھا اور برا بھلا کہتا ہوا رکشہ اڑالے گیا۔ میری طبیعت صاف ہو گئی۔ لیکن پیدل ہونے کی وجہ سے میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اب اس اصول پرستی کے نتیجے میں مجھے پیدل چلنا تھا۔ لیکن چلنے سے پہلے میں نے دوائے غیاب کی شیشی نکال کر ایک ڈوز لے لیا۔ ریشماں کیلئے دوا بچانا میں نہیں بھولا تھا۔ پھر میں لیپ پوسٹ کے نیچے کھڑا اپنے سائے کو دیکھتا رہا۔ غائب ہونے کی تصدیق کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ اور اس وقت میں کوئی خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔

چند ہی لمحوں کے بعد میرا سایہ غائب ہو گیا۔ میں نہایت اطمینان سے گامے شاہ کی کوشی کی طرف چل دیا۔ جس سے میں ساٹھ پیسے کی خاطر آگے نکل آیا تھا۔ اپنی منزل پر پہنچ کر میں نے پھانک پر پاؤں رکھا۔..... اوپر چڑھا اور اندر کود گیا۔ لان میں اندھیرا تھا۔ البتہ عمارت کی بیرونی کھڑکیاں روشن تھیں۔ میں نے لان عبور کیا اور برآمدے میں داخل ہو گیا۔ طویل راہداری سے گزرتا ہوا میں اس کمرے کی طرف بڑھا، جہاں کبھی مجھے قید کیا گیا تھا۔ اس دوران میں تمام کمروں میں جھانکتا جا رہا تھا۔ بڑے کمرے میں گامے شاہ حسب سابق بیٹھا آب حرام سے شوق فرما رہا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ بد بخت کی خوب ٹھکانی لگاؤں لیکن راستہ کھٹوٹا کرنا

ناسب نہیں تھا۔ چنانچہ میں آگے بڑھ گیا۔

اس کمرے میں جھانکتے ہی میری باچھیں کھل گئیں، جہاں کچھ دن پہلے میرا قیام رہا تھا۔ راگو ہر مقصود وہاں موجود تھا لیکن کچھ اچھے حال میں نہیں تھا۔ میں نہایت اطمینان سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ریشماں وہاں موجود تھی۔ اس کا چہرہ شعلہ جوالا بنا ہوا تھا۔ کمرے میں کمالا اور سا کا وہ غیبت ساتھی بھی موجود تھا، جسے میں شام کو دیکھ چکا تھا۔

”اگر چیخنا چاہو تو جی بھر کے چیخ سکتی ہو۔“ کمالا کہہ رہا تھا۔ ”لیکن فائدہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ تر ہے، کھانا کھا لو۔“ اس نے ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ مجھے گھر جانا ہے۔“ ریشماں نے جواب دیا۔

میں مہبوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اتنے قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ کسی دمیدہ گلاب کی مانند تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت بس تھی۔

”اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔“ کمالے نے کہا۔

”کیوں سمجھوں۔ صورت بھی دیکھی ہے اپنی..... پھٹکار برس رہی ہے۔“ وہ پھر گئی۔

”تمہاری مرضی..... لیکن زیادہ تین پانچ کرو گی تو ہاتھ بڑ دوں گا۔“ کمالے نے اسے دس دی۔

غصہ تو بہت آیا لیکن میں قبل از وقت مداخلت کر کے کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”آخر تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“ ریشماں نے پوچھا۔ اس بار اس کا لہجہ نرم

”تمہیں ہیروئن بنائیں گے، فلم کی۔“ کمالے کے ساتھی نے انتہائی گستاخ لہجے میں کہا۔ ”فلم تو سمجھتی ہونا..... اس کا کیسٹ جگے کو بھی بھجوائیں گے۔ بڑا غیرت دار بنتا ہے۔ فلم لے کر خودکشی کر لے گا۔“

یہ سن کر ریشماں کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ لڑکی کیسی ہی جی دار ہو، اس قسم کی صورت ل میں خود کو سنبھال نہیں سکتی۔ میرے لیے غصہ ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں توجہ ہٹانے کے لیے کھانے کی ٹرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو ایک طرف رکھی تھی۔ ٹرے پر پانی کا ایک جگ لٹا تھا۔ ساتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔ میں نے جیب سے دوائے غیاب دوائے بے ہوشی کی شیشیاں نکالیں اور گلاس میں انڈیل دیں۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ شماں تو کھانے پینے سے ویسے ہی انکار کر رہی تھی۔ اگر یہ پانی ضائع ہو گیا تو..... اب تو رے پاس دوا بھی نہیں تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ ریشماں وہ پانی پی لے۔

پوچھا۔

”پیچ..... پیچ..... چڑیا۔ وہاں تو کوئی بھوت ہے، شاہ جی۔“ کمالے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”کیا بکتا ہے۔“ گامے شاہ دباڑا۔ اسی وقت میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ میں یہ قدم اٹھا تو بیٹھا لیکن یہ ڈر بھی تھا کہ حسب سابق کہیں ظاہر نہ ہو جاؤں۔ اس صورت میں یقیناً میری چٹنی بی بن جائے گی..... اور غالباً عمرانی چٹنی کھلائے گی۔ گامے شاہ بھی بوکھلا گیا۔ وہ کہتے کے سے عالم میں بیٹھا رہ گیا۔ ”کک..... کون ہے؟“ وہ بکھلایا۔

”شاہ جی..... یہ کونسی بی آسب زدہ ہے جی۔“ کمالے کا ساتھی بھی بکھلایا۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے..... اور بیٹھے رہے۔ میں نے مزید چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی اور کمرے سے نکل آیا۔ اب مجھے ریشماں کی خبر لینا تھی۔ ریشماں والے جانے پہچانے کمرے میں داخل ہوتے ہی میری طبیعت صاف ہو گئی۔ ریشماں وہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نہایت اطمینان سے اسی کرسی کی طرف بڑھا، جس پر وہ ابھی کچھ دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے احمقوں کی طرح کرسی کو ایسی ٹٹولا، جیسے ریشماں کو نہیں، کسی چھوٹی سی سوئی کو تلاش کر رہا ہوں۔ یہ جان کر مجھے شدید جھکا لگا کہ وہ نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی طور پر بھی غائب ہو گئی تھی۔

میں بے جان سا ہو کر اسی کرسی پر گر گیا، جس پر اسے ہونا چاہیے تھا۔ میں خالی الذہن سا بیٹھا رہا۔ میرا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی میں کچھ سوجنے کے قابل ہوا۔ ریشماں کہاں جا سکتی تھی۔ یہی ایک صورت تھی کہ وہ بے ہوش ہونے سے قبل کرسی سے اٹھ گئی ہو اور پھر کہیں بے ہوش ہو کر گر گئی ہو۔ میں نے ان مفروضے کے تحت کمرے کے ایک ایک گوشے کو ٹٹولنا شروع کر دیا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں نکل سکی ہوگی۔ میں گھنٹوں کے بل بیٹھا بڑی ترتیب سے اسے فرش پر ٹٹولتا پھر رہا تھا کہ دروازے کی طرف سے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ آنے والے گامے شاہ کے دو عدد گر گئے تھے، جو صورت ہی سے خطرناک بد معاش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے احمقوں کی طرح سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ ظاہر ہے، میں تو انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

”یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ ان میں سے ایک بولا۔

”یعنی لڑکی فرار ہو گئی۔“ دوسرے نے تبصرہ کیا۔

”ظاہر ہے، وہ احمق کمالا دروازہ جو کھلا چھوڑ گیا تھا۔“ پہلے نے جواب دیا۔ ”خیر..... آؤ

”خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“ ریشماں گڑ گڑائی۔ ”میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟“

”تو ہم بھی تمہارا کیا بگاڑ رہے ہیں۔“ کمالے نے جواب دیا۔ ”ہم تمہیں مفت میں ہیروئن بنا رہے ہیں۔“

ریشماں اب رونے لگی تھی۔ میں کا موشی سے اسے روتے دیکھتا رہا۔ اس عالم میں وہ اور بھی حسین ہو گئی تھی..... برسات میں دھلے ہوئے کسی پھول کی طرح! کمالے کے ساتھی نے پانی کا گلاس اٹھایا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اگر دواملا پانی ضائع ہو گیا تو ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر ان لوگوں سے الجھ پڑوں گا۔

کمالے کے ساتھی نے پانی کا گلاس ریشماں کی طرف بڑھایا جس کی اپ بھگیاں بندھ گئی تھیں۔ ”لو پانی پی لو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

ریشماں نے انکار نہیں کہا۔ شاید میری دعا قبول ہو گئی تھی۔ ریشماں نے پانی پی لیا تو میری جان میں جان آئی۔ اب میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ان دونوں کو کمرے سے نکال باہر کروں۔ اگر ریشماں ان کے سامنے ہی غائب ہو جاتی تو بہت برا ہوتا۔ میں تو یوں بھی غائب ہونے کی اس صفت کو خود تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اس راز میں ریشماں تک کو شریک کرنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ اور اب..... کسی بھی لمحے ریشماں غائب ہو سکتی تھی۔

چنانچہ میں نے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں بھی اتنی دیر تک ان کی خرافات برداشت کر کے میں ان خبیثوں کا خاصا مقروض ہو چکا تھا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کمالے کی کمر پر ایک زور دار لات رسید کی۔ وہ اپنے ساتھی سے جا لکرایا۔ ان دونوں نے آنکھیں بھاڑ بھاڑ کر ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ لیکن انہیں کچھ نظر نہ آیا۔ ان کے حلق سے ڈری ڈری چیخیں نکل گئیں۔

”یار..... یہ کمرہ ہی..... آ..... آسب زدہ ہے۔“ کمالا بکھلایا۔ ”نکل چلو یہاں سے۔“ وہ دونوں فوراً ہی نکل بھاگے۔ ریشماں کے چہرے پر حیرت تھی۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے نکلا۔ میں اب وہاں مزید افراتفری پھیلانا چاہتا تھا تا کہ ان کی توجہ اس کمرے سے ہٹا رہے۔ ریشماں کے غائب ہونے کے بعد تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہتا۔

حسب توقع انہوں نے بوکھلا کر گامے شاہ کے کمرے کا رخ کیا۔ گامے شاہ اپنے شغل میں مصروف تھا۔ اسے ان دونوں کی مداخلت بے حد گراں گزری، لیکن وہ ان دونوں کے چہرے اور ان کی سراسیمگی دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا۔ ”کیا بات ہے؟ کیا حال ہے، چڑیا کا؟“ اس نے

تلاش کریں۔ ممن ہے، ابھی نکل نہ سکی ہو۔ اور اگر نکل گئی تو شاہ جی ان دونوں کی کھال گرا دیں گے، مار مار کر۔“

وہ واپس چلے گئے تو میں پھر ریشماں کو تلاش میں مصروف ہو گیا۔ اس کمرے میں غائب شدہ ریشماں کو تلاش کرنا ایسا ہی تھا، جیسے بھوسے کے ڈھیر میں کوئی سوئی ڈھونڈنا۔ کمرے کی مکمل تلاشی خاصی دیر میں پوری ہوئی۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ریشماں کمرے میں نہیں ہے۔ میں نے کمرے کا چپہ چپہ ٹٹول لیا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ بات طے تھی کہ ریشماں بے ہوش ہونے سے پہلے کوٹھی سے نہیں نکل سکتی تھی۔ یوں میرے لیے ایک انتہائی سنگین مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں ریشماں کو تلاش کرنے کے لیے تو چھ ماہ درکار تھے۔ دوسری طرف یہ دھڑکا تھا کہ میں کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتا ہوں۔ بہر حال اس کمرے میں اب میرا کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ میں باہر نکل آیا۔

باہر افراتفری کا عالم تھا۔ گانے شاہ کے گز گئے ریشماں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ لیکن انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ریشماں انہیں نظر نہیں آ سکتی۔ یہ مسئلہ میرے لیے بھی تھا۔ میں بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے منصوبے میں کوئی جھول نہیں تھا۔ بس اسے قسمت کی خرابی ہی کہا جاسکتا تھا۔ میں عجیب الجھن میں تھا ظاہر ہو جاتا تو، گانے شاہ کے گز گئے میرے لیے عذاب بن جاتے۔ اور یوں ریشماں کو لئے بغیر ناکام جانے کا تصور بھی میرے لیے روح فرسا تھا۔ راہداری میں غنڈے مسلسل بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں احتیاط سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آگے بڑھتا رہا۔ اچانک مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ ”شاہ جی..... ہم نے چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ لڑکی کوٹھی میں نہیں ہے۔“ وہ آواز میرے لیے مژدہ جان فزا تھی۔

”ایک ایک کی چڑی اتار دوں گا۔“ گانے شاہ نے جواب دیا۔ لہجہ بہت خراب تھا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہاں قدرے سکون ہو جائے گا۔ اسکے باوجود میں بڑے محتاط انداز میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ داخلی دروازہ کچھ ہی دور رہ گیا تھا کہ مجھے ٹھوکر لگی۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کسی انسانی وجود پر گرا۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ غائب حالت میں ریشماں ہے..... بے ہوش ریشماں۔ ساری مایوسی دور ہو گئی۔ میری جان میں جان آ گئی۔ بالآخر مجھے گوہر مقصود مل گیا تھا۔ اب میں سرخروئی کے ساتھ واپس جاسکتا تھا۔

یہ میری اور ریشماں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ داخلے دروازے کے اس قدر قریب بے ہوش ہو کر گری تھی..... اور پھر وہ بیچ راہداری میں بھی نہیں تھی بلکہ راہداری کی ایک دیوار کے ساتھ تھی۔ ورنہ اب تک روندی جا چکی ہوتی۔ بہر حال میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اسے

ٹٹولا۔ عجیب صورت حال تھی۔ ایک غائب ہستی دوسری غائب ہستی کو اندھوں کی طرح ٹٹول رہی تھی..... پھر اچانک مجھے آشفتم مزاج دوائے غیاب کا خیال آگیا۔ ہم دونوں کسی بھی وقت ظاہر ہو سکتے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے ریشماں کو سہارا دے کر بٹھانا چاہا لیکن وہ میرے قابو میں نہ آ سکی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ بے ہوش آدمی کا وزن کس طرح بڑھا دیتی ہے۔ وہ بوجھ گل بدن، نازک اندام ریشماں کی بجائے جگے پہلوان کا بوجھ معلوم ہو رہا تھا۔

اب مسئلہ اسے باہر لے جانے کا تھا۔ وہ اتنی ہلکی پھلکی نہیں تھی، جتنی کہ نظر آ رہی تھی۔ آخر کو جگے پہلوان کی بہن تھی۔ اسے گھسیٹ کر بہ آسانی باہر نکالا جاسکتا تھا لیکن اس میں تین قباحتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے میرا دل دکھتا۔ منظور نظر تفتی ہی وزنی کیوں نہ ہو، اسے بے دردی سے سیٹا نہیں جاسکتا۔ دل کے سودے عجیب ہوتے ہیں..... چاہے پہلی نظر میں ہو یا ایک سوچ پھر دس نظر میں..... لیکن مجبورہ کا وزن کرانے کی زحمت کوئی نہیں کرتا، نہ ہی محبت میں وزن یا جہم کی کوئی قید ہوتی ہے۔ دوسری قباحت یہ تھی کہ اگر میں اپنے محبت بھرے دل پر ضبط کا جگا..... میرا مطلب ہے پتھر رکھ کر اسے گھسیٹتا تو نہ صرف اس کا لباس پھٹ جانے کا خدشہ تھا بلکہ اس کا نازک بدن چھل بھی سکتا تھا۔ تیسری قباحت یہ تھی کہ گھسیٹنے جانے کی آواز گانے شاہ اور اس کے گرگوں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ یوں میرے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ تب میں نے جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یعنی کسی نہ کسی طرح اسے لا کر باہر نکالنا تھا۔ پہلے مرحلے میں، میں نے اسے کسی نہ کسی طرح دیوار کے سہارے بٹھادیا۔ اس دوران میرا سانس پھول گیا تھا۔ لیکن سانس درست کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ ہاتھ بٹاتے ہی وہ پھر پہلے کی طرح گر جاتی، چنانچہ دوسرے مرحلے میں، میں نے اسے کندھے پر ڈالنے کی کوشش کی، لیکن لڑکھڑاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ خوش قسمتی سے وہ اسی پوزیشن میں گری، جس میں اسے بٹھایا ہوا تھا۔ البتہ اسی دوران اس کا سر بری طرح دیوار سے ٹکرایا تھا۔

میں جھنجھٹا گیا اور مایوس بھی ہو گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کتنی ہوش مندی سے منصوبہ بنایا تھا اور اب پتہ چل رہا تھا کہ ہر منصوبے میں ہنگامی صورت حال کی گنجائش رکھنا ضروری ہوتی ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے قوت فیصلہ اور حاضر دماغی درکار ہوتی ہے۔ اس وقت میں اتنا مایوس تھا کہ ممکن تھا، اسے وہیں چھوڑ کر واپس چلا آتا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ عام طور پر رسم ہے کہ دوہلا دہن کو اٹھا کر اپنے گھر کی چوکھٹ پار کرتا ہے۔ اگر میں اس سنگین موقع پر اس رسم کی تجدید نہ کر سکا تو وہ نگین موقع تو مجھے ملے گا ہی نہیں اور اگر مل گیا تو اس وقت میں ناکام ہو کر اوروں سے..... ریشماں سے بلکہ خود سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں رہوں گا۔

میرے کانوں میں شہنائیاں سی گونجنے لگیں اور جسم میں جیسے تو انائی کی کوئی لہری دوڑ گئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوٹھی میں اب کہیں نقل و حرکت نہیں تھی۔ گامے شاہ شاید اپنے شغل میں مصروف ہو گیا تھا اور اسکے گرگے اس کے متوقع قبر سے ڈر کر دیکے بیٹھے ہوں گے۔ میں نے ہمت کر کے بے ہوش اور غائب ریشماں کو اپنے کندھے پر ڈالا اور دوڑ لگا دی۔ داخلی دروازے سے نکل کر لان تک پہنچتے پہنچتے میں بری طرح باپ گیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ایک باتا کر میں اسے دوبارہ نہیں اٹھا سکوں گا۔ چنانچہ میں بانپتا، کانپتا، لڑکھڑاتا اسے اٹھائے گیٹ کی طرف بڑھتا رہا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے آہستگی سے اسے گھاس پر گرادیا اور خود بھی وہیں ڈھ گیا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے میں اپنی سانسوں پر کبھی قابو نہ پاسکوں گا۔

ذرا جان میں جان آئی تو پھر مسائل منہ بھاڑ کر سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میں خود تو گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف کو دسکتا تھا لیکن ریشماں کو اس پار لے جانا میرے بس سے باہر تھا۔ ریشماں کے سامنے غائب حالت میں آنے سے بھی پے چیدگیاں پیدا ہوتیں۔ میں نے جیب سے دو اے غیب کے توڑ والی شیشی نکالی اور دوا کا ایک ڈوز لے لیا۔ ریشماں کے لیے دوا بجانی میں نہیں بھولا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے اسے بے ہوشی ہی کے عالم میں دوا پلانے کا فیصلہ کر لیا۔ ضروری نہیں تھا کہ ہوش کے عالم میں وہ میری بات مانتی..... اعتبار کرتی۔ دشواری تو ضرور ہوتی لیکن کسی نہ کسی طرح میں نے دوا اس کے حلق میں اندیل دی۔ اب مجھے صرف انتظار کرنا تھا..... اس کے ظاہر ہونے اور ہوش میں آنے کا..... میں پریشان بھی تھا۔ اگر گامے شاہ کے غنڈے اس طرف نکل آئے تو ہم بڑی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ بالآخر میری نظروں نے وہ حیرت انگیز اور خوبصورت منظر دیکھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی انسان کو غائب حالت سے حاضر ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہاں اندھیرا تھا، اس کے باوجود میں نے ریشماں کو حاضر ہوتے دیکھ لیا۔ عدم کی دھند سے اس کا وہ چاند چہرہ ابھرا تو میں مہبت ہو کر رہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ کسمائی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”خاموش رہنا۔ اس وقت تم ان غنڈوں کی قید سے رہا ہونے کے بہت قریب ہو۔“ میں نے سرگوشی کی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ چیخا چلانا نہ شروع کر دے۔ اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور اٹھ بیٹھی۔

”میں کہاں ہوں؟“ اس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آواز بھی سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔

”ابھی اسی کوٹھی میں ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ذرا طبیعت سنبھل جائے تو اس پھانک پڑ چڑھ کر دوسری طرف کو دنا ہوگا۔“ میں نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکن تم ہو کون؟“

”میں تمہارا.....“ میں کہتے کہتے رک گیا۔ دل کی بات لبوں پر لانے میں اس کے بھڑک جانے کا خطرہ تھا۔ ”میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ میرا نام ابو العمران ہے۔“

”خیر ہو گے۔“ اس نے بے حد لاپرواہی سے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ پھانک پر چڑھ رہی تھی۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا، پھر میں بھی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے گیٹ پر چڑھنا شروع کیا تو وہ دوسری طرف اتر کے آگے بڑھ گئی تھی۔

”اسے رکو۔“ میں نے سرگوشی میں اسے پکارا۔

”کیوں رکو؟“ اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

میں گیٹ سے کو دکر دوسری طرف اتر اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ ”ریشماں سنو تو۔“ میں نے اسے پکارا۔

”کیا ہے؟“ اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن وہ رک گئی تھی۔ ”تم کیا بلا ہو اور تمہیں میرا نام کیسے پتہ چلا۔“

”میں ابو العمران ہوں اور تمہیں جانتا ہوں۔“ میں نے مختصراً کہا کیونکہ تفصیلی بیان میں اپنے رومینک ہو جانے کا خطرہ تھا۔

”تم ابو العمران ہوتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن تم مجھے کیسے جانتے ہو۔“ وہ مجھے اسی تفصیل کی طرف گھسیٹ رہی تھی۔ جس سے میں بچ رہا تھا۔

”یہ سب کچھ بعد میں پوچھ لینا۔“

”تم نے مجھے روکا کیوں تھا؟“

”ارے..... دیکھو نا اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے ہیں۔ تم تنہا چلو گی تو کسی مصیبت میں پھنس سکتی ہو۔“ میں نے بے حد خلوص سے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید میری بات کی معقولیت متاثر کر گئی تھی۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وقت اتنا زیادہ بھی نہیں ہوا تھا، لیکن قلندر روڈ گھرے سنائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی گاڑی بھی آتی جاتی نہیں دکھائی دی۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے وہ رک گئی۔

”ٹھہر جاؤ۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میں رک گیا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ”تو اب کوئی اور چکر چلا رہے ہو، تم لوگ۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں تو میں خوب پہچانتی ہوں۔ ایک بار تم نے گھر تک میرا پیچھا کیا تھا۔ پھر بھائی جان کے ہاتھوں مار بھی کھائی تھی۔ اور آج بھی تم میرے پیچھے آرہے تھے۔ میں تمہیں.....“

”میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے تو تمہیں ان

کے چنگل سے نکالا ہے۔“

اس نے تھیک آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا تم..... تم تو صورت ہی سے یتیم معلوم ہوتے ہو۔“ وہ بولی۔

”وہ تو میں ہوں۔ اس میں برائی کیا ہے۔“ میں نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔

”کب موت..... تم میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟“

میں نے کوشش کر کے آنکھیں نشیلی بنائیں اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ارے..... تم تو بھیگتے بھی ہو۔“ اس نے اظہارِ تاسف کر کے سارے رومانس پر پانی

پھیر دیا۔ ”خیر..... میرے سوال کا جواب دو۔“

”تت..... تم..... مم..... مجھے..... اچھی..... لگتی ہو۔“ میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

”صورت بھی دیکھی ہے کبھی اپنی۔“ وہ یک لخت ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ”پھٹکا برس رہی

ہے چہرے پر..... بونا سا قد ہے اور پورا جسم پسلیوں پر مشتمل معلوم ہوتا ہے۔ پتہ ہے نا.....

میں جگے کی بہن ہوں۔ منہ نوج لوں گی تمہارا۔“

”پتہ ہے مجھے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”خیر چھوڑو۔ میں تمہیں ناپسند سہی لیکن قدم

آگے بڑھاؤ۔ جس وقت وہ تمہیں ہیروئن بنانے پر تلے ہوئے تھے، تب تو آواز بھی نہیں نکلی

تھی۔ اب میرا منہ نوچنے کو کہہ رہی ہو، حالانکہ میں تمہیں ان خبیثوں سے بچالایا ہوں۔“ یہ لہ لہ

میں آگے چل دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ قدموں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ وہ

میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ میں بھی اناڑی تو تھا نہیں۔ میں نے سینکڑوں فلمیں دیکھی تھیں۔

ہزاروں کہانیاں پڑھی تھیں۔ اگر وہ میرے ساتھ سخت رویہ اختیار نہ کرتی تو مجھے حیرت ہوتی۔

فلموں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہیرو، ہیروئن کو بچاتا ہے اس کے باوجود ہیروئن اسے آنکھیں

دکھاتی ہے۔ پھر ہیرو ناراض ہو کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہیروئن اس کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔ اور

بالآخر اسے منالیتی ہے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی، لیکن اس نے مجھ سے معذرت تو

درکنار، بات بھی نہیں کی۔ میں نے کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں

گم تھی۔ میں نے اپنی اکھڑ قائم رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

چلتے ہوئے پندرہ منٹ ہو گئے لیکن ہمیں کوئی سواری نہ ملی۔ اب مجھے تشویش ہوئی۔

اس طرح پیدل چلنا ہر اعتبار سے خطرناک تھا۔ اگر کوئی پولیس والا مل جاتا تو مصیبت ہی آ جاتی۔

سلطان احمد مجھے پہلے ہی دھمکی دے چکا تھا۔ ”کاش کوئی رکشہ کوئی ٹیکسی مل جاتی۔“ میں نے

کراہتے ہوئے کہا۔

میرا یہ کہنا غضب ہو گیا۔ ریشماں نے اتنی تیزی سے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا کہ

میں سنائے میں رہ گیا۔ وہ وہیں بیچ سڑک پر کھڑی روئے جا رہی تھی اور میں بت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس صدمے سے سنبھلا۔ ”آخر ہوا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں نے خدا نخواستہ کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور روتی رہی۔ اب تو میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔ ”بات کیا ہے ریشماں؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”میری..... کتابیں..... میرا پرس.....“ وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ”اور بھیمہ.....

بھانجی..... بھائی تو مجھے جان سے مار دے گا۔“

وہ واضح طور پر جگے پہلوان کا حوالہ دے رہی تھی۔ میرے دیوتا کوچ کر گئے۔ اسی رفتار

سے چلتے رہنے کی صورت میں ہم بمشکل صبح کے تین چار بجے تک اپنے قتل یا جگے کے

اکھاڑے تک پہنچتے۔ جگہ یقیناً اپنی بہن کی تلاش پاگل ہوا جا رہا ہوگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میرا

جگے سے سامنا ہو گیا، تو وضاحت پیش کرتے کرتے میرا سوئم بھی ہو چکا ہوگا۔ عجیب مصیبت

میں پھنس گیا تھا۔ ریشماں کو چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا تھا کہ آدابِ محبت کے خلاف تھا۔ اس کا

ساتھ دینے کی صورت میں جگے کے ہاتھوں میری جواں مرگی مقدر تھی۔

”پرس کی تم فکر مت کرو ریشم۔“ میں نے اسے چمکارتے ہوئے کہا، لیکن دماغ بدستور

اپنی متوقع موت پر ماتم کر رہا تھا۔ ”کتابیں تم اور لے لینا۔“

”بھیمہ..... بھیمہ..... بھائی.....“ اس نے بمشکل کہا اور پھر رونا شروع کر دیا۔

”اس کا بھی ایک حل ہے۔ چلو..... ہم کہیں دور چل کر اپنی دنیا بسائیں، جہاں کوئی ظالم

جگانہ ہو۔ بس میں ہوں تم ہو، پھول، کھلتے ہوں۔“

جواباً اس نے ایک زوردار دھتھور رسید کر دیا۔ ”تم..... تم ہی رہ گئے ہو میرے لیے۔ اس

سے تو بہتر ہے کہ بھائی مجھے مار ڈالے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ اور بھائی کو یاد کرتے ہی پھر

رونے لگی۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ اس کے انداز میں کوئی نسوانی ادا نہیں تھی۔ بلکہ سچائی تھی..... نفرت تھی

میرے لیے ایسے میں آدمی کیا کر سکتا ہے، جب اس کے محبوب نے اسے ٹھکرا دیا ہو اور یقیناً

موت اسکے سر پر منڈلا رہی ہو۔ میں نے بھی زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ چند لمحوں تک تو یہ

ڈبل ٹریجڈی پروگرام چلتا رہا، پھر شاید وہ میرے حق میں دستبردار ہو گئی۔ لیکن اب مجھے اپنا ہوش

بھی نہیں تھا۔ میں روتا ہی رہا۔ چند لمحوں کو وہ خاموش رہی، پھر بولی۔ ”اے..... اے عمران

صاحب..... تمہیں کیا ہو گیا؟“ لہجہ سخت تھا۔

میں بدستور روتا رہا۔ بری طرح دل بھرا آیا تھا۔

وہ اکڑ گیا اور اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینا شروع کر دیا۔ ”کیا ثبوت ہے، تمہارے پاس؟“ وہ قدرے مہذب ہو گیا۔

”ثبوت؟“ میں بوکھلا گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”کوئی بچہ وچہ..... کوئی نکاح نامہ؟“

”بچہ!“ میں نے کن آنکھوں سے ریشماں کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں سے برہمی جھانک رہی تھی۔ ”بھئی بچہ تو ہمارا ہے نہیں۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”اور نکاح نامہ ہم ساتھ لے کر تو نہیں گھومتے۔“

”تب تو تمہیں تھانے چلنا ہی پڑے گا۔“

”یار انسپکٹر صاحب، جانے دو.....“

”چلو..... سیدھی طرح چلے چلو۔“ وہ ضد پر اتر آیا۔

اچانک ہی مجھے ایک خیال آ گیا جس کے تحت میں نے بڑے اطمینان سے ریشماں کا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو بیگم..... یہ بھی اچھا ہوا۔ ہمیں کوئی سواری تو یوں بھی نہیں مل رہی ہے۔ اب کانسٹیبل صاحب.....“ میں نے کانسٹیبل پر خاص طور پر زور دیا۔ ”..... کی وجہ سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ پھر کئی دن ہوئے سلطان سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید تھانے میں وہ بھی مل جائے، چائے کی بھی طلب ہو رہی ہے۔ سلطان ہمیں چائے پلائے بغیر رخصت نہیں کرے گا۔ اور کانسٹیبل کی بھی تسلی کر دے گا۔“

تیر نشانے پر بیٹھا۔ کانسٹیبل گڑبڑا گیا۔ ”کون سلطان۔“ اس نے شک آمیز لہجے میں پوچھا۔

”انسپکٹر سلطان۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔

”آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟“ کانسٹیبل اور مہذب ہو گیا لیکن اس کے لہجے میں اب بھی شبہ کی جھلک تھی۔

”ہم پیر بھائی ہیں اور شاہ طمطر اقل کے مرید ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں سلطان نے میرے عزاز میں اپنے ہاں قوالی کرائی تھی۔“

”اوہ..... اوہ جناب۔“ کانسٹیبل نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”جیسی تو میں کہوں کہ آپ کی شکل جانی پہچانی سی کیوں لگ رہی ہے۔ اب یاد آیا۔ ارے جناب میں بھی شریک ہوا تھا اس محفل میں..... سب سے پچھلی قطار میں بیٹھا تھا۔ لیکن آپ تو پیر محفل تھے۔ جناب، بہت شاندار لگ رہے تھے، آپ۔“

میں نے گردن اکڑا کر ریشماں کی طرف دیکھا، لیکن فوراً ہی ڈھیلا پڑ گیا وہ مجھے کھا جانے

”ارے تو رو کیوں رہے ہو؟“ اس مرتبہ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”تو..... اور کیا کروں۔“ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کیا میں نے۔ جان جو کھوں میں ڈالی اور تمہیں بچایا۔ تم مجھ سے اتنی نفرت سے بات کر رہی ہو۔“

”دیکھو عمران..... تم مجھ سے یک طرفہ توقع رکھو تو یہ تمہاری غلطی ہے۔“ اس کا لہجہ اور نرم ہو گیا۔ ”میں تم سے نفرت تو نہیں کرتی..... لیکن میں تم سے محبت بھی نہیں کرتی۔ کیا محبت یونہی راہ چلتے ہو جانی ہے۔“

اس کی بات مجھے معقول بھی لگی اور مستقل کا چانس بھی نظر آیا۔ ”لیکن میرا کیا ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”میں تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔ اتنی رات کو تمہیں اکیلا تو گھر نہیں جانے دوں گا۔ کی تو میں نے بھلائی ہے لیکن جگہ کو کس طرح سمجھاؤں گا۔ یہ داستان امیر حمزہ شانے سے پہلے ہی، وہ تمہیں تو نہیں، مجھے یقیناً مار ڈالے گا۔“

جگہ کے حوالے پر وہ پھر شروع ہو گئی۔ اس حماقت پر میرا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ ڈالوں لیکن اس سے پہلے ہی دوسری مصروفیت نکل آئی۔ میں اور ریشماں حماقت گریہ میں الجھے ہوئے تھے۔ ہمیں اس کانسٹیبل کی آمد کا پتہ نہیں چلا۔

”کیا تماشا ہو رہا ہے یہ؟“ اس نے آواز کو رعب دار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بری طرح اچھل پڑا۔ خود پر قابو پانے میں چند لمحے لگ گئے۔“

”سک..... کچھ نہیں جی.....“ میں ہکھلایا۔ ”بس اپنی مرحومہ والدہ یاد آ گئی تھیں۔“

”پر تم دونوں اتنی رات کو یہاں کیا کر رہے ہو۔“ اس نے کڑک کر کہا۔ ریشماں کی گریہ و زاری میں بربیک لگ گیا۔ پھر جیسے ہی اس نے کانسٹیبل کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار نظر آنے لگے۔

”کون ہو تم دونوں..... چلو تھانے۔“

”لیکن کیوں؟“ میں نے احتجاج کیا۔

”وجہ پوچھتا ہے۔“ کانسٹیبل اور بے لگام ہو گیا۔

”رات کو غیر لڑکی کے ساتھ گھوم رہا ہے اور پھر وجہ پوچھتا ہے۔ وجہ تو تھانے چل کر پتہ چلے گی۔“

”غیر لڑکی!“ میں نے حیرت ظاہر کی۔ ”یہ میری اہلیہ ہیں، انسپکٹر صاحب۔“ میں نے اسے کھن رسید کیا۔

والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ میرے فخر کے وہ تمام جذبات ٹھنڈے پڑ گئے، جو کانسٹیبل کے اعتراف شناسائی کے نتیجے میں ابھر آئے تھے۔
”خیر..... تو چلو، تھانے چلیں۔“ میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

”ارے جناب..... کیوں گناہگار کرتے ہیں۔ آپ بس جناب..... زمانہ ہی خراب آ گیا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی ایسی غلطی ہو جاتی ہے۔ امید ہے کہ آپ انسپکٹر صاحب سے اس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔“

”نہیں بھئی۔“ میں نے مربیانہ لہجے میں کہا۔ ریشماں کا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ ”میں بہت غریب پرور آدمی ہوں۔“

”اچھا بیگم صاحب..... غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔“ کانسٹیبل نے ریشماں کے سامنے سر کو خفیف سا خم کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا بایاں ہاتھ فارغ تھا، وہ میں نے اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہاتھ کی پشت کو چوما..... آنکھوں سے لگایا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

میرا دل اب بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ چلا گیا تو ریشماں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ ”چھوڑو میرا ہاتھ۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

”کیا کرتی ہو۔“ میں نے بوکھلا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”کہیں وہ پلٹ کر نہ آ جائے۔“
تھانے جانا پڑ گیا تو بہت برا ہو گا۔“ میں پھر جگے کا تذکرہ کرتے کرتے رہ گیا، جس کا تصور ہی مجھے دہلائے دے رہا تھا۔ ”اور خدا کے لیے اب تم رونے نہ بیٹھ جانا۔“ میں نے اپیل کی۔

ہم آگے بڑھ گئے۔ میں دل ہی دل میں سواری ملنے کی دُعا کئے جا رہا تھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ خدا جانے، صبح کس کی صورت دیکھ کر گھر سے نکلا تھا۔ اب تو ٹانگیں بھی جواب دینے لگی تھیں۔

”یہ سلطان کا کیا قصہ تھا؟“ ریشماں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”قصہ تھا نہیں بلکہ اب بھی ہے۔ انسپکٹر سلطان کے حوالے سے اسی وقت جان بچ گئی۔ ورنہ اگر تھانے چلے جاتے تو یقین کر دو کہ وہ مجھے اغوا کے الزام میں بیچ مچ حوالات میں بند کر دیتا۔ بنتا تو وہ میرا پیر بھائی ہے لیکن ہے بہت طوطا چشم..... سمجھیں بیگم۔“ آخری ٹکڑا میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کیا بکواس ہے۔ دماغ خراب ہے، تمہارا۔“ وہ برہم ہو گئی۔

میں خاموش ہو گیا۔ ہم پیدل ہی چلتے رہے اور ہمیں کوئی سواری نہ ملی۔ بارہ بجے کے قریب ہم اورنگ آباد کے خاصا قریب جا پہنچے تھے۔ اچانک ایک اور افتاد نازل ہوئی۔ اس

مرتبہ افتاد پیدل نہیں تھی۔ بلکہ جیب میں بیٹھ کر آئی تھی اور اس کے کاندھوں پر دو پھول بھی تھے۔ مکالمے تقریباً وہی ہوئے۔ جو پہلے بھی ہو چکے تھے۔ البتہ پچھلا انجام طریقہ تھا۔ جب کہ اس مرتبہ المیہ ثابت ہوا۔

سب انسپکٹر تصدیق کیے بغیر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ میں سلطان کا کوئی شناسا بھی ہو سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ یقین کرنے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا کہ ریشماں میری بیوی ہو سکتی ہے۔ اس کے، اس یقین کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

میں اسے کسی طرح قائل نہ کر سکا۔ ریشماں چپ چاپ کھڑی رہی۔ بالآخر سب انسپکٹر نے ہمیں جیب میں بٹھالیا۔ ذرا ہی دیر بعد میں دن میں دوسری مرتبہ تھانے کا منہ دیکھ رہا تھا۔ سب انسپکٹر نے جیب دروازے ہی پر روک دی اور چیخ پکار کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد دوسرا ہی دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔ ان میں ایک وہی تھا جو شام کو مجھے گداگری کے الزام میں پکڑ لے گیا تھا۔

”اوئے رحیم..... اس کو لے جا کے بند کر دے۔“ سب انسپکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور مجھے جیب سے باہر دھکیل دیا۔

”اور ریشماں؟“ میں نے احتجاج کیا۔

”انہیں میں گھر چھوڑ کر آ رہا ہوں۔“ اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

صورت حال ایسی تھی کہ میں احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ریشماں کا اتنی رات گئے تھانے میں قدم رکھنا خود مجھے بھی گوارا نہیں تھا۔ لیکن اتنی رات گئے اسے تھا اس انسپکٹر کے ساتھ جانے دینا..... پھر مجھے جواز مل ہی گیا۔ ”تو پھر تم مجھے کس جرم میں بند کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اغوا کے جرم میں۔“ اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے جواب دیا۔

”مم..... میں۔“ ریشماں نے کچھ کہنا چاہا۔

سب انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ چپ رہیں ریشماں بی بی۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم سب تو آپ کی تلاش میں باؤ لے ہو گئے ہیں۔ اب میں چھپتے چھپاتے آپ کو گھر چھوڑ آؤں گا۔“ پھر وہ رحیم نامی کانسٹیبل کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اوئے، کھڑے میرا بوتھا کیا دیکھ رہے ہو، لے جاؤ۔ اسے اور حوالات میں بند کر دو۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب آگے بڑھا دی اور میں ہونٹوں کی طرح کھڑا کھڑا ہی رہ گیا۔

رحیم نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو مجھے ہوش آیا۔ ”ہوں..... دن کو بھیک مانگتے ہو اور رات کو اغوا کی وارداتیں کرتے ہو۔“ اس نے غرا کر کہا۔ ”تم سے تو میں اچھی طرح سمجھوں گا۔“ چلو۔“

”ہاتھ چھوڑو میرا۔“ میں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا۔ ”میں خود چل رہا ہوں۔ مجھے سلطان سے ملنا ہے۔“

”ابھی نکل جائے گی ساری اکٹروں۔“ اس نے کہا۔

میں نے عزت بچانے کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی اندر داخل ہو جاؤں۔ سامنے والے کمرے میں ہیڈ محرم موجود تھا۔ اس نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رحیم نے تقریر شروع کر دی۔

”اچھا تو یہ ہے جگے صاحب کا مجرم۔“ ہیڈ محرم نے میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ..... اسے بند کر دو۔“

”پہلے میں ذرا اس کی طبیعت صاف کر دوں.....“ رحیم نے کہا۔ وہ شاید شام ہی سے مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ الیاس صاحب آ کر خود ہی نمٹیں گے، اس سے۔“ ہیڈ محرم نے اسے ڈانٹ دیا۔

”میں جا کر جگے صاحب کو تلاش کرتا ہوں۔“ دوسرے کا نشیبل نے کہا۔ ”بے چارے نہ جانے کب سے مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ خدا جانے کہاں ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ ہیڈ محرم نے کہا۔ پھر وہ رحیم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اسے لے جا کر بند کر دو۔“

رحیم نے مجھے لے جا کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور دروازے پر تالا لگا کر واپس چلا گیا۔ میں نے کوٹھری کا جائزہ لیا۔ وہاں بچانے کے لیے فرش، اوڑھنے کے لیے چھت اور سر کے نیچے رکھنے کے لیے دیوار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تھکن سے برا حال ہو رہا تھا۔ نیند کا تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تھکن کی اس کیفیت میں اس طرح بیٹھنا راحت بخش معلوم ہو رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں، میں بے خبر ہو گیا، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں سو گیا تھا۔

خدا جانے مجھے اس حال میں بیٹھے کتنی دیر ہوئی تھی کہ کسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کوٹھری کے سلاخ دار دروازے پر وہی سب انپکٹر کھڑا تھا، جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا تھا۔ ”کیا حال ہے؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اب تو مجھے چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں ریشمیں نے پوری کہانی سنا دی ہوگی۔“

”کیسی کہانی! میں تو بس اسے گھر چھوڑ آیا ہوں۔ جگا پہلوان تھا نہیں..... ورنہ اسے سنبھالنا دشوار ہو جاتا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تم نے اپنی شامت کو دعوت دی ہے۔ اگر تم نے

سلطان صاحب کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو اب تک میں تمہارا دماغ درست کر چکا ہوتا۔ صبح جب سلطان صاحب آئیں گے، تب تمہارا فیصلہ ہوگا۔“

”مجھے بستر تو لا دو۔“

”یہ تھانہ ہے..... اسپتال نہیں۔“ اس نے تینکے لہجے میں کہا۔ ”بس..... اب آرام کرو۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے قدرے اطمینان ہو گیا۔ سلطان کی آمد تک تو خیریت ہی خیریت تھی۔ اس کے بعد جو ہوتا سو ہوتا، لیکن مجھے ریشمیں پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس کی خاطر میں نے کتنی قربانیاں دی تھیں، لیکن اس کی بے مہری کا یہ عالم تھا کہ اس نے میری صفائی تک پیش نہیں کی تھی۔ بس ہونٹ سی کر بیٹھ گئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر اس وقت میرے پاس دوائے غیاب ہوتی تو میں کتنی آسانی سے گھر پہنچ گیا ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ مجھے دوائے غیاب اور اس کا تریاق خاصی مقدار میں ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن شیشیاں اٹھائے اٹھائے پھرنا بھی کوئی معمولی عذاب نہیں تھا۔ البتہ ایک صورت تھی۔ دو اسکنوف کی صورت میں تیار کر کے کپسول بنانے کا تجربہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ یہ تجربہ ضرور کروں گا۔

سناے نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔ لہذا مجھے اس منحوس کوٹھری میں بھی نیند آ گئی۔ کوٹھری میں چھتوں کی بہتات تھی اور چھتوں بھی سائز کے اعتبار سے چھوٹے موٹے پرندوں جتنے ہی تھے۔ اس کے باوجود میں تھکن سے نڈھال ہونے کی وجہ سے گھوڑے بچ کر سویا۔ صبح کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا، میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں تو رحیم کو کوٹھری میں موجود پایا۔

”چلو..... تمہیں سلطان صاحب بلارہے ہیں۔“

میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے کوٹھری سے نکل آیا۔ جیسے ہی میں سلطان کے کمرے میں داخل ہوا، وہ مجھ پر برس پڑا۔ ”کیا ہو گیا ہے، تمہیں..... تم جن بادشاہ کی بدنامی کرانے پر تلے ہوئے ہو۔ بات بھیک مانگنے تک حد درہتی تو غنیمت تھا۔ اب تم نے اغوا کرنا بھی شروع کر دیا۔“

”کیا میں رحیم کے سامنے ہی اپنی صفائی پیش کر دوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے حد تیکھے لہجے میں پوچھا۔

وہ گڑ بڑا گیا۔ چند لمحوں سوچتا رہا..... پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے رحیم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ”ہاں..... اب بولو کیا بات ہے۔“ وہ غرایا۔ ”لیکن یاد رکھنا، اس بار میں تمہیں بخشوں گا نہیں۔“

”تمہیں یاد ہے، میں نے پہلے ہی تمہیں ریشماں کے اغوا کے بارے میں آگاہ کیا تھا لیکن تم نے گامے شاہ کے خلاف کوئی ایکشن لینے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ اب میں اس پورے واقعے کی رپورٹ درج کراؤں گا۔ میں نے طمطراقیل کی مدد سے اسے رہا کرایا اور اب تم لوگ مجھ پر ہی اس کے اغوا کا الزام عائد کر رہے ہو۔“

اس کی آڑوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ”چھوڑو پیر بھائی..... غصہ تھوک دو۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہاں..... تم نے مجھے بتایا تو تھا۔“

”یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں رات بھر کوٹھری میں بند رہا ہوں اور ننگے فرش پر سویا ہوں۔“ مجھے غصہ آ گیا۔

”ارے، میں ذمے دار لوگوں کو سخت سزا دوں گا۔ کھال کھنچو اداؤں گا، مردودوں کی۔“

”اور میں طمطراقیل سے کہوں گا کہ وہ تمہیں بھی سخت سزا دے۔“

اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ”خدا کے لیے پیر بھائی..... ایسا نہ کرنا۔ دیکھو نا..... آخر ہم پیر بھائی ہیں۔ میں.....“

”کہاں ہے وہ مردود..... چھھر کی اولاد۔“ باہر سے کسی کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ ”میں اس کا خون پی جاؤں گا۔“ آواز اسی کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے جگا دروازے پر داخل ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھرے ہوئے سائنڈ کی طرح چھٹا۔ میں بدک کر سلطان کی اوٹ میں جا چھپا۔

سلطان اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”کیا بات ہے پہلوان اتنے برہم کیوں ہو؟“

”میں..... میں اس کا خون پی جاؤں گا۔“ جگا پھر دھاڑا اور میری طرف جھپٹا لیکن سلطان نے اسے بازو سے تھام لیا۔

”یہ..... اس نے تو گامے شاہ کے چنگل سے چھڑایا ہے، تمہاری بہن کو۔“ سلطان نے کہا۔ ”یہ میرے پیر بھائی ہیں۔ بہت شریف آدمی ہیں۔“

”میں خوب جانتا ہوں اسے یہ پہلے بھی ایک بار ریشماں کی وجہ سے میرے ہاتھوں پٹ چکا ہے۔“

سلطان نے یہ سنتے ہی مجھے گھور کر دیکھا۔ جواباً میں نے بھی اسے آنکھیں دکھادیں۔ اس وقت اصل مسئلہ میری سلامتی کا تھا۔ سلطان میرے تیور دیکھ کر سنبھل گیا۔ ”آپ نے اپنی بہن سے بھی پوچھا؟“ اس نے جگے سے پوچھا۔

”مجھے تو ابھی پتہ چلا ہے، میں ساری رات اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ ابھی تک گھر نہیں گیا، لیکن میں جانتا ہوں کہ مجرم یہی ہے۔“

”لیکن پیر بھائی ایسا نہیں کر سکتے۔“ سلطان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے..... میں سمجھ گیا۔ تم اسے بچا رہے ہو، لیکن کب تک بچاؤ گے۔“ جگے نے دھمکی دی اور پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر ہم دونوں سانٹے کے سے عالم میں بیٹھے رہے۔ ”ناشتہ مانگو اؤں پیر بھائی؟“ سلطان نے پوچھا۔

”بڑی عنایت ہے، تمہاری، لیکن میں اب گھر جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

سلطان میرے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ تھانے کے دروازے تک وہ میرے ساتھ لگا رہا، میری چال پوسی کرتا رہا، لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے تو جگے کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی تھی۔ گیٹ پر سلطان نے زبردستی میرا ہاتھ تھام لیا اور اسے بڑی گرم جوشی سے دباتے ہوئے بولا۔ ”میری طرف سے دل صاف کر لو پیر بھائی..... اور ہاں جن بادشاہ کو میرا اسلام کہنا۔ میں اس جہمرات کو پھر ان کی فاتحہ دلاؤں گا اور تمہارے اعزاز میں قوالی بھی کراؤں گا۔“

”خدا حافظ۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا اور وہاں سے چل دیا۔

میں نے دن کی روشنی میں اپنا حلیہ دکھایا تو کلیجہ منہ کو آ گیا۔ شام کو کچھڑ میں پھسلا تھا تو کپڑوں کا بیڑا غرق ہوا تھا۔ رہی سہی کسر کوٹھری میں ننگے فرش پر سونے کی وجہ سے پوری ہو گئی تھی، لیکن اسی حال میں گھر تک پہنچنا تھا، مرتا کیا نہ کرتا..... نظریں جھکائے گھر کی طرف بڑھتا رہا۔

گھر پہنچ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ رات بے آرامی میں گزری تھی۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

سو کر اٹھا تو دوپہر کے کھانے کا وقت نکل چکا تھا۔ میرے ذہن پر سفوف اور کپسول والا تجربہ بھی سوار تھا۔ چنانچہ میں بازار سے مکھن اور ڈبل روٹی لے آیا۔ چائے بنائی اور ڈبل روٹی سے شکم پری کی۔ اس کے بعد میں دوا پر کام کرنے میں مصروف ہو گیا۔

کئی گھنٹے بعد سفوف تیار ہو گیا۔ میں نے ایک پھٹکی ماری اور آئینے کے سامنے بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ میں غائب ہو گیا تھا۔ پھر میں نے تریاق والا سفوف استعمال کیا تو کچھ ہی دیر بعد مجھے آئینے میں اپنا عکس دکھائی دینے لگا۔

اب مجھے یہ سفوف بڑے پیانے پر تیار کرنا تھا۔ اگلے دن بازار سے خالی کپسول اور پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں خرید لایا، جن میں آٹھ دس کپسول بے آسانی رکھے جاسکتے تھے۔

کپسول میں نے مختلف رنگوں کے خریدے تھے تاکہ کسی الجھن کا امکان نہ رہے۔

اگلے دو دن میں اسی چکر میں لگا رہا۔ بالآخر سفوف، کپسولوں میں بھر کر میں نے دوائے

غیاب کے آٹھ کپسول پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لیے اور دوائے غیاب والا ایک کپسول پانی کے ساتھ نگل لیا۔ اسی وقت دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو جان ہی نکل گئی۔ دروازے پر جگا کھڑا تھا۔

سوائے اس کے کوئی اور صورت نہیں تھی کہ میں باہر بھاگ لوں۔ میں بھاگا تو جگے نے مجھے پکارا لیکن میں کہاں رکنے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ دوڑنے کے معاملے میں وہ مجھے شکست نہیں دے سکتا۔ وہ تھوڑی دور تو میرے پیچھے بھاگا..... پھر رک گیا۔

کافی دور جا کر میں نے قدموں کو بریک لگائے اور عام رفتار سے چلنے لگا۔ رکنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں گھر سے نکل تو آیا تھا لیکن اب مجھے دوا لجنسین پریشان کر رہی تھیں۔ ایک تو میں گھر کھلا چھوڑ آیا تھا۔ دوسرے دوائے غیاب کا کپسول حلق سے اتار چکا تھا اور کسی بھی لمحے غائب ہو سکتا تھا۔ تریاق کپسول استعمال کیا جاسکتا تھا۔ لیکن میں قیمتی دوا ضائع کرنے کی فضول خرچی نہیں کر سکتا تھا..... پھر مجھے خیال آیا کہ تریاق کپسول تو میں ساتھ لانا ہی بھول گیا ہوں۔

اچانک مجھے ٹھوکر لگی۔ پھر جو میں نے قدم بڑھایا تو چپل پیچھے ہی رہ گئی۔ ہوائی چپلوں میں سب سے بڑی نامعقولیت یہی ہوتی ہے، اب اسے پہن کر چلنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ میں نے اسے ہاتھ میں نکال لیا اور موچی کی طرف بڑھ گیا، جو خوش قسمتی سے سامنے ہی بیٹھا نظر آ گیا تھا۔

”اسے ایک نانا لگا دو۔“ میں نے چپل موچی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
موچی نے سراخا کر میری طرف دیکھا۔ پھر نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور منہ کھل گیا۔

”پکڑو نا چپل۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
اس بار موچی کے کھلے منہ سے عجیب لائینی سی آوازیں نکلنے لگیں، لیکن اس نے چپل کی طرف اب بھی ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

”ارے یار..... چپل کی مرمت کرو گے یا نہیں۔“ میں نے دریافت کیا۔
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

”بھیم..... بھیم..... بھیم..... بھوت.....“ اس کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ادھر ادھر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں پھر موچی کی طرف متوجہ ہوا، جو اب بھوت بھوت چیختا ہوا ایک طرف بھاگ اٹھا تھا۔ بازار میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ میری سمجھ میں پوری بات آ گئی۔ یقیناً میں غائب ہو چکا تھا۔ موچی کی سراسیمگی اس بات کا

ثبوت تھی۔ میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ چپل جڑوانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ٹوٹی ہوئی چپل اور درست چپل، دونوں ایک طرف پھینک دیں اور گھر کی طرف واپس چل دیا۔ غائب حالت میں ننگے پاؤں مجھے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ آگے..... کچھ لوگوں نے موچی کو گھیر لیا تھا اور اس سے سوالات کر رہے تھے۔ وہ ہکلا ہکلا کر نہ جانے کیا جواب دے رہا تھا۔

میں خاموشی سے نکلتا چلا آیا، لیکن مجھے گھر تک پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ ننگے پیر چلنا بھی ایک عذاب ثابت ہو رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کنکر تو خیر برداشت کیے جاسکتے تھے لیکن جب ایک کیلا پتھر بری طرح چبھا تو میری جان پر بن آئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ غائب ہونے کا فائدہ اتنا تو اٹھایا ہی جاسکتا ہے کہ کسی دکان سے اپنے لیے چپلوں کی ایک جوڑی حاصل کر لی جائے۔ یہ خیال آتے ہی میں بازار کی طرف چل دیا۔ فٹ پاتھ پر چپلوں کی کئی دکانیں تھیں۔ میں ایک دکان کی طرف بڑھ گیا، لیکن وہاں پہنچ کر بجائے اس کے کہ چپل اٹھاتا، مجھے اپنے ضمیر سے بحث کرنا پڑ گئی۔ چھوٹی سی دکان تھی اور دکاندار بہت غریب معلوم ہوتا تھا۔ ایسے مین چپلوں کی ایک جوڑی پار کرنا مجھے بہت بڑا جرم معلوم ہو رہا تھا۔ میں گوگو کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک شخص دکان پر چلا آیا۔ اس نے کئی چپلیں دیکھنے کے بعد ایک چپل منتخب کی اور دکاندار سے اس کے دام پوچھے۔

”ایک سو دس روپے۔“ دکاندار نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جس کی عمر دس سال رہی ہوگی۔

”دینے والی بات کرو بھائی۔“ خریدار نے کہا۔

”چلیے آپ دو روپے کم دے دیجیے۔“

”صرف دو روپے۔“

”ایمانداری کی بات ہے صاحب کہ یہ چپل مجھے سو روپے کی پڑتی ہے۔ دس روپے میرے منافع کے ہیں اس میں سے بولے، کتنا کم کر دوں۔“

خریدار یہ سن کر آگے بڑھنے لگا۔

”سنیے تو صاحب..... آپ کیا دیں گے؟“

”نوے روپے۔“ خریدار نے کہا۔

”یہ تو نقصان کا سودا ہے جناب۔“ دکاندار نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔
”چلیے..... بچا نوے دے دیجیے۔“

”نہیں..... میں تو نوے ہی دے سکتا ہوں۔“

”چلیے صاحب، آپ جیتے، میں بار۔“ دکاندار نے کہا اور چپلیں لفافے میں ڈال کر

اسے خریدار کی طرف بڑھا دیا۔ خریدار نے اسے سوکا نوٹ دیا تو اس نے دس کا نوٹ واپس دے دیا۔ خریدار چپلوں کا لگانا دیا، جیسے کوئی معرکہ سر کر کے جا رہا ہو۔

نہیں ان کے مکالے بڑی دلچسپی سے سنتا رہا تھا۔ آخر میں میرا دل بھر آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بارن قدر دشوار ہوتا ہے۔ دکاندار بے چارے کو محض کاروبار جاری رکھنے کے لیے صرف ایک سوے میں دس روپے کا خسارہ اٹھانا پڑا تھا۔ میں.....

اچانک دکاندار کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اپنے بیٹے سے مخاطب تھا۔ ”دیکھا بیٹے..... اسے کہتے ہیں، کاروبار۔ اب بتاؤ..... وہ ناولٹی شوز والی دکان بھی تو اپنی ہی ہے۔ اب سمجھو، میں اس چھوٹی سی دکان پر کیوں جھک مارتا ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں بابا۔“ لڑکے نے کہا۔

”کوڑھ مغز..... یہی چپل اپنی اس دکان، ناولٹی شوز پر ساٹھ روپے کی بکتی ہے۔ یہاں میں نے احسان کر کے نوے کی بیٹی ہے۔ گاہک بھی خوش، منافع بھی زیادہ۔ آئی بات سمجھو۔“

”جی بابا..... میں سمجھ گیا۔“ لڑکے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میری کھوپڑی گھوم گئی۔

”آئیے..... بابو جی، آئیے۔“ دکاندار نے کسی سے کہا۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ایک خوش رو اور خوش پوش جوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی..... کشش تھی۔ مجھے ایسا لگا، جیسے وہ خاص طور پر مجھے دیکھ رہا ہو، لیکن ظاہر ہے، یہ میرا وہم تھا۔ غائب حالت میں وہ مجھے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور چپلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا۔

مجھے دکاندار کی باتیں سن کر سخت غصہ آیا تھا۔ کم بخت کس طرح لوٹ مار کر رہا تھا۔ میں اسے غریب دکاندار سمجھا تھا، لیکن اب پتہ چلا کہ ناولٹی شوز ازم نامی مشہور دکان کا مالک وہی ہے۔ میں اس کی خاطر خواہ خواہ اپنا خون جلا رہا تھا..... ضمیر کی مار سہہ رہا تھا۔ ایسے آدمی کی دکان سے تو اصولاً مجھے سب سے مہنگا جوتا اڑانا چاہیے تھا۔ میں چپلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے طے کر لیا تھا کہ آئندہ کبھی ہوائی چپل نہیں پہنوں گا۔ پھر چمڑے کی ایک نفیس چپل مجھے پسند آئی گئی۔ دکاندار نے خریدار کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ لڑکا بھی ان دونوں کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اپنی پسندیدہ چپلیں اٹھائیں اور چل دیا۔ دو قدم آگے جا کر میں نے پلاسٹک کی ٹھیلی چپلیں نکال کر پہن لیں۔

”یہ صاحب آپ کے جاننے والے تھے؟“ میرے کانوں میں نئے خریدار کی آواز

ہی۔ وہ دکاندار سے مخاطب تھا۔ میں حیران رہ گیا۔

”کن صاحب کی بات کر رہے ہیں، آپ؟“ دکاندار نے جواباً پوچھا۔ مجھے اطمینان سو دا، لیکن میں نے قدم تیز کر دیے۔ یہ بات طے تھی کہ خریدار نے مجھے دیکھا تھا۔ جب کہ دکاندار مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ خدا جانے..... دوامیں پھر کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی..... یعنی میں کسی کے لیے حاضر تھا اور کسی کے لیے غائب۔ یہ صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔

”وہ صاحب، جو چپل لے کر گئے ہیں۔“ خریدار کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ میری طرف اشارہ بھی کر رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم، دکاندار نے کیا جواب دیا۔ میں نے تو بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ پھر مجھے قب سے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ میں ایک تاریک گلی میں ٹھس گیا، لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ تعاقب کرنے والے کی رفتار بہت تیز ہے۔ درمیانی فاصلہ بت تیزی سے سمٹ رہا تھا۔

گلی ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھے آلیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور میری گردن پھڑکی۔ ”شرم نہیں آتی تمہیں؟“ اس نے کہا۔

”کک..... کیا مطلب؟“

”چوری کرتے ہو۔ شرم کرو۔ تم تو پوری برادری کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو۔“

”ب..... برادری..... کیا مطلب؟“ میں بوکھلا گیا۔

”مطلب وتلب بعد میں سمجھاؤں گا۔ پہلے چل کر چپل واپس کرو۔“

میں اور بوکھلا گیا۔ چپل واپس کرنے کی صورت میں، بازار میں افراتفری مچ جاتی۔ لیونکہ اس ایک شخص کے سوا میں کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

”بھئی..... کیا میں تمہیں نظر آ رہا ہوں؟“ میں نے بڑی بے چارگی سے پوچھا۔

”لو..... نظر نہ آنے کی کیا بات ہے، تم میں..... اوہ..... میں سمجھا..... تم اس وقت غائب

الٹ میں ہو؟“

میں نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے تو حاضر ہو جاؤ۔“

میں اس فی ہے کئی فرمائش پر ششدر رہ گیا۔ وہ حاضر غائب کے چکر سے واقف بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی میں نے بے تکی فرمائش کر رہا تھا۔ میری گردن اب بھی اس کے اشارے میں تھی۔

”مم..... میں حاضر نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کہا۔ اس کا جغرافیہ اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”بکواس مت کرو۔ مجھ سے بہانے بازی نہیں چلے گی۔“ اس نے گرفت مزید سخت کر دی۔ ”حاضر ہو جاؤ..... اور میرے ساتھ واپس چلو۔ اس شریف آدمی سے معافی مانگو اور چپل بھی واپس کرو۔“

میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ کیا کروں..... تریاقی کپسول میں گھر ہی بھول آیا تھا۔ اب بھلا کس طرح حاضر ہوتا۔

”جلدی کرو..... ورنہ گردن توڑ دوں گا۔“ اس نے گرفت مزید سخت کرتے ہوئے دھمکی دی۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔

”آخر تم ہو کون؟“ میں نے جھلا کر پوچھا۔
”مجھے نہیں جانتے!“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”میرا نام مسکرائیل ہے۔ چلو اب

جلدی سے حاضر ہو جاؤ۔“
اس کا نام سن کر میری سٹی گم ہو گئی کیونکہ وہ یقیناً کوئی جن تھا۔ میں تھرتھرا کر اپنے لگا اور پسینہ تو گویا میرے جسم سے پھواروں کی طرح بہہ نکلا تھا۔

☆.....☆.....☆

میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا اور جسم اس بری طرح لرز رہا تھا، جیسے میں جاڑے کے بخار میں مبتلا ہوں۔ اتنی خراب صورت حال سے میں پہلے بھی دو چار نہیں ہوا تھا۔ میری گردن بدستور اس کی گرفت میں تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ میں بے ہوش کیوں نہیں ہو گیا۔ ادھر وہ میرے جسم کے رقص بے اختیار پر حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بات میرے حق میں جانی تھی۔ انسان ہر نئی چیز اور نئی بات پر حیران ہوتا ہے، لیکن یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ اسے قبول کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا۔ چنانچہ میرے ذہن نے بھی مسکرائیل نامی اس جن کو قبول کر لیا۔ بدن کا لرزہ کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گیا۔ خوفزدہ تو میں اب بھی تھا، لیکن اعصابی طور پر خود پر قابو پا چکا تھا۔

”چلو.....“ اس نے مطالبہ کرنے والے انداز میں کہا۔

”میری گردن تو چھوڑو۔“

اس نے میری گردن چھوڑ دی۔ اسے یقین تھا کہ میں کہیں بھاگ نہیں سکوں گا، اس بات کا خود مجھے بھی یقین تھا۔ لہذا میرا بھانسنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ البتہ میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا، جس پر عمل کر کے اس مصیبت سے باعزت طور پر جان چھڑائی

جاسکے۔ لیکن کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ دراصل جن کے سلسلے میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔
”بھائی..... میری ایک التجا ہے۔“ میں نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس معاملے کو یہیں ختم کر دو۔“

وہ یک لخت برہم ہو گیا۔ ”اگر تم شرافت سے نہ گئے تو اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

”اچھا، چپل ہی واپس کرنی ہے، نا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں..... اور تمہیں معافی بھی مانگنا ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بے بسی سے کہا۔ ”ایک صورت

ہے۔ تم بھی غائب ہو جاؤ۔ پھر ہم چل کر چپل واپس کر دیں گے میں اس مردود، فراڈ چپل والے سے معافی بھی مانگ لوں گا۔“

اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”عجیب جاہل جن ہو تم..... یا پھر بن رہے ہو۔“
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تمہیں جناتی اصول بھی یاد نہیں ہیں۔“ اس نے کہا۔

میں مزید بوکھلا گیا۔ ”میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”واقعی تم جاہل ہو۔“ واہ دانت پیس کر بولا۔ ”میرے خیال میں تم حقائق بڑھتی کے بیٹے ہو۔ تمہارا نام تو جہلائیل ہونا چاہیے۔ اچھا..... یہ بتاؤ کہ تم نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟“

میں بے حد فخر یہ لہجے میں اسے اپنی تعلیم کے متعلق بتانے ہی والا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ میں ایک جن سے ہم کلام ہوں اور وہ مجھے بھی ایک جن ہی سمجھ رہا ہے۔ شاید اسی میں میری بہتری بھی تھی۔ ”میں واقعی جاہل ہوں۔“ میں نے قسمی صورت بنا کر کہا۔

”پھر یہاں کیوں چلے آئے؟“ اس نے ترجم آمیز لگا ہوں سے مجھے دیکھا۔ ”تمہیں معلوم نہیں، ہم حاضر حالت میں آنے کے بعد کم از کم تین دن کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ تین دن سے پہلے غائب نہیں ہو سکتے۔ مجھے حاضر ہوئے ابھی ایک ہی دن ہوا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر وہ غائب ہو سکتا تو بات پھر بھی بن جاتی۔

”سوچ کیا رہے ہو، اب چلو۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”اور ہاں..... اب جلدی سے حاضر ہو جاؤ۔“

حاضر ہونا میرے بس میں نہیں تھا۔ اگر ہوتا تب بھی ایسا ہرگز نہ کرتا۔ حاضر حالت میں تو میری چٹنی ہی بن جاتی۔ میرا کیریر تباہ ہو کر رہ جاتا۔ پھر مجھے دوائے غیاب کا خیال آ گیا۔ میں

نے جیب سے شیشی نکالی اور نہایت ادب سے ایک کپسول ہتھیلی پر رکھ کر اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”یہ دوائے حل المشکات ہے۔“

”اے..... تم جاہل ہو کر اتنی ثقیل زبان بولتے ہو۔“ اس نے مجھے ڈانٹا۔ ”اور مجھے اس دوا کی کوئی ضرورت نہیں، اب چلتے ہو یا اٹھا کر لے چلوں؟“

”ذرا ٹھہرو..... پہلے میں تمہیں یہ دوا کھا کر دکھا دوں۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے کپسول منہ میں ڈالا اور اسے نگل گیا۔ پھر میں نے منہ کھول کر اسے دکھایا تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ میں نے کپسول نگل لیا ہے۔ تب میں نے ایک کپسول نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں۔ تم مجھے کیا دھوکہ دو گے۔“ اس نے کہا اور کپسول نے کر نگل لیا۔ ”ہاں، اب چلو۔“

اب اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہذا اس کے ساتھ چل دیا۔ میں نے کپسول یہ سوچ کر لیا تھا کہ ممکن ہے، اس بار میں اس جن کی نگاہوں سے بھی غائب ہو جاؤں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسری طرف وہ بھی غائب نہیں ہوا تھا۔ بہر حال، اب کشاں کشاں اس جائے مصیبت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”تم حاضر ہو گئے ہونا۔“ اچانک ہی اس نے پوچھا۔

”ہاں..... میں حاضر ہو گیا ہوں۔“ میں نے بلا جھجک کہا اور جیب سے شیشی نکال کر، ایک اور کپسول اس کی طرف بڑھا دیا۔ ممکن ہے، جن ہونے کی وجہ سے ایک کپسول اس کے لیے ناکافی ہو، لہذا دوسرا کپسول آزمانے میں کوئی حرج نہ تھی۔

”نہیں..... اب میں یہ چیز نہیں کھاؤں گا۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”کھالو، کھالو، چلوغوزے ہوتے تو اس سے تمہاری خاطر تواضع کرتا۔“ میں نے کہا۔ ”نی الحال اسی سے کام چلاؤ..... تمہیں حضرت سلیمان کی قسم۔“

اس نے فوراً کپسول نگل لیا۔ پھر مجھ پر آنکھیں نکالیں۔ ”عجیب بدتمیز جن ہو۔ آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔“

میں نے بے حد خلوص سے وعدہ کر لیا کہ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔

ہم چلتے رہے۔ اب ہم اس تاریک گلی سے نکل آئے تھے۔ میں نے روشنی میں دیکھا کہ میرا سایہ اب بھی غائب ہے اور مسکرائیل پر میرے دو کپسول ضائع ہو چکے ہیں۔ کوئی نتیجہ نہیں

نکلا۔ وہ اب بھی نظر آ رہا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ اچانک اس نے پوچھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یعنی اب مجھے اپنے نام کا ترجمہ جناتی زبان میں کرنا تھا۔ میں اہل اور عمران کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا۔

میں نے تمہارا نام پوچھا ہے؟“ اس نے دہرایا۔

”مسکرائیل.....“ میں نے جلدی سے کہا۔

ہم بازار میں پہنچ گئے۔ کچھ فاصلے پر وہی دکان تھی، جہاں سے میں نے چپل اڑائی تھی۔ یعنی میں جائے مصیبت کے خاصا قریب پہنچ گیا تھا۔ ”میرا ہاتھ تو چھوڑو۔“ میں نے التجا کی۔ ”میں تمہارے مقابلے میں تو دوڑ نہیں سکتا۔“

اس نے ازراہ مہربانی میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اب مجھے آئندہ کالائے عمل ترتیب دینا تھا۔ میں اس کی رفتار دیکھ چکا تھا، چنانچہ بھاگنا فضول تھا۔

”ارے..... پاگل تھا کوئی۔“ دکاندار کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اب ہم دکان کے خاصا قریب پہنچ چکے تھے۔ دکاندار اچھا خاصا مجمع لگائے کھڑا تھا۔ ”کسی ایسے آدمی کی طرف اشارہ کر رہا تھا، جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ پھر اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا.....“ روئے سخن مسکرائیل ہی کی طرف تھا۔

میں نے دکان کے گرد و پیش کی تفصیل ذہن نشین کی۔ دکان سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بس کھڑی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

”دیکھیں..... دیکھیں یہی ہے۔“ دکاندار نے لوگوں کو اشارے سے بتایا۔ ذرا آنکھیں تو دیکھیں اس کی میرا خیال ہے، پھر گلے پڑے گا۔ خیر سمجھ لوں گا اس سے بھی، میں نے بڑے بڑے پاگلوں کو سیدھا کر دیا ہے۔“

اتنی دیر میں ہم دونوں دکان پر پہنچ گئے۔ دکاندار بھڑکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ”معاف کیجیے گا جناب۔“ مسکرائیل نے بے حد لجاجت سے کہا۔ ”یہ میرے بھائی ہیں، بس یونہی شرارت سے چپل چرالے گئے تھے۔ اب اسے واپس کرنے آئے ہیں۔“ اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ چپل واپس دے دو۔“

دکاندار اور اگر گرد کھڑے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مسکرائیل کو مجھ سے مخاطب ہوتا دیکھ رہے تھے۔ پھر دکاندار کو شاید اپنے دعوے کا خیال آ گیا۔ ”ابے تو پاگل ہے تو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔“ وہ دہاڑ کر بولا۔

”تمیز سے بات کیجیے۔“ مسکرائیل نے اسے ڈانٹا۔

”موقع واردات پر پکڑے گئے ہو۔“ مداخلت کرنے کہا۔ پھر میں نے کن انھیوں سے دیکھا۔ وہ میرے برابر ہی اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔

”ہوں..... اس نے ہوں کو بے حد طویل کرتے ہوئے کہا۔ ”لاش موجود ہے۔“ میں بھونچکا رہ گیا۔ پہلے تو میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بس کے نیچے دیکھا۔ لیکن مجھے کوئی لاش دکھائی نہ دی۔ پھر اضطراری عالم میں، میں مداخلت کار کی طرف مڑا اور بڑبڑایا۔ ”کہاں ہے لاش؟“

”بونیس ہو..... یہ سامنے کیا پڑا ہے..... اور اسے تہی نے نقل کیا ہے۔“ اتنی دیر میں میرے اوسان ٹھکانے آچکے تھے۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ ”ارے مرزا دہشت..... تم؟“

”ہاں میں۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”لیکن اس وقت میں ایک قانون پسند شہری بھی ہوں اور ایک ذہین سراغ رساں بھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔ ہم دونوں اب بھی اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ ”بکومت۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”تمہیں اس لاش کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔“

ذرا مجھے جائے واردات کا اچھی طرح معائنہ کرنے دو۔“ یہ کہہ کر وہ بس کے نیچے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اس کی نظروں کا تعاقب کیا، لیکن مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اب مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ ویسے غصہ جھاڑنے کے لیے وہ بے حد مناسب آدمی تھا۔ بلکہ اس کے تو میں ایک دو ہاتھ بھی جھاڑ سکتا تھا۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، مرزا دہشت۔“

”مرگیا مرزا دہشت۔“ وہ چیخا۔ ”میری دوستی کے حوالے سے تم اتنا سنگین جرم کر کے بچ نہیں سکتے۔ میں قانون شکن مجرموں کا دشمن نمبر تین ہوں۔“

میراجی تو چاہا کہ اس سے، پہلے دو دشمنوں کے بارے میں پوچھوں، لیکن اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی دکھ کر مجھے خود بھی سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ میں نے پھر بس کے نیچے مذکورہ لاش تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ ”لاش کہاں ہے، بھائی؟“ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا..... ”اب تھوڑی دیر بعد تم کہو گے کہ ایک حادثے کے نتیجے میں تمہاری بیانی بلکہ یادداشت بھی جاں بحق ہو گئی ہے۔“ اس نے تادیبی لہجے میں کہا اور پھر ہاتھ بڑھایا۔ ”یہ رہی لاش۔“ میں نے دیکھا، اس کا ہاتھ سڑک سے تقریباً ایک بالشت اوپر تھا۔ میں دہل کر رہ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی شخص غائب حالت میں قتل کر دیا گیا ہو۔ میں نے پھر مرزا کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں سنگینی خیمہ زن تھی۔ ”کک..... کیا کہہ رہے ہو، مرزا؟“ میں نے رو دینے والے

”میں بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔ بس یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔“ ”آپ نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟“ مسکرائیل نے فوراً آنکھیں نکالیں۔

دکان دار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ..... جو توں کی ایک جوڑی مسکرائیل کے سر پر دے ماری۔ ”دیکھو اس کی آنکھیں دیکھو۔ یہ یقیناً ایک خطرناک پاگل ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بری طرح چیخنے لگا۔

مسکرائیل سناٹے میں آ گیا۔ میرے لیے یہ مہلت بہت کافی تھی۔ میں بس کی طرف لپک پڑا۔ بس کی اوٹ میں پہنچ کر میں اکڑوں بیٹھ گیا اور وہ منظر دیکھنے لگا۔ وہ سب مسکرائیل پر پل پڑے تھے۔ مسکرائیل پٹ رہا تھا اور ادھر ادھر مجھے تلاش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ عمرائیل..... عمرائیل کہہ کر مجھے پکار رہا تھا۔ اس حماقت پر اس کی مرمت کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ وہ یقیناً کوئی بے حد شریف جن زادہ تھا کیونکہ وہ ابھی تک جارحیت پر نہیں اترا تھا۔ پٹ رہا تھا اور ہونقوں کی طرح چاروں طرف مجھے تلاش کر رہا تھا۔

میں بس کی اوٹ سے نکل کر فرار ہو سکتا تھا مگر میں کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اگر بھاگتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو میری خیر نہیں تھی۔ پھر تو وہ مجھے پاتال میں بھی نہ چھوڑتا۔ اس کی رفتار تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ وہ اس وقت عوام الناس کے ہاتھوں جتنی سعادت ندی سے پٹ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس کے ہاتھ آ گیا تو وہ تمام دبی ہوئی جارحیت کا نشانہ مجھ نہاتا تو اس کی ہونٹوں میں آگ بھڑک اٹھتی۔ چنانچہ میں اکڑوں بیٹھا اس کی پٹائی کا منظر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تو وہ کسی سعادت مند لیکن نالائق بیٹے کی طرح مجھے کے ہاتھوں پٹتا رہا پھر شاید اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بے سود قربانی دے رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ برادری کی عزت خطرے میں نہیں ہے بلکہ برادری کا گمراہ فرو عمرائیل بھی فرار ہو چکا ہے۔ اچانک ہی اس نے بگشت ایک طرف دوڑ لگا دی۔ کچھ حضرات نے اس کا ناکام تعاقب بھی کیا، لیکن مسکرائیل کی رفتار بہت تیز تھی۔ جلد ہی وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کا وزن تو ہوا کے جھونکے سے زیادہ نہیں تھا، لیکن صورت حال اور اس برقعے کا اچانک پن..... میں جہاں کا تھاں رہ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پلٹ کر دیکھتا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جن زادہ مسکرائیل پلٹ آیا ہے اور اب میری خیر نہیں ہے۔

”کیا ہو رہا ہے؟ جانتے ہو جرم کبھی نہیں پھلتا۔“ ایک بارعب آواز سنائی دی۔ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ اسی وقت میری نظر اپنے سائے پر پڑ گئی۔ کم بخت دو! پھر دھوکا دے گئی تھی۔

زخم کا نشان ریڑھ کی ہڈی کے ۲۷ ویں اور ۲۸ ویں مہرے کے درمیان ہے۔ یقیناً یہ وار مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔“

میں نے دوبارہ بے بسی سے بس کے نیچہ دیکھا لیکن مجھے کوئی چاقو دکھائی نہ دیا۔
”لیکن مجھے شک ہے۔“ مرزا دہشت کا بیان جاری رہا۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ زخم مقتولہ کے جسم پر موت کے بعد لگایا گیا ہے۔ مقصد صرف سراغ رساؤں کو بھٹکانا تھا۔ بہر حال، چاقو پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات ضرور ہوں گے۔ کیوں؟“ اس نے اچانک ہی مجھ سے پوچھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے قدرے سنبھل کر کہا۔ ”لیکن تم تو ہوٹل چار سو بیس کے کیشیئر ہو..... تمہیں تفتیش کا حق کس نے دیا؟“

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ”ارے وہ ملازمت تو ایک فریب ہے۔ میں خفیہ کا آدمی ہوں۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“

میرے دیوتا کو ج کر گئے۔ وہ یقیناً ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا۔ میں نے ناولوں میں پڑھا تھا کہ پولیس کے خفیہ محکمے کے کارکن اپنی شناخت چھپانے کے لیے بعض اوقات بے حد گھٹیا کام بھی کرتے ہیں۔

”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“ اس نے دہرایا۔

”تم چاقو پر انگلیوں کے نشانات کی بات.....“

”ہاں ہاں۔“ اس نے میری بات کا ٹیڈی۔ ”تم نے دستانے استعمال کیے تھے؟“

”دستانے..... میں نے زندگی میں کبھی دستانے نہیں پہنے۔“

”واردات کرتے وقت ہمیشہ پہنا کر دو۔“ اس نے مربیانہ لہجے میں نصیحت کی۔ ”اب مارے گئے نابچو،..... چاقو پر تمہاری انگلیوں کے نشانات یقیناً ملیں گے اور وہ تمہیں تختہ دار تک پہنچا دیں گے۔“

”لیکن میں نے چاقو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“ میں نے احتجاج کیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ مجھے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ چاقو اور لاش تو اب تک نظر نہیں آئی۔

اس نے میری بات نہیں سنی اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”لیکن نہیں..... اگر میرا خیال درست ہے اور لاش پر موت کے بعد چاقو استعمال کیا گیا ہے تو تم پرنٹل کا الزام نہیں آئے گا، بس لاش کی بے حرمتی کے جرم میں تین سال کی سزا ہوگی۔“

یہ سن کر میری کچھ جان میں جان آئی۔

”اور جہاں تک میرا خیال ہے، آلہ قتل یہ ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بس کے نیچے

انداز میں کہا۔

”اب یہ ڈرامہ بند کرو قاتل۔“ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”مجھے غور کرنے دو۔ لباس سے تو یہ جاپانی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن.....“ وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”تت..... تو کیا ل..... لڑکی..... کی لاش ہے؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”تم سے زیادہ کسے معلوم ہوگا قاتل۔“ اس نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کی نفرت سمو کر کہا۔ ”ہاں..... خد خد خد سے تو پاکستانی ہی لگتی ہے، لیکن رنگت.....“ اس پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ ”رنگت افریقیوں کی سی ہے۔“

میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ فوراً ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ ”خاموش بیٹھے رہو اور مجھے تفتیش کرنے دو۔“ اس نے پستول لہراتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”اور یاد رکھو..... بھاگنے کی کوشش کی تو تمہاری تشریف چھلنی کر دوں گا۔“

مری گھگھی بندھ گئی۔ عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ قتل کے الزام میں گرفتاری..... جب کہ لاش مجھے نظر نہیں آ رہی تھی..... میں دل ہی دل میں دوا کو سنے لگا۔ کم بخت ہمیشہ غلط موقع پر دعا دیتی تھی۔ یہ معاملہ ویسے بھی بہت پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

”خون بہت تھوڑا سا بہا ہے..... بلکہ مجھے تو یہ خون بھی کسی مرغ کا خون معلوم ہوتا ہے۔“ مرزا دہشت کی خود کلامی پھر شروع ہو گئی۔ ”گویا قاتل نے اسے قتل کہیں اور کیا ہے..... اور قتل کے بعد لاش یہاں لاکر ڈال دی ہے۔ کیوں؟“ وہ اچانک میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”مم..... میں..... کک..... کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

”..... تو تم آسانی سے اعتراف جرم نہیں کر دو گے..... آہا۔“ اس نے پھر غائبانہ لاش پر نظریں جمادیں۔ جو ابھی تک مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ ”گویا لڑکی نے مزاحمت کی تھی۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”اس کے ناخن میں قاتل کی کھال کے ٹکڑے اور متعدد بال ہیں اور.....“ وہ پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”اور میں لیبارٹری کے معائنے کے بغیر بھی یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بال تمہارے ہی ہیں۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے انکشاف کیا۔

”مم..... مرزا..... مم..... میری بات تو سنو..... مم، میں تو۔“

”بکومت، اب تمہیں پھانسی کے پھندے پر پہنچا کر ہی دم لوں گا۔“ وہ دہاڑا اور پھر لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہوں..... آلہ قتل بھی موجود ہے۔ تیز دھار چاقو..... اور لاش کے جسم پر

سے کا غذا کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا اور اسے سو گھنٹے لگا۔ ”کڑوے بادام کی بو..... ہوں تو یہ بات ہے۔ لڑکی کو کہیں اور پونا شیم سائنائیڈ دیا گیا۔ پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی کے ۲۷ ویں اور ۲۸ ویں مہرے کے درمیان چاقو استعمال کیا گیا..... تاکہ تفتیشی افسر بھٹک جائے۔ پھر لاش لاکر یہاں ڈال دی گئی۔ اس پڑیا میں یقیناً سائنائیڈ ہوگا اور اس پڑیا پر تمہاری انگلیوں کے نشانات بھی ہوں گے۔“

”کیا کہہ رہے ہو، مرزا.....“

”مرزا نہیں..... انسپکٹر تفضل کہو۔“ اس نے میری بات کا ٹکڑا دی۔ میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن آواز نہیں نکلی۔ میرا حلق بالکل خشک ہو گیا تھا۔

”چلو..... بھورے بالوں والے جنونی قاتل کا کیس تو میں نے حل کر لیا.....“

”لیکن میرے بال تو کالے ہیں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”اب تک قتل ہونے والی تمام لڑکیوں کے بال بھورے تھے، اس لیے اخبار والوں نے تمہیں بھورے بالوں والے جنونی قاتل کا نام دیا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی اس کے تیور بدل گئے۔ ”تم، بے رحم، سفاک قاتل۔ موت کی سزا تمہارے جرائم کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ میرے بس میں ہوتا تو تمہیں کتوں سے نچوڑ دیتا۔“

کتوں کے تذکرے پر میرے رو گئے کھڑے ہو گئے۔ میں ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ ”لیکن مرزا.....“

”پھر وہی مرزا۔“ وہ دباڑا۔ ”انسپکٹر کیوں نہیں کہتے۔“

”انسپکٹر..... یقین کرو کہ میں بے قصور ہوں۔ میں نے ہرگز قتل نہیں کیا۔“

”ہر قاتل یہی کہتا ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”یہ تمام مکالمے عدالت کے لیے محفوظ کر لو۔ فی الحال ہمیں تھانے چلنا ہے۔“ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ جیسے ہی ہم دونوں پلٹے..... مرزا کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ میرے ہوش اڑ گئے۔

ایک باوردی ہیڈ کانسٹیبل کھڑا ہمیں قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ خدا جانے وہ کتنی دیر سے کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ مرزا دہشت کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔ میں تو اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ مرزا نے آگے بڑھنا چاہا، لیکن پولیس مین نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ”کیا بات ہے مائی باپ؟“ مرزا نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کہاں چلے جا رہے ہو؟“ پولیس والے نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

”گھگھ..... گھگ..... گھر۔“ مرزا ہکلا یا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ہکلانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

”گھر کہاں چلے..... تم دونوں کو تھانے چلنا ہوگا۔“

”وہ کیوں م..... مائی باپ؟“ مرزا نے پوچھا۔

”قتل کے جرم میں۔“

”قتل..... کیسا قتل؟ مائی باپ..... میں جاسوسی ناول لکھتا ہوں۔ اہل بھائی کو یہاں بیٹھے

دیکھ کر ایک پلان سوچ گیا۔ ہم تو پریکٹس..... میرا مطلب ہے، ریہرسل کر رہے تھے، مائی باپ۔“

”کیوں بکواس کرتے ہو؟“ پولیس والے نے ڈانٹا۔

”آپ خود دیکھ لیجیے۔ یہاں کوئی لاش نہیں ہے۔“ مرزا نے بس کے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کانسٹیبل نے جھک کر نیچے دیکھا۔ پھر مرزا کا پستول اٹھاتے ہوئے سیدھا ہو گیا.....

اور بغیر لائسنس کا پستول بھی لیے پھرتے ہو۔“

”وہ جی..... یہ تو نقلی پستول ہے۔“

مجھے مرزا پر اس شدت کا غصہ آیا کہ اگر مائی باپ کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا تو میں اسکی ہڈیاں چاڈھ لیتا۔ تم ازم اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ۲۷ ویں اور ۲۸ ویں مہرے سے ضرور محروم کر دیتا، لیکن مجبوری تھی اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

”اچھا تو یہ نقلی ہے۔“ پولیس والے نے کھسپائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جی ہاں.....“ مرزا نے اپنی کمروہ ہتھیلی کی نمائش کر ڈالی۔

”اوئے..... بند کر یہ دانت۔“ پولیس والا اچانک دباڑا۔ ”تمہیں قتل کے جرم میں تھانے چلنا ہے۔“

”لیکن لاش کہاں ہے، مائی باپ۔“ مرزا نے فریاد کی۔

”اور کیا جناب، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔“ میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہوں..... لاش غائب کر دی ہے، اس لیے اکڑ رہے ہو۔ تھانے چل کر دو منٹ میں تمہارا دماغ درست ہو جائے گا۔“

مرزا واویلا کرتا رہا اور میں اس پر دانت پیتا رہا، لیکن پولیس والے نے ہماری ایک نہ سنی۔ بالآخر وہ ہمیں لے کر تھانے کی طرف چل دیا۔ مرزا دہشت بیگ اسکی بے سود چالوسی کیے جا رہا تھا۔ میں اپنی حماقت پر کڑھ رہا تھا۔ غضب خدا کا، اس خبیث نے سائنائیڈ کی پڑیا تک سو گھنٹی۔ اور میں اس قدر حواس باختہ ہوا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں دلایا کہ وہ زہریشی میں رکھا جاتا ہے، اس کی پڑیا نہیں بنائی جاتی۔ میں دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ لیکن میں

یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکا کہ مرزا دہشت بیگ نہ صرف بہترین اداکار تھا بلکہ ایک اچھا مصنف بھی تھا۔ اس نے ڈرامہ ہی ایسا پاورفل پیش کیا تھا کہ خود میرے اپنے ہوش و حواس اتفاقی چھٹی پر چلے گئے تھے۔ پھر میں نے جو ہوا، اس پر خاک ڈالی اور صورت حال کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ تھانے میں یقیناً سلطان سے ملاقات ہوئی، یعنی تھانے جانا مخدوش بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ سلطان تلون مزار جی میں، دوائے غیاب سے کم نہیں تھا۔ موڈ اچھا ہوتا تو خاطر مدارت کر ڈالتا اور خراب ہوتا تو قتل کی ایف آئی آر کاٹ کر حوالات میں بند کر دیتا، اس کے بعد چھتر لگا تا کہ لاش کے متعلق بتاؤ۔ مجھے پھر مرزا دہشت بیگ پر غصہ آ گیا۔ بد بخت نے خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔

”اور میاں.....“ پولیس والے نے پلٹ کر مجھے مخاطب کیا تو میں چونک پڑا۔ ”بھاگنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر مرزا دہشت بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا جو منہ ہی منہ میں لفظوں کا مکھن بلو کر اسے رسید کر رہا تھا۔ ہر بار وہ اسے ڈپٹی صاحب کہہ کر مخاطب کرتا۔ لیکن پولیس والا بھی بے حد خشک جلد کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ جو سارا مکھن جذب کر رہا تھا۔ وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ میں ایک قدم پیچھے اپنی تقدیر کو، کوستا ہوا چل رہا تھا۔ جلد ہی ہم اس بس اسٹاپ تک پہنچ گئے، جہاں گزشتہ روز مجھے بن مانگے بھیک ملی تھی۔ چلتے چلتے اچانک پولیس والے نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور سراسیمہ ہو کر بولا۔

”ارے..... کہاں غائب ہو گیا، یہ؟“

میں نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ نہ جانے کس کی بات کر رہا تھا۔

”کہاں گیا، تمہارا ساتھی؟“ پولیس والے نے مرزا پر آنکھیں نکالیں۔

”مجھے کیا معلوم، ڈپٹی صاحب!“ مرزا نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو آپ کے

ساتھ چل رہا ہوں۔“

میں نے بوکھلا کر خود کو ٹوٹا..... پھر اپنا سایہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر سایہ ہوتا تو ملتا۔ میرا جی چاہا کہ خوشی سے ناپنے لگوں۔ میں نے بے اختیار جیب سے دوائے غیاب کے کپسولوں کی شیشی نکالی اور اسے چوم لیا۔ بالآخر دوا مکمل بہ دفا ہو رہی تھی۔ مرزا اور پولیس والا، دونوں ہی بوکھلا کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔

”تم بہت بد معاش ہو۔“ پولیس والے نے گھونہ لہراتے ہوئے، مرزا سے کہا۔ ”پہلے تو نے لاش غائب کی اور اب اپنے ساتھی کو بھگا دیا۔“

”مم..... میں نے کہاں بھگایا ہے، ڈپٹی صاحب! میں تو آپ کے شانہ بشانہ چل رہا

تھا۔“

”تم سے تو میں تھانے چل کر سمجھوں گا۔“

”میرا تو خیال ہے، اب مجھے بھی چھوڑ ہی دیجیے۔“

”تمہیں چھوڑ دوں۔“ پولیس والے نے سخت لہجے میں کہا۔ ”پھر وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔“

”اچھا..... یہ بتاؤ کہ تمہاری جیب میں کیا ہے؟“ اس کا لہجہ راز دارانہ تھا۔

مرزا دہشت بیگ نے بوکھلا کر اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ ”جج..... جی ہاں..... تین روپے تیس

پیسے ہیں۔ ڈیڑھ روپے صبح کے کرائے کا چھوڑ کر باقی پیسے.....“

”تین روپے میں پیسے! ہنہہ.....“

”چلیں آپ سارے ہی لے لیں۔ میں صبح پیدل چلا جاؤں گا۔“ مرزا نے فراخ دلی

دکھائی۔

”ہائیں..... مجھے رشوت دے رہے ہو۔“ ایک لخت پولیس والے کے تیور بدل گئے

”قتل جیسے سنگین جرم کے بعد رشوت کی پیشکش..... چلو، جلدی چلو۔ اب تو تم سے تھانے میں

بات ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے مرزا کا ہاتھ تھاما اور اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں بھی ان کے

پیچھے پیچھے چل دیا۔ ”ویسے بڑے افسوس کی بات ہے۔“ پولیس والے نے چلتے چلتے کہا۔ ”اس

کے لہجے میں تاسف تھا۔“ اتنے بڑے مجرم ہو تم۔ قتل کر کے لاش غائب کر دیتے ہو۔ لیکن جیب

میں صرف تین روپے تیس پیسے رکھتے ہو.....“

”کیسا قتل..... کہاں کا قتل۔“ اس بار مرزا دہشت بیگ رو دیا۔ ”ڈپٹی صاحب، میں تو

بہت نرم دل آدمی ہوں۔ آج کل گھر میں کھٹل ہو گئے ہیں۔ کم بخت رات بھر کاٹتے رہتے

ہیں۔ میری نرم دلی دیکھیے کہ آج تک ایک بھی نہیں مارا۔ میں بھلا قتل کیا کروں گا۔“

”اچھا بکو اس مت کرو۔“ پولیس والے نے اسے ڈانٹ دیا۔

اب ہم تھانے کے گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ وہ دونوں گیٹ میں داخل ہو گئے۔ لیکن میں

رک گیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ غائب حالت میں اندر جا تو سکتا تھا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دوا

کس وقت دھوکا دے جائے۔ اندر جانے میں مجھے یہ تو فائدہ تھا کہ سلطان کے رد عمل کا اندازہ

ہو جاتا، پھر میں اس کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ خراب موڈ میں ہوا اور میں اچانک

ظاہر ہو گیا تو..... مجھ میں اس وقت کا تصور کرنے کی بھی جرأت نہیں تھی۔ پھر مجھے خیال آ گیا

کہ دوا تو میری جیب میں بھی موجود ہے۔ میں نے تھیلی جیب سے نکال کر دیکھی۔ اس میں چار

کپسول باقی تھے۔ میں نے فوری طور پر ایک اور کپسول نگل لیا۔ اب کچھ دیر کے لیے یہ دھڑکا

نہیں رہا تھا کہ میں اچانک ہی ظاہر ہو جاؤں گا۔ میں تھانے میں گھس گیا۔

مرزا دہشت بیگ ہیڈ محرر کے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں سیدھا سلطان کے کمرے

کی طرف چل دیا۔ کمرے کے قریب پہنچا تو اندر سے آنے والی آوازوں نے میرے اندازے کی تائید کر دی۔ مرزا انسپکٹر سلطان سے نبر آ رہا تھا۔ میں سلطان کے کمرے میں داخل ہوا تو مرزا کو سلطان کے رو برو کھڑے پایا۔ میں کمرے کے ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا، جہاں سے ان دونوں کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

”تو تم ہومرزادہشت جگ؟“ سلطان کہہ رہا تھا۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔“ مرزا نے بڑی شدت سے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن میں واضح طور پر اس کی ٹانگوں کو نفی میں ہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے تمہارے تقریباً تمام ناول پڑھے ہیں۔ تم میرے پسندیدہ ناول نگار ہو۔ تم اپنے ناولوں میں بڑے بے چیدہ کیس نہایت آسانی سے کر لیتے ہو۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ لیکن مجھے زندگی میں کبھی کسی ایسے کیس سے واسطہ نہیں پڑا جو تمہارے کسی کیس سے مطابقت رکھتا ہو۔“

مرزا دہشت نے پہلو بدلا۔ اب اس کی ٹانگوں کی منفی جنبش رک گئی تھی۔ ایسا لگتا کہ سلطان کی تعریف نے اس کا اعتماد بحال کر دیا ہو۔ ”دراصل میں ہمیشہ ایسے کیس حل کرنے کے چکر میں رہتا ہوں، جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔“ مرزا نے فخریہ لہجے میں اسٹارٹ لیا اور پھر پہلو بدلا۔ ”اگر اجازت ہو تو فرش پر ہی بیٹھ جاؤں۔ دراصل مجھ سے زیادہ دیر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔“

”آؤ..... یہاں، اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“ سلطان نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ مرزا نے بے حد سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی۔

”تو جناب میں نے ایسے ایسے قتل کروائے ہیں، جو عملاً ناممکن ہیں۔“ مرزا نے کہنا شروع کیا۔ ”شاید آپ کو میرا ناول ”متوالی آنکھ“ یاد ہوگا۔ وہ نازک طبع حسینہ جو صرف پلک جھپکنے سے مر جاتی ہے اب آپ دیکھیں کہ آلہ قتل کتنا انوکھا ہے..... ایک انسانی آنکھ! مقتولہ کے جسم پر زخم کا کوئی نمایاں نشان نہیں۔ خون بھی نہیں نکلا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی کوئی مدد نہیں کرتی۔“ اس نے رک کر سلطان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”کہتے رہو۔“ سلطان نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہارا یہ ناول نہیں پڑھا۔“

”آپ دیکھیں جناب کہ میں نے اس قتل کے لیے مقتولہ کی کردار نگاری کیا غضب کی، کی تھی۔ وہ اتنی نازک لڑکی تھی کہ ماں اسے برا بھلا کہتی تو اس کی پتی اچھل آتی، کوئی خلاف مزاج بات کہتا تو اس کے منہ پر مہا سے نکل آتے۔ کوئی اس پر غلط نظر ڈالتا تو اس کے چہرے پر جھبائیاں پڑ جاتیں۔“ مرزا نے قدرے توقف کے بعد پھر سلطان کا معائنہ کیا۔ سلطان کے

تاثرات دیکھ کر یقیناً اس کا دل خوش ہو گیا ہوگا۔

”وقفہ مت کرو۔ بولتے رہو۔“ سلطان نے بے چینی سے کہا۔

”سو جناب، اس کے قتل کا کیس جب کیپٹن ڈفر کو ملا تو اسے دانتوں پسینہ آ گیا۔ بظاہر لڑکی کی موت قدرتی معلوم ہو رہی تھی۔ کیپٹن کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں حس بالکل خاموش تھی، لیکن نویں حس کا بلب مسلسل جل بھج رہا تھا۔ یعنی وہ قتل کا کیس تھا۔ کیپٹن ڈفر جانتا تھا کہ لڑکی کو قتل کیا گیا ہے۔ لیکن وہ یہ بات ثابت کیسے کرتا۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ آلہ قتل کس طرح کا ہے۔ وہ مردہ خانے میں بیٹھا لڑکی کی لاش کو گھورتے ہوئے اس سلسلے میں غور کر رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق لڑکی کی موت دماغ کی رگ پھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے جو بغیر کوئی نشانہ چھوڑے دماغ میں داخل ہو کر رگ پھاڑ سکتا ہے۔ اچانک ہوا چلی.....“ مرزا کا لہجہ بے حد پراسرار اور ڈرامائی ہو گیا۔

مجھے اپنے روکنے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ سانس روکے بیٹھا تھا۔

”اچانک ہوا چلی..... لاش کی کنپٹی پر گرمی ہوئی بالوں کی لٹ اڑی تو کیپٹن کو وہ نشان نظر آیا۔ اس کے دماغ میں مروشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر محدب عدسہ نکالا اور نشان کا جائزہ لیا۔ وہ نشان، انسانی آنکھ جتنا بڑا تھا۔ کیپٹن نے جھٹ اس کی پیمائش کر ڈالی۔ آنکھ قدرے چھوٹی تھی، نشان کی سرخی میں بھورے پن کی آمیزش تھی، جس سے پتہ چلتا تھا کہ قاتل کی آنکھ بھورے رنگ کی ہوگی۔ اس ایک لمحے میں کیپٹن کو آلہ قتل کی نوعیت اور اس کے ساز کا بھی پتہ چل گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ آلہ قتل کہاں تلاش کیا جائے۔ لڑکی کی لاش ایک سینما ہال میں پائی گئی تھی۔ نشان کا بائیں کنپٹی پر ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ قاتل، لڑکی کے بائیں جانب بیٹھا تھا اور جس وقت اس نے لڑکی کو آنکھ مارنے کا کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس الجھن کو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لڑکی کو لایا علمی میں آنکھ مارنے کا کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس الجھن کو کیپٹن کی بارہویں حس نے رفع کر دیا۔ جواب سیدھا سادا تھا۔ قاتل نے لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوگا، لیکن عین موقع پر لڑکی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی ہوگی۔ قاتل اپنی آنکھ کا ٹرائیکلر ڈیپچا ہوگا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے اگر اس نے لڑکی کو سامنے سے آنکھ کا نشانہ بنایا ہوتا تو وہ مرنے سے بچ جاتی۔ زیادہ سے زیادہ اس کے چہرے پر طویل عرصے کے لیے داغ پڑ جاتا۔ اب کیپٹن کے لیے قاتل کی تلاش کا کام درپیش تھا۔ اس کے پاس آلہ قتل سے متعلق پوری تفصیل موجود تھی۔ اس کے باوجود کیس الجھ گیا۔ بد قسمتی سے قاتل ٹرک کے حادثے میں مارا گیا اور اس کی وصیت کے مطابق اس کی ایک آنکھ کسی یک چشم کروڑ پتی دوشیزہ کے

مجھے بہت زور کا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ مردود کی اچھی طرح دھنائی کروں لیکن مرزا کی طوطا ی کا مکمل مظاہرہ دیکھنے کی خاطر خود پر جبر کر لیا۔

”اچھا..... اب تم پوری کہانی سناؤ الو۔“ سلطان نے غراتے ہوئے کہا۔

”عالی جاہ میں شادمان مارکیٹ سے گزر رہا تھا کہ میں نے ابو العمران کو ایک رکی ہوئی کے قریب اکڑوں نیچے دیکھا۔ وہ بس کے نیچے کچھ دیکھ رہا تھا۔ بس، پھر میں بھی تجس کے یں مارا گیا۔ میں نے بھی جھک کر دیکھا۔“

”اور وہاں لاش موجود تھی؟“

”نہیں جناب!“

”لیکن نواز نے خود تمہاری ساتھی کو کہتے سنا تھا کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ اگر لاش نہ ہوتی یہ بات کیوں کہتا؟“ سلطان نے کہا۔

”قسم لے لیجئے عالی جاہ..... میں نے کوئی لاش نہیں دیکھی۔“

”کچھ بھی ہو تمہیں لاش کے متعلق بتانا ہوگا۔“ سلطان نے کہا۔ ”تم بڑے ناول نگار ہو لیکن تم نہیں جانتے کہ پھیٹی کسے کہتے ہیں؟“

اب مرزا کی ٹانگیں اس بری طرح نفی میں بل رہی تھیں کہ اس کا ایک جگہ کھڑا رہنا بھی وہی معلوم ہو رہا تھا۔ ”مم..... میں بتاتا ہوں۔ ابو العمران اکڑوں بیٹھا کچھ دیکھ رہا تھا..... کچھ نظر تو نہیں آیا لیکن میں نے سوچا کہ اس نے قتل کر کے لاش غائب کر دی ہوگی۔ اب طا کہ اس نے قتل کر کے لاش غائب کر دی ہوگی۔ اب احتیاطاً دیکھ رہا ہوگا کہ خون کا کوئی وغیرہ تو نہیں رہ گیا ہے۔ بس پھر میں نے سچ اگلوانے کے لیے یہ ظاہر کیا جسے لاش میرے نے ہے اور میں اس کا حلیہ بیان کر سکتا ہوں۔ اس نے حلیہ سن کر بھی میرے بیان کی تردید کی۔ میں آگے قتل کے متعلق بھی بے سرو پا ہانکتا رہا۔ اس نے اس کی بھی تردید نہیں کی۔“

”آدمی تم ذہین ہو۔“ سلطان نے کہا۔

”مرزا نے ہڈیوں پر مشتمل اپنا سینہ پھلا لیا اور فخریہ انداز میں مسکرانے لگا۔

”اوئے سیدھے کھڑے رہو اور یہ بیسی بند کرو۔“ سلطان کے تیور پھر بدل گئے۔ ”ابھی لاش نہیں ملی سمجھے۔“

مرزا بالکل الف ہو گیا۔ ”وہ بھی مل جائے گی۔“ اس نے بے حد خلوص سے کہا۔ ”عالی بے حد ذہین افسر ہیں۔“

سلطان خوش نظر آنے لگا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے پھر تیور بدل لی ”لاش کا حلیہ بتاؤ۔“

”لیکن وہ فرضی حلیہ تھا جناب۔“ مرزا نے فریاد کی۔

لگا دی گئی۔ یہ وہی آنکھ تھی، جو قتل کی مرتکب ہوئی تھی۔ کیپٹن ڈفرن تحقیق کرتے کرتے کروڑ پتی دوشیزہ تک پہنچ گیا۔ دوشیزہ کی ایک آنکھ سیاہ تھی اور دوسری بھوری..... بھوری آنکھ درحقیقت آگے قتل تھی۔ جب کہ بائیں آنکھ، جو کہ آگے قتل تھی، مقتولہ کی بائیں جانب سے اس کی بائیں کیپٹی کو متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس دوشیزہ کا کہنا تھا کہ وہ زندہ میں کبھی چہارٹا کیز نہیں گئی اور نہ ہی اس نے وہ فلم دیکھی تھی..... بلکہ اس نے تو یہ بھی ثابت کر دیا کہ جس روز قتل کی واردات ہوئی، وہ ایک چشم تھی..... یعنی آگے قتل اس کے پاس نہیں تھا۔ کیپٹن ڈفرن.....

”بند کرو یہ بکواس۔“ سلطان کھڑا ہوتے ہوئے دباڑا۔

میں متوالی آنکھ، کی کہانی بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ یک لخت چونک پڑا۔ مرزا دہشت بیگ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

”اوئے، کرسی چھوڑ دو اور سیدھے کڑے ہو جاؤ قاتل۔“ سلطان پھر دباڑا۔

مرزا دہشت بیگ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگیں پھر نفی میں ملنے لگیں۔

”سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور مجھے آج کی واردات کے بارے میں سچ بچ بتاؤ۔“ سلطان پھر چلایا۔

”وہ..... وہ عالی جناب..... آ..... آج تو کوئی واردات نہیں ہوئی۔“ مرزا اٹھانے لگا۔

وہ تو..... ہم پریکٹس..... میرا مطلب ہے، ریہرسل کر رہے تھے۔ میں ایک نیا ناول لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔“

”اوئے..... کبھی آئینے میں اپنا وجود دیکھا ہے۔ بالکل چوسا ہوا گنا نظر آتے ہو۔ لیکن یاد رکھو، میں تمہارے لیے رس نکالنے والی مشین ثابت ہوں گا۔ میں اب بھی تمہارا رس نکال سکتا ہوں۔“

سلطان پھر مثالیں دینے پر اتر آیا۔ اس کی تازہ مثال سن کر مجھے زور کی ہنسی آئی لیکن میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بچھینچ لیا۔ مرزا کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی جھٹکے میں رس سے بالکل محروم ہو چکا ہے۔ ”مم..... میں..... کس..... سچ.....“ وہ ہٹکانے لگا۔

”میں پوچھتا ہوں، لاش کہاں ہے؟“ سلطان دباڑا۔

”وو..... وہ تو ابو العمران کو معلوم ہوگا۔“ مرزا نے جواب دیا اور میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”بائیں..... اس چکر میں بھی پیر بھائی..... خیر، اس مرتبہ ایسے رگڑوں گا جیسے نیولا سانپ کا سر رگڑتا ہے۔“

”فرضی حلیہ ہی بتاؤ۔“ سلطان غرایا۔ پھر اس نے دلیل دی۔ ”ابوالعمران نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔“

اب مجھے بشمول اپنے کمرے میں موجود ہر شخص پر غصہ آ رہا تھا۔ اس خبیث مرزا دہشت بیگ نے مجھے اس مصیبت میں پھنسا دیا تھا اور میں بڑے معصومیت سے پھنس بھی گیا تھا اور اب وہ مردود انسپٹر سلطان اس قدر اطمینان معاملے میں اس قدر سنجیدہ ہوا جا رہا تھا۔

”بتاؤ حلیہ۔“ سلطان نے گرج کر کہا۔

مرزا نے وہی حلیہ بیان کرنا شروع کر دیا، جو مجھے سنایا تھا۔

”گویا وہ کسی افریقی لڑکی کی لاش تھی۔“ سلطان نے پر تفلر لہجے میں کہا۔

”لیکن نقوش دیسی تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”ممکن ہے، لاش پر قتل کے بعد میک اپ کر دیا گیا ہو۔“ مرزا نے خیال آرائی کی۔

”کیا بکواس ہے۔“ سلطان نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اچھا۔۔۔۔۔ تم اپنے ساتھی کا نام لاؤ۔“

”ابوالعمران بتاتے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ لیکن وہ میرا ساتھی نہیں۔ وہ پہلے ہی سے جائے واردات پر موجود تھا۔ یہ میری بد قسمتی تھی کہ میں اس وقت وہاں سے گزر رہا تھا۔“

حالاں کہ اس کا وہاں سے گزرنا میری بد قسمتی ثابت ہوا تھا۔

”یقین نہیں آتا۔ اچھا اس کا حلیہ بتاؤ۔“ سلطان نے کہا۔

”وہ لڑکی جاپانی کمونو۔۔۔۔۔“

”میں لاش کا نہیں، ابوالعمران کا حلیہ پوچھ رہا ہوں۔“ سلطان نے وضاحت کی۔

”اوہ، اچھا۔“ مرزا دہشت نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے وہ ناک بھوں کے

حوالے سے شاید دماغ پر زور دیتا رہا، پھر بولا۔ ”بونا سا قد ہے ان کا چہرہ ہانگ کا نگ کی گھڑ جیسا، جس پر ہر وقت بارہ بجے رہتے ہیں۔“

”یہ حال تھا اس کم بخت ناول نگار کے مشاہدے کا۔ فرضی لاش کا حلیہ کیسی تفصیل سے رہا تھا اور جیتے جاگتے ابوالعمران کا حلیہ بیان کرتے وقت اسے ڈھنگ کے الفاظ اور تشبیہ نہیں مل رہی تھیں۔“

”یہ کیا حلیہ بتا رہے ہو۔“ سلطان نے اسے ڈانٹا۔ ”ٹھیک طرح سے بتاؤ۔“

”جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔ دیکھیے۔۔۔۔۔ دائیں طرف کے بال گھونگھریا لے ہیں اور بائیں طرف

سیدھے۔۔۔۔۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور بھورے رنگ کی ہیں۔ لیکن ڈھیلے چہرے پر ننگے، معلوم ہوتے ہیں۔ غور کرتے وقت وہ بھیگا معلوم ہوتا ہے۔ پیشانی تنگ ہے۔ ناک می دائیں جانب جھکی دکھائی دیتی، کبھی بائیں جانب۔ ایک طرف کا رخسار بھرا ہوا ہے، سری طرف کا پیکا ہوا۔ ہونٹ موٹے موٹے ہیں اور دبانہ اتنا بڑا ہے کہ ہونٹوں کے گوشے، نوں سے رزا و نیاز کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ مسکرات ہے تو ہونٹ پھیلنے کی وجہ سے کان نے لگتے ہیں۔ ہنستا ہے تو رخساروں پر چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں ابھر آتی ہیں۔ چلتا ہے تو پھدکنے لگتا ہوتا ہے۔“

مجھے پھر غصہ آ گیا۔ کم بخت کس قدر اطمینان سے اپنا حلیہ بیان کر رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو پیر بھائی ہی کا حلیہ ہے۔“ سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن میں اس وقت مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری اہش تھی کہ سلطان اس مردود مرزا کو اچھی طرح رگڑے بلکہ نچوڑ ڈالے۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔

”عالی جاہ، میں اس ابوالعمران کو خوب جانتا ہوں۔“

”گھر بھی دیکھا ہے، اس کا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ گلی میں ایک کالی کلونی لڑکی سے فلیتہ بھی لگا ہوا ہے، اس کا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ سلطان نے کہا پھر اچانک اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”بکواس مت کرو۔ اسے نہیں، وہ میرا پیر بھائی ہے۔ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میں اس لڑکی سے ابوالعمران کی مادی کرادوں گا۔“

”ارے سن۔۔۔۔۔ نہیں، عالی جناب۔“ مرزا نے فریاد کی۔ ”وہ لڑکی ہرگز اس قابل نہیں ہے۔ البتہ تم۔۔۔۔۔ میں،۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔“

”تم نہیں جانتے یہ دل کے معاملات ہیں۔ بہر حال ہم اس کے گھر چلیں گے۔“ سلطان ٹھکڑا ہوا۔

میرے دیوتا کوچ کر گئے۔ زیتون تو یوں بھی میرے پیچھے پڑی رہتی تھی۔ اب اگر سلطان اس سلسلے میں سنجیدہ ہو گیا تو تباہی آ جائے گی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے تھے۔ میں بھی باہر آ گیا۔

تھانے سے نکل کر سلطان نے اپنی موٹر سائیکل اشارت کی، مرزا دہشت بیگ کو پیچھے بٹھایا اور میرے گھر کی طرف چل دیا۔ میں نہایت اطمینان سے پیدل چل دیا۔ پھر اچانک ہی

مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کا دروازہ تو چوہٹ کھلا ہوا تھا۔ تریاتی کپسول بھی وہیں چھوڑ آیا تھا۔ میرا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میں نے اپنی رفتار بڑھادی۔

گھر پہنچا تو کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے ہنگامی حالات پر احساس ہوا۔ میرے کمرے میں عجیب منظر تھا۔ سلطان ایک دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب عجیب چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ فضا میں ہاتھ پاؤں مارتا لیکن اسے اپنے جسم پر قابو بھی نہیں رہا تھا۔ ایک بار وہ بہت تیزی سے بلند ہوا اور دھماکے سے چھٹ سے ٹکرایا۔ یقیناً اس کے سر میں بہت زور کی چوٹ لگی ہوگی۔ بہر حال، میرے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ میں تیزی سے ڈریسیر کی طرف لپکا، جہاں میں تریاتی کپسولوں کی تھیلی چھوڑ گیا تھا۔ تھیلی وہیں موجود تھی۔ میں نے کپسول گئے۔ اس میں سات کپسول موجود تھے، جب کہ میں نے آٹھ رکھے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک کپسول مرزا دہشت بیگ نے استعمال کیا ہے۔ میری سمجھ میں پوری بات آگئی۔ وہ دوائے غیاب کا تریاق تھا، مرزا نے دوائے غیاب استعمال کیے بغیر ہی اسے استعمال کر لیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بے وزن ہو کر رہ گیا۔ پہلے تو میں دل ہی دل میں کانپ گیا۔ پھر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ تجربہ مرزا دہشت بیگ پر ہو گیا تھا۔ میں نے کپسولوں کی تھیلی جیب میں رکھ لی اور دہشت بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو بدستور چھٹ سے چپکا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ تھوڑا سا دائیں بائیں کھسک لیتا تھا۔ میں موقع غنیمت جان کر بیرونی دروازے کی طرف لپک پڑا۔ ان حالات میں بیرونی دروازے سے قریب رہنا ہی بہتر تھا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر میں پھر تماشا دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے مجھے مرزا سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

مرزا نے پھر بری طرح ہاتھ پیر چلائے اور تیرتا ہوا نیچے کی طرف آیا۔ اس کے پاؤں فرش پر نہیں لگے۔ وہ دوٹ اوپر ہی تیرتا رہا۔

”آخر ہوا کیا ہے تمہیں؟“ سلطان نے دیوار سے چپکے چپکے دریافت کیا۔

”کک.....“ مرزا اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ وہ پوری رفتار سے تیرتا ہوا مجھ سے ٹکرایا۔ لیکن مجھے تو وہ ہوا کا جھونکا ہی محسوس ہوا۔ البتہ میرا رد عمل فطری تھا۔ میں نے اس کے دہتھڑ رسید کیا۔ وہ بلبلاتا کر چیخا۔ ”کک..... کون ہے یہ؟“

”میں پوچھتا ہوں، تمہیں ہوا کیا ہے؟“ سلطان چیخا۔

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“ اس نے فضا میں قلابازی کھاتے ہوئے کہا۔ اب اس کا سر فرش کی طرف تھا اور ناگئی اوپر تھیں۔

یہی مداخلت کرنے کا موقع تھا ورنہ دوا کا راز خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ ”وہم ہے تمہارا۔“

میں نے بھاری آواز بنا کر کہا۔ ”تمہیں میں نے سزا دی ہے۔“

”کک..... کون بلا ہے، یہ؟“ مرزا ہکلا یا۔

”خاموش، بے ادب۔“ سلطان گرجا اور فوراً منوذب ہو گیا۔ ”خوش آمدید، جن بادشاہ!“ اس نے کہا۔ ”امید ہے کہ آپ نے میری جمعرات والی فاتحہ قبول کر لی ہوگی۔“

”کجو اس مت کرو۔“ میں نے بھاری آواز میں اسے ڈانٹا۔ ”میں دوسرے عقیدے کا جن ہوں۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ سلطان گڑگڑایا۔ ”تب تو آپ قوالی کے بھی خلاف ہوں گے۔“

”بالکل..... مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“

”تب پھر میں آپ کی خدمت کیسے کروں؟“

”بس اپنے کام سے کام رکھو۔“

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور یہ کیا قصہ ہے عالی مرتبت؟“ اس نے فضا میں تیرتے ہوئے مرزا دہشت بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ جواب ہاتھ پاؤں نہیں مار رہا تھا۔ غالباً بے ہوش ہو گیا تھا۔

”اس نے جھوٹ بول کر میرے دوست کو مصیبت میں پھنسانے کی کوشش کی تھی، اس کی سزا بھگت رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تم یہاں کیسے؟“

”مم..... میں قتل کے سلسلے میں ابوالعمران سے پوچھ گچھ کرنے حاضر ہوا تھا۔“

”دماغ خراب ہوا ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”کوئی قتل نہیں ہوا۔ ہر بات کو مسئلہ نہ بنالیا کرو۔“

”جی خراب ہوا ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”کوئی قتل نہیں ہوا۔ ہر بات کو مسئلہ نہ بنالیا کرو۔“

میں بوکھلا گیا۔ وہ اس مصیبت کو میرے گلے میں ڈال کر جا رہا تھا جسے دنیا مرزا دہشت بیگ کے نام سے جانتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد تو میں اچھی خاصی مصیبت میں پھنس جاتا۔ ہر گز نہیں۔ تم ابوالعمران سے ملے بغیر نہیں جاسکتے، میں نے کہا۔

”سس..... سنئے تو۔“ اس نے فریاد کی۔ لیکن میں نے چھپ سادھ لی۔

”شہنشاہ طم..... مطم..... نہیں بنتا۔“ اس نے اپنے رخسار پیٹتے ہوئے کہا۔ ”چلے گئے۔“

میں کمرے سے نکل آیا۔ دروازے مگی اوٹ میں کھڑے ہو کر میں نے تریاتی کپسول

حلق سے اتار لیا۔ چند ہی لمحے بعد مجھے اپنا سایہ نظر آ گیا اور میں کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ”تم لوگ میرے گھر کو تماشا بنانے پر تلے ہوئے ہو۔“

”اے جن بادشاہ نے سزا دی ہے۔“ سلطان نے خوش ہو کر انکشاف کیا۔ ”تم یہاں کیسے پیر بھائی۔“

”یہ میرا گھر ہے۔“ میں نے بگڑ کر کہا۔ ”البتہ تم یہاں کیسے؟“ اگر تم انیسویں کی حیثیت سے آئے ہو تو.....“

”تم بھول رہے ہو کہ ہم پیر بھائی بھی ہیں۔“ سلطان نے بے حد محبت سے کہا۔

”خیر، تب تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ کیا مصیبت ہے۔“

”اے جن بادشاہ نے سزا دی۔“ سلطان نے دہرایا۔ ”اچھا، اب میں چلتا ہوں۔“

”تم اس وقت تک نہیں جاسکتے، جب تک یہ اپنی اصلی حالت میں واپس نہیں آ جاتا۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”یہ طمطراقیل کا حکم ہے۔“

”بہت بد تمیز ہو تم۔“ وہ بگڑ گیا۔ ”کھلے عام جن بادشاہ کا نام لیتے ہو، بلکہ اس وقت تو دعویٰ کر رہے ہو کہ تم ہی جن بادشاہ ہو۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”کہہ رہے ہونا کہ میں نہیں جاسکتا، یہ جن بادشاہ کا حکم ہے۔“

”ارے نہیں۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جن بادشاہ نے مجھے یہاں

آنے کا حکم دیتے وقت کہا تھا کہ تم سے یہ بات کہہ دوں۔“

”تب تو مجبوری ہے۔“ سلطان نے سرد آہ بھر کر کہا۔

”لیکن یہ خبیث اصلی حالت میں کب واپس آئے گا؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔“ میں نے اس خبیث کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جواب ہوش میں

آچکا تھا۔

میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس کے ذریعے اسے لینڈ کرایا جاسکے۔ پھر مجھے ایک بات سوچ گئی۔ ”چلو اسے پکڑ کر نیچے کھینچو۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔“ میں نے سلطان سے کہا۔ سلطان نے سر کو یہی انداز میں جنبش دی۔ گویا وہ مجھ سے متفق تھا۔

وہ جیسے ہی تیرتا ہوا قریب آیا۔ ہم دونوں نے دائیں بائیں سے اسے تام لیا اور وہ نیچے کھینچنا شروع کر دیا۔ اسے کھینچنا ایسا ہی لگ رہا تھا، جیسے کوئی ہوا پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ تاہم ایسا لگا جیسے ہم اسے لینڈ کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن اچانک ہی ہوا کا ایک تیز

جھونکا آیا اور وہ ہمارے قابو سے باہر ہو گیا۔ میں تو خیر صورت حال بھانپتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ بیٹھا تھا۔ البتہ سلطان کو کچھ دیر ہو گئی۔ نتیجتاً وہ بھی مرزا کے ساتھ اٹھتا چلا گیا۔ اس نے بوکھلا کر مرزا کا ہاتھ چھوڑ دیا، لیکن اب مرزا نے اسے دبوچ لیا تھا۔ مرزا شاید بے وزن ہونے کی وجہ سے اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور سلطان دھپ سے فرش پر گر پڑا۔ دھماکہ اتنا زور کا ہوا..... مجھے خدشہ ہو چلا کہ محلے میں افراتفری مچ گئی ہوگی..... ان دنوں دھماکے بہت عام ہو چلے تھے۔ سلطان فرش پر چپٹ پڑا تھا۔ اس کی پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔ میں نے اس کی بض دیکھ کر یہ یقین کرنا چاہا کہ کہیں وہ فردوس مکانی تو نہیں ہو گیا۔ اسی وقت اس نے میری گردن دبوچ لی۔ ”یہ سب تمہاری بدمعاشی ہے۔“ اس نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے الزام عاید کر دیا۔

”میرا کیا قصور ہے۔“ میں نے بہت معصومیت سے کہا۔ ”تمہاری نیت میں فتور ہوگا۔

جبھی تو تمہیں بھی سزا ملی ہے۔ یقیناً تم مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئے ہو گے۔“

اس نے پھر مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھورا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ پھر اسے احساس ہوا

کہ وہ کس طرح فرش پر استراحت فرما رہا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”مم..... میریں..... متعلق توں کچھ سوچو۔“ اوپر سے مرزا کی منمنناٹ سنائی دی۔

”ہاں پیر بھائی..... اس بے چارے کے متعلق بھی تو کچھ سوچو۔“ میں نے سلطان سے

کہا۔

تم ہی سوچو۔ میرا بس چلے تو اسے پھانسی پر چڑھا دوں۔“ سلطان غرا کر بولا۔

مرزا دہشت پھر منمنایا لیکن اس بار اپنی بات کا مفہوم خود اس کے پلے بھی نہیں پڑا ہوگا۔

میں پھر غور کرنے لگا۔ کمرے کا جائزہ لیا کہ شاید کوئی ایسی چیز نظر آ جائے، جس سے مرزا کی بے

وزنی کا مسئلہ حل ہو سکے۔ پھر مجھے لوہے کی وہ کرسی نظر آ گئی جو پشت گاہ سے محروم تھی۔

”اے مرزا۔“ میں نے منہ اوپر اٹھا کر مرزا کو مخاطب کیا۔ ”یہ کرسی تھامنے کی کوشش کرو۔

شاید اس طرح تم گراؤنڈ ہو سکو۔“

مرزا نے منمننا کر شاید گراؤنڈ ہونے کی اصطلاح پر احتجاج کیا، لیکن اس کے ہاتھ پیروں

کی حرکت سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے میری تجویز پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ

فضا میں کسی نو مولود بچے کی طرح ہاتھ پاؤں پٹختا رہا۔ فضا میں اتنی دیر کی پیرا کی کے باوجود اسے

یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ نیچے کا سفر کرنے کے لیے ہاتھ پیروں کو کس طرح ہلانا چاہیے۔ کم بخت نرا

ناول نویس ہی تھا۔ سلطان لا تعلقی سے کھڑا اس کرسی کو دیکھ رہا تھا، جو مرزا دہشت بیگ کا مجوزہ

ہدف تھا۔ اس کے چہرے پر تنکدر کے آثار تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی گرنے کے صدمے

سے نہیں سنبھل سکا ہے۔

میں مرزا دہشت بیگ کی طرف متوجہ تھا، جو جواب غوطہ لگانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن اسے سمتوں پر بھی اختیار نہیں تھا۔ کرسی کی طرف آنا ہی اس کے لیے کاردار تھا۔ میں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کرسی اٹھا کر اس کے نیچے گھومنے لگا۔ بالآخر مجھے موقع مل گیا۔ جیسے ہی وہ ڈریسر کی سمت تیرتا نظر آیا، میں نے کرسی ڈریسر پر رکھ دی۔ خوش قسمتی سے اس دفعہ اس نے سمت تیرا کی نہیں بدلی، لیکن وہ افقی سمت میں تیر رہا تھا، اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، اس کا سر کرسی کی پشت گاہ کے خلا سے گزرتا۔ ڈاڈریسر سے ٹکرایا۔ اس نے ایک دردناک چیخ ماری اور کرسی سمیت بلند ہو گیا۔ اب اس کی گردن کرسی کے خلا میں پھنسی ہوئی تھی، بلکہ کرسی اس کی گردن میں لٹکی ہوئی تھی، جیسے کوئی ٹائی ہو۔ وہ پھنسی پھنسی آوازیں نکالتا ہوا تیر رہا تھا۔

صورت حال اور بگڑتی دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔ ”کچھ کرو یا۔“ میں نے سلطان سے اپیل کی۔ ”ذرا سی اونچ نیچ ہوئی تو اس غریب کی گردن ٹوٹ جائے گی۔“ سلطان نے گردن اٹھا کر مرزا دہشت بیگ کو دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر ہنسنے لگا۔ ”یہ غریب ہے..... یہ مردود۔“ اس نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”یقین کرو، یہ اسی سلوک کا مستحق ہے۔ اس نے تمہیں قتل کے الزام میں پھنسانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔“

”کچھ بھی ہو..... ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔“

اسی وقت میں نے مرزا کو تیرتے ہوئے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھتے دیکھا۔ میری سٹی گم ہو گئی۔ میں نے بوکھلا کر سلطان کو پکارا۔ سلطان بھی وہ منظر دیکھتے ہی صورت حال کی سنگینی سمجھ گیا۔ ہم دونوں تیزی سے لپکے۔ سلطان آگے آگے تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے مرزا دہشت بیگ کا آدھا وجود دروازے سے نکل چکا تھا۔ سلطان نے لپک کر اس کی ٹانگیں تھام لیں۔ ”پیر بھائی..... میری کمر مضبوطی سے پکڑ لو، ورنہ میں بھی چلا..... اور ہاں، مجھے چھوڑ نہ دینا۔“ وہ چیخا۔ میں نے تیزی سے اس کی کمر تھام لی۔

عجیب صورت حال تھی۔ ہم مرزا کو کمرے میں کھینچ رہے تھے۔ جب کہ اس کا بے وزن وجود باہر نکلنے پر مصر تھا۔ ہم دونوں پسینے میں نہا رہے تھے۔ اب اس صورت حال کا تصور کرنا ہوں تو ہنسی روکنا محال ہو جاتی ہے۔ اگر مرزا دہشت بیگ اس رات باہر کھلی فضا میں نکل گیا ہوتا، تو نہ جانے کیا کیا ہوتا۔ یقیناً وہ پتنگ کی طرح اڑتا پھرتا اور اسے نیچے اتارنا کسی بھی طرح ممکن نہ ہوتا۔

”میں چھوڑ رہا ہوں اسے۔“ سلطان بانپتے ہوئے کہا۔ وہ ہوا سے زور آزمائی کرتے

کرتے نڈھال ہو گیا تھا۔ ”اڑنے دو مردود کو۔“

”ارے نہیں ایسا غضب نہ کرنا۔“ میں چلایا۔ پھر میں نے تیزی سے سلطان کی کمر چھوڑ کر مرزا کی ٹانگ تھام لی اور صورت حال قدرے قابو میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم جیسے تیسے مرزا کو کھینچ کر اندر لائے۔ سلطان نے ٹھوکر مار کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے مرزا کی ٹانگ چھوڑ دی۔ سلطان بھی فارغ ہو گیا تھا۔ ہم دونوں کھڑے بانپتے رہے۔

”کس مصیبت میں پھنسنے لیا، میں۔“ کچھ دیر بعد سلطان نے بھناتے ہوئے کہا۔

”مجھے خیال نہیں رہا کہ کرسی ہلکی ہے۔“ میں نے کرسی کے ساتھ کی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ یہ افقی سمت میں تیرتا ہوا آئے تو کسی طرح اسے لوہے کی اس میز کے نیچے ٹھونس دیں۔ میں اسے پیچھے سے میز کے نیچے دھکیلوں گا، تم آگے سے کھینچنا۔“

اس بات پر مرزا نے منمننا کر زبردست احتجاج کیا۔ لیکن میں میز کو دھکیل کر کمرے کے وسط میں لے آیا۔ پھر میں تیرتے ہوئے مرزا کے سائے میں اس کے پیچھے پیچھے گھومنے لگا۔ جیسے ہی وہ مطلوبہ بلندی اور سمت میں آیا۔ میں نے سلطان کو ہوشیار کیا اور مرزا کو میز کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف سلطان بھی مصروف ہو چکا تھا۔ ہم نے مرزا کو جیسے تیسے میز کے نیچے دھکیلا۔ سلطان میز کے کنارے سے ٹکرایا اور کمرہ اس کی دہاڑے سے گونج کر رہ گیا۔ میں ہونفوں کی طرح سلطان کو تھکنے لگا۔ اچانک ہوا کو کاٹتی ہوئی، ٹوٹوں، کی آواز سنائی دی۔ آواز کی سمت دیکھا تو میری روح فنا ہو گئی۔ مرزا دہشت بیگ تیزی سے نیچے آ رہا تھا اور میں عین لینڈنگ کے مقام پر کھڑا تھا میں تیزی سے ہٹا لیکن پھر بھی میری گردن اس کی زد میں آ گئی۔ شدید جھٹکا لگا اور میں سلطان کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

ہوش آیا تو سوائے ایک تبدیلی کے صورت حال بدستور تھی۔ سلطان اسی ہلاکت خیز کرسی پر بیٹھا قہر آلود نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی مرزا دہشت بیگ کو دیکھے جا رہا تھا۔ مرزا اب بھی بے ہوش تھا۔ میں نے اپنی گردن کو چھو جو پھوڑے کی مانند دکھ رہی تھی۔ جیسے تیسے میں اٹھ بیٹھا۔

”اسے ہوش میں لاؤ!“ میں نے سلطان سے فرمائش کی۔

”بس بہت ہو چکی۔“ وہ غرایا۔ ”مجھے کئی دن تک لنگڑانا پڑے گا۔ میرا بس چلے تو اس

مردود ناول نگار کو قتل کر کے تمہارے سر ڈال دوں۔“ وہ بہت ہنسنا ہوا تھا۔

”تمہاری مرضی۔“ میں نے دردناک لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میری گردن

دوسرے یقیناً جاگنے پر مجبور ہو جاتے ہوں گے۔ لیکن برابر والی چار پائیوں پر سوئے ہوئے اس کے چاروں ملازم میرے اس خیال کی تردید کر رہے تھے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر رحیم کو جھنجھوڑا۔ دو مرتبہ جھنجھوڑنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کا وجود فرست گیر میں آ گیا۔ اس کا اندازہ میں نے گاڑی کی آواز یعنی اس کے خراٹوں سے لگایا تھا۔ ایک بار اور جھنجھوڑنے سے وہ نیوٹرل میں آ گیا۔ بالاخر فضا ساکت ہو گئی۔ یعنی اس نے آنکھیں کھول دیں، چند لمحے وہ آسمان کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔
وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں قدرے پھیل گئی تھیں۔ انسان کو سوتے سوتے اٹھایا۔ جائے تو وہ ہمیشہ ایسی ہی ناقابل فہم حرکتیں کرتا ہے۔ وہ بھی مجھے ہر طرف تلاش کر رہا تھا، جب کہ میں اس کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ ”کک..... کون..... کہہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔ اس بار اس کی آواز لڑکھڑاہی تھی۔
”میں ہوں کالا چور..... کھانا دیتے ہو یا نہیں۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ کم بخت نے آنکھیں کھول دی تھیں لیکن جاگ کے نہیں دے رہا تھا۔
اس بار اس کا رد عمل بہت خوف ناک ثابت ہوا۔ ہنسنے..... ہنسنے..... بھوت۔“ اس نے بشکل پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلانا چاہا کہ میں بھوت نہیں ہوں، مگر میرا یہ عمل بے سود ثابت ہوا۔ اس کی پھنسی پھنسی آواز گویا میرے لمس کی تاثیر سے کھل گئی۔ اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بھوت بھوت چلانے لگا۔ میں بوکھلا گیا۔ سب سے پہلے اس کے چاروں ملازم اٹھے۔ اس کے بعد دھڑا دھڑا دروازے کھلنے لگے۔ ذرا سی دیر میں میلے کا سماں ہو گیا۔ رحیم کی چیخیں سن کر کم از کم آدھا محلہ وہاں جمع ہو گیا تھا۔ مجھے چونکہ صورت حال کا بروقت ادراک ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے بھوت نہ ہونے پر اصرار نہیں کیا بلکہ دوائے غیاب کو دل ہی دل میں سلواتیں سناتا وہاں سے کھسک لیا۔ عجیب مصیبت تھی۔ بھوک لگ رہی تھی اور میں دن میں تیسری دفعہ غائب ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے دوا اور اس کا تریاق دونوں ہی اس وقت میری جیب میں موجود تھے۔ میں ایک تاریک گلی میں گھس گیا اور جیب سے ڈونوں تھیلیاں نکال لیں۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا، میں رنگ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن خوش قسمتی سے میرے پاس سچ دوا پہچاننے کا ایک اور ذریعہ بھی موجود تھا۔ دوائے غیاب کے پانچ کپسول میں استعمال کر چکا تھا جب کہ تین بھی تھیلی میں موجود تھے۔ تریاق کپسول صرف دوا استعمال ہوئے تھے۔ ایک میں نے استعمال کیا تھا اور دوسرا مرزا دہشت بیگ نے نادانستی میں استعمال کر کے اس کے خوف ناک نتائج کا

ہمیشہ کے لیے ٹیڑھی ہو گئی ہے۔“
”ٹوٹ جاتی تو بہتر تھا۔“ سلطان نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد اس کی موٹر سائیکل کے اشارٹ ہونے کی آواز آئی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

اب میں مرزا دہشت بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جس طرح پڑا ہوا تھا اسے دیکھ کر یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اس دار فانی سے کوچ نہ کر گیا ہو۔ میں نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھا۔ میں ہاتھ روم سے گلاس میں پانی لایا۔ چھینے مارنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”مجھے نہلانے کی ضرورت نہیں، میں گھر سے نہا کر نکلا تھا۔“ اس نے نہایت قہمیہ آواز میں کہا۔ ”شاید میرے جسم کی ایک ایک ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔“
”چلو اٹھو اور اپنا راستہ لو۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے۔“
”آج تو میں بھی یہیں سونے پر مجبور ہوں۔“ اس نے لیٹے لیٹے کمرے کا جائزہ لیا۔ ”اس حال میں تو میں خود سے اٹھ بھی نہیں سکتا۔“

”تو پھر سو جاؤ۔“
”بھائی ابو العمران، میری مدد کرو، آخر میں تمہارا پسندیدہ رائٹر ہوں۔“ اس نے فریاد کی۔
”اب نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔ اس سے پہلے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم ناول کس طرح لکھتے ہو۔“

”اچھا تو انسانیت کے نام پر ہی میری مدد کرو۔“ اس نے اپیل کی۔
میں نے بے زاری سے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور دوسرے بستر کی طرف لے گیا۔ ہر قدم پر وہ ہائے ہائے کرتا رہا۔ پھر بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب اگر کچھ کھانے کو مل جائے تو میں آدھا زندہ ہو جاؤں۔“
”تمہارا آدھا زندہ ہونا بھی کم خطر ناک نہیں ہے۔“ میں نے کہا، لیکن مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں بھی بھوکا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ ”خیر..... میں دیکھتا ہوں شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔“ یہ کہہ کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

باہر ہر طرف سناٹا تھا۔ اللہ توکل ریسٹورنٹ بند ہو چکا تھا، لیکن ہوٹل کا پروڈر رائٹر باہر ہی چار پائی ڈال کر سوتا تھا۔ پہلے تو میں نے ادھر ادھر کھانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ لیکن بیکری بھی بند ہو چکی تھی۔ بالاخر میں نے رحیم کو اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ماحول پر طاری سناٹے میں، پس منظر موسیقی کے طور پر رحیم کے خراٹے گونج رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ سوتا ہوگا تو

سامنا کیا تھا۔ مرزا دہشت کا خیال آتے ہی مجھے تریاقی کپسول سے ڈر گئے لگا لیکن حاضر ہونا بھی ضروری تھا۔ یوں تو دنیا میں ہر آدمی غائب ہونے کی صلاحیت حاصل کرنا چاہے گا لیکن اس سلسلے میں کتنی پے چیدگیوں سے سابقہ پر سکتا ہے، اس کا اندازہ میرے سوا کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔ بہر حال میرے پاس وہ کپسول استعمال کرنے کے سلسلے میں دو مدافعتی دلیلیں بھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ مرزا دہشت نے بغیر دوائے غیاب استعمال کئے تریاق کپسول اپنے جہنمی پیٹ میں اتارا تھا اور دوسرے یہ میرے لئے حاضر ہونا ناگزیر تھا۔

میں نے دونوں تھیلیوں کو ٹول کر کپسول گئے، اور پھر تریاقی کپسول نکال کر نگل لیا۔ اس کے بعد میں گلی سے نکل آیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ میں حاضر ہوا ہوں یا نہیں۔ اب صرف یہی ڈر تھا کہ کہیں میں پبلک کے سامنے جلوہ گر نہ ہو جاؤں۔ محلے میں رت جگا سا ہو گیا تھا۔ آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔ ہر شخص اپنی اپنی بات کر رہا تھا۔ بہر حال، میں جیسے ہی روشنی میں پہنچا، مجھے اندازہ ہو گیا کہ خوش قسمتی سے میں فوراً ہی حاضر ہو گیا ہوں۔ میں پھر اللہ توکل ریسٹورنٹ کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچا تو بتا چلا کہ محفل جمی ہوئی ہے اور رحیم میر محفل بنا بیٹھا ہے۔ وہ ہنسنی آواز لہجے میں خود کو پیش آنے والے واقعے کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں مصروف تھا۔

”آؤ، ابومیاں آؤ۔“ مجھے دیکھتے ہی اس نے آواز لگائی۔

میں نے قریب پہنچ کر سب کو سلام کیا۔ پھر میں حرفِ مطلب زبان پر لے آیا۔ ”یار رحیم بھائی، بھوک لگ رہی ہے، زبردست۔“

”اتنی رات گئے..... آخر آپ وقت پر کھانا کیوں نہیں کھاتے۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر اپنے ملازم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”افضلو..... ابو بھائی کو کھانا دے۔“

افضلو مجھے ہوٹل میں لے گیا۔ سب سے پہلے اس نے پانی کا جگ اور گلاس لا کر رکھا، پھر بولا۔ ”کیا لاؤں، زنا ب؟“

”پہلے یہ بتا کہ کھانے میں کیا کیا ہے۔“

”صرف آلو مٹر ہیں۔“

”ابے..... تو پھر تو مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہا ہے کہ کیا لاؤں؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”پوچھنا تو ہمارا فرض ہے۔“ اس نے اخلاق بگھارا۔

”اچھا..... اچھا لے آ.....“

وہ کھانا لایا تو میں نے کھانے پر ٹوٹ پڑا کھانے سے فارغ ہو کر میں نے فضلو سے ایک پیٹ میں سائن نکلوایا۔ دو روٹیاں لیں اور بل ادا کر کے باہر نکل آیا۔ میں دو قدم ہی چلا تھا کہ

مجھ سے فضلو نے آواز لگائی۔ ”پلیٹ کے پیسے نہیں لیے ہیں، زنا ب۔“

”کبواس مت کر..... صبح واپس دے جاؤں گا۔“ میں نے کہا تو اس نے دانت نکال دیے۔ باہر آ کر میں نے رحیم کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ جواب بھی قصہ خوانی کا زار لگائے بیٹھا تھا۔

”شکریہ تو اس بھوت کا ادا کرو ابومیاں، جس نے مجھے اٹھا دیا، ورنہ اس وقت کھانا کہاں نا ہے۔“ رحیم نے جواب دیا۔

میں نے دل ہی دل میں اپنا شکریہ ادا کیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ مرزا دہشت کھانا کھتے ہی از خود اٹھ بیٹھا، جیسے اسے کبھی کوئی تکلیف ہی نہ رہی ہو۔ البتہ کھانا کھاتے ہی اس نے بے شروغ کر دی۔

”اچھا اب بنومت۔“ میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ”کھانا کھاتے وقت تو ٹھیک ٹھاک تھے..... اور ہاں، یہ تمہیں ہوا کیا تھا؟“

”ہونا کیا تھا، پولیس والوں کی قربت میں ہمیشہ میرے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ ہاں ڈریسر پر کپسول پڑے نظر آئے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ بس کے پاس تم کس طرح اکڑوں بٹھے ہوئے تھے۔ یقیناً تم بھی پیٹ کے درد کے مریض ہو گے۔ درد شدید تھا، میں نے ایک لپسول نگل لیا۔ دو چار منٹ تو خیریت رہی، پھر میں غبارے کی طرح اوپر اٹھتا چلا گیا۔“

”ہوں تو یہ بات ہے۔“ میں نے کچھ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے نہیں سزا ملی ہے یاد رکھو مرزا..... اگر تم پر نزع کا عالم طاری ہو اور کوئی ڈاکٹر تمہیں بتائے کہ یہ لپسول موت کی دوا ہے، تب بھی میرے گھر سے بلا اجازت کوئی چیز کبھی نہ اٹھا کر کھانا۔ ورنہ تین کرو، موت کو تلاش کرتے پھر دو گے اور تمہیں مرنے بھی نہیں دیا جائے گا۔“

”پیٹ بری بلا ہے ابل بھائی۔“ اس نے بھکاریوں کے سے لہجے میں کہا۔ ”ویسے تم مجھ سے خفا کیوں ہو؟“

”مجھے معلوم ہے تم قابل اعتبار آدمی نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے تو مجھے مروانے بل کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ہاں، میرا حلیہ کیا بیان کر رہے تھے تم اور زیتون سے میرا معلق..... میرے حساب سے تو تم جیسے آدمی کو پیدا ہونے بغیر ہی مر جانا چاہیے تھا۔“

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ”ہاں..... یاد آتا ہے۔ جس وقت میں معلق تھا۔ اس وقت میں نے ایک اجنبی آواز سنی تھی۔ بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کہا تھا اسے میں نے سزا دی ہے۔ نظر اقل کون ہے، بھائی؟“

”وہ ایک جن ہے اور میرا بڑا معتقد ہے۔“

”جن..... ارے باپ رے۔“ مرزا پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”کہاں رہتا ہے، وہ؟“

”یہیں..... اسی گھر میں۔“

مرزا بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ ”مجھ سے نہیں سو یا جائے گا، یہاں۔ میں اپنے گھر چلتا ہوں۔“
”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے طمطر اکیل کو اپنے کسی ناول کا کردار بنایا تو سمجھ لینا.....“

”میری کیا مجال.....“ اس نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا..... میں چلتا ہوں خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

اس کے جاتے ہی میں نے دروازہ بند کیا اور آکر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ دوائے غیاب نے مجھے پھر تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ دیر تک میں اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ مجھے احساس تھا کہ ایک حماقت مجھ سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ میں نے ذرا سی دیر میں تین کپسول کھا لیے تھے۔ دوسرے، دوا کو سنوف میں تبدیل کئے جانے سے اس کی قوت میں بھی شاید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دوا میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ مجھے ہی احتیاط برتنا چاہئے۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

صبح آکھ کھلی تو آٹھ بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی تیاری کی اور رحیم کے ہوٹل کی پلیٹ لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کے ہوٹل پر مسکے بند اور ملائی والی ڈبل چائے کا ناشتہ کر کے میں دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے حسب معمول ایک فائل کھول کر اپنے سامنے رکھ لی، جس کے مندرجات مجھے زبانی یاد ہو چکے تھے۔ پھر میں اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ نہ جانے کیوں اور کیسے ریشماں یاد آ گئی۔ یادوں میں پھول سے کھل گئے۔ لیکن جب یہ یاد آیا کہ اس نے مجھے انخوا کے الزام سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی تو بے پناہ غصہ آیا اور اس کے بعد تو مجھ پر رقت سی طاری ہونے لگی لیکن اس سے پہلے ہی مجھے اپنے مستقبل کے سائلے جگے پہلوان کی دھمکی یاد آ گئی۔ میں پریشان ہو گیا اور میرے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگی۔ دفعتاً چپڑا سی نے مجھے چونکا دیا۔ ”آپ کو اشتیاق صاحب یاد کر رہے ہیں۔“

”میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کرو۔“ میں نے بیزار سی کہا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ ہمیں کوئی ڈھنگ کا یاد کرنے والا بھی نہیں۔ اشتیاق صاحب..... ہنہ۔“

ذکیہ نور دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر ہنسنے لگی۔ چپڑا سی گڑبڑا گیا۔ ”اہل صاحب! آپ میرا

مطلب نہیں سمجھے۔“ اس نے کہا۔ ”اشتیاق صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے۔“
”اچھا بھائی، تم میری طرف سے انہیں علیکم السلام بولو..... اور اب مجھے ڈسٹرب مت کرو۔“

اس دفعہ چھٹ ازادینے والا قہقہہ بلند ہوا۔ ذکیہ نور کا ساتھ یا سین نے بھی دیا تھا۔ اب وہ دونوں بے تحاشا ہنسنے جارہے تھے۔ میں ہونفوں کی طرح انہیں، اور چپڑا سی مجھے دیکھے جارہا تھا۔ وہ دونوں کافی دیر تک ہنسنے رہے بالآخر اشتیاق صاحب اپنے کمرے سے نکل آئے۔
”کیا ہو رہا ہے؟“ انہوں نے چیخ کر پوچھا۔ ذکیہ اور یا سین نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے ان لوگوں کا۔“ بالآخر ان کی طرف سے مجھے جواب دینا پڑا۔
”اوہ آپ..... آپ کو تو میں نے بلایا تھا۔“ وہ میری طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں بولے۔

”مجھے تو پتا نہیں سر۔“

”اچھا..... اب آپ راجہ کے ساتھ میرے کمرے میں تشریف لے آئیے۔“ انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ روئے سخن چپڑا سی کی طرف تھا۔
”چلیے۔“ راجہ نے مجھ سے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور راجہ کے ساتھ اشتیاق صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔

”راجہ نے آپ کو میرا پیغام نہیں دیا تھا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”دیا تھا..... اور میں نے جوابی پیغام بھی دے دیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”پہلے اس نے مجھے اطلاع دی کہ آپ مجھے یاد کر رہے ہیں۔ میں نے جواباً شکریہ کہہ دیا۔ پھر اس نے کہا کہ آپ نے مجھے سلام بولا ہے۔ میں نے جواباً علیکم السلام بول دیا۔ اس کے علاوہ تو اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔“

”جج..... جی ہاں صاحب۔“ چپڑا سی راجہ ہٹلایا۔

”اچھا..... تم باہر جاؤ۔“ اشتیاق صاحب نے اس سے کہا اور اس کے جاتے ہی مجھ پر برس پڑے۔ ”تم خوب جانتے ہو کہ جب کسی کو بلانا ہو تو چپڑا سی سے یہی کہلوایا جاتا ہے۔“

”میں اشاروں کنایوں کی زبان نہیں سمجھتا جناب۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

”بہر حال، تم چھٹیاں بہت کرنے لگے ہو۔“ انہوں نے پینترا بدلا۔ ”کل تم کہاں تھے؟“

ڈیلنگ کرتا تھا۔ اس لیے اشتیاق صاحب کے پاس ملاقاتی آتے رہتے تھے۔ پھر جیسے ہی پہلا ملاقاتی ان کے کمرے میں داخل ہوا، میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ”کیا بات ہے؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ان کا ملاقاتی بھی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے جواب میں دائیں ہاتھ کی چھنگلیاں بلند کر دی۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولے۔

”بب..... ہاتھ روم چلا جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے۔“ وہ بھنا کر بولے۔ ملاقاتی بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے کہا تھا کہ میں اجازت کے بغیر سیٹ نہ چھوڑوں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ دران کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی باہر نکل آیا۔ ملاقاتی نے یقیناً بڑی مشکل سے بے ساختہ فیکے کا گلا گھونٹا ہوگا۔ میں اس کا چہرہ سرخ ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد میں دوبارہ ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ ملاقاتی موجود تھے۔ میں نے سب سابق اشتیاق صاحب کو چھنگلیاں دکھائی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کے لئے کہہ دیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ چوتھی مرتبہ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے خود اپنی چھنگلیاں بند کر دی اور دانت پیستے ہوئے گویا مجھے دفع ہونے کا اشارہ کیا۔

اس مرتبہ میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ اشتیاق صاحب اپنے کمرے سے نکل کر میری میز کی رफ چلے آئے۔ ”یہ کیا بے ہودگی ہے۔“ انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ذکیہ نور فوری طور پر توجہ ہوگی۔“

”میں سمجھا نہیں سر۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”یہ تم بار بار ہاتھ روم کیوں جارہے ہو؟“

”میں خود حیران ہوں جناب میرا خیال ہے ڈاکٹر سے مشورہ کرنا پڑے گا۔“

”اور یہ تم ہر بار چھنگلی اٹھائے میرے کمرے میں کیوں آ جاتے ہو؟“

”آپ ہی کا حکم تھا کہ بغیر اجازت.....“

”حوالہ ضرور یہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔“

”مجھے علم نہیں تھا جناب۔ اب اس سلسلے میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔“ میں نے فطرت آمیز لہجے میں کہا۔ اشتیاق صاحب پاؤں پیچھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ”لے ذکیہ کی طرف دیکھا، جو زیر لب مسکرا رہی تھی۔“ تم کیوں ہنس رہی ہو؟“ میں نے متوجہ ہو کر پوچھا۔

”جی..... وہ میرے دادا کا انتقال ہو گیا تھا۔“

”لیکن ان کا انتقال تو بہت پہلے ہو چکا ہے۔“

”وہ تو سگے دادا کا تذکرہ ہے۔ کل والے میرے رشتے کے دادا تھے۔“

اشتیاق صاحب نے بے زاری سے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے..... لیکن اب تم میری اجازت کے بغیر سیٹ نہیں چھوڑو گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

”جی بہت بہتر۔“ میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ اپنی سیٹ پر پہنچ کر میں دوبارہ فائل پر جھک گیا۔

”کیا کہہ رہے تھے، اشتیاق صاحب؟“ ذکیہ نور نے میری طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

”بہت پریشان تھے۔ انہیں بہت تشویش ہے۔“ میں نے رازدارانہ سرگوشی میں کہا۔

”کس سلسلے میں؟“ ذکیہ نور کا لہجہ بھی رازدارانہ ہو گیا تھا۔

”تمہارے سلسلے میں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک پڑی۔

”کہہ رہے تھے کہ میں ذکیہ کے بارے میں پریشان ہوں۔ اپنی زندگی میں اس کے

ہاتھ پہلے کر دوں تو سکون آئے۔ کافی عمر ہو گئی ہے اس کی۔“

”مر جاؤ خدا کرے۔“ ذکیہ نے دو ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

میں نے جھکائی دے کر خود کو بچا لیا اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”میں نے کہا، کوئی اچھا سا چیز اسی دیکھ کر اسے بیاہ دیجیے۔ کلرک اور چیئر اسی ایک دفتری کو جنم دیں گے۔ دفتری اللہ والوں کے ریٹائرڈ ہونے میں ابھی بیس سال باقی ہیں، یوں دفتری کی پوسٹ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

ذکیہ رو ہانسی ہو گئی اور اس نے منہ پھیر لیا۔ میں نے اسے بہت منایا..... ہنسنا چاہا لیکن اس کے بعد اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ چارونا چار میں پھر فائل پر جھک گیا۔ یعنی اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد یاسین نے مجھے چائے کے لئے اٹھانا چاہا..... لیکن میں نے انکار کر دیا۔

”کیوں بھی..... یہ تہہ ملی کیسی؟“ یاسین نے پوچھا۔

”اشتیاق صاحب نے کہا ہے کہ میں ان کی اجازت کے بغیر سیٹ نہ چھوڑوں۔ تمہارا

اصرار ہے تو میں ان سے جا کر پوچھ لیتا ہوں کہ کیا میں یاسین کے ساتھ چائے پی آؤں۔“

”نہ بابانہ..... مجھے تو معاف ہی رکھو۔“ یاسین نے کہا اور اکیلا ہی چائے پینے چلا گیا۔

میری نظریں اشتیاق صاحب کے دفتر کے دروازے پر جم گئیں۔ ہمارا سیشن پبلک

س کا فارمولا درست ہو، تب بھی وہ جن کو قید تب ہی کر لے گا، جب جن موجود ہوگا۔ ”ٹھیک ہے، کسی دن ملوادوں گا۔“ میں نے کہا۔ پھر اس سے بمشکل چچھا چھڑا کر میں گھر پہنچا اور سو گیا۔ اگلا دن دفتر میں معمول کے مطابق گزرا۔ قابل ذکر بات صرف یہ ہوئی کہ اشتیاق صاحب نے بلا اجازت سیٹ چھوڑنے کے سلسلے میں میرا ایکسپلے انیشن کال کر لیا۔ میں نے معذرت تو کر لی لیکن تہیہ کر لیا کہ اگلے دن انہیں شاندار سبق دوں گا۔

آفس سے میں سیدھا گھر چلا آیا۔ کپڑے بدل کر میں سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ دروازے پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ پہلے تو میں دم سا وہ لیتا رہا کہ ممکن ہے، آنے والا مایوس ہو کر واپس چلا جائے۔ لیکن گولہ باری شدید ہو گئی۔ چارونا چار میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھولتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ باہر دو لمبے ترنگے اور کچھ شخم پہلوان کھڑے تھے چہرے جانے پہچانے تھے۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ میں نے انہیں کہاں دیکھا تھا..... جگے کے اکھاڑے میں..... وہ یقیناً جگے کے پٹھے تھے کچھلی مرتبہ جگا خود آیا تھا اور میں اسے جل دے کر بھاگ نکلا تھا۔ لیکن اس بار بھاگ جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ دونوں دروازہ گھیرے کھڑے تھے۔ ”جج..... جی..... فف..... فرمائیے۔“ میں نے پوچھا۔

ان میں سے ایک بولا۔ ”ہمارے ساتھ چلو۔“

”کک..... کیوں.....؟“

”تمہیں استاد نے یاد کیا ہے۔“

”لل..... لیکن.....“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ دی۔

”جو کچھ کہنا ہے، استاد کے سامنے کہنا۔“ اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ”بس اب شرافت سے چل دو۔“

میں نے سوچا کہ شور مچا کر محلے والوں کو جمع کر لوں لیکن اس وقت دوسرا پہلوان بولا۔ ”گڑ بڑ کی تو یہیں پر گرون توڑ دوں گا۔ استاد نے یہ نہیں کہا تھا کہ تمہیں زندہ ہی وہاں پہنچانا ہے۔“

استاد نے یہ واقعی بہت برا کیا تھا۔ اب اپوزیشن بہت نازک ہو گئی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ باہر نکل کر میں انہیں غپے دے کر بھاگ سکتا تھا۔ وہ ریس میں مجھ سے نہیں جیت سکتے تھے۔ اب میرے لیے یہی ایک موقع تھا۔ چنانچہ میں نے ہامی بھری۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں چل رہا ہوں۔ ذرا تالا لے آؤں۔“

میں پلٹا ہی تھا کہ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”اسے بتا دو تالا کہاں ہے۔ یہ

”کچے خبیث ہوتم۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

میں کندھے اچکا کر فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

تین بجے کے قریب میں آفس سے نکلا۔ شادمان پہنچ کر میں نے رحیم کے اللہ توکل ریسٹوران میں کھانا کھایا اور گھر کا راستہ لیا۔ مصروفیت کے بارے میں میں پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ اب مجھے نسخوں والی کتاب کے ہر نسخے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ بے شک..... ان میں بعض دوائیں مثلاً دوائے صداقت، دوائے دیانت اور دوائے رحم ولی مجھے نقصان پہنچا چکی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو۔ سیدھی سی بات ہے، بعض دوائیں ایسی تھیں، جنہیں دوسروں کو استعمال کرنا یقیناً سودمند ہوتا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ان تمام دواؤں کو سفوف کی شکل میں تیار کر کے مختلف رنگوں کے کپسولوں میں بھریں گا۔ رنگوں کی گڑبڑ سے بچنے کے لئے مجھے دواؤں کا ایک کیٹلاگ بھی تیار کرنا ہوگا۔

گھر پہنچتے ہی میں دواؤں کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ نو بجے تک میں نہ صرف دوائیں تیار کر کے کپسولوں میں بھر چکا تھا بلکہ میں نے ان کو بہ اختیار رنگ اپنی ڈائری میں بھی نوٹ کر لیا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے لئے نکلا ہی تھا کہ مرزا دہشت بیگ نازل ہو گیا۔ اسے پتا چلا کہ میں کھانا کھانے جا رہا ہوں تو وہ بھی چپک گیا۔ حسب معمول کھانے کا بڑا حصہ اس نے چٹ کر لیا، پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”گاجر کا حلہ مل جاتا تو اور مزہ آ جاتا۔“ ”ممکن حلوے کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے چوٹ کی۔

”ارے نہیں یار..... اسے تو میں تمہاری امانت سمجھتا ہوں۔“ اس نے کھسپائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے تو معاف ہی رکھو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے سلطان کے سامنے اس آبنوی حسن کو مجھ سے منسوب کر دیا تھا۔ اپنی بلا میرے سرمے ڈالو۔“

”ارے ہاں..... میں تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔“ اس نے پٹری بدلی۔ ”میں اس جن سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا نام ہے اس کا.....“

”طمطر اقل۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ جن ہے، میرا پالتو جانور نہیں ہے کہ جب جی چاہے پکڑ کر تم سے ملوادوں۔“

”پھر بھی بھی ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ میں واصل جن کو بوتل میں بند کرنے کا فارمولا جانتا ہوں۔“

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ اس اس سلسلے میں معقول سزا دوں گا۔ ظاہر ہے۔

رکشہ رکھتے ہی وہ دونوں تیزی سے نیچے اتر گئے۔ ”آ جا بھی پہلوان۔“ ان میں سے کوئی ایک بولا۔

میں نے ہلنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے ہلا نہیں گیا۔ کچھ تو ان دونوں نے مجھے اس طرح پسیا تھا کہ میں خود کو سرے اور اپنے ٹھوس بدن کی مناسبت سے سرمئی چٹان محسوس کر رہا تھا۔ اس پر مستقبل میں ہونے والی ٹھکانی کی دہشت..... میری آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔ جب میں کوشش کے باوجود نیچے نہ اتر سکا تو ان میں سے کسی نے مجھے گردن سے تھام کر گھسیٹ لیا۔ گرفت بہت سخت تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس نے مجھے چھوڑا تو میں چکراتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

”لے بھائی اسے تو اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔“

”کیسے جوان ہیں آج کل کے۔“ دوسرے نے طنز کیا۔

ان میں سے کسی نے گردن سے تھام کر مجھے کسی مردہ چھپکلی کی طرح لٹکا لیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن میرا ذہن تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

ہوش آیا تو ہوش رہا قسم کا ایک منظر آنکھوں کے سامنے تھے۔ وہ جگے کا اکھاڑہ نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا ایک پرسکون کمرہ تھا۔ ایک کونے میں چھوٹی سی ایک رائٹنگ ٹیبل اور ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میز پر ایک ٹیبل لیپ تھا۔ چند کتابیں تھیں، جن میں ایک ایسے پلٹ کر رکھی گئی تھی جیسے کوئی ابھی انہی پڑھتے ہوئے اٹھ کر گیا ہو۔ دوسری جانب ایک شوکیس نما الماری تھی اور وہ الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ الماری کے ساتھ ہی ایک صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ خود میں ایک آرام دہ مسہری پر دراز تھا۔ کمرے کی ہر چیز سلیقے کی مظہر تھی۔ اس کے علاوہ مکین کی خوش ذوقی کا اظہار کر رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ جہاں تک یاد تھا..... مجھے دو پہلوان گھیر گھار کر جگے کے اکھاڑے لائے تھے..... آخری بات صرف یہ یاد تھی کہ مجھے کسی شکنجے میں جکڑ کر اکھاڑے کی طرف لے جایا جا رہا تھا..... اور اب یہ چھوٹا سا ٹیس کمرہ، جو بے حد پرسکون معلوم ہو رہا تھا..... یا مظہر العجائب..... آخر یہ کیا راز ہے.....

میں مزید الجھتا رہتا لیکن دروازے کی طرف سے سنائی دینے والی قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ ل..... وہ دریشتمان ہی تھی۔ میں بھٹی بھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کرسی کھینچ کر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”اب کیسے ہیں آپ؟“ اس کی مترنم آواز سنائی دی۔ گویا یہ خواب نہیں تھا۔ پھر بھی میں

لے آئے گا۔“ اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے مجبوراً اسے تالے کا محل وقوع سمجھایا اور وہ اندر چلا گیا۔ دوسرا میرا ہاتھ تھامے کھڑا رہا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

چند لمحوں بعد پہلا ہتھالا لے کر آ گیا۔ ہم باہر نکلے اس نے تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔ میں احتجاج بھی نہ کر سکا۔ باہر نکلتے ہی مجھے وہ رکشہ نظر آیا، جس میں وہ دونوں مجھے لینے آئے تھے۔ میں نے دل میں اپنی خیر و عافیت پر فاتحہ پڑھ لی۔ ہاتھ تھامنے والا مجھے کھینچتا ہوا رکشہ کی طرف چل دیا۔ ”چلو بیٹھو۔“ اس نے مجھے رکشہ میں دھکیلا۔ اس کا دوسرا ساتھی دوسری طرف بیٹھ چکا تھا۔ میں جل تو جلال تو کا ورد کرتا ہوا رکشہ میں بیٹھ گیا۔

”ابے کھسک اس طرف کو۔“ اس ناہنجار نے مجھے مزید دھکیلا۔

”کک..... کیا مطلب؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”میں بھی بیٹھوں گا۔“

”آ..... آ..... آپ بھی.....“ میں نے حیرت سے کہا۔

”تو تیرا کیا خیال ہے، میں پیدل آؤں گا۔“ اس نے برامانتے ہوئے کہا۔

”نن..... نہیں۔“ میرا خیال تھا کہ رکشے والا تین سواریاں نہیں بٹھائے گا۔“

”ارے..... یہ تو گھر کا رکشہ ہے۔“ اس نے رکشہ میں گھستے ہوئے کہا۔ ”تھوڑا سا اور

ادھر ہو جا۔“

میں دوسری طرف والے پہلوان سے ملا بیٹھا تھا۔ یہ نادر شاہی حکم سن کر میں نے کھسکا جا ہا لیکن چٹان سے ٹکرا کر رہ گیا۔ بالآخر دوسرا پہلوان بھی کسی نہ کسی طرح رکشے میں ٹھس ہی گیا۔ ڈرائیور نے رکشہ اشارت کیا اور آگے بڑھا دیا۔

یہ میری زندگی کا سب سے اذیت ناک سفر تھا۔ مجھ پر پہلی مرتبہ یہ کھلا کہ سینڈوچ کیا چیز ہوتا ہے۔ میں اس صورت حال کو بن کباب ہرگز قرار نہیں دوں گا۔ ان دونوں کے سامنے بے اعتبار جیشہ میری وہ حیثیت ہرگز نہیں تھی جو بن کے سامنے مرے سے مرے کباب کی ہوتی ہے۔ بلکہ اس صورت حال کو ایک ایسا چکن سینڈوچ کہا جاسکتا ہے، جس میں چکن کے نام پر چند ریشے رکھ دیے جاتے ہیں۔ ایک تو میں اس تنگ سے رکشہ میں ان دونوں کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا، دوسرے رکشہ ایک شکنستہ سڑک سے گزر رہا تھا۔ دھچکوں نے اور مصیبت کھڑی کر دی۔ میں کچل کر رہ گیا۔ وہ سفر بمشکل پانچ منٹ کا رہا ہوگا لیکن مجھے وہ بہت طویل عرصہ محسوس ہوا۔ تمام راستے میں اپنے ہوش و حواس قائم رکھنے اور اپنے جسم کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب رکشہ جگے کے اکھاڑے کی حدود میں داخل ہوا تو میں نیم بے ہوش کی کیفیت سے دوچار تھا۔

لیے۔“

ریشماں چلی گئی تو وہ پھر گویا ہوا۔ ”بابو..... مجھے نہ تو شکر یہ ادا کرنا آتا ہے اور نہ ہی معافی اگنا آتی ہے..... مجھے ریشماں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسی لیے میں تمہارے گھر گیا تھا تم نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے بابو..... مجھے افسوس ہے.....“ وہ خاصا جذباتی ہو گیا۔

”نہیں..... نہیں، کوئی بات نہیں۔“ صورت حال ایسی تھی کہ میں خود کو چند محسوس کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس موقع پر مجھے کس طرح کے پر تکلف جملے بولنے چاہئیں۔

کچھ دیر بعد ریشماں ٹرے پر کسی کے دو گلاس رکھ کر لے آئی۔ جگے نے بہت اصرار کر کے مجھے لمی پلائی۔ کچھ ہی دیر بعد صورت حال نارمل ہو گئی۔

”میں نے ان دونوں کا دماغ درست کر دیا ہے جو تمہیں اتنی بدتمیزی سے لائے تھے۔“ جگے نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تو اب بھی یہ سب ایک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اتنی آسانی سے درجانات تک آپہنچا تھا۔ شاید فلمیں اور افسانے واقعی حقیقت سے قریب ہوتے ہیں۔

”تمہاری تعلیم کہاں تک ہے، برخوردار؟“ جگے نے اچانک ہی پوچھا۔

”جی..... میں نے ایم ایس سی کیا ہے۔“

”میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا تھا میری سمجھ میں یہ باتیں کہاں آتی ہیں۔“ جگے نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو تم ریشماں کی تھوڑی مدد کر دیا کرو پڑھائی میں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب وہ باہر پڑھنے جایا کرے۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مجھ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ ”ریشماں کے مضامین کیا ہیں؟“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو تم اسی سے پوچھ لینا۔“ جگے نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال..... فیس یا جو بھی کہتے ہیں اسے وہ میں منہ مانگی دوں گا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔“ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا میں چلتا ہوں۔“

”نہیں بھئی..... میں تمہیں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔ تم بیٹھو، میں اکھاڑے کا چکر لگا کر آتا ہوں۔“

میں بیٹھ گیا۔ اس کے جاتے ہی ریشماں آ گئی۔ ”کیسے..... کیا حال ہے؟“ اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

”جی..... ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ میں گڑ بڑا گیا۔ ”آپ کے مضامین کیا ہیں؟“ کچھ

نے احتیاطاً اسے چھو لینا چاہا۔

”کیا کرتے ہیں۔“ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں خود اپنی ہی چٹکی لے کر دیکھوں۔ چنانچہ میں نے اپنے بازو میں چٹکی لی اور محض سی کر نہیں رہ گیا بلکہ بساط بھر خوف ناک چیخ ماری۔ چیخنے کا سبب میری چٹکی نہیں تھی بلکہ وہ تکلیف تھی، جس نے ذرا سا ملتے ہی سارے جسم کو اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا۔ مجھے یقین آ گیا کہ وہ سراپا حقیقت تھی، کوئی خواب نہیں تھی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ ریشماں پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگی۔

”میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ وہ محبوب سی ہو گئی اور اس عالم میں مزید حسین لگنے لگی۔ میں چند کے وارفتگی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا اس نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے رخسار تمنانے لگے۔

”گویا آپ مجھ پر مہربان ہو گئیں۔“ میں دھیرے سے کہا۔

”آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کو بھائی جان نے بلوایا ہے۔“ وہ تنکھے لہجے میں بولی۔

میری نگاہوں کے سامنے جگے کا خونخوار چہرہ گھوم گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا چہرہ زرد ہو گیا ہوگا۔

”کہیں پھر سے بے ہوش نہ ہو جائیے گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”لل..... لیکن جگے بھائی..... میرا مطلب ہے میں نے تو آپ کو.....“

میں جملہ پورا نہ کر سکا کیونکہ زمین کی دھمک سے جگے کے نزول کا پتا چل رہا تھا۔ میں نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ واقعی جگا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ شہادت پڑھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت مجھے اپنے دکھتے ہوئے جسم کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔

”آبا برخوردار..... اٹھ بیٹھے تم۔“ جگے نے لہک کر کہا۔ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا لیکن

انداز معاندانہ نہیں تھا۔

”مم..... میں۔“ اس سے زیادہ میرے منہ سے کچھ نہیں نکلا۔ میں تو حیرت سے آنکھیں

پھاڑے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میری ہڈیاں بکھر کر رہ جائیں۔ لیکن جگے کا انداز محبت آمیز تھا اور میری ہڈیاں غالباً محبت کو ترسی ہوئی تھیں۔ اس لیے اس کے معاف سے مجھے قدرے سکون ملا۔ معاف سے فارغ ہو کر اس نے بے حد گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر وہ ریشماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”جاریشماں لمی سشی لا، بابو برخوردار کے

توقف کے بعد میں نے سنبھالا لیتے ہوئے پوچھا۔

”بی ایس سی کر رہی ہوں۔ فزکس کیمسٹری.....“

”تب تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”جگے بھائی کہہ رہے تھے.....“

”یہ بات میں نے ہی ان سے کہی تھی۔“ ریشماں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”ان دن کے واقعے کے بعد میں ٹیوشن پڑھنے نہیں جانا چاہتی۔“ آپ یہاں آ کر پڑھا دیا کریں۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ ویسے بھی مجھے ذرا سی راہنمائی کی ضرورت ہے اور بس۔ آپ کو زیادہ مغز ماری نہیں کرنی پڑے گی۔“

میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔ غچ شوق کھلنے لگا۔ ”تو آپ کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ پیدا ہو ہی گیا۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”آپ پتا نہیں فلموں کے چکر سے کب نکلیں گے۔“ اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”میں یقیناً آپ کی احسان مند ہوں۔ لیکن آپ ہر بار یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی فلم کے ہیرو وائٹ نہیں بلکہ حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔“

میں گم صم سا ہو کر رہ گیا۔ مجھے اس سے محبت کی طلب تھی۔ احسان مندی کی نہیں۔ ”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ میں اپنی توقعات پر شرمندہ ہوں۔“ میں نے بچھے بچھے سے لہجے میں کہا۔

”آپ برا تو نہیں مان گئے۔ میری صاف گوئی کا۔“

”نہیں..... اور میرے خیال میں مجھے یہ حق حاصل بھی نہیں۔“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ اس کا لہجہ پھر شوخ ہو گیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا..... اب میں اجازت چاہوں گا۔“ میں سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”نہیں..... آپ کھانا کھا کر جائیے گا۔“

”دراصل میں نے ایک دوست کو گھر پر ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”اس صورت میں میں اصرار نہیں کروں گی۔ اچھا پڑھانے کے لیے کس وقت آیا کریں گے۔“

”سوچ کر بتاؤں گا۔ میری مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔“ میرا لہجہ خشک ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔ گویا آپ میری مدد نہیں کریں گے۔“ اس نے بچھے بچھے سے لہجے میں کہا۔

”صرف اس لیے کہ آپ کے بارے میں میرے جذبات وہ نہیں ہیں، جو میرے بارے میں آپ کے ہیں۔“

میں شرمسار ہو گیا۔ اس نے میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ ”نہیں، یہ بات نہیں۔“ میں نے مدافعتی لہجہ اختیار کیا۔

”جھوٹ مت بولیں۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں آپ کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتی ہوں۔“

اس کے اس جملے نے مجھے دہلا دیا۔ اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا..... اور بھی نہ جانے کیا کچھ تھا۔ وہ بہت عجیب لڑکی تھی۔ محبت سے انکار بھی کرتی تھی اور اپنائیت کی باتیں بھی کرتی تھی۔ میں الجھ کر رہ گیا۔

”وعدہ کیجیے کہ آپ ہفتے میں کم از کم ایک بار مجھے پڑھانے ضرور آئیں گے۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔“ اس نے مزید کہا۔

میں چونک کر اسے دیکھا لیکن اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

”میرا خیال ہے میں کافی ذہین ہوں۔ ہفتے میں ایک دن کی راہنمائی میرے لیے کافی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا۔ اچھا خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر میں اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آیا۔ باہر اکھاڑے میں جگا اپنے پٹھوں کو زور کرانے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری طرف آیا۔

”کیا بات ہے برخوردار، میں بس آنے ہی والا تھا۔“ اس نے کہا۔

”مجھے اچانک ہی یاد آ گیا کہ میں نے کسی کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔“

”اچھا..... تب تو کوئی بات نہیں۔ ویسے آتے جاتے رہنا۔“ اس نے کہا۔ پھر ایک طرف منہ کر کے اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ”شیرے..... شیرے..... اوشیرے اے شیرے۔“

ایک طرف سے وہی رکشہ ڈرائیور دوڑتا چلا آیا۔ جس کے رکشہ میں میرے اغوا کی کارروائی عمل میں لائی گئی تھی۔ ”کیا بات ہے استاد؟“ اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”دیکھ بابو کو بڑی عزت سے ان کے گھر چھوڑ کے آ، اور ہاں ان کا خیال رکھنا اپنے ہی آدمی ہیں۔“ جگے نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا اور پھر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

”آئیے جناب۔“ رکشہ والے نے بے حد احترام سے کہا۔

میں اس کے پیچھے پیچھے رکشہ تک چلا آیا۔ اس بار سفر بچھلی بار سے کہیں مختلف تھا لیکن میری کیفیت اس دفعہ بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ آتے وقت میں بری طرح خوف زدہ تھا۔ وسوسوں کا شکار تھا اور اب واپس ہوتے ہوئے بھی عجیب سی تنہائی اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ ایسی کیفیت

میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ شاید یہ ریشماں کی باتوں کا اثر تھا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ کسی ان پڑھ پہلوان کی بہن اتنی ذہین اور اتنی طباع بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی باتوں کی پاکیزگی نے میری روح کو سرشار کر دیا تھا۔ لیکن انکار محبت پر اس کے اصرار نے دل گرفتہ بھی کر دیا تھا۔ مجھے بڑی شدت سے اپنی تہی دامنی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس لڑکی میں تمکنت تھی..... شہزادیوں کا سا وقار تھا۔ واقعی میں اس کا اہل کہاں تھا۔ سرکاری دفتر کا ایک حقیر سا کلرک، جو اپنی ضروریات بھی مشکل پوری کیا کرتا تھا۔ ہاں..... میں اس کے قابل نہیں تھا۔ دل ہی دل میں یہ بات وہہراتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میرا پورا وجود گہری اداسی کی دھند میں لپٹ گیا ہے۔ پھر اس اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی..... دوائے غیاب..... ہاں دوائے غیاب کی مدد سے میں اپنی کا یا لٹ سکتا تھا، اپنے حالات بدل سکتا تھا۔

خیالات کی وہ رو اس وقت تھی، جب رکشہ میرے گھر کے سامنے رک گیا۔ میں نے نیچے اتر کر اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ تب مجھے یاد آیا کہ چابی تو جگے کے پٹھے کے پاس ہی رہ گئی ہے۔ ”معاف کرنا بھائی!“ میں نے شیرے ڈرائیور سے کہا۔ ”میرے گھر کی چابی تو تمہارے پاس رہ گئی ہے۔ مجھے چابی لا دو تو.....“

”ضرور صاحب..... ابھی لایا۔“

”میں تمہیں یہیں ملوں گا۔“

رکشہ والے نے سر کو تھیمی جنبش دی اور رکشہ واپس موڑ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں وہیں ٹھہرنے لگا۔ اب اندھیرا ہو چلا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں گم تھا اور مجھے گرد و پیش کا احساس تک نہیں تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد شیرا مجھے چابی دے گیا۔ چابی ہاتھ میں لیے میں دروازے کی طرف بڑھا۔ تالا کھولا۔ کنڈی کھول کر دروازہ دھکیلنے ہی والا تھا کہ کسی نے عقب سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ جس انداز میں وہ ہاتھ میرے کندھے پر رکھا گیا تھا، اسے میں دست شفقت تو ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ میں نے آہستہ سے گردن گھمائی اور پلٹ کر دیکھا تو میری روح فنا ہو گئی۔ ایک اور مصیبت میرے پیچھے موجود تھی۔

مسکرائیل مجھے خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

مجھ پر مایوسی کا شدید غلبہ ہوا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں ریشماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں خاصا دل گرفتہ تھا۔

اپنی تہی دامنی کا احساس مجھے اداس کر گیا تھا۔ پھر اس کیفیت میں، میں نے سوچا تھا کہ دوائے غیاب کی مدد سے اپنے حالات بہتر بناؤں گا تا کہ ریشماں جیسی انمول لڑکی کو اپنا سکوں۔ لیکن اب مجھے شک ہو رہا تھا کہ اس نامعقول دوا کی مدد سے مصائب تو مول لے سکتا ہوں، حالات کو بہتر نہیں بنا سکتا۔ اس بات کا زندہ ثبوت مجسم حالت میں اس وقت میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

وہ ایک جن تھا..... اور یہ بات میری سٹی گم کر دینے کے لئے کافی تھی۔ لیکن شدید مایوسی کے عالم میں شاید آدمی بالکل ہی بے خوف اور نڈر ہو جاتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوا۔ میں نے بے حد بڑی بے نیازی سے بولا۔ ”کیا بات ہے؟ آپ کو پہچانا نہیں کیا چاہتے ہیں آپ۔“

لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکی۔ پھر اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ”یہی کافی ہے کہ میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ اندر چلو۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔

مزید جرح کرنا مناسب نہ تھا۔ میں نیدر وازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے ہی چلا آیا۔ میں نے سوچ دبا کر کمرے میں روشنی کر دی۔ پھر میں نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تشریف رکھیے۔“

اس نے حیرت سے پہلے مجھے اور پھر صوفے کی طرف دیکھا۔ انداز میں الجھن تھی۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں خفیف سی چمک لہرا گئی۔ ”اچھا..... آپ شاید تشریفیے، کہنا چاہیے تھے۔“ اس نے تحقیق کے سے انداز میں کہا اور صوفے پر تشریف لایا۔

میری کھوپڑی ناچ کر رہ گئی..... میں تو سمجھتا تھا کہ گیسوئے ارد و تراشنے بلکہ حجامت کرنے کی ذمہ داری صرف ہیئر ڈریسرز ایسوسی ایشن نے ہی قبول کی ہے لیکن اب پتا چلا کہ جن برادری نے بھی یہ بیڑا اٹھالیا ہے۔ ویسے تو ہر شخص اس زبان کو حتی المقدور گنجا کرنے پر تلا ہوا ہے۔

”جی فرمائیے؟ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ”تو یہ ہے؟ آپ کا غریب خانہ؟“ چند لمحے بعد وہ بولا۔

”آپ کے منہ سے یہ دولت خانہ کہلائے گا..... اور میرے منہ سے غریب خانہ۔“ میں نے اسے توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجیے گا، مجھے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔“ اس کا لہجہ معذرت خواہانہ

تھا۔ ”میں اُردو پڑھ تو لیتا ہوں مگر بولنے کے معاملے میں رواں نہیں ہوا ہوں۔ ہاں..... تو بات یہ ہے کہ اس وقت میں ایک مصیبت سے دوچار ہوں۔“

میں منہ سے کچھ نہ بولا، البتہ وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ چند لمحے شاید میرے تبصرے کا انتظار کرتا رہا، پھر بولا۔ ”میں کوشش کے باوجود غائب نہیں ہو سکا ہوں۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔“

میں بوکھلا گیا۔ ”تو اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے اس روز مجھے دو بیضے کھلائے تھے۔“

وہ کپسول کے لیے مناسب ترین لفظ استعمال کر رہا تھا۔

”آپ کا مطلب ہے، ان کی وجہ سے یہ انہونی ہوئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ان بیضوں میں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ میں برباد ہو گیا۔ گھر بھی واپس نہیں جاسکتا۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا کہ ان باتوں سے میرا کیا تعلق ہے۔“

”میں نے آپ کو غائب دیکھا ہے۔“ وہ چیخا۔ اسے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جلالی قسم کا جن نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کے لہجے نے مجھے

لرزادیا۔ ”آپ غائب ہو سکتے ہیں۔“ اس نے مزید کہا۔ انداز الزام دینے والا تھا۔

”تو اس میں کیا بڑی بات ہے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہماری برادری کا ہر فرد ایسا کر سکتا ہے۔“

”بس..... بہت ہو چکی۔“ وہ غرایا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ انسان ہیں۔ مجھے مزید بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کو غائب ہونے کی

قدرت کیسے مل گئی۔“

میں خاموش رہا۔ ظاہر ہے، اس بات کا جواب دینا میرے مفاد میں نہیں تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔“ کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

”وہ کیسے؟“

”جس طرح آپ غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مجھے بھی غائب کروادیں۔“ اس نے فرمائش کی۔ ”میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

میں سنائے میں آ گیا۔ کسی جن پر احسان کرنے کا چانس نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔

لیکن دشواری یہ تھی کہ میں اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ وہ فطری طور پر غائب ہونے کی صلاحیت کا مالک تھا۔ لیکن میں نے حاضر حالت میں اس پر دوائے غیب کے دو کپسول استعمال کر ڈالے تھے اور وہ غائب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے بیان کردہ جناتی قانون کے مطابق وہ حاضر حالت میں آنے کے بعد تین دن تک غائب ہونے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ اور تب دوائے غیب کے دو کپسول بے اثر ہوئے تو گویا اس کی بات سچ ثابت ہو گئی۔ اب وہ برے پاس دھرا ہوا تھا اور تین دن گزرنے کے باوجود غائب ہونے پر قادر نہیں ہوا تھا۔ اس کی تشویش فطری تھی۔ میں صرف اندازہ لگا سکتا تھا کہ کیا ہوا ہوگا۔ اس نامعقول دوائے مجھے بھی گنتی کا ناچ نچار کھا تھا۔ اس کے سسٹم پر غیر موثر ثابت ہونے کی صورت میں، دوائے اس کے سسٹم پر کچھ ایسے اثرات مرتب کر دیے ہوں گے کہ وہ غائب ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ بات بعد الامکان نہیں تھی۔ دشواری یہ تھی کہ اس کے مدارک کی کوئی صورت مجھے ٹھانی نہیں دے رہی تھی۔

”کیا بات ہے۔ کس سوچ میں پڑ گئے، آپ؟“ اس نے مجھے چونکا دیا۔

”کچھ نہیں..... بات یہ ہے کہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”نہیں کر سکتے۔“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔ میں آپ کی

کردن بھی توڑ سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ خوفناک ہو گیا۔

میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ یہی کافی تھا کہ وہ آپ جناب کر رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا لیکن اسے بتائے بغیر مفر بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اسے دوائے غیب کی رام کہانی سنا

الی۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے میری باتیں سنتا رہا۔ اس نے درمیان میں یک بار بھی مجھے نہیں ٹوکا۔

”عجیب بات ہے۔ وہ دوا مجھ پر بے اثر ہو گئی۔“ میرے خاموش ہونے کے بعد وہ بولا۔

”آپ یوں کریں کہ وہ بیضے دوبارہ مجھے کھلائیں۔“

میں خاموشی سے الماری کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے احتیاطاً دوائے غیب کے دو کپسول

کالے اور واپس آ گیا۔ کپسول میں نے اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اس نے ممنونیت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کپسول لے لیے۔ وہ اپنا ہاتھ منہ کی طرف لے جا رہا تھا کہ میں

نے اسے ٹوک دیا۔ ”ذرا ٹھہریے۔ میں پانی لے آؤں۔ ممکن ہے صرف کپسول نگلنے سے فرق پڑے۔“ پھر میں دوڑ کر پانی لے آیا۔ ”پہلے ایک کپسول لے کر دیکھیں۔“ میں نے مشورہ دیا۔

اس نے پانی سے ایک کپسول حلق سے اتار لیا۔ پھر ہم دوا کے رد عمل کا انتظار کرتے رہے۔ وہ بہت بے چین نظر آ رہا تھا..... بلکہ وہ بیجانی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ پندرہ منٹ

گزر گئے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا چنانچہ وہ دوسرا کپسول بھی نکل گیا۔ لیکن دوانے بھی شاید اس پر اثر انداز نہ ہونے کی قسم کھالی تھی۔ آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد اس کی مایوسی قابل دید تھی۔

”میں برباد ہو گیا۔“ اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا اور رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”بھائی مسکرائیل، ذرا اس بات کی وضاحت تو کرو۔“ میں نے کہا۔

”بات یہ ہے عمرا.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ”پہلے تم اپنا اصلی نام بتاؤ۔“ اب وہ بے تکلف ہو رہا تھا۔

”میرا نام ابوالعران ہے لیکن تم مجھے صرف عمران کہہ سکتے ہو۔“

”ہاں تو بات یہ ہے کہ یہاں ہم اپنے اصلی روپ میں تھوڑا ہی آتے ہیں۔ میرا یہ روپ بھی اصلی نہیں ہے۔ اور اب میں اپنے اصلی روپ میں اس وقت تک نہیں آسکوں گا، جب تک میری غائب ہونے کی فطری صلاحیت واپس نہیں آ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب گھر نہیں جاسکتا۔“

”اس کے باوجود تمہارے گھر والے تمہیں پہچان سکتے ہیں۔ تم جناتی زبان بول کر انہیں قائل کر سکتے ہو۔“ میں نے دلیل دی۔

”جناتی زبان تو تمہارے ہاں کے فراڈ عامل تک بول لیتے ہیں۔“ وہ جھلا گیا۔

”تم انہیں وہ باتیں سنا کر قائل کر سکتے ہو۔ جو تمہارے اور ان کے علاوہ کسی کے علم نہیں۔“

”ہاں..... یہ ممکن ہے لیکن تم میرے طبشت حضور سے واقف نہیں ہو۔ وہ مجھے سخت سزا دیں گے۔“

”یہ طبشت حضور کیا شے ہوتا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

اچانک ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”وہ جیسے بھی ہیں، میں ان کی توہین بردشت نہیں کر سکتا۔“ وہ دھاڑا۔ پھر شاید اسے کچھ خیال آیا۔ اس کے چہرے کا تناؤ دور ہو گیا۔ ”معاف کرنا یا..... میں اپنی زبان بول گیا تھا۔ تمہاری زبان میں انہیں ابا کہتے ہیں۔“

میں اس کے اچانک غصے پر ششدر رہ گیا تھا۔ اسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا اور باقی تفتیش سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ فی الحال سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا تھا۔

”تو پھر اب تم کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی سنگین مسئلے پر غور کر رہا ہے۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اب یہیں رہوں گا۔“ اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔

”سک..... کیا مطلب؟“ میری بوکھلاہٹ فطری تھی۔

”یہیں، تمہارے ساتھ رہوں گا۔ مشک بو سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔“

”یہ مشک بو کون ہے؟“

”میری منگیت ہے۔ طبشت حضور..... میرا مطلب ہے ابا حضور بڑی شدت سے میری نادی کے درپے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”تو کرلو شادی، اس میں حرج بھی کیا ہے!“

”حرج تو کوئی نہیں، لیکن مشک بو کے سینگ بہت چھوٹے ہیں۔“

میں نے گڑبڑا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”سینگ چھوٹے ہیں؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں..... میرے سینگوں کے مقابلے میں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔“ اس نے کہا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ شاید وہ اپنے سینگوں پر ہاتھ پھیرنا چاہ رہا تھا کیونکہ فوراً ہی اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی، پھر وہ سنبھل گیا۔ غالباً اسے یاد آ گیا تھا کہ اس وقت وہ انسانی روپ میں ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا لیکن وہ ایک حقیقی جن تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا۔

”اور تمہاری جناتی قوتیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو برقرار ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم صورت بدل سکتے ہو؟“

”ہاں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے ہی ہاتھ ہٹا، میں حیران رہ گیا۔ میرے سامنے میرا ایک ہم شکل کھڑا تھا۔

”بس بھائی ٹھیک ہے، لیکن مجھ پر رحم کرو۔“ میں نے کہا۔ اس نے دوبارہ چہرے پر ہاتھ پھیرا اور سابقہ حالت میں واپس آ گیا۔

”تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”بس ٹھیک ہے اب ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔ نہ جانے کیوں، تم مجھے بے حد اچھے لگنے لگے ہو۔“ اس نے بے حد خوش ہو کر کہا۔

اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ البتہ اس سلسلے میں کچھ مسائل بھی درپیش

”اس کی فکر نہ کرو۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”تمہارے ایک اشارے پر میں لاکھوں روپے حاضر کر دوں گا۔“

یہ سن کر مجھے یاد آ گیا کہ وہ جن زادہ ہے اور واقعی یہ اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ کچھ مناسب نہیں تھا۔ ”نہیں..... میں ایسا کوئی اشارہ نہیں کروں گا۔ البتہ چھوٹی موٹی کسی ضرورت کے موقع پر میں تم سے بلا تکلف مدد مانگ لیا کروں گا۔“

”اب میرا بھی ایک مسئلہ سن لو۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”تمہیں بھوک بھی لگتی ہے!“ میں نے تھیر آ میز لہجے میں پوچھا۔ ”خیر..... ابھی اللہ توکل ریسٹوران چلتے ہیں اس مسئلے کو حل ہی سمجھو۔“

میں نے پیسے جیب میں ڈالے اور اسے ساتھ لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ راست میں کئی شناسا ملے اور میں نے اسماعیل، کا ان سے، اپنے کزن کی حیثیت سے تعارف کرایا۔ ریسٹوران پہنچ کر ہم نے کھانا طلب کیا۔ تب مجھ پر مسکرائیل کے جوہر کھلے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ محض خوش خوراک کہنا اس کی بہت بڑی توہین ہے۔ میں تو بلا نوش کی مناسبت سے اسے بلا خور ہی کہوں گا۔ ذرا سی دیر میں وہ دس بارہ تھوری نان اور پانچ پلیٹ سالن صاف کر گیا۔ فضلو نیل میں بار بار اسے دیکھتا، جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو..... ادھر مسکرائیل کو اس طرح کھاتے دیکھ کر میں خود کھانا بھول گیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میری بھوک ہی اڑ گئی۔ مجھے تو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ بل بھی ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ اللہ توکل ریسٹوران شہر کے سستے ترین ریسٹورانوں میں سے تھا اور کچھ شروع مہینہ ہونے کی وجہ سے میری جیب بھی بھاری تھی۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے پچاس کا نوٹ نکالا اور رحیم کی طرف بڑھادیا۔ پھر میں نے پلٹ کر فضلو کی طرف دیکھا کیونکہ ابھی تک اس کی گرج دار آواز سنائی نہیں دی تھی۔ وہ میرے پیچھے ہی کھڑا انگلیوں پر کچھ حساب لگانے میں مصروف تھا۔ چہرے پر الجھن تھی۔

”ابے کیا ہو گیا ہے، تجھے! فیم کھانے لگا ہے، جلدی بتا ابو میاں کتنے پیسے ہوئے؟“ رحیم نے دھاڑ کر کہا۔

”وہ..... وہ..... بلوا دینا!“ فضلو نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”ابے..... ابو میاں کوئی سب کا بل تھوڑا ہی دے رہے ہیں، جل جلدی بتا۔“

”نہیں بننا استاد، تم ہی حساب لگا لو۔ چودہ روٹیاں، ایک آلو قیہ، ایک آلو منر، ایک آلو چنا، دو آلو گوشت اور ایک ماش کی دال۔“ فضلو نے جلدی جلدی اپنا بوجھ اتارا اور اطمینان کی

تھے۔ پہلا مسئلہ خالص معاشرت تھا۔ عموماً کسی محلے میں کسی بھی تنہا جوان کی آمدورفت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نو جوان لڑکیوں اور ان کے والدین کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ دونوں کے اسباب مختلف..... بلکہ یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اب میں اتنا عرصہ گزار کر قدرے معتبر ہو چکا تھا لیکن سند تو صرف شادی شدہ افراد کو ملتی ہے۔ اب ایسے میں میرے گھر ایک خور و نو جوان کی آمد و خالوں کے لئے تشویش کا باعث ہوتی۔ لیکن مسکرائیل کی ثابت قدمی اسے بھی محلے والوں کے نزدیک معتبر ٹھہرا سکتی تھی۔ اس معاملے کا ایک مثبت رخ یہ بھی تھا کہ مسکرائیل جس معاشرے سے آیا تھا۔ وہاں لمبے سینک حسن کا معیار تھے جب کہ ہمارے ہاں کی لڑکیاں اس نعمت سے محروم ہیں۔ اس اعتبار سے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ مسکرائیل یہاں کسی لڑکی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اسی لئے میں نے اس مسئلے کو نظر انداز کر کے دوسرے مسائل پر نظر ڈالی۔

”بھائی، پہلے یہ طے کر لو کہ تمہارے اور میرے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟“ میں نے گویا مطلع عرض کیا۔

اس کے جناتی سینے میں یقیناً خلوص کی چاندنی بکھر گئی ہوگی کیونکہ اس کا انسانی چہرہ کچھ روشن سا ہو گیا۔ ”ہم تم دوست ہیں، بشرطیکہ تم اسے قبول کرو۔“ اس نے پر خلوص لہجے میں کہا۔ ”دنیوی معاملات میں“ میں تمہیں استاد کا درجہ دوں گا۔ نہ جانے یہاں میرے قیام کی مدت کتنی طویل ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اور لوگوں سے میں تمہیں، رشتے کے بھائی کی حیثیت سے متعارف کرواؤں گا۔ اب آؤ نام کی طرف تمہارا یہ نام، یعنی مسکرائیل یہاں نہیں چلے گا۔“

”اس کے متعلق تو تم ہی کچھ سوچو۔“

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ”تمہارے نام کا انگریزی ترجمہ ہوا اسمائل۔ اب ہم اسے صوتی اعتبار سے مشرف بہ عربی کرتے ہیں، یعنی تمہارا نام اسماعیل ہے۔ یہ تمہارے جناتی نام سے قریب تر بھی ہے اور انگریزی میں بھی ہم معنی ہے۔“

اس کے چہرے پر ستائش کی تاثرات بکھر گئے لیکن وہ مرعوب نظر آنے لگا۔ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

”اب آخری مسئلہ۔“ میں نے کہا۔ ”دوستی کا عہد کرنے کے بعد اس پر گفتگو کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری ننھی منی سی تنخواہ دو افراد کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں اب تک شادی کر کے ایک بٹا دو ہو چکا ہوتا۔“

”تمہارا مطلب روپے سے ہے؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گہری سانس لی۔ گھبراہٹ میں وہ چائے بھول ہی گیا۔ اب رحیم پر مشکل وقت آن پڑا تھا۔ اس نے پہلے مجھے، پھر مسکرائیل کو اور آخر میں پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ مسکرائیل کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔

”دو چائے بھی ہیں۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ابو میاں کیا پورے محلے کی دعوت کر دی تھی، آپ نے؟ چائے سب کو نہیں پلائی؟“

رحیم بولا۔

میں بری طرح گڑبڑا گیا۔ ”نن..... نہیں تو..... یہ میرے ماموں زاد ہیں۔ اسماعیل۔“

میں نے مسکرائیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اگر یہ آپ کے ساتھ رہنے آئے ہیں تو مجھے ضرور بتا دیجیے۔ اسی حساب سے مجھے کچھ اضافے بھی کرنے ہوں گے..... ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔“ اس نے مسکرائیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مسکرائیل بڑی بے نیازی سے اس کے پیچھے لنگی ہوئی بارہ شریف کو دیکھتا رہا۔

”ہاں رحیم بھائی! اب یہ میرے ساتھ ہی رہیں گے۔“ میں نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔

رحیم کو پیسے دے کر ہم باہر نکل آئے۔ گھر پہنچ کر میں نے بستر لگائے۔ مسکرائیل کا اصرار تھا کہ وہ میرے ہی کمرے میں سوئے گا۔ ہم دونوں اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ میں مسکرائیل سے جناتی برادری کے قصے سننے لگا، جو میرے لیے بے حد حیران کن تھے۔ اس کے طہشت حضور بے حد سخت گیر تھے، لیکن طہشت جان بہت شفیق قسم کی ہستی تھیں۔ ملازمین کی خاصی بڑی فوج تھی، گھر پر۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ دو چار دن اور وہ یہاں رک گیا تو اس کی ڈھنڈیا مچ جائے گی۔ اس کے علاوہ اس نے جناتی معاشرے کے متعلق کافی معلومات فراہم کیں۔ جنوں میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ وہاں عام طور پر جناتی زبان بولی جاتی تھی۔ لیکن کسی حد تک اردو کا رواج بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے جنوں نے ہمارے ہاں انسانی روپ میں آ کر تعلیم حاصل کی تھی۔ ان میں سے بہت سارے جن ایسے بھی تھے جنہوں نے اردو میں ایم اے کیا تھا بلکہ وہ جن تو ادیب فاضل اور منشی کامل کی اسناد بھی حاصل کر چکے تھے۔

ہماری گفتگو جاری تھی کہ اچانک جیسے زلزلہ آ گیا۔ معاً زلزلہ تو چند لمحوں کے لیے ختم گیا، لیکن گولہ باری شروع ہو گئی۔ تب کہیں میری سمجھ میں آیا کہ کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بجے تھے۔ دروازہ بدستور پیٹا جا رہا تھا۔ بالآخر مجھے اٹھنا پڑا۔ مرزا دہشت بیگ کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے بہت زور کا غصہ

آ گیا۔ ”یار مرزا..... تم بہت تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے عاجز آ گیا ہوں۔ نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی، جب تم سے تعارف.....“

”ہانگ کا نگ کی فیور لیو با ہوگی۔“ اس نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”اس میں صبح کے وقت دو پہر ہوتی ہے اور دو پہر کے وقت شام..... میری مانو تو اسے کسی ریلوے لائن پر رکھ کر خود کشی کروادو۔“ پھر اس نے پلٹ کر نگ کی طرف دیکھا۔ زیتون کے دروازے پر لٹکا ہوا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ ”واہ..... گاجر کا حلوہ۔“ مرزا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے بال درست کرنے کے سے انداز میں سر پر ہاتھ پھیرا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ مردود درحقیقت حسن آئینوں کی خدمت میں سلام عقیدت پیش کر رہا ہے۔ میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ زیتون جو اب کوئی ایسا وعلیم رسید کرے کہ اس ناول گھیسٹ کے بچے کی بتیسی گلی میں بکھر کر رہ جائے۔

اچانک مجھے ایک جھٹکا لگا۔ پتہ چلا کہ مرزا مجھے دھکیل کر اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں دانت پیتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ جیسے ٹھنک گیا..... پھر اس نے ایک زوردار سلام داغ دیا۔ میں جلدی سے اپنے بستر پر لیٹ گیا کہ کہیں دہشت بیگ اسے خالی پا کر لیٹ گیا تو مجھے رات فرش پر ہی گزارنا پڑے گی۔

مسکرائیل نے بڑے شائستہ لہجے میں اسے سلام کا جواب دیا اور پھر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں منہ پھلائے خاموش لیٹا رہا۔ مرزا چند لمحے ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ میں خاموش رہا تو اس نے خود ہی گفتگو چھیڑ دی۔ ”آپ سے کبھی نیاز حاصل نہیں ہوئے۔“ اس نے مسکرائیل سے کہا۔

مسکرائیل اس طرح اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا جیسے بستر میں یکا یک کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ ”ہم نذر نیاز کے قائل نہیں ہیں۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ میں نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔

”میرا مطلب ہے، آپ سے تعارف نہیں ہے۔“ مرزا گڑبڑا گیا۔

”وہ تو آپ سے بھی نہیں ہے۔“ مسکرائیل غرایا۔

مرزا نے بڑی مظلوم نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں اب بھی خاموش رہا البتہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہا۔ ”جہنم میں جاؤ۔“

”وہ..... آپ کا نام!“ مرزا نے پھر بات چھیڑی۔

”میں مسکرا.....“ مسکرائیل کہتے کہتے رک گیا۔ اسے اچانک ہی خیال آ گیا تھا کہ اس کا اصل نام قابل قبول نہ ہوگا۔ لہذا بات نبھانے کے لیے خاصے توقف کے بعد بولا۔ ”..... نہیں سکتا۔ مسوڑوں میں کچھ تکلیف ہے۔“

مرزا بالکل ہی بوکھلا گیا۔ ”میں نے آپ کا نام پوچھا تھا، جناب۔“
 ”اوہ اچھا..... میرا نام اسماعیل ہے۔“

”خادم کو مرزا تفصیل حسین کہتے ہیں، لیکن ادبی حلقوں میں مرزا دہشت بیگ کے نام سے جانا جاتا ہوں۔ اب تک ڈھائی سو ناول ترجمہ..... میرا مطلب ہے تخلیق کر چکا ہوں۔ لیکن معاشرے نے میری قدر نہیں کی اور اب میں زبوں حالی.....“
 مسکرائیل اچھل پڑا۔ ”اوہ تو آپ ہیں وہ دہشت بیگ۔“ اس نے پرتپاک لہجے میں کہا اور مرزا سے لپٹ گیا۔

میں انگشت بدندان رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، حالانکہ اصولاً مجھے اپنا سر پیٹ لینا چاہیے تھا۔ مرزا بھی اس اچانک پذیرائی پر ششدر رہ گیا تھا۔ پھر جب مسکرائیل نے اپنے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مودبانہ لہجے میں اس سے تشریفے، کہا تو وہ بالکل سناٹے میں آ گیا۔ لیکن اس عالم میں بھی بستر پر تشریفے سے باز نہ آیا۔ مسکرائیل بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ”وہ ناول..... کیا نام ہے اس کا.....“ ”جن کا اغوا، آپ ہی نے لکھا تھا نا؟“ اس نے پوچھا۔

مرزا نے بے ساختہ گردن اکڑالی اور سینہ..... بلکہ پسلیاں بھی پھلا لیں۔ ”جی..... جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ پسلیاں پھلانے کے نتیجے میں اس کے لیے بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے اندر ہی اندر سانس خارج کر دیا اور نتیجتاً بالکل ہی چپک گیا۔
 ”اس ناول میں آپ نے جن برادری کے طرز زندگی اور بود و باش کی عجیب و غریب منظر کشی کی ہے۔ آپ کو وہ ناول لکھنے کے لیے مواد کیسے اور کہاں سے ملا؟“
 ”پہلے ان کی بغل میں گلتیاں نکلی تھیں، پھر گدی میں پھوڑا نکلا تھا۔ اتنا بڑا پھوڑا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھوڑا کیا تھا، مواد کا سمندر تھا، وہ پھوٹ جاتا تو کم از کم یہ شہر تو غرق ہی ہو جاتا.....“ میں نے بے حد بھنا کر کہا۔

”یہ مذاق کر رہے ہیں۔“ مرزا نے ہنس کر کہا۔ پھر آنکھیں نکال کر مجھے گھورا اور دوبارہ مسکرائیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دراصل میں نے جناتی معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس ناول میں تو میرے مشاہدے کی بس ہلکی سی جھلک ہے، بہت کچھ تو میں سینے میں چھپائے بیٹھا ہوں۔“ مرزا نے پسلیوں کے اس پنجر کو پیٹتے ہوئے کہا۔ جسے وہ اپنا سینہ سمجھ رہا تھا۔

میں نے مسکرائیل کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک ابھرتے دیکھی۔ مجھے خوشی ہوئی کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ اس اول درجے کے جھوٹے ناول نگار مرزا دہشت بیگ کی شامت آئیو

ن ہے۔ ”وہ سب کچھ آپ نے دیکھا ہے؟“ مسکرائیل نے پوچھا۔

”ارے صاحب، میں جنوں ہی میں پلا بڑھا ہوں۔ میں چھوٹا سا تھا کہ ایک جن مجھے لوار کر کے لے گیا۔ میرے والد صاحب نے ایک عامل سے رجوع کیا۔ سات سال ہو گئے مگر اہل صاحب کچھ بھی تو نہ کر سکے۔ ادھر میں جنوں کی بستی میں رہتا رہا۔ جن مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے میری تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ بہترین مونیسوری اسکول میں داخل کرایا۔ یوں دس سال بیت گئے۔ کچھ تو میں بہت ذہین تھا..... بہت پٹیاغ۔“ مرزا نے پھر سینہ چلانے کی کوشش کر ڈالی اور اس کی آواز بدل گئی۔ طباع، پٹیاغ ہو کر رہ گیا۔ پھر شاید اس نے بے میں آنے ہی میں بہتری سمجھی۔ ”جی ہاں، میں بہت ذہین تھا۔ خدا نے مجھے بہت سی ملاخیتیں بخشی تھیں۔ بہت سے علم میں نے بغیر کسی راہنمائی کے سیکھے ہیں۔ تو جناب میں پندرہ سال کا تھا کہ اغوا کنندہ جن کا انتقال ہو گیا۔ اصولاً اس کے بعد بادشاہت مجھے ملنی چاہیے تھی۔ لیکن وہاں مملاتی سازشیں شروع ہو گئیں۔ ایک رات میرے محل پر شب خون مارا گیا۔ میں نے سات آٹھ جنوں کو بوتل میں بند کر لیا۔ میں چاہتا تو ان کا بادشاہ بن بیٹھتا۔ جنوں کی حسین ترین نذرادی مجھ پر فدا تھی۔ لیکن وہاں میرادل نہ لگا اور میں اپنی دنیا میں واپس بھاگ آیا۔“
 ”وہ بوتلیں تو آپ ساتھ ہی لائے ہوں گے؟“ مسکرائیل نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

”جی ہاں، جی ہاں۔“ مرزا نے شدت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پھر جب انہوں نے درو کر معافیاں مانگیں تو میں نے انہیں آزاد کر دیا۔“

”ہوں..... تو یہ بات ہے۔“ مسکرائیل نے کہا۔ پھر میں نے اسے منہ ہی منہ میں کچھ بولتے دیکھا..... اچانک مرزا اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور پھر مسلسل اچھلنے لگا۔ اس دوران اسکے منہ سے عجیب عجیب الفاظ نکل رہے تھے۔ میں صرف، ارے باپ ر، سمجھ سکا۔ وہ اپنی پتلون کو بری طرح جھٹک رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھدکتا ہوا ہاتھ روم میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آیا تو اس کے ہونٹوں پر چھپنی چھپنی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے بستر کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

”کیا قصہ تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ..... کچھ نہیں۔“ وہ گڑ بڑا گیا۔

”پھر دیکھ لیجیے۔ کہیں کوئی اور.....“ مسکرائیل نے کہا۔

”جی نہیں۔ میں اسے نکال آیا۔“ لیکن مرزا بات پوری نہ کر سکا اور دوبارہ اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ وہ بہت زیادہ بے چین معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ روم کا رخ

کیا۔ چند منٹ بعد وہ باہر نکلا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
 ”یار، بتاتے کیوں نہیں..... کیا مصیبت آن پڑی تم پر۔“ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔
 ”پپ..... پپ..... پتلون میں لال..... لال..... لال بیگ۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے
 جواب دیا۔

مسکرائیل نے اسے مخاطب کیا۔
 شاید اس کی بات مرزا کے دل کو لگ گئی مجھے پوری طرح نظر انداز کر کے وہ سنجیدگی سے
 ناک بھوں پر زور ڈالنے لگا۔

”آپ ناک میں سوچ رہے ہیں۔ اس طرح بات نہیں بنے گی۔“ مسکرائیل نے اسے
 ٹوک دیا اور مرزا بری طرح گربزا گیا۔ ”جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، آپ اس سے پہلے جنوں کا
 تذکرہ کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کسی جن کو آپ کا انداز برا لگا ہو اور اس نے آپ کو سزا دی ہو۔“
 ”ارے نہیں..... ہی ہی ہی.....“ مرزا پہلے تو ہنسا پھر اس کی ہنسی میں بریک لگ گیا۔
 ”جی ہاں..... ممکن ہے۔“ وہ بولا۔ ”ایک جن تو یہاں بھی رہتا ہے۔“

مسکرائیل نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”اس کا نام طمطراقیل ہے اور مرزا دہشت اسے بوتل میں بند کرنا چاہتا ہے۔“ میں کہا۔
 ”ارے نہیں جناب..... وہ تو مذاق تھا۔“ مرزا نے یوں منہ اوپر اٹھا کر کہا جیسے چھت پر
 چسپاں کسی ہستی سے مخاطب ہو۔ ”میں تو جن حضرات کا بہت معتقد ہوں۔“
 ”ہرگز نہیں۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جن کو بوتل میں بند کرنے کا فارمولا جانتے ہو۔ تبھی
 نے فرمائش کی تھی کہ طمطراقیل کو تم سے ملواؤں۔“

”ارے..... ارے، عمران بھائی۔ مرواؤ گے کیا مجھے؟ وہ تو میں عقیدت کی وجہ سے ملنا
 چاہ رہا تھا..... کسی جن کو بوتل میں بھلا کون بند کر سکتا ہے۔“

”اوہ وہ جن جنہیں تم جنوں کی مملکت سے پکڑ لائے تھے!“ میں نے یاد دلایا۔
 ”ہاں، تم نے میرے سامنے یہی کہا تھا۔“ مسکرائیل نے تائید کی۔

”وہ معاملہ اور تھا۔“ مرزا کسی سوچ میں پڑ گیا۔ ”دراصل بچپن میں مجھے فلموں سے بہت
 دلچسپی تھی۔ میں چائلڈ اسٹار بننا چاہتا تھا۔ اسی چکر میں گھر سے بھاگ نکلا۔ فلم اسٹوڈیوز میں
 دھکے کھاتا پھرا۔ فلم میں وکام نڈل کا البتہ ایک اسٹوڈیو کی کینیٹین میں ٹیبل مین کی ملازمت مل
 گئی۔ میں نے اسے ہی غنیمت جانا کیونکہ وہاں بڑے ہیرو اور ہیروئنوں کا دیدار نصیب ہو جاتا
 تھا۔ ہدایت کاروں اور مصنفوں کو تو میں گھاس ہی نہیں ڈالتا تھا۔ سات آٹھ سال بعد جب
 وہاں سے اکتا گیا تو اپنے گھر لوٹ آیا اور یہ کہانی گھڑ کر سنا دی کہ مجھے ایک جن اٹھا کر لے گیا
 تھا۔ بس اسی لمحے میرا ارٹنگ کیریئر شروع ہو گیا۔“

”اور وہ بوتل والے جن؟“ مسکرائیل نے پوچھا۔

”ارے وہ..... وہ تو گھر والوں کو مرعوب کرنے کے لیے میں نے بوتلوں میں سگریٹ کا
 دھواں بھر لیا تھا۔“ مرزا نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

”اوہ..... گویا آپس کا معاملہ ہے“ مسکرائیل نے تبصرہ کیا۔
 ”کک..... کیا مطلب؟“ مرزا کے لہجے میں خفگی تھی۔
 ”بھئی آپ مرزا دہشت بیگ ہیں..... اور وہ جو آپ کے گدگدیاں کر رہا تھا، وہ لال
 بیگ ہے۔“

اچانک مرزا نے پھر چیخنا اور اچھلنا شروع کر دیا۔ ”ارے باپ رے..... ارے،
 ارے..... کاٹنا بھی ہے۔“ اس نے پھر ہاتھ روم کی طرف دوڑ لگا دی۔ اب کے وہ باہر آیا تو
 بالکل ہی نڈھال ہو رہا تھا۔

”ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ بیگ ہیں اور وہ بھی بیگ ہی ہے۔ لال ہے تو کیا ہوا؟
 ہے تو بیگ ہی گویا یہ آپ کا خاندانی معاملہ ہے۔“ مسکرائیل نے یوں سلسلہ کلام جوڑا جیسے چند
 لمحے قبل کچھ ہوا ہی نہ ہو۔“

مرزا کے چہرے پر لرزے کے سے آثار تھے۔ ”آپ میری توہین کر رہے ہیں۔“ اس
 نے احتجاج کیا۔

”توہین کا احساس لال بیگ کو بھی ہوتا ہوگا۔ اسی لیے وہ آپ کو مسلسل تنگ کر رہا ہے۔“
 مسکرائیل نے نہایت اطمینان سے کہا۔ اس کے یہ کہتے ہی مرزا کی اچھل کود پر شروع ہو گئی۔
 البتہ اس دفعہ ایک نئی بات ہوئی..... اس اچھل کود کے دوران اس کی پتلون کے بائیں پانچے
 سے ایک صحت مند سالال بیگ پکا اور سیدھا ہاتھ روم کی طرف بھاگا۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور میں ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔
 مسکرائیل کی سنجیدگی قابل دید تھی۔ ”بہتر ہے کہ آپ اپنے نام سے بیگ الگ کر دیں۔“
 ”پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔“ مرزا نے جواب دیا۔ ”اچانک ہی یہ مصیبت ٹوٹی ہے مجھ پر۔“
 ”دراصل یہ گھر ہی منحوس ہے۔“

اس بات پر مجھے مرزا کی بے وزنی، اور اسکے مناظر یاد آ گئے۔ میری ہنسی کی رفتار اور بڑھ
 گئی۔

”ہنس لو..... خوب ہنس لو، دوست نہادشمن۔“ مرزا نے گرج کر کہا۔
 ”نہیں بھئی، مرزا صاحب۔ اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچیے۔ ایسا کیوں ہوا۔“

اس مرتبہ مسکرائیل کو ہنسی آگئی البتہ میں سنجیدہ رہا۔ میں مرزا کے فن کا مظاہرہ دیکھ بلکہ بھگت چکا تھا۔ مجھے اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں آ سکتا تھا۔ وہ کم بخت بلا کا گپ ساز تھا لیکن مسکرائیل کا برا حال تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے ہنس رہا تھا۔ اس طرح ہنستے دیکھ کر غالباً مرزا دہشت کی انا کو ٹھیس لگی۔ وہ پھرا کر گھبرا گیا۔

”یہ ابھی جو میری پتلون میں لال بیگ گھسے تھے، انہیں آپ کیا سمجھتے ہیں۔“ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”یہ جنوں ہی کی کارستانی ہے۔ میری ان سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ کچھ اور بس نہیں چلتا تو وہ اس طرح کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن میں ان میں سے کسی نہ کسی کو بوتل میں بند کر کے ہی رہوں گا۔ یہ عمل مجھے خوب آتا ہے۔“ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ”تو اس جن..... کیا نام ہے اس کا..... طمطراق آئل..... اس سے کب ملوار ہے ہیں۔ عمران بھائی۔“

مسکرائیل کی ہنسی میں ایک دم بریک لگ گیا۔ آنکھوں میں خوف ناک چمک نظر آنے لگی۔ میرا جی تو چاہ رہا تھا کہ مسکرائیل اس کی چٹنی بنا ڈالے لیکن اسے اپنے ہاتھوں سے سزا دینا زیادہ مناسب تھا۔ چنانچہ میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ وہ مزید کوئی حرکت نہ کرے۔

”ایسا کرو مرزا اکل آ جاؤ۔ میں طمطراقیل کو بلا لوں گا۔“

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اپنا ساز و سامان بھی ساتھ لے آنا، پھر ہم تمہارے فن کا مظاہرہ دیکھیں گے۔“

”ٹھیک ہے، عمران بھائی۔“ مرزا نے سعادت مندی سے کہا۔ ”میں چلتا ہوں، اور..... ہاں، ایک پانچ کا نوٹ ہوگا، آپ کے پاس۔ دراصل پیسوں کی میرے پاس کمی تو نہیں، لیکن اس عمل کے لیے جو چیزیں خریدنی پڑتی ہیں، وہ میں اپنے پیسوں میں نہیں خرید سکتا۔“ مجھے اس بے ہودہ دلیل پر شدت سے غصہ آیا، لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ”میری جیب میں بھی صرف سو کا نوٹ ہے۔“ میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں، وہی دے دیجیے۔ اس عمل میں ایسی کوئی پابندی نہیں کہ پانچ کا نوٹ ہی ضروری ہو۔“

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹ باہر نکال لیے۔ ”اوہ..... یاد ہی نہیں رہا۔ وہ نوٹ تو میں نے کھلا کر لیا تھا۔“ میں نے کہا اور پانچ کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

”ایسا کریں..... سات روپے دے دیں۔“ وہ مزید بھیل گیا۔ ”مجھے خیال نہیں رہا تھا، عملیات کا حساب سات گیارہ، اکیس..... کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

میں جانتا تھا کہ بے حد ڈھیٹ آدمی ہے..... پیسے لیے بغیر ٹلے گا نہیں۔ بہتر ہے کہ جلد جان چھڑالی جائے۔ چنانچہ میں نے مزید دو روپے اس کے حوالے کیے اور بڑی گرم جوش مانفہ کیا۔ وہ ہمیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر پرنظر ڈالی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ صبح دفتر بھی جانا تھا کیونکہ ایکسپلے نیشن کا بھی دینا تھا، لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

”یہ کیا بلا تھی، عمران بھائی؟“ مسکرائیل نے مجھے چونکا دیا۔

”یہ مرزا دہشت بیگ تھا۔ اپنی نوعیت کا ایک ہی پیس ہے۔ بہت ذہین ہے، تخلیقی توں سے مالا مال ہے۔ اس کے زرخیز خیال کا کمال میں دیکھ چکا ہوں۔ کم بخت نے قتل زام میں تقریباً پھنسوا ہی دیا تھا۔ لیکن ہمارے بجر معاشرے میں اس قسم کے لوگوں کے گنجائش ذرا کم ہی ہوتی ہے۔“

”تو یہ واقعی ناول نویس مرزا دہشت بیگ ہے۔ اگر یہ وہی ہے تو مجھے اس کا ناول ”خونی“ بہت پسند ہے۔“ مسکرائیل کا لہجہ پُر اشتیاق تھا۔

”ہاں، یہ وہی مرزا دہشت بیگ تھا۔ مگر یہ لال بیگ والا کیا قصہ تھا؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“ مسکرائیل نے لاپرواہی سے کہا۔ ”وہ برادری کی توہین کر رہا مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے معمولی سی سزا دے ڈالی۔“

”یہیں بیٹھے بیٹھے۔“

”میں یہیں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا کیا کر سکتا ہوں۔ اور یہ طمطراقیل کون ہے؟“

”میں ہی ہوں، غائب ہوتا ہوں تو طمطراقیل ہو جاتا ہوں۔“ میں نے شرما تے ہوئے

”یار، تم با کمال آدمی ہو، مان گیا، تمہیں۔“ مسکرائیل نے پرستاش نگاہوں سے میری دیکھا۔ ”تو کل تم اسے طمطراقیل سے ملاؤ گے۔“

”ہاں، دو اکھا کر غائب ہو جاؤں گا، پھر خوب درگت بناؤں گا اس کی۔ بوتل میں جن نے کا بھوت سر سے اتر جائے گا۔“

”لیکن بھئی، میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ واقعی ایسے عمل ہوتے ہیں، جن سے جن میں قید ہو جاتے ہیں۔ کہیں میں نہ مارا جاؤں۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اور واقعی کچھ پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ ”ارے..... چھوڑو بھی۔ وہ کوئی سچ سچ کا عامل تو ہے نہیں چلو، اب سو جاؤ۔ مجھے صبح دفتر جانا ہے۔“

”لیکن مجھے تو بھوک لگ رہی ہے، بھائی۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بے

بسی سے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”یار ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم نے چھ آدمیوں کی خوراک پیٹ میں اتاری ہے۔ اب پھر بھوک..... خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ اگر تمہاری بھوک کا یہی حال رہا تو میرے لیے فاتحوں کی نوبت آ جائے گی۔“

”کیا کروں..... مجبوری ہے، مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ اور ہاں پیسوں کی کوئی فکر نہ کرنا۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو کے نوٹوں کی گڈی لہرائی۔
”وہ تو ٹھیک ہے۔ اس صورت میں تو پیسوں کی فکر واقعی تمہیں کرنا پڑے گی۔ لیکن اب رات کے بارہ بجے کھانا کہاں سے ملے گا؟“

”میں..... میں کیا کروں، مجھے بھوک.....“

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے مرزا کے جانے کے بعد دروازہ تو بند کیا ہی نہیں تھا۔ میں اٹھا اور دروازہ بند کرنے کی نیت سے چلا۔ کمرے میں روشنی کی وجہ سے آنگن کا اندھیرا بہت گہرا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی میں نے کمرے سے باہر قدم بھی نہیں نکالا تھا کہ اندھیرا متحرک ہوا اور مجھ سے ٹکرا گیا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا اور چاروں شانے چت کمرے میں آ گرا..... متحرک اندھیرا ابھی نہ سنبھل سکا۔ وہ بھی میرے اوپر آن کرا۔

”سک..... سک..... کون ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں تو تمہیں کبھی نظر ہی نہیں آتی۔“ کوئی منمنایا۔

مجھے اس کی آواز پہچاننے میں ایک لمحہ لگا۔ پھر میں بری طرح بھنا گیا۔ میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ لیکن میری پسلیوں پر اب بھی بوجھ تھا۔ ”اٹھو نا۔“ میں نے محلے میں اپنی عزت و عافیت کے پیش نظر دھیسے لہجے میں چیخنے کی کوشش کی۔

”مجھے تو گرا دیا تھا تم نے۔“ بسورتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔

”تو پھر یہ کون ہے؟“

”یہ..... یہ میری گھڑی ہے۔“

میں نے گھڑی کو دھکیلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کیوں آئی ہو یہاں؟“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا اور جھپٹتے ہوئے مسکرائیل کی طرف دکھا، لیکن جو کچھ مجھے نظر آیا وہ حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مسکرائیل کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس تیغ آہنوں کو تنکے جا رہا تھا۔

”میں..... میں تمہارے ساتھ.....“ وہ منمنائی۔

”کیا بکواس ہے یہ۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”تم بانو کو ساتھ لے جا سکتے ہو تو تم..... میں.....“

”یہ سراسر بکواس ہے بانو کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔“ نے جواب دیا اور محجوب نگاہوں سے مسکرائیل کی طرف دیکھا، لیکن وہ نہایت وارفتگی سے ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا، اور میری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔

”ہونہ ہو۔ ہمارا یہ تعلق کبھی نہیں ٹوٹے گا۔“ زیتون کے لہجے میں قطعیت تھی۔

میں بے بسی کے زیر احساس لرز کر رہ گیا۔ بس چلتا تو اسے کچا ہی چبا جاتا، لیکن وہ تھی بھی اہوئی چپاتی جیسے رنگ کی شخصیت.....

”اور ہاں یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔“ اچانک زیتون کے تیور بدل گئے۔ ہمارا الفنگا دوست..... وہی کالی چھکلی جیسا..... وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتا ہے اور آتے جاتے لرتا ہے۔ تم اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔ کسی دن مجھے خود ہی سمجھانا پڑے گا۔“

وہ واضح طور پر مرزا دہشت بیگ کا تذکرہ کر رہی تھی۔ مرزا کی حرکتیں میں خود بھی دیکھ چکا میں جانتا تھا کہ مرزا جہاں ہے اور جیسا ہے، کی بنیاد پر مرمنے کے لیے تلا بیٹھا تھا۔ زیتون روازے کا پردہ ہلتا دیکھ کر فدا ہو گیا۔ اس کا عشق کس قسم کا تھا، میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا۔ بتا اس آڑے وقت میں وہی کھوٹا سکہ میرے کام آ سکتا تھا۔

میں نے لہجے میں مٹھاس سمونے کی کوشش کرتے ہوئے اسے خوشخبری سنائی۔ ”وہ تمہیں لے جانا.....“

عام لڑکیوں کا چہرہ غصے یا شرم سے سرخ ہو جاتا ہے۔ لیکن زیتون کے چہرے پر میں نے وز عجیب رنگ دیکھا۔ ”اس کا چہرہ اودا بینگنی رنگ کا ہو گیا۔“ اسے تو میں جوتی کی نوک پر میں مارتی۔ ”وہ مٹھیاں بھی بچ کر غرائی۔“ ہنہہ گاجر کا حلوہ..... اور بس، ذرا نمک بہت زیادہ..... چکا ڈر کہیں کا۔“ اس نے دہشت بیگ کی باتیں دہرائیں۔

”یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔“ میں نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”تمہاری بات اور ہے۔“ رومینک بننے کی کوشش میں وہ بھیٹکی نظر آنے لگی۔

”اے اپنی آنکھوں کے زاویے درست کرو۔ یہ ادھر ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟“ میں نے ڈاکر کہا۔

”سبحان اللہ۔“ مسکرائیل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ لہجے میں وارفتگی تھی۔

زیتون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی نا موجود ہے۔ ”ہائے اللہ یہ کون ہے۔“

”یہ میرا غم زاد ہے۔ اسماعیل نام ہے، اس کا۔“ میں نے غم زاد کو اس طرح استعمال کیا

کہ غم زاد اور ہم زاد کی درمیانی شکل ہو کر رہ گیا۔

”خیر، ہوتا ہے۔ تم میری بات کا جواب دو۔ بولو کیا کہتے ہو۔“

”تم یہ گھڑی اٹھاؤ اور اپنا راستہ ناپو۔“

”پلیز..... پلیز ابو جی۔“ وہ گڑ گڑانے لگی اور اسی حساب سے میں گڑ بڑانے لگا۔

”عمران بھائی سست آدمی معلوم ہوتے ہیں.....“ مسکرائیل نے مداخلت کی۔ ”تم اکیلے

کیوں نہیں کہیں چلی جاتیں؟“

زیتون نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”عجب احمق آدمی ہو۔ اتنا بھی

نہیں پتہ کہ اکیلے نہیں بھاگا جاتا۔“

”مسکرائیل قدرے شرمندہ نظر آنے لگا۔“ ہمارے ہاں تو اکیلے ہی بھاگ لیا جاتا ہے۔“

اس نے شرمسار لہجے میں کہا۔ ”خیر..... یہاں ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔“ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر

کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”چلو..... میں بھاگوں گا تو تمہارے ساتھ۔“

”ہنہ..... میں بھاگوں گا۔“ زیتون نے منہ بگاڑ کر نقل اتاری۔ ”جان نہ پہچان.....

چلے ہیں بھگانے۔“

”جان پہچان کا کیا ہے۔ بھاگتے بھاگتے ہی ہو جائے گی۔“ مسکرائیل مدافعا نہ لہجے میں

بولا۔ ”ویسے تم کہاں تک بھاگنا چاہتی ہو؟“

اس مرتبہ میں نے مداخلت کر ڈالی۔ ”اے میرے معصوم بھائی۔“ میں نے مسکرائیل کو

چمکارتے ہوئے کہا۔ ”یہ خود ڈیڑھ افق ہے.....“

”یہ خود ڈیڑھ کیا ہوتی ہے، عمران بھائی۔“ مسکرائیل نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

”تمہارے سامنے دھری ہوئی ہے، میرے بھائی۔“ میں نے زیتون کی طرف اشارہ

کیا۔ ”خواتین کا نصف..... حساب کی زبان میں خواتین بنادو..... دراصل ہمارے ہاں نصف

نازک کو کم از کم ڈیڑھ مانا جاتا ہے۔ البتہ ڈیڑھ سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔“

”ہاں..... تم کچھ بتا رہے تھے۔“ مسکرائیل نے مجھے یاد دلایا۔

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ خود ڈیڑھ نہ صرف افق کے اس پار تک بھاگنا چاہتی ہے بلکہ

درمیان میں مناسب یا نامناسب وقفوں سے بچے بھی اس ریس میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔“

”واہ..... خوب ایڈ ونچر رہتا ہوگا۔“ مسکرائیل نے خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ پھر وہ

زیتون کی طرف متوجہ ہو گیا جو میری طرف دیکھ کر خوب دانت پیس رہی تھی۔ ”اور اس گھڑی

میں کیا ہے؟“ اس نے زیتون سے پوچھا۔

اس میں میرے کپڑے اور زیورات ہیں.....“ زیتون نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

”کمال ہے، بھاگتے وقت تو انسان کو ہلکا پھلکا ہونا چاہیے۔“ مسکرائیل کے لہجے میں ملکی

سی مایوسی در آئی۔ ”یہاں تو ہر چیز الٹی معلوم ہوتی ہے۔ بھاگتے وقت اور زیادہ بوجھ لاد جاتا

ہے، اپنے اوپر۔ جو کپڑے پہنہ جا سکیں، انہیں گھڑی میں لپیٹ کر اٹھا لیا جاتا ہے۔ ویسے یہ

بات ضروری ہے، کیا؟“

”ضروری ہے..... میں ان پر بوجھ بنانا نہیں چاہتی۔“ زیتون نے میری طرف دکھتے

ہوئے کہا۔

”اچھا..... تو گھڑی ٹرانسپورٹ کا کام دیتی ہے..... تب تو بہت ضروری ہے۔“

مسکرائیل بولا۔

میری توجہ ان ہی جمل کر رہ گئی البتہ زیتون نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”تو خوا ڈیڑھ، میرے پاس فی الحال تو گھڑی نہیں ہے، البتہ میں بغیر گھڑی کے بھی آپ

کے ساتھ بھاگ سکتا ہوں۔ لیکن یہ رسم ضروری ہو تو میں گھڑی کا بندوبست بھی کر لوں۔

زیورات کی تو شاید مجھے ضرورت نہیں ہوگی۔“

”تمہیں کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہوگی.....“ زیتون نے بھنا کر کہا۔ ”اگر یوں ہر

ایک کے ساتھ بھاگنے والی ہوتی تو عبد اللہ و دمر گیا ہے کیا! میں تو بس ابو جی کو پسند کرتی ہوں۔“

مسکرائیل نے ایک دلدوز آہ بھری اور پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا، شاید اسے پھر بھوک

ستانے لگی تھی۔

”اچھا زیتون..... اب تم یہاں سے چل دو ورنہ مجھے قاضی صاحب سے بات کرنا پڑے

گی۔ اور ہاں آئندہ یہاں کبھی نہ آنا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”نہیں، تم یہاں ضرور آیا کرو۔ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔“ مسکرائیل نے دردناک لہجے

میں کہا۔

”اور آئندہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔“ میں نے مزید کہا۔

”البتہ آنکھ اٹھا کر، آنکھ گرا کر جس طرح بھی چاہو مجھے دیکھ سکتی ہو۔“ مسکرائیل نے ٹکرا

لگایا۔

زیتون ایک بڑی سی پلیٹ میں کچھڑی لیے نمودار ہوئی۔ کچھڑی پر وہ خوب ساری چٹنی بھی سجلائی تھی۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

مسکرائیل نے وہ پلیٹ چھٹی اور مر بھوکوں کی طرح کچھڑی پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن چٹنی اس کا نام پوچھے لے رہی تھی۔ اس کی ناک سے..... آنکھوں سے پانی بہتا رہا..... وہ سوسوں کرتا رہا، لیکن کچھڑی ہڑپ کرتا رہا۔ اسے پلیٹ تھا کر زیتون پانی کا گلاس بھر لائی اور عجیب شفقت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ میں دل ہی دل میں لرزتا رہا۔ اگر محلے میں کسی کو پتہ چل جاتا کہ زیتون اس وقت میرے گھر میں موجود ہے تو یقینی طور پر میرا فندیلا ہو جاتا۔ میں زیر لب خدا سے خیر و عافیت طلب کرتا رہا۔ مسکرائیل نے پلیٹ صاف کر کے زیتون کے حوالے کی اور پھر پانی ڈاکر گیا۔ پھر اس نے خالی گلاس زیتون کی طرف بڑھایا۔ ”اور پانی لاؤ۔“ اس نے شوہروں کے سے حکمانہ لہجے میں کہا۔

زیتون نہال ہو گئی اور لپک کر گلاس پھر بھر لائی۔ اس بار مسکرائیل نے گلاس خالی کر کے زیتون کی طرف بڑھایا تو میرا پیانہ صبر چھلک گیا۔ میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ”یار تم جتنا کہو گے، میں پلا دوں گا۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”خدا کے لیے اسے تو جانے دو۔ جاؤ بھی تم۔“ میں نے زیتون سے کہا۔

اس نے پھر شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پھر پلیٹ اٹھا کر چل دی۔

”یہ گٹھری بھی لے جاؤ اپنی۔“ میں نے پکارا۔

اس نے واپس آ کر گٹھری بھی اٹھالی۔

”اس وقت تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“ مسکرائیل نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ ”اور ہاں..... آئندہ گٹھری میں کھانا رکھنا بھی نہ بھولنا۔“

زیتون نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور کمرے سے نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی لپکا۔ دروازہ کھول کر میں نے دائیں بائیں جھانکا..... گلی سنان تھی۔ ”چلو جاؤ۔“ میں نے زیتون سے کہا۔

”اور اپنی اس سیاہ چھپکلی کو سمجھا دینا، ورنہ پٹ جائے گا۔ میرے ہاتھوں۔“ اس نے دھمکی دی اور باہر نکل گئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور بخیر و عافیت بلا ٹلنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر میں کمرے میں پلٹ آیا۔ مسکرائیل اطمینان سے پاؤں پھیلائے لیٹا تھا، لیکن اس کی سوسوں اب بھی جاری تھی۔ میں اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔

”یار مجھ سے سنجیدہ ہو کر بات کرنا۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”سچ بتاؤ کہ وہ تمہیں کیسی

”اور میرے خواب دیکھنے چھوڑ دو۔“

”میرے خواب دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔“

زیتون نے پہلے تو میری طرف شاکی نظروں سے اور پھر مسکرائیل کی طرف ممنونیت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”آپ بہت اچھے ہیں۔“ وہ مسکرائیل سے مخاطب ہوئی۔ ”اب میں آپ کے بارے میں سوچوں گی۔“

”مسکرائیل نے باجھیں کھلا کر کہا۔“ اور ہاں تمہاری گٹھری میں کھانے

پینے کی بھی کوئی چیز ہے۔“

”نہیں..... لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”مجھے..... مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ مسکرائیل پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”عجیب بات ہے، بھاگنے کے لیے تم نے گٹھری میں کپڑے بھی رکھ لیے اور زیورات بھی..... لیکن کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں رہی۔ حالانکہ یہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔“

”آئندہ خیال رکھوں گی۔“ زیتون نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ ”کیا بہت بھوک

لگ رہی ہے؟“ اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

مسکرائیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”موٹگ کی دال کی کچھڑی اور چٹنی کھائیں گے۔“

”اس وقت میں ہر چیز کھا سکتا ہوں۔“ مسکرائیل نے جواب دیا۔ ”لیکن بہت ساری

لانا۔“

”میں ابھی لائی۔“ یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف لپکی۔

”یہ گٹھری لیتی جاؤ، اپنی۔“ میں نے پکارا۔

”پھر لے جاؤں گی۔“ اس نے جواب دیا اور میں سر پٹینا رہ گیا۔ وہ باہر نکل گئی۔

”یار، تم ضرور مرداؤ گے، بیڑا

سر پٹینے سے فارغ ہو کر میں مسکرائیل کی طرف متوجہ ہوا۔

غرق کراؤ گے میرا۔“

اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ ناچار میں نے اسے معاشرے میں بھاگنے والوں کا مقام،

بھاگنے کی معاشرتی قابحتیں وغیرہ سب سمجھایا۔

”ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔“ میرے چپ ہونے کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”لیکن کیا کروں، مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔“

”محبت.....؟ اور زیتون سے؟“ میں دہل کر رہ گیا۔ میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ

لگی؟“

”بہت اچھی، بڑی مزے دار۔“ اس نے کہا۔ ”البتہ تیکھا پن بہت زیادہ ہے۔“
 ”کہاں کی ہانک رہے ہو؟“ میں بری طرح بھنا گیا۔ ”میں زیتون کی بات کر رہا ہوں۔“
 ”اوہ، میں سمجھا کچھ بڑی اور چٹنی کے متعلق پوچھ رہے ہو۔ ہاں بھائی، وہ بھی بہت اچھی ہے۔“

”تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں اس سے محبت ہوگئی ہے؟“ میں نے یاد دلایا۔
 ”تو اس میں حیرت یا پریشانی کی کون سی بات ہے۔“

”محبت کوئی بری چیز ہے کیا؟ پھر وہ لڑکی تو ہے ہی محبت کے قابل۔“
 ”تم نے شاید اسے غور سے نہیں دیکھا۔“

”میں نے زندگی میں اس سے زیادہ بغور کسی ہستی کو دیکھا ہی نہیں۔ واہ..... کیا بے مثال حسن تھا۔ میری آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں۔“

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن لہجے کی طرح اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
 نہ جانے کیوں مجھے بہت زور کا غصہ آ گیا۔ ”عجیب بد ذوق آدمی ہو تم!“ میں نے کہا۔ ”میں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی میں ایسی کون سی خوبی ہے۔“

”دیکھو دوست! پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت کی اپنی ایک نظر ہوتی ہے۔ اس کا حسن، اس کی خوبیاں دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تم اسے میری آنکھ سے دیکھو۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ اور ہاں..... ایک بات اور۔ تم نے کبھی محبت کی ہے؟“

”ہاں کی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ساتھ ہی میری نگاہوں میں ریشماں کا سراپا لہرا گیا۔ میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔

”کیسی ہے وہ؟“ اس نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”بے حد حسین ہے..... اتنی حسین کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں تو خیر سائنس کا آدمی ہوں۔ شاعر بھی اس کے حسن کو لفظوں میں نہیں سمیٹ سکتے۔“

”خیر میرے تصور کو تو تم چھوڑو۔“ اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ بتاؤ، تمہیں محبت کا جواب محبت سے ملا یا نہیں؟“

اس کے سوال نے مجھے دھکی کر دیا۔ مجھے ریشماں کی بے مہری یاد آ گئی..... بے مہری جس میں عجیب سی اپنائیت بھی تھی۔ ”نہیں۔“ بالآخر میں نے جواب دیا۔

”بس، یہ بات ہے حسین لڑکیوں کے خمرے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔“ اس نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ”تم اس کے معیار حسن پر پورے نہیں اترے ہو گے، پھر وہ اگر تمہاری محبت کا جواب محبت سے دے، تب بھی استقلال کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ وہ حسین ہے، اسے اور لوگ بھی سراہیں گے۔ کسی بھی وقت وہ مرکز محبت تبدیل کر سکتی ہے، کسی اور کی طرف ملتفت ہو سکتی ہے۔ لیکن زیتون کے اور میرے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہوگی۔“

اس کی بات کسی تیز دھار والے خنجر کی طرح میرے دل میں اتر گئی۔ لیکن جلد ہی میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ”لیکن تم تو جن ہو؟“ میں نے اعتراض کیا۔

”جنوں اور انسانوں کے درمیان ایسے رشتوں کی مثالیں موجود ہیں؟“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن تم اپنی منگیتر کو اس لیے ناپسند کرتے ہو کہ اس کے سینک چھوٹے ہیں۔ زیتون کے سر پر تو سرے سے سینک ہی نہیں ہیں۔“ میں نے ایک اور دلیل پیش کی۔

”سینک لمبے نہ ہوں تو پھر ان کا نہ ہونا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔
 ”اگر زیتون کے سر پر سینک ہوتے اور..... اور لمبی سی دم بھی ہوتی تو وہ کتنی حسین لگتی۔“ میں نے کہا۔ پھر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”تم میرے دوست ہو، لیکن میری محبت کا مذاق نہیں اڑا سکتے۔“ وہ اچانک ہی پھر گیا۔ اسے غضب ناک دیکھ کر میری ہنسی یکنخت رک گئی۔ اس کے اس انداز نے مجھے یقین دلایا کہ وہ زیتون پر بری طرح فریفتہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس فریفتگی کا تصور ہی میرے لیے مضحکہ خیز تھا، البتہ اب ہنسنا بھی مخدوش تھا۔

”اب میں سونا چاہتا ہوں۔“ اس نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا اور کروٹ بدل لی اور میں نے اٹھ کر لائٹ آف کر دی۔ پھر میں بھی بستر پر آ لیٹا، کچھ دیر میں کروٹیں بدلتا رہا، پھر مجھے نیند آ گئی، لیکن وہ کچھ اچھی نیند نہیں تھی۔ تمام رات زیتون میرے خوابوں میں دندناتی رہی۔ کبھی زور زور سے دم ہلاتی، کبھی سینک مروڑتے ہوئے شرماتی۔ قہقہے میرے پیٹ میں بچل رہے ہوتے، لیکن ہنسنے کی مجال نہ ہوتی۔ صبح میری آنکھ جلد ہی کھل گئی، آنکھ کھلتے ہی پتہ چلا کہ میں پیٹ کے درد کی وجہ سے جلدی اٹھا ہوں۔ درد کی وجہ غالباً وہی خواب تھے، جن میں مجھے اپنے ساختہ قہقہوں کو پیٹ میں ہی ٹھونسنا پڑا تھا۔

اٹھتے ہی میں نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ مسکرائیل کی خوش خوراک کی وجہ سے ہوٹل کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ باورچی خانے میں ضرورت کی سب چیزیں موجود تھیں۔ میں بازار سے دودھ، ڈبل روٹی، مکھن اور انڈے خرید لایا۔ ناشتہ تیار کر کے میں نے چائے کا پانی رکھا اور

باتھ روم میں گھس گیا۔ باتھ روم سے باہر نکلا تو مسکرائیل اٹھ چکا تھا۔ میرے نکلنے ہی وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

”اچھا بھائی، اب میں دفتر جا رہا ہوں۔“ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے مسکرائیل سے کہا۔

”واپسی کب ہوگی؟“ اس نے پریشان ہو کر بیویوں کے سے لہجے میں پوچھا۔
 ”آج دفتر میں بھی جنگ لڑنی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”بہر حال، میں شام تک آ جاؤں گا۔ نوٹوں کی گڈی تمہارے پاس موجود ہے۔ جی بھر کر کھانا کھانا۔ لیکن خدا کے لیے اس زیتون سے دور رہنا۔ ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو وہ تمہارے سر پر سوار ہو جائے گی۔“

”تو اس میں کیا بری بات ہے؟“
 ”محلے والے تمہاری چٹنی بنا دیں گے۔ تم ابھی ہماری معاشرتی زندگی سے پوری طرح واقف نہیں ہو۔“

”تو پھر میری محبت کا کیا بے گناہ؟“ اس نے دردناک لہجے میں پوچھا۔
 ”اس سلسلے میں زیتون کے باپ سے بات کریں گے۔“ میں نے اسے دلا سادیا۔ ”وہ بے چارے تو یہ خوش خبری سن کر اتنے مسرور ہوں گے کہ تمہیں جہیز کی صورت میں بہت سا انعام و اکرام بھی دیں گے۔“

”اچھا..... ضرور بات کرنا۔“ مسکرائیل نے بے حد خوش ہو کر کہا۔
 میں نے ضرورت کے مطابق دواؤں کے کپسول اپنی جیب میں رکھے اور اسے خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا۔ سارے راستے میں اپنی زندگی پر غور کرتا رہا، جو اچانک ہی بے حد غیر حقیقی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں کوئی افسانہ پڑھ رہا ہوں..... حقیقتوں سے پرے۔ جب وہ زندگی خود مجھے افسانہ لگ رہی تھی، تو میں جانتا ہوں کہ آپ اسے حقیقت ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ لیکن میں اس پر اصرار بھی نہیں کروں گا۔

میں دفتر ٹھیک وقت پر پہنچ گیا تھا..... دفتر میں خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ کچھ عرصہ سے اشتیاق صاحب نے دفتری اوقات کے معاملے میں سختی برتنا شروع کر دی تھی۔ خود اشتیاق صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے۔ میں نے حاضری لگائی اور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ابھی میں نے فائل نکالی ہی تھی کہ یاسین میرے پاس آ گیا اور بے حد زار دارانہ انداز میں بولا۔ ”تمہارے ایکسپلے نیشن کے سلسلے میں اشتیاق صاحب کی اے سی صاحب سے بھی بات ہوئی ہے۔“

”تو پھر؟“ میں نے آنکھیں نکالیں۔ ”کیا کروں میں؟ اس سلسلے میں ڈی سی صاحب سے ملوں۔“

”کیا بات ہے یار؟ مرچیں چبا کر آئے ہو کیا؟“
 ”تم بات ہی ایسی کر رہے ہو۔ سیدھی سیدھی بات کرو تا کہ میں مطلب بھی سمجھ سکوں۔“
 ”اے سی صاحب بات کو آگے بڑھانے کے موڈ میں ہیں۔ ایکسپلے نیشن کی کاپی تمہاری پرسنل فائل میں لگا دی گئی ہے۔ اگر تمہارا جواب ذرا بھی کمزور ہو تو تمہیں شوکا زدے دیا جائے گا۔ اس کے بعد چارج شیٹ اور پھر معاملہ ٹائیں فٹ۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔
 مجھے اس لمحے اس پر بہت پیار آیا۔ دفتر کے ساتھی عام طور پر اچھے دوست نہیں ہوتے، لیکن وہ اچھا دوست تھا۔ میں نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھپ تھپایا۔ ”اچھا، یہ بات ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ تم دیکھنا، میرا جواب نقشہ ہی بدل دے گا۔“

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ اس وقت ذکیہ نور نے مداخلت کر ڈالی۔ ”کیا جواب دو گے تم؟“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”سارا دن دفتر سے غائب رہنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ سب سے اچھی بات یہی ہے کہ معذرت کر لینا۔“

اس کا جملہ اور لہجہ دونوں اس قدر بیویانہ تھے کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ”اتنا غصہ کیوں کرتی ہو؟“ میں نے بڑے پیار سے کہا۔ ”دفتر ہی سے غائب رہا ہوں، کوئی گھر چھوڑ کر تو نہیں بھاگا ہوں میں۔“

وہ جھینپ کر اپنی فائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یاسین بھی اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ میں نے دراز سے کاغذ نکالا اور وضاحتی خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ گزشتہ روز میں نے حاضری لگائی تھی اور اس کے بعد ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا۔ دفتر میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ چھٹی کے وقت سے بیس منٹ پہلے البتہ میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا تھا۔ اس عرصے میں ایکسپلے نیشن کال لیئر تیار ہو چکا تھا۔ ڈسپنچر ستار نے فوراً ہی مجھے وہ لیئر ریسو کر دیا۔ میں نے وہ سب کچھ ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کیا تھا۔ اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ویسے بھی سرکاری ملازمین اسی قسم کے لیٹرز کے سائے میں پل کر اپنے بال سفید کرتے ہیں۔ میں نے اشتیاق صاحب کے جاری کردہ خط وضاحت طلبی کا مختصر ترین جواب لکھا، نیچے جا کر اس کی فوٹو اسٹیٹ کروائی اور ستار کے پاس جا پہنچا جواب میں نے ستار کی طرف بڑھایا اور فوٹو اسٹیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس پر دستخط کر کے مہر لگا دو۔“

”بہت تیز ہو رہے ہو بلبل بھائی۔“ اس نے مجھے چھیڑا۔ ”اتنی جلدی کا ہے کی..... تین دن میں جواب دینا ہے۔“

”میں زیادہ سسپنس برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

اس نے جواب، فوٹو کاپی پر باضابطہ ریسرو کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں واپس اپنی سیٹ پر آ بیٹھا اور فائل پر جھک گیا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ستار میرا جواب پڑھ رہا ہے۔ جلد ہی میرا جواب سیکشن میں ہاتھوں ہاتھ گردش کرنے لگا۔ گھومتا پھرتا وہ جواب ذکیہ تک آیا۔ ذکیہ اسے پڑھتی رہی۔ میں بڑی بے نیازی سے فائل پر جھکا رہا، جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔ بالاخر وہ جواب پھر ستار کے پاس جا پہنچا۔

”تو یہ احمقانہ جواب دیا ہے تم نے؟“ ذکیہ جھنجھلا کر بولی۔ ”ہونہہ..... پچش کی وجہ سے میں مجبوراً اس بے ضابطگی کا مرتکب ہوا۔“ اس نے میری نقل اتاری۔

اتنے میں یاسین بھی اسی طرف چلا آیا۔ وہ بہت تشویش زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ”یہ کیا جواب دیا ہے تم نے۔“ اس نے مجھے ڈانٹا۔ ”اس سے تو بہتر تھا کہ تم چپ چاپ معذرت کر لیتے۔“

”کیوں کر لیتا معذرت؟ اس سے بہتر جواب ممکن ہی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی وقت ہے اہل بھائی۔“ یاسین نے پر خلوص لہجے میں کہا۔ ”یہ جواب واپس لے کر دوسرا جواب دے دو۔ بس معذرت کر لو۔ یہ نوکری ہے بار۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ میں نے گویا کان پر بھٹکتی ہوئی مکھی اڑائی۔ ”آؤ، میں تمہیں چائے پلاؤں۔“

اسے رضامند پا کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چل رہی ہو تم بھی؟“

میں نے ذکیہ سے پوچھا۔

”جی نہیں، میں سنجیدگی سے ملازمت کر رہی ہوں۔“ اس نے بھنا کر جواب دیا۔

”اچھا، اشتیاق صاحب پوچھیں تو کہنا، میں ٹائلٹ گیا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے یاسین کا ہاتھ تھاما اور گینٹین کی طرف چل دیا۔ چائے پیتے ہوئے بھی یاسین کے دماغ پر میرا جواب سوار رہا۔ پھر جب میں نے تفصیل سے اسے سمجھایا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”تو یہ بات ہے اہل بھائی۔“ اس نے چبک کر کہا۔

”دیکھتے رہو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

واپس سیکشن پہنچے تو پتہ چلا، اشتیاق صاحب نے مجھے طلب کیا ہے۔ میں سیدھا ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ”تم نہیں مانو گے ابوالہول۔“ وہ مجھے دیکھتے ہی پھنکارے۔ ”کہاں گئے تھے؟“

”میں..... میں تو ہاتھ روم گیا ہوا تھا سر۔“ میں نے بے حد معصومیت سے کہا۔ وہ کچھ جھینپ سے گئے۔ ”ہاں، ٹھیک ہے، یہ ایک جگہ ہے، جہاں تم مجھ سے پوچھتے بغیر جاسکتے ہو۔“ انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“

میں واپس چلا آیا اور چھٹی کے وقت تک اسی ایک فائل کا مطالعہ کرتا رہا، جواب سے بہت پہلے مجھے زبانی یاد ہو چکی تھی۔ چھٹی کا وقت ہوتے ہی میں باہر نکل آیا۔ بھوک بہت زور کی لگ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے گھر کا رخ کیا۔ مسکرائیل بہت بور دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں نکالتا ہوا بولا۔ ”مجھ سے اس طرح بیٹھا نہیں جاتا۔“

”تو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ چہل قدمی کر لیا کرو۔“ میں نے نہایت اطمینان سے کہا۔ وہ بری طرح بھنا گیا۔ ”یہ نوکری کرنا ضروری ہے، تمہارے لیے؟“ اس نے پوچھا۔ ”تم ساتھ ہوتے تو ہم گھومتے پھرتے، تفریح کرتے، دنیا دیکھتے۔“

”دیکھو بھائی۔ تمہاری باتوں کے ترتیب وار جواب کچھ یوں ہیں۔ نوکری کرنا بے حد ضروری ہے۔ میں کوئی پستی ریس تو ہوں نہیں کہ بغیر کچھ کمائے آرام سے زندگی گزار سکوں۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت میں تمہارے پاس ہوں۔ ہم گھوم پھر سکتے ہیں، تفریح کر سکتے ہیں۔ رہی دنیا کی بات تو میرے بھائی، میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے، یہ بال چھائوں میں کالے نہیں کیے۔“ میں نے بالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”اور تو سب ٹھیک ہے۔ یہ آخری بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں دنیا دیکھنے سے پہلے نہیں آئے گی۔ ویسے یہ ہمارے ہاں کا ایک جدید محاورہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر چلیں؟“

اچانک مجھے مرزا دہشت یاد آ گیا۔ ”اے یار..... تمہیں شاید یاد نہیں رہا کہ ایک تفریح خود چل کر ہمارے گھر آنے والی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال، وہ ویسے بھی کچھ دیر میں آتا ہے۔ ہم اس کی واپسی سے پہلے گھر لوٹ آئیں گے تاکہ تفریح کی تیاری کر سکیں۔“

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”اچھا..... وہ ناول نویس۔ ہاں، یہ بات تو ہے۔ بس آج کی تفریح منسوج۔ ویسے بھی میں چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک دوسرے کے متعلق مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تم مجھے اپنے متعلق سب کچھ بتا دو عمران بھائی۔“

میں نے بے حد تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔ کہاں تو ابھی بوریت کے مارے مرا جا رہا تھا..... باہر نکلنے اور سیر کرنے کی باتیں کر رہا تھا اور اب گھر میں ٹھہرنے کے درپے ہو گیا۔

کے بعد عالموں سے ان کی لاگ ڈپٹ چلتی رہتی ہے۔
مسکرائیل امرا کے طبقے سے متعلق تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جیسا کہ وہ پہلے
بھی بتا چکا تھا کہ اس کی ایک منگیت بھی تھی، جسے وہ سینگ چھوئے ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتا
تھا۔ وہ سیر و تفریح اور زندگی کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا،
وہ میرے علم میں تھا۔

”تمہارے طبشت حضور کا کیا نام ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”دھائیل..... اور اب وہ یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہمارے خدام یہاں مجھے
تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔“ اس نے جواب دیا۔
”اور تم جب تک غائب ہونے کی صلاحیت حاصل نہ کر لو، اپنے اصلی روپ میں آ بھی
نہیں سکتے؟“

”یہی بات ہے۔ اور میں اپنے اصلی روپ میں واپس آنا بھی نہیں چاہتا۔ تم لوگ میرا
اصلی روپ دیکھ لو تو چیخیں مار کر بے ہوش ہو جاؤ گے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لڑکی..... کیا نام ہے
اس کا..... زیتون، وہ مجھے دیکھ کر بے ہوش ہو جائے۔ مجھے اس سے شدید محبت ہو گئی ہے۔“
”نہیں..... یقین کرو..... کم از کم زیتون تمہارا اصل روپ دیکھ کر بے ہوش نہیں ہو سکتی۔
امکان اس بات کا ہے کہ تمہارا اصل روپ دیکھ کر وہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گی۔ میرا تو خیال
ہے، وہ غلطی سے یہاں پیدا ہو گئی ہے ورنہ وہ تمہارے ہی ہاں کی مخلوق ہے۔“ میں نے بے
خلوص سے کہا۔

مسکرائیل کے چہرے پر پہلے تو تکدر کے آثار نظر آئے..... پھر وہ مسکرانے لگا۔ ”کاش
ایسا ہی ہو۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”اور ہاں، میں تمہاری زبان سیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے فرمائش کی۔
”یہ تو مشکل ہے۔“ مسکرائیل نے جواب دیا۔ ”اردو کے متبادل جناتی الفاظ تو میں تمہیں
وقتاً فوقتاً بتا سکتا ہوں۔ لیکن ہماری زبان کی قواعد بہت سخت ہے۔ میں خود ہی نہیں پڑھ سکا،
تمہیں کیا پڑھاؤں گا۔“

”میں قواعد پڑھنا بھی نہیں چاہتا۔ ہماری اپنی قواعد کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارا نظریہ ہے
کہ مادری زبان، قواعد کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ قواعد ہمارے ہاں زبردست اختلافی
مسئلہ ہے۔ بس تم مجھے مکمل حد تک الفاظ کا کچھ ذخیرہ فراہم کر دینا۔“
”اس نے سر کو تقبیہی جنبش دی اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔
”اب کیا ارادے ہیں؟“

”یار مسکرائیل، تم نے کھانا تو کھالیا ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔ ”بھوک تو نہیں لگ رہی ہے
تمہیں؟“

”میں کھانا کھا چکا ہوں۔“ اس نے سراپا مسکرائیل ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے اس
وقت بھوک بھی نہیں لگ رہی ہے۔“
”کتنی دفعہ کھایا تھا کھانا؟“

”پانچ دفعہ۔ اور ہاں..... ہر بار میں نے ایک نئے ہوٹل کا رخ کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا
کہ میری وجہ سے تم تماشا بن جاؤ۔“

مجھے اس پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ وہ بہت ذہین جن ثابت ہو رہا تھا اور خود غرض بھی نہیں
تھا۔ میں شدید بھوک میں اس کا حال دیکھ چکا تھا۔ ایسے عالم میں کسی دوسرے کی پوزیشن کا
خیال رکھنا یقیناً بڑی بات تھی۔ ”تب تو ٹھیک ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”بس اب تم مجھے اپنے متعلق بتاؤ..... پوری تفصیل کے ساتھ۔“

میں سنجیدگی سے اسے اپنی کہانی سنانے بیٹھ گیا۔ اپنا خاندانی پس منظر، نام کی تاریخ،
نفسوں کی کتاب کا ملنا، دو اے غیب کا نزول اور اس کے بعد کی تمام آفتیں..... غرض میں نے
ہر بات اسے بتادی۔ رہنماں والے معاملے میں وہ مجھ سے کرید کرید کر سوال کرتا رہا۔
”تو اب تم اسے پڑھانے کب جاؤ گے؟“ آخر میں اس نے پوچھا۔

”چلا جاؤں گا۔“ میں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ”ہفتے میں ایک دن کا وعدہ کیا ہے
میں نے۔“

”اور جگا پہلوان اب تم پر جان چھڑکنے لگا ہے؟“
”ہاں..... لیکن میں بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔ خصوصاً رہنماں کے
روپے کی روشنی میں۔“

”خیر چھوڑو، دیکھا جائے گا۔“
”اچھا، اب تم اپنے متعلق بھی تو بتاؤ۔“

”ضرور..... ضرور۔“ اس نے کہا اور اپنی رام کہانی شروع کر دی۔ پہلے اس نے مجھے
جناتی معاشرے کے بارے میں سمجھایا۔ انسانی معاشرے کی طرح وہ بھی طبقات میں منقسم
ہے۔ وہاں تین طبقے ہیں..... ایک حکمران طبقہ..... دوسرا امرا کا طبقہ اور تیسرا خادموں کا طبقہ۔
اس کے علاوہ فطرت کے اعتبار سے جنوں کی دو قسمیں ہیں۔ شریف جن اور شریر جن۔ شریر
جنوں کو وہاں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ انہیں رشتے اول تو ملتے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مایوس
بوکر ہماری دنیا کا رخ کرتے ہیں اور پہلی فرصت میں کسی بھی لڑکی پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ اس

”پروگرام یہ ہے کہ میں اب غائب ہو جاؤں گا۔ تم میرا روپ اختیار کر لینا۔ پھر میں مرزا کی چٹنی بناؤں گا۔ لیکن تم میری آواز اور لہجہ بھی اختیار کر سکو گے؟“

”یقیناً کر سکوں گا۔“ اس نے میری جیسی آواز اور لہجے میں جواب دیا اور میں سشدر رہ گیا۔

ہم تیاری میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ایک ساتھ دو اے غیاب کے دو کپسول نگل لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ عین موقع پر دو ادعا دے جائے۔ مجھے غائب ہونے میں چند منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ادھر مسکرائیل نے میری جگہ لے لی تھی۔

میں آئینے کے سامنے کھڑا چند لمحے آئینے کی چمک دار سطح کو دیکھتا رہا، جو میرا عکس دکھانے سے قاصر تھی۔ پھر میں مسکرائیل کی طرف پلٹا۔ ”تمہیں نظر آ رہا ہوں، میں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم میری نظروں سے نہیں چھپ سکتے۔“ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن اپنی نظروں کو ذرا قابو میں رکھنا۔“ میں نے تاکید کی۔

اچانک خیال آیا کہ میں نے کچھ جلد بازی سے کام لیا ہے اور اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا کہ ابھی ہم نے رات کا کھانا نہیں کھایا ہے۔ مرزا کے آنے کے بعد تو خدا جانے کتنی دیر بعد کھانے کا موقع ملتا۔ مجھے تو خیر زیادہ بھوک نہیں تھی۔ لیکن مسکرائیل نے اظہار کر دیا کہ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ اب یہی ایک صورت تھی کہ وہ جا کر کھانا لے آتا۔ میرا اشارہ پاتے ہی اس نے دیکھی سنبھالی اور باہر کا رخ کیا۔

”پیسے تولیتے جاؤ۔“ میں نے اسے پکارا۔

اس نے جھٹ جبیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی گڈی کی نمائش کر ڈالی۔ میں کھیا کر خاموش ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بے مقصد ادھر ادھر ڈولتا پھرا۔ یونہی الماری ٹولنے لگا۔ الماری میں سیال دوائے غیاب کی شیشی نظر آ گئی۔ وہ کسٹرائل کی بوتل میں تھی۔ میں نے بوتل نکال کر ڈریسر پر رکھ دی۔ کسی ہنگامی ضرورت کے وقت وہ بھی کام آ سکتی تھی۔ پھر میں کچن سے پلیٹیں نکال لایا۔ اتنی دیر میں مسکرائیل لدا پھندا واپس آ گیا۔ وہ کھانے کا اتنا سامان لے آیا تھا، جس سے کم از کم دس افراد کی دعوت کی جاسکتی تھی۔ اس نے روٹیاں اور سالن کی دیکھی میز پر رکھی اور بے صبری سے بولا۔ ”چلو اب شروع ہو جاؤ۔“

میں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکالا۔ اس نے اپنی پلیٹ پوری طرح بھر لی۔

”دیکھی ہی میں کھا لوں۔“ میں نے مشورہ دیا۔ لیکن اس وقت اسے کھانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ وہ بری طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔

میں نے ابھی دو تین لقمے ہی لیے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے گھڑی پر نظر الی۔ آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ ”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ میں نے کہا۔ ”میرا کھانا تو لیا۔ کم بخت ہمیشہ غلط وقت پر آتا ہے۔“

”ان اللہ مع الصابرین۔“ مسکرائیل نے نوالا نگلتے ہوئے بے حد خلوص سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو مرزا دہشت بیگ اس کے ساتھ تھا۔ اس کے نتھنے بڑک رہے تھے۔ اب میری بہتری اسی میں تھی کہ کرسی چھوڑ دیتا اور ساتھ میں کھانا بھی.....

”واہ..... خوب وقت پر آیا ہوں، میں۔“ مرزا نے چبکتے ہوئے کہا اور میری سیٹ پر شریف رکھ لی۔ پھر وہ بری طرح چونک پڑا۔ ”ہائیں..... کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں نیرت تھی۔ ”یہاں بیٹھ کر کون کھا رہا تھا؟“

”م..... میرا مطلب ہے، اسماعیل تھے۔ اچانک کوئی کام یاد آ گیا۔ اٹھ کر چلے گئے۔“ مسکرائیل نے بات بنائی۔

”لیکن کرسی تو اب بھی گرم ہے؟“ مرزا نے کے لہجے سے شک جھلک رہا تھا۔ ”کمال ہے، باہر بھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”یار، تم آدمی ہو یا شرلاک ہو مز۔“ مسکرائیل نے خالصتا میرے انداز میں چڑچڑے بن کا مظاہرہ کیا۔

”ممکن ہے، وہ دوسری طرف چلا گیا ہو۔ بہر حال، کھانا چاہو تو شروع کرو، نہیں تو تفتیش کرتے رہو۔“

اب بات ایسی آن پڑی تھی کہ مرزا تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔ کھانے کو بہر حال اولیت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ کھانے پر پل پڑا۔ میں اسے کھاتے دیکھ کر دل ہی دل میں جھلتا رہا۔ وہ کم بخت ہر بار ایسے ہی موقعوں پر نازل ہوتا تھا اور میرے حصے کا بیشتر کھانا چٹ کر جاتا تھا۔ لیکن آج تو ستم کی حد ہو گئی تھی۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے میرے حصے کا کھانا کھائے جا رہا تھا اور میں ہاتھ بڑھا کر ایک لقمہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ بہر حال، یہ بات طے تھی کہ وہ کھانا اسے قیامت تک ہضم نہیں ہو سکتا تھا۔ ادھر مسکرائیل کھانے کی طرف یوں متوجہ ہو گیا تھا، جیسے وہاں کوئی اور موجود ہی نہ ہو۔ جب کہ مرزا عام طور پر کھانا کھاتے ہوئے زمینوں کے حسن شورزدہ پر بھرہ ضروری سمجھتا تھا۔ اس موقع پر بھی وہ باز نہ رہ سکا۔ ”کیا بات ہے نکمین ڈش.....“ وہ منہ چلاتے ہوئے بولا۔ ”میری توجان جاتی ہے.....“

مسکرائیل کھانے میں اس قدر مصروف تھا کہ محض غاؤں غاؤں کر کے رہ گیا۔ ویسے بھی بات شاید اس کے پلے نہیں پڑی تھی، ورنہ ممکن تھا کہ رقابت کے زیر اثر وہ سر پھٹول پر آمادہ

ہو جاتا۔ مرزا کے لیے خاموشی خلاف توقع تھی، کیونکہ اس کے نزدیک وہ ابو العمران تھا۔ اس کا ہاتھ اور چہرہ چڑھ کر تانہ دونوں بیک وقت رک گئے۔ اس نے حیرت سے مسکرائیل یعنی اپنے تئیں اس خاکسار کی طرف دیکھا۔ اچانک ہی اسے پہلی بار وہاں بہت سی غیر معمولی باتوں کا ادراک ہوا کیونکہ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آئے۔

”یہ امران بھائی، نصیب دشمنان، تمہاری طبیعت تو ناساز نہیں۔“ اس نے پوچھا۔
جواب میں مسکرائیل نے اسے گھور کر دیکھا۔ لیکن منہ بدستور چلاتا رہا۔ ”خیامطلب؟“
”یہ اتنا بہت سارا کھانا..... اور پھر کھانے کے ساتھ تمہارا یہ جارحانہ سلوک..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کل تو میں تمہیں اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”بخواس مت خرو۔ خانہ خاتے رہو۔“ مسکرائیل نے غرا کر کہا۔
”نہیں یا کوئی گزبر ضرور ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے کچھ لوگوں کی دعوت کی تھی۔ پھر انہوں نے تمہارا بایکٹ کر دیا۔ تم اُن پر آیا ہوا غصہ اتارنے کے لیے اور اپنا پیرو وصول کرنے کے لیے، کھانے پر پل پڑے ہو۔ کمزور آدمی کا غصہ ایسا ہی ہوتا ہے۔“
اس بار مسکرائیل لقمہ حلق سے اتار کر فارغ ہو چکا تھا۔ آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔
”پھر دکھاؤں تمہیں کمزوری والا غصہ؟“

مرزا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ خود میں بھی حیران رہ گیا۔ وہ جملہ مسکرائیل نے اپنے لہجے میں ادا کیا تھا۔ میں نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا، تب شاید اسے یاد آیا کہ وہ اس وقت ابو العمران کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی دانت نکال دیے اور میرے انداز میں بولا۔ ”ڈر گئے نا، مرزا! چھوڑو یا رکھنا کھاؤ۔ اس وقت تو تم نے واقعی میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔“
مرزا مطمئن نہ ہو سکا۔ تاہم کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بار بار کن آنکھوں سے مسکرائیل کی طرف بھی دیکھتا رہا جو دنیا دماغ سے بے خبر ہو کر صرف کھانے کا ہو کر رہ گیا۔

میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ چنانچہ وہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کھانے کا وہ ڈبل پروگرام آسانی سے ختم ہونے والا نہیں۔ میں انہیں کھاتے دیکھ کر سوائے اپنا خون جلانے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ یہ اطمینان ضرور تھا کہ آج مرزا دہشت بیگ کی خبر لیتے ہوئے مرزا آجائے گا۔

وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو سالن کی دیگی خالی ہو چکی تھی اور روٹیوں کا بھی صفایا ہو گیا تھا۔ پیٹ بھرنے کے بعد مرزا کی رکی ہوئی طبیعت کچھ رواں ہو گئی۔

”عمران بھائی..... روٹیاں کتنی لائے تھے؟“

اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”بیس تھیں۔“ مسکرائیل نے سادگی سے جواب دیا۔
”گویا تم ساڑھے انیس روٹیاں کھا گئے۔ عمران بھائی، میری مانو تو کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ تمہارے پیٹ میں یقیناً کچھ بے ہو گئے ہیں۔“
”کیچوے؟“ مسکرائیل نے بمشکل ابکاٹی روکتے ہوئے کہا۔ ”گندی باتیں مت کرو۔ کھانے کا مزہ خراب کر دیا، تم نے۔“

”اچھا..... گاجر کے حلوے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”گاجر کا حلوہ!!“ مسکرائیل حیران نظر آنے لگا۔

”دیکھو عمران بھائی، بنو نہیں۔ تم خوب جانتے ہو کہ میں کس کے متعلق بات کر رہا ہوں۔“ مرزا دہشت نے بے حد ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے بڑی مشکوک نگاہوں سے مسکرائیل کو دیکھا۔ ”کہیں یہ تجاہل عارفانہ کسی چکر کی وجہ سے تو نہیں۔ کہیں وہ قاتل نگاہیں تمہارے دل میں بھی ترازو تو نہیں کر گئیں۔ کہیں وہ حسن شب و بچور تمہاری روشنی گزیدہ ہستی کا مقدر تو نہیں جگا گیا.....“ مرزا ڈرامائی انداز میں مکالے بولے جارہا تھا اور مسکرائیل کا حیرت سے کھلا ہوا منہ ہر مکالے کے ساتھ کچھ اور کھلتا جارہا تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ مرزا کی تقریر جاری تھی..... ذکر اس پریش کا، اور پھر بیان اپنا۔ گویا میری نثر نگاری..... میرے زور بیان نے مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیا ہے۔ بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا۔ لیکن عمران بھائی، میری محبت، راستے کی ہر رکاوٹ کو پھلانگ جائے گی۔ اب اس کے بغیر میری وہ حالت، جو ماضی بے آب کی ہوتی ہے، جو لیل بے ہوا کی ہوتی ہے، جو فیل بے خاک کی ہوتی ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ کل رات میں نے کس طرح کاٹی ہے اور کل رات نے مجھے کس طرح کاٹا ہے۔ عمران بھائی، مجھ پر رحم کرو.....“ مرزا، مسکرائیل کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ”اب مجبوراً زل کو وصل مستقل سے شاد کرو۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔“

میرے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ کم بخت مسکرائیل سے وصال طلب کر رہا تھا اور وہ بے چارہ بے خبر تھا۔ مرزا نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ ایک بات طے تھی کہ مسکرائیل کے ذخیرہ الفاظ میں بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ یوں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا جیسے سو گیا ہو۔ مرزا اپنی ہانکے جارہا تھا اور مسکرائیل ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

بالآخر مرزا نے مسکرائیل کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ”پلیز..... عمران بھائی، میری اس سے شادی کراؤ۔“

مسکرائیل اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے پولٹری فارمنگ کا کوئی شوق نہیں۔ میرا مطلب

ہے، میں نے کوئی شادی دفتر تو نہیں کھول رکھا ہے۔“ انے جواب دیا۔

مرزا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے۔ تب پھر مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ارے ہاں..... وہ طمطر اقل کہاں ہے۔ اسے بلاؤ نا۔“ اس نے فرمائش کی۔

”بلاؤ نا کیا..... وہ تو یہیں موجود ہوگا۔“ مسکرائیل نے جواب دیا۔ ”تم اپنا سامان نکالو۔“

مرزا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ چیزیں نکالنا شروع کر دیں۔ چند لمے بعد مسکرائیل ہی نہیں، میں بھی حیران رہ گیا۔ مرزا نے پہلے تو جیب سے وہ کرچھا نکالا، جس میں لوہان وغیرہ سلگا یا جاتا ہے۔ پھر اگر بتی کا ایک پیکٹ برآمد ہوا۔ اس کے بعد موٹی تازی سی ایک پڑیا اور آخر میں ایک بڑی ساری بوتل..... اس کے کوٹ کی جیب بلاشبہ عمدہ عیار کی زنبیل کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی اس کی جیبوں میں اور بھی بہت کچھ ہوگا۔

مرزا نے بوتل فرش پر رکھ کر مسکرائیل کی طرف دیکھا اور جھینپے ہوئے انداز میں بولا۔ ”احتیاطاً بڑی بوتل لے آیا ہوں۔ دراصل جن کے ساز کا علم نہیں ہے نا۔ معلوم نہیں کتنا بڑا جن ہو اور کتنا دھواں بنے۔ کچھ دھواں باہر رہ گیا تو جن بھی نامکمل رہ جائے گا۔“

مسکرائیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے جھنجھلا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے پھر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

مرزا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سرخ چاک کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ کچھ ناپ تول اور بیشتر ناک بھوں کے ذریعے غور و فکر کر کے اس نے ایک میٹر ہا میٹر ہا سادارہ بنا ڈالا۔ پھر پڑیا کھولی، جیب سے باجس اور کچھ کونلہ نکالا۔ کونلہ کرچھے میں ڈال کر اس نے مسکرائیل سے مٹی کا تیل طلب کیا۔ لیکن مٹی کا تیل گھر میں موجود نہیں تھا۔ مجبوراً اس نے پرانے اخبار استعمال کئے۔

کونلہ دیکھنے لگے تو مرزا نے کرچھا دائرے میں رکھ دیا۔ بخورات کی پڑیا بھی دائرے میں پہنچ گئی۔ اب مرزا نے جیب سے اگر گردان نکالا، اگر بتیاں سلگا کر اس میں لگا میں۔ پھر اس نے اگر گردان اور بڑی بوتل بھی دائرے میں رکھ دی۔

”اب میں عمل شروع کرنے والا ہوں۔“ اس نے مسکرائیل سے کہا۔ ”کوئی ایسی ویسی بات ہو تو تم نہ گھبرانا۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اور ہاں..... وہ جن اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟“

”اس وقت تک عام طور پر سو جاتا ہے۔“ مسکرائیل نے جواب دیا۔

”اس کی موجودگی کی کسی طرح تصدیق نہیں ہو سکتی؟ دراصل عمل کی کامیابی کے لیے جن کا مخصوص حد میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کسی طرح پتہ چلاؤ نایار۔“

”یہ تو ممکن نہیں۔“ مسکرائیل بولا۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ میں اب عمل شروع کر رہا ہوں۔ عمل کے دوران مجھے مخاطب نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر وہ بھی حصار میں چلا گیا۔ پھر اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے بخورات کرچھے میں پڑے ہوئے دیکھتے اور سلگتے کونلوں پر ڈالنے شروع کر دیے۔ چند ہی لمحوں میں کمرہ خوشبودار دھوئیں سے بھر گیا۔ عجیب پر اسرار سا ماحول ہو گیا تھا۔ اب تو میں بھی گھبراہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ دھواں خوشبودار ہونے کے باوجود ناگوار گزر رہا تھا۔ اچانک مجھے پہلی جھینک آئی اور پھر تو چھینکوں کا تانتا بندھ گیا۔

مرزا بری طرح چونک پڑا۔ ”گویا جن واقعی موجود ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”وہ اگر سو بھی رہا تھا تو اب جاگ گیا ہے۔ چھینکوں سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ اب میرا کام دشوار اور خطرناک ہو گیا ہے۔ آخر چھینکیں کیوں آنے لگیں اسے؟“

”ممکن ہے، خوشبو سے الرجک ہو۔“ مسکرائیل نے تبصرہ کیا۔

میں ان کی باتیں تو سن رہا تھا، لیکن اپنی چھینکوں پر قابو پانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ دیر تک میں چھینکتا رہا۔ پھر شاید مجھ میں چھینکنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ میں ایک دم مضطرب ہو کر رہ گیا۔

”کاش..... میں اس کی نیند کے دوران عمل کر سکا ہوتا۔“ مرزا نے بڑی حسرت سے کہا۔

”خیر..... اللہ مالک ہے۔ اچھا عمران بھائی، اب میں عمل شروع کر رہا ہوں۔“

عمران بھائی، نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔

مرزا نے جھوم جھوم کر کسی اجنبی زبان میں وظیفہ شروع کر دیا۔ ابھی اسے وظیفہ شروع کیے ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مسکرائیل نے مشورہ طلب انداز میں میری طرف دیکھا۔ مرزا بدستور وظیفے میں مصروف تھا۔ میں تیزی سے مسکرائیل کی طرف بڑھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر آنگن میں لے گیا۔ ”سنو دوست..... اب تم میری جگہ نہ بولنا۔“

میں نے اسے سمجھایا۔ ”البتہ میں بولوں تو اس کے مطابق ہونٹ ہلانے کی کوشش کرنا۔ فلموں میں یہ چیز ڈنگ کہلاتی ہے اور اکثر پکڑ لی جاتی ہے۔ لیکن یہاں امکان ہے کہ کام چل جائے گا۔ اور ہاں..... اب میں تمہارے پیچھے ہی کھڑا ہوں گا۔ جاؤ اب دروازہ کھول دو۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ خدا جانے، اس عجیب و غریب صورت حال میں کون مداخلت کرنے نازل ہوا تھا۔ اسے باہر ہی سے نر خدا دینا بہتر تھا۔ لیکن دروازہ کھلنے کے بعد جو صورت دکھائی دی، وہ آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔ وہ سلطان تھا۔ اس نے مسکرائیل کو زور

دارسلام سے نوازتے ہوئے اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔ پھر وہ نہ صرف اندر گھس آیا بلکہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مسکرائیل نے دروازہ بند کیا اور پیچھے پیچھے چل دیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ اب مسکرائیل کا ایک نیا امتحان شروع ہونے والا تھا۔

میں مسکرائیل کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ سلطان حیرت سے مرزا دہشت بیگ کو دیکھے جا رہا تھا۔

”سلطان بھائی..... تم کیسے آئے؟“ میں نے پوچھا۔ مسکرائیل نے ہونٹ ہلائے۔ سلطان چونک کر مسکرائیل کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے سے ناگواری مترشح تھی۔ ”میں نے سوچا، پیر بھائی سے مل لوں۔ لگتا ہے کہ تم سے ملے برسوں ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ کیا تماشا ہے؟“ اس نے مرزا کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ جن کو بوتل میں بند کرنے کا عمل کر رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ سلطان کے چہرے پر زلزلے کے سے اثرات نظر آنے لگے۔ ”کیا جکتے ہو؟ کہاں ہے جن؟“

”ادب سے بات کرو۔ تمہیں طمطراقیل کا ذرا بھی لحاظ نہیں۔“
”طمطراق..... کک..... کیا مطلب۔ کیا یہ جن بادشاہ کو بوتل میں بند کرنا چاہتا ہے۔“
”ہاں..... اس کا ارادہ تو یہی ہے۔“

”میں..... میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ جن بادشاہ اور بوتل میں! غضب خدا کا، میں تو خون پی جاؤں گا اس کا۔“
میرے اشارے پر مسکرائیل نے سلطان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”صبر سے کام لو پیر بھائی۔“
میں نے سلطان کو مشورہ دیا۔
”لعنت ہو تم پر ابو العمران۔ تم اپنے گھر میں یہ حرکتیں کرو رہے ہو۔ جن بادشاہ کے خلاف۔“

”یہ اس کا اور طمطراقیل کا آپس کا معاملہ ہے۔“ میں نے کہا۔
مرزا کی بد بدعاہٹ بھی بند ہو گئی تھی اور آنکھیں بھی کھل گئی تھیں۔ اب وہ سلطان کو خوف زدہ لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا، جو آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ ”یہ ان کا آپس کا معاملہ تمہارے لیے ہو گا۔“ وہ دھاڑا۔ ”میرے نزدیک تو یہ پولیس کیس ہے۔ میں اسے ابھی گرفتار کروں گا۔“
”مم..... میری بھی تو سنیے عالی جناب۔“ مرزا، وظیفہ بھول کر ہکھلنے لگا۔ ”مم..... میں تو.....“

”تمہاری تو میں تھانے پہنچ کر خبر لوں گا۔“ سلطان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”میرا

وعدہ ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے اس بوتل میں اتار دوں گا..... اور یاد رکھو، تم دھوکے میں تبدیل ہوئے بغیر اس بوتل میں اترو گے۔“

مرزا دہشت کی واضح طور پر کھل گئی۔ وہ بری طرح لرزنے لگا۔ اس نے رحم طلب نظروں سے مسکرائیل کی طرف دیکھا۔

اب میرے لیے طمطراقیل کی حیثیت سے مداخلت کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ سلطان کو قابو میں رکھنے کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔ میں نے آواز بھاری بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”سلطان، تمہیں اس معاملے میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے یہ اجازت میں نے دی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کتنا بڑا عامل ہے۔“

سلطان بوکھلا کر کورنش بجالایا۔ ”عالی مرتبت جن بادشاہ۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ یہ سب کچھ میرے علم میں نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے، اب تم صرف تماشا دیکھو۔ اس ناول نگار کی خبر میں خود لوں گا۔“
مرزا کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ جن اور انسپکٹر سلطان دونوں کی دھمکیاں اس کے لیے ایک جیسی لرزہ خیز تھیں۔ وہ بری طرح گڑگڑانے لگا۔
”لیکن اس شخص کی طرف سے میرا دل برا ہو گیا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”یہ زیادتی ہے جن حضور۔ مجھے صفائی کا موقع تو ملنا چاہیے۔ تو بہ..... تو بہ۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار سینے لگا۔ ”میری یہ مجال..... میں آپ کو بوتل میں بند کروں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عمل تو مجھے میرے دادا زاد بھائی نے بتایا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دراصل یہ عمل ہمارے سگدادا کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ ہمارے سگدادا نے اس عمل کے ذریعے ایک جن کو بوتل میں بند کر لیا تھا لیکن بالآخر ان کی موت اسی جن کے ہاتھوں ہوئی۔ جن نے موقع پاتے ہی انہیں دھلے ہوئے کپڑے کی طرح نچوڑا اور پھر گنتی پر لٹکا دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ عمل فراڈ ہے۔ لیکن میں اپنے دادا زاد بھائی کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے..... وہ ہچکچانے لگا۔

”جلدی سے بات پوری کرو۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔
”میں نے سوچا، اگر دھپیل لگ گئی اور آپ پھنس ہی گئے تو آپ سے ایک چھوٹا سا کام کروالوں گا اور بس۔“ مرزا نے مرے مرے لہجے میں بتایا۔

سلطان مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”میں تیرا.....“
”تم خاموش رہو سلطان۔“ میں نے سلطان کو ڈانٹ دیا۔ ”ہاں تو مرزا دہشت بیگ۔“

میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔“ میں نے شاہانہ انداز میں کہا۔

”نہیں جناب..... اب تو میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ آپ بہت عالی ظرف جن ہیں۔“
 ”بکواس مت کرو۔“ میں نے اسے ڈپٹے ہوئے کہا۔ ”اب تمہاری بچت کی یہی صورت ہے۔ تمہیں یہ عمل مکمل کرنا ہوگا۔“

”آ..... آ..... آپ خفا تو نہیں ہوں گے؟“

”جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اور سلطان تم خاموشی سے بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہو۔“

ان دونوں نے فوری طور پر میرے حکم کی تعمیل کی۔ سلطان میرے بیڈ پر بیٹھ گیا اور مرزا نے وہی ناقابل فہم وظیفہ شروع کر دیا۔ مسکرائیل کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بے حد ہیزار دکھائی دے رہا تھا اور مجھے بڑی شاک نگاہوں سے دکھ رہا تھا۔ اس کے لیے وہ صورت حال غالباً بہت زیادہ عبرتناک ہوگی۔ وہ جن ہو کر بھی غائب ہونے کی صلاحیت سے محروم تھا، جب کہ میں بشر ہو کر دوائے غیاب کے زور پر جن بنا بیٹھا تھا۔

اس بار مرزا نے آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ وہ وظیفہ بھی پڑھے جا رہا تھا اور باری باری سلطان اور ابوالعمران یعنی مسکرائیل کو بھی دیکھے جا رہا تھا۔ میں محض اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے وظیفہ جاری رکھے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ پھر اچانک ہی میری نظر مسکرائیل پر پڑی اور میں چونکا ہوا گیا۔ مسکرائیل اس وقت اپنے آپے میں نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے پر شدید کرب کے تاثرات تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ باطنی طور پر کسی خوفناک اذیت سے گزر رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس کی یہ کیفیت نہ صرف سلطان نے بلکہ مرزا دہشت نے بھی دیکھ لی تھی۔

پہنچے۔ وہ بہت حیران نظر آیا، پھر اچانک اس کی آنکھوں میں معنی خیز شیطانی چمک لہرائی۔ اس کے بعد اس کی آواز بلند ہو گئی اور وظیفہ پڑھتے ہوئے اس کے جوش و خروش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ مجھے بڑی سنگین گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ اب مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

”کیا بات ہے پیر بھائی۔“ سلطان نے مسکرائیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

مسکرائیل کے ہونٹ تو ہلے لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔ اس کے بدن کا لرزہ بڑھ گیا تھا۔ ادھر مرزا دہشت بیگ بھی وظیفہ پڑھتے ہوئے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ سلطان کی چہرے پر گہری تشویش کے تاثرات تھے۔ کمرے کا ماحول بہت عجیب سا ہو گیا تھا۔

بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں تیزی سے بڑھا، حصار میں داخل ہوا اور مرزا کی گردن دیوچ لی۔ مرزا دہشت کے مارے ساکت ہو گیا۔ وہ وظیفہ بڑھنا بھی بھول گیا۔ اس کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ وہ گردن چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن تھامے تھامے مسکرائیل کی طرف دیکھا۔ اب اس کی حالت معمول پر آ گئی تھی۔ وہ بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔ چہرے سے خوف مترشح تھا۔

اچانک مجھے حصار کے اندر کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود مجھے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سے خوف کی کیفیت میں، میں نے مرزا کی گردن چھوڑ دی اور تیزی سے حصار سے باہر نکل آیا۔ اسی وقت کسی ان دیکھی قوت نے مرزا دہشت کو اٹھا کر دیواری کی طرف پھینک دیا۔ میں نے تو بس مرزا کو از خود اڑ کر دیوار سے ٹکراتے دیکھا۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ دھپ سے فرش پر گر ا اور ایسے لمبا لمبا لٹ گیا، جیسے انتقال کر گیا ہو۔ میرا اپنا بدن بری طرح لرز کر رہ گیا۔ خوف کے مارے میرا برا حال تھا۔ مسکرائیل اور سلطان اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔

”دیکھو..... کہیں مرنے تو نہیں گیا۔“ بالآخر مسکرائیل نے خاموشی کا طلسم توڑا۔

”کاش مرہی گیا ہو۔“ سلطان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، لیکن وہ مرزا دہشت کی طرف بڑھ گیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے مرزا کی نبض دیکھی اور پھر سوگوار لہجے میں بولا ”زندہ ہے۔“

اس کی مایوسی دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”ہنس لو، جن بادشاہ، ہنس لو۔“ سلطان نے میری طرف منہ کرتے ہوئے بڑے درد ناک لہجے میں کہا۔

”کاش تم نے قوم کو اس لپاڑیے ناول نویس سے نجات دلادی ہوتی۔ یہ تو دھرتی کا بوجھ ہے جن بادشاہ۔“

”چلو..... اب اس پر چھڑکاؤ کرو تا کہ یہ ہوش میں آئے۔“ میں نے حکم دیا۔

”جو حکم جن بادشاہ کا۔“ سلطان نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے حکم پر تو ہم مردے بھی نہلا سکتے ہیں۔“

مجھے پھر ہنسی آ گئی اور وہ بے حد خوش نظر آنے لگا۔ پھر وہ پانی لینے کے لیے چلا گیا۔ میں نے مسکرائیل کی طرف دیکھا۔ اس سے بات کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا، لیکن اس کی سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر میں قدرے مطمئن ہو گیا۔

کمرے کی طرف چل دیا۔ اندر سلطان اور مرزا کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ”آؤ..... پیر بھائی“ میں اس نامعقول ناول نگار کو سمجھا رہا تھا کہ تو بین جنات کی بڑی کڑی سزا ملتی ہے۔“ سلطان نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں حاضر ہو چکا ہوں۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ دل و دماغ سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

”کیا بات ہوتی ہے جناب کی۔“ سلطان نے چالپوسی کے انداز میں کہا۔ ”وہ چاہیں تو انسانی روپ اختیار کر لیں۔ طبیعت کے بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے دیکھو..... میں جن بادشاہ کا کتنا معتقد ہوں۔ وہ کہیں تو جان نکال کر تھیلی پر رکھ دوں۔“

اصولاً مجھے اتنا سن کر ہی کھٹک جانا چاہیے تھا، لیکن میں بے حد اعصاب شکن مراحل سے گزر کر یلکھت پر سکون ہوا تھا، اس لیے اس کی تقریر کی معنویت سے آگاہ نہ ہو سکا مجھے تو اس وقت ہر طرف ہر انہی ہر نظر آ رہا تھا۔

”طمطر ائیل بے حد شریف النفس اور نیک طبیعت جن ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”بے شک..... بے شک۔“ سلطان جھومنے لگا۔ ”لیکن پیر بھائی، تم جن بادشاہ سے کتنے بے تکلف ہو۔ لگتا ہے، گہرے دوست ہو اس کے۔ واللہ مجھے تو تم پر رشک آنے لگا ہے۔“
 کیا بات ہے تمہاری۔ میں تو تمہارا بھی معتقد ہوں۔“

”ہونا بھی چاہیے۔“ مرزا دہشت نے بڑے خلوص سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں ابھی نفاہت تھی، لیکن مجھے اس بات پر کچھ حیرت ہوئی کہ خلاف معمول سلطان نے اسے ڈانٹا نہیں۔

”بھئی، مجھے تو تم لوگ معاف ہی رکھو۔“ میں نے بے حد انکسار سے کہا۔
 ”ارے پیر بھائی، کبھی تو ہم لوگوں کو خدمت کا موقع دیا کرو۔“ سلطان کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

”اچھا..... اب رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ کیا تم لوگ یہیں بسیرا کرو گے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”یہ میرا گھر ہے، کوئی سرائے نہیں ہے۔“

وہ دونوں ہی ہنسی کرنے لگے، لیکن اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔ شاید مسکرائیل، اسماعیل بن کرواپس آ گیا تھا۔ میں تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے کندھی گرائی اور دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی زیتون اندر گھر آئی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔

”خدا کے لیے..... زیتون، اس وقت میرے گھر میں مہمان موجود ہیں۔“ میں نے گڑگڑاتے ہوئے اس سے رحم کی اپیل کی۔

سلطان پانی لے کر آیا اور مرزا کے قریب بیٹھ کر اس کے منہ پر چھینے دینے لگا۔ ”کاش، میرے پاس پانی کی جگہ تیزاب ہوتا۔“ ساتھ ہی ساتھ وہ حسرت بھرے لہجے میں بڑبڑایا۔ کچھ دیر بعد مرزا کسمسایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں، لیکن آنکھیں کھولتے ہی اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔

”بس..... اب پھر بے ہوش نہ ہو جانا۔ ورنہ جان سے مار دوں گا۔“ سلطان غرایا، مسکرائیل بھی ان کی طرف بڑھ گیا۔

سلطان کا نادر شاہی حکم سن کر مرزا نے مکرر بے ہوش ہونے کا یقینی پروگرام ملتوی کر دیا اور کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”ہوا کیا تھا؟“ مسکرائیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

مرزا نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا، جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ ”تم مت چھو نا مجھے۔“ وہ ہسٹریائی انداز میں چلایا۔ ”مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ تم جن ہو، ہاں، میں جانتا ہوں، تم جن ہو۔“

مسکرائیل ششدر رہ گیا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ سلطان نے مرزا پر آنکھیں نکالیں۔ ”تمہارا دماغ الٹ گیا ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ مرزا کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ”میرے عمل کا اثر اس پر ہو رہا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ.....“

”میں کہتا ہوں، بکواس بند کرو۔“ سلطان نے اسے ڈانٹا لیکن اب وہ مسکرائیل کی طرف شک آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکرائیل کو آنگن میں چلنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل آیا۔

”میرا سر چکر رہا ہے۔“ مسکرائیل کی آواز سنائی دی۔ ”ذرا آنگن میں ٹہل لوں۔“

”ضرور پیر بھائی ضرور۔“ سلطان نے لہک کر جواب دیا۔ میں اتنی دیر میں دوائے غیاب کے دو کپسول حلق سے اتار چکا تھا۔ مسکرائیل کمرے سے نکل کر میری طرف چلا آیا۔ ”اب تم تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے کھسک لو۔“ میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ ”پانچ منٹ بعد آ جانا اور ہاں..... اپنی صورت بھی بدل لو۔ میں حاضر ہونے والا ہوں۔“

میں نے کہنے کے تو یہ بات کہہ دی تھی۔ لیکن جانتا تھا کہ حاضر ہونا میرے اختیار میں نہیں..... بلکہ دوا کے اختیار میں ہے۔ ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے دروازہ کھولا اور مسکرائیل کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر میں دوا سے رحم کی اپیلیں کرتا ہوا

اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے دیوتا کوچ کر گئے۔ وہ سلطان تھا۔ شاید وہ میری لاعلمی میں میرے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا تھا۔ ”باتیں اندر چل کر کر لینا۔“ سلطان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
 ”یہ..... یہ کون ہے؟“ زیتون نے گہرا کر مجھ سے پوچھا۔ ”میں..... میں اب گھر جاؤں گی۔“

”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔“ سلطان نے بارعب لہجے میں کہا۔ ”ابھی تم گھر نہیں جاسکتیں۔ اندر چلو۔ آج میں یہ معاملہ بھی نمٹا ہی دوں۔ چلو پیر بھائی۔“ اس نے مجھے ہٹا دیا۔
 زیتون مرے مرے قدموں سے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ ”چلو پیر بھائی۔“ سلطان نے دہرایا۔
 ”دیکھو پیر بھائی، تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔
 ”ممکن ہے، ایسا ہی ہو۔ تم اندر تو چلو۔“

اسی وقت دروازہ دھڑ سے کھلا اور مسکرائیل اندر آ گیا۔ ”کیا باتیں ہو رہی ہیں یہاں؟“ اس نے پوچھا لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس روز میرا گھر باشوا ڈیوریم کا اسٹیج بن کر رہ گیا تھا۔ عجیب ڈراما ہو رہا تھا۔ ہم تینوں کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ پہلا ایکٹ شروع ہو چکا ہے۔
 ”میں منہ نوچ لوں گی تمہارا۔“ زیتون کی آواز سنائی دی۔
 ”کاش..... میں اپنا منہ علیحدہ کر کے تمہاری خدمت میں پیش کرنے کی قدرت رکھتا۔“ مرزا دہشت نے حسرت بھرے لہجے میں جواب دیا تھا۔
 زیتون ابھی جواب دینے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ہم لوگ کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔ ”میں نے کل ہی کہا تھا نا کہ اپنے اس عجیب الخلق دوست کو سمجھا لو ورنہ کسی دن.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
 میں بری طرح گڑ بڑایا ہوا تھا، جواب کیا دیتا۔ بس مرزا کو گھور کر رہ گیا۔

”کیا قصہ ہے یہ؟“ سلطان نے نہ جانے کس سے پوچھا۔
 ”قصہ وہی پرانا ہے۔ انسپکٹر صاحب۔“ مرزا نے دردناک لہجے میں کہا۔ ”لڑکیوں میں نہ جانے تضاد کیوں ہوتا ہے۔ بظاہر لڑتی ہیں، باطن مرتی ہیں۔ بس یہی حال یہاں بھی ہے۔“ اس نے زیتون کی طرف اشارہ کیا اور پھر اسی سے مخاطب ہو گیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم کبھی میرے بغیر اسی طرح بے کل رہتی ہو.....“
 میں نے بوکھلا کر مسکرائیل کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے

چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر گویا اسٹیج کی طرف، دوبارہ متوجہ ہو گیا۔

”میں سچ مچ منہ نوچ لوں گی تمہارا۔“ زیتون غرائی۔
 ”یعنی زخم لگاؤ گی۔ کوئی حرج نہیں..... بشرطیکہ ان زخموں پر اپنے آبنوی حسن کا بے حساب نمک بھی چھڑکے کا وعدہ کرو..... اے دوشیزہ ڈیوریم نمکدان۔“
 ”تم آستین کا خنجر ہو۔ تمہیں اپنے دوست کی عزت کا بھی خیال نہیں۔“ زیتون میری طرف اشارہ کرتے ہوئے غرائی۔

”پلیز..... زیتون، مجھے ان معاملات سے الگ.....“ میں نے اپیل کرنا چاہی۔
 ”بس پیر بھائی، خاموش رہو۔“ سلطان نے میری بات کاٹ دی۔ ”اور تم دونوں بھی چپ ہو جاؤ۔“ اس نے بھری ہوئی زیتون اور سراپا عشق مرزا کو ڈانٹا۔ ”مجھے یہ بات پوری طرح سمجھنے دو۔ ہاں..... لڑکی کیا تم پہلی بار یہاں آئی ہو؟“ اس نے زیتون سے پوچھا۔
 ”نہیں..... پہلے بھی آتی رہی ہوں۔“

سلطان نے سخت نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس سے پوچھا۔ ”اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتی تھی ابو جی سے کہ اگر موقع ہو تو آج گھڑی لے آؤں۔“
 ”میری بھی تو.....“ میں نے احتجاج کرنا چاہا۔
 ”سن لوں گا تمہاری بھی۔ پہلے مجھے صورت حال سمجھنے دو۔“ سلطان نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ ”ابو جی کس کو کہہ رہی ہو؟“
 ”انہیں۔“ زیتون نے میری طرف اشارہ کیا۔
 ”ابو جی کہتی ہو..... اور یوں چپکے چپکے ملنے بھی آتی ہو۔ کیا انہیں ابو جی سمجھتی نہیں ہو؟“ سلطان نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

”ابو جی کیوں سمجھنے لگی انہیں..... ابو تو ان کا نام ہے۔“ زیتون نے دلیل دی۔
 سلطان نے بڑی مشکل سے ایک بے ساختہ مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔ جی چاہا، ایک ہاتھ سے سلطان اور دوسرے سے زیتون کا گلا گھونٹ دوں، لیکن فی الحال تو مسئلہ جان بچانے کا تھا۔

”کپڑے اور زیورات کی گھڑی میں تیار رکھتی ہوں ان کے ساتھ بھاگنے کے لیے۔“ اس کم بخت لڑکی نے پھر میری طرف اشارہ کیا۔

”ہوں..... تو یہ چکر ہے۔“ سلطان نے زیر لب کہا۔
 ”یہ لڑکی کریک ہے سلطان بھائی۔ یہ ہر مرتبہ یہی فرمائش لے کر آتی ہے اور میں ناٹ

جاتا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے صفائی پیش کی۔

”پہلی بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔“ مرزا سے چپ نہ رہا گیا۔

”کیا مطلب؟“ اب سلطان اسکی طرف مڑا۔

”یہی کہ یہ لڑکی کریم ہے۔“

”ابو جی کے منہ سے تو میں یہ بات سن سکتی ہوں، لیکن تم.....“ زیتون دانت چیشی ہوئی مرزا کی طرف چھینی مگر سلطان نے اسے روک لیا۔

”اور تم جو ابھی اس کے ساتھ رومانس بگھا رہے تھے۔“ سلطان نے مرزا کو یاد دلایا۔

”تو مجھے کب انکار ہے۔“ مرزا نے بے حد ڈھٹائی سے کہا۔ ”اس کی اسی خصوصیت سے مجھے عشق ہے۔“

”دیکھیں، دیکھیں اسے چپ کرالیں انپکٹر صاحب۔“ زیتون بھر کر بولی۔

”دیکھو لڑکی..... اب تم سیدھی اپنے گھر جاؤ۔“ سلطان نے بے حد سخت لہجے میں زیتون کو مخاطب کیا۔ ”اگر معاملہ پیر بھائی کا نہ ہوتا تو اس وقت تم تھانے میں ہوتیں۔ گھر جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔ گھر سے بھاگنے کا کبھی نہ سوچنا۔ میں تمہارے حق کے لیے لڑوں گا۔ میں تمہاری اور پیر بھائی کی شادی کرادوں گا بس، اب تم جاؤ۔“

زیتون نے سلطان کو پھر مجھے اور آخر میں مرزا دہشت بیگ کو بالترتیب ممنوعیت آمیز اور قہرناک نگاہوں سے دیکھا۔ اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی تین افراد نے بیک وقت صدائے احتجاج بلند کی۔ الفاظ تک ایک تھے۔ ”لیکن یہ ظلم ہے۔“

سلطان نے باری باری ہم تینوں کو گھورا، پھر خصوصیت سے میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”پیر بھائی تم یہاں معقولیت سے بات کرو گے یا تھانے میں۔“

”کیوں لے جاؤ گے تم مجھے تھانے؟“ میں نے آنکھیں نکالتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا جرم کیا ہے، میں نے؟“

”تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہیں بلا سبب بھی بند کر سکتا ہوں، حالانکہ تم ایک معصوم لڑکی کو درغلانے کے مرتکب ہوئے ہو۔ بہر حال، میری بات کا جواب دو۔“

”پوچھو..... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ میں نے نرم پڑنے ہی میں عافیت جانی۔

”یہ کیا چکر ہے اور کب سے چل رہا ہے؟“

”کیسا چکر..... تم واقعی میرے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔“ میں نے احتجاج کیا۔ ”میرا کوئی چکر نہیں چل رہا ہے۔“

”مجھے تمہارے اس دوست نے بھی یہ بات بتائی تھی۔“ سلطان نے مرزا دہشت کی

طرف اشارہ کیا، جس کی گردن نفی میں ہلنے لگی تھی۔

”دوست.....“ میں نے بے حد نفرت سے کہا۔ ”یہ شخص تو واقعی آستین کا سانپ ثابت ہو رہا ہے۔“ اب مرزا بڑی شدت سے اثبات میں سر ہلار ہاتھا۔

”اور لڑکی کا بھی یہی کہنا ہے۔ اگر تم نے اسے درغلایا نہ ہوتا تو وہ یہاں آنے کی ہمت کیسے کرتی۔“

”کمال کرتے ہو تم۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”تم نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اب تک بھاگنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوئی۔ وہ تو کل بھی کٹھری لے کر آئی تھی۔ یہ شخص میری شرافت ہے کہ ابھی تک اپنے گھر میں موجود ہے۔“ میں جوش میں سینہ پیٹنے لگا تھا۔ انجام کار مجھے بری طرح کھانسی آ گئی۔

”ہاں، یہ سچ ہے۔“ مسکرائیل نے پر زور لہجے میں میری بات کی تائید کی۔

”تم سے انزویو بعد میں ہوگا۔“ سلطان نے اسے ٹوک دیا۔ ”دیکھو پیر بھائی، فی الحال میں تمہاری بات مانے لیتا ہوں لیکن میں مطمئن نہیں ہوا ہوں۔ اگر تم اس معاملے میں قصور وار ثابت ہوئے تو تمہیں اس سے شادی کرنا ہوگی۔“ اب وہ مرزا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں بھی..... اب تم بتاؤ، کس ظلم کی بات کر رہے تھے، کس کے ساتھ ہو رہا تھا ظلم؟“

مرزا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”ظلم تین افراد کے ساتھ ہونے والا تھا۔“ اس نے اس طرح کہا جیسے عدالت میں کھڑا بیان دے رہا ہو۔ ”میرے ساتھ اس لیے کہ آپ میری محبت کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ زیتون کے ساتھ اس لیے کہ زبردستی کی شادی اس کے لیے خانہ بربادی ثابت ہوگی۔ عمران بھائی کو وہ کسی قیمت پر قبول نہیں ہے۔ عمران بھائی کے ساتھ اس لیے کہ آپ اتنی بد صورت لڑکی زبردستی اس کے سر منڈھ رہے تھے۔“

”خوب..... اور تم خود اس بد صورت لڑکی سے شادی کے لیے مرے جا رہے ہو۔“ سلطان نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”میری بات اور ہے، میں نے تو محبت کی ہے۔“ مرزا نے تقریباً گا کر جواب دیا۔ ”یوں بھی میں خوابوں میں خزانے تلاش کرنے کا قائل ہوں۔“

”اوائے بند کرو یہ بکواس۔“ سلطان دھاڑا۔ ”تھانے لے جا کر پھینٹی لگاؤں گا تو دو منٹ میں تمہارے تمام خزانے باہر آ جائیں گے۔“

”تو پھر میں وہ بات.....“ مرزا نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”اچھا، بس خاموش رہو۔“ سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکھت وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ مرزا منہ ہی منہ میں کچھ بول کر خاموش ہو گیا۔“

”ہاں..... اب تم بتاؤ۔ کیا ظلم کر رہا تھا میں؟“ سلطان نے مسکرائیل سے پوچھا۔

”آپ تین افراد کے ساتھ چار طرح کا ظلم کر رہے تھے۔“ مسکرائیل نے جواب دیا۔
پھر اس نے مرزا دہشت بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے بیان کردہ ظلم نمبر دو اور تین سے میں پوری طرح متفق ہیں۔ ان کے علاوہ آپ تیسرا ظلم یہ کر رہے تھے کہ میری پہلی بہن محبت کو شہید کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اور چوتھا ظلم یہ تھا کہ آپ زیتون کو مجھ جیسے خوبرو نوجوان کی زوجیت سے محروم کر رہے تھے۔“

مسکرائیل کے اس بیان کے بعد وہاں سناٹا چھا گیا۔ سلطان اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا اور مرزا کی تو آنکھیں حلقوں سے تقریباً باہر نکل آئی تھیں۔ بہر حال پہلے سنبھالا بھی اسی نے لیا۔ ”تت..... تت..... تم بھی بروٹس؟“ اس نے دردناک لہجے میں مسکرائیل سے پوچھا۔

”تو گویا تم بھی اس لڑکی کے امیدوار ہو۔؟“ سلطان نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ مسکرائیل نے کہا اور شرما کر گردن جھکا لی۔

میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میرے حلق سے چھت شکاف قہقہہ نکل گیا۔ سلطان نے گھور کر میری طرف دیکھا، لیکن بدستور ہنستا رہا۔ اپنی ہنسی پر قابو پانے میں مجھے چند منٹ لگے۔ ”اب تم شادی دفتر کھول لو سلطان بھائی۔“ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”اخبار میں اشتہار دینا۔ جدید دور کے تقاضوں کے عین مطابق شادی بذریعہ تفتیش۔ پہلے آئیے اور پہلے پایے کی بنیاد پر رجوع کیجئے، کیسا آئیڈیا ہے؟“

”پیر بھائی..... میں جن بادشاہ کی وجہ سے تمہیں بہت ڈھیل دیتا رہا ہوں۔“ سلطان تنک کر بولا۔ ”تاؤ نہ دلاؤ..... ورنہ میں تمہاری شادی اس لڑکی سے کرا کر دم لوں گا، خواہ کچھ ہو جائے۔“

میں لرز کر رہ گیا اور مسکرائیل اور مرزا بیگ آواز کسی ناقابل فہم زبان میں احتجاج کرنے لگے۔ ”چپ ہو جاؤ تم دونوں۔“ سلطان دھاڑا اور وہ دونوں میکائیگی انداز میں خاموش ہو گئے۔

”میں..... میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ مرزا نے فریاد کی۔

”مم..... میرا بھی یہی حال ہے۔“ مسکرائیل نے بھی دہائی دی۔

”اور وہ تم دونوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ وہ تو پیر بھائی پر جان دیتی ہے۔“ سلطان نے یاد

دلایا۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو جان نہیں دیتا اس پر۔ کوئی زبردستی ہے۔“ میں نے بلبلاتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں۔ وہ تو زندہ رہ سکتی ہے، ان کے بغیر۔“ سلطان نے دلیل دی۔

”بالکل درست۔ یہ تینوں مر جائیں، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے اس کی پہل تسلیم کر لی۔ ”لیکن ایک حل ہے، اس مسئلے کا۔“

”وہ کیا؟“ سلطان نے پوچھا۔ مسکرائیل اور مرزا متوقع نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ان دونوں کی نگاہوں میں ایک ہی اپیل تھی۔

”وہ یہ کہ تم خود اس سے شادی کر لو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ سلطان گڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ دونوں پھر بیگ آواز احتجاج کرنے لگے۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے یا تم مجھے پاگل سمجھ رہے ہو۔“ چند لمحے بعد سلطان سنبھل کر بولا۔ ان دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”ایک حل اور بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اگر ایسا ہی ہے تو اسے اپنے پاس محفوظ رکھو۔ ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔“ سلطان کا لہجہ بے حد خراب ہو گیا۔

”فیصلہ طمطراقیل پر چھوڑ دو۔“

”واہ پیر بھائی واہ۔“ سلطان نے اچھل کر مجھے دبوچ لیا۔ ”کیا بات ہے تمہاری عقل و دانش کی..... جیسے گھپ اندھیرے میں بری طرح گہنایا ہوا چاند۔“

”اس کی اس بے تکی مثال پر میں بھنا گیا۔“ اچھا..... دور ہٹو۔ مجھے وحشت ہوتی ہے۔“ میں نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس نے کھسپائے ہوئے انداز میں مجھے چھوڑ دیا۔

”میں عمران بھائی کی تجویز سے متفق ہوں۔“ مسکرائیل بولا۔

”مجھے سخت اعتراض ہے، اس تجویز پر۔“ مرزا نے احتجاج کیا۔

”کیا اعتراض ہے تمہیں؟“ سلطان نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

”طمطراقیل.....“ مرزا نے کہنا شروع کیا، لیکن سلطان کے تیور دیکھتے ہوئے فوراً ہی اصلاح کر لی۔ ”میرا مطلب ہے، جن بادشاہ اس معاملے میں غیر جانبدار نہیں ہیں۔ وہ بوتل والے قصے کی وجہ سے مجھ پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں گے۔ ہر حال میں میرے خلاف فیصلہ دیں گے۔“

”جن بادشاہ کے بارے میں یہ ہرزہ سرائی..... میں ابھی تھانے میں لے جا کر تمہارا دماغ درست کر دوں گا۔ تاکہ تم جن بادشاہ کے بارے میں آئندہ ایسی گستاخانہ بات نہ کر سکو۔“

”تو پھر میں وہ بات.....“ مرزانے کہنا چاہا۔
 ”ٹھیک ہے۔ میں سوچوں گا اس سلسلے میں۔“ سلطان نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ڈھائی بجنے والے تھے۔ ”بس یاد بہت ہو گئی۔ اب آپ لوگ اپنے گھر کا راستہ لیں۔“ میں نے کہا۔ ”پوری رات تباہ کر دی۔“
 ”اتنی بے رخی پیر بھائی۔“ سلطان ہنستے ہوئے بولا۔ ”خیر، میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔“

”میں بھی چل رہا ہوں۔ آپ کے پاس تو موٹر سائیکل ہوگی؟“ مرزا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”لیکن تمہارا میرا راستہ الگ ہے۔“ سلطان نے بڑے بے رخی سے کہا۔ لیکن پھر اچانک ہی موم ہو گیا۔ ”ہاں..... آؤ چلو۔“

وہ دونوں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ میرا نیند کے مارے برا حال ہو رہا تھا، لیکن نیند شاید نصیب میں تھی ہی نہیں۔ وہ عشق کی نرسری کلاس کا اسٹوڈنٹ جس کا نام مسکرائیل تھا، میرے کان کھاتا رہا۔ نہ جانے کب تک میں اس کا ہڈیاں سناتا رہا..... نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔ مسلسل جھنجھوڑے جانے کی وجہ سے میری آنکھ کھلی تو جسم اور ذہن کی کیفیت ایسی تھی، جیسے مجھے سوئے ہوئے ابھی تھوری ہی دیر ہوئی ہو۔ میں نے جھلا کر آنکھیں کھولیں تو مسکرائیل کو سر پر سوار پایا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے بے حد درشت لہجے میں پوچھا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔
 ”تم ایسا کرو، مجھے کھانا جاؤ۔ میں کم از کم تمہارے پیٹ میں سکون سے سوتو سکوں گا۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”اب تو برداشت نہیں ہو رہی۔ میں تو بہت دیر کا جاگا ہوا ہوں عمران بھائی۔ جب تک برداشت کر سکا، کرتا رہا، لیکن اب.....“ اس نے پھر پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔
 ”تو تم جا کر ناشتہ کر آتے۔“

”اکیلا ہوں تو اور بات ہے۔ تمہارے ہوتے ہوئے تو میں ایسا نہیں کر سکتا۔“
 میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ دفتر جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا، کم از کم مسکرائیل کی تودل جو کی کر دوں۔ چنانچہ اٹھتے ہی ہاتھ روم میں گھس گیا۔ ہاتھ روم سے نکلا تو میری حالت قدرے بہتر تھی۔ پانی سے کسلندی دور ہو گئی تھی۔ ”چلو، اب نکل چلو یہاں سے۔“ میں نے مسکرائیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں گھر سے نکل آئے۔ اللہ تو کل ریسٹوران کا رخ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس وقت تو وہاں صرف دو پہر کا کھانا ہی مل سکتا تھا۔ جب کہ ناشتے کے بغیر میرا کام نہیں چلتا تھا۔ ایسے مواقع پر میں ہمیشہ ناشتے کو فوقیت دیتا تھا، خواہ اس کے نتیجے میں دو پہر کا کھانا، رات ہی کو کیوں نہ کھانا پڑے۔

”تمہاری جیب میں نوٹوں کی گڈی اب بھی موجود ہے۔“ میں نے مسکرائیل سے دریافت کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ”کوئی ایک گڈی کی بات نہیں ہے، جتنی کہو گے حاضر ہو جائیں گی۔“
 ”اور یہ گڈیاں آتی کہاں سے ہیں؟“

”یہ زیر مبادلہ کا چکر ہے اور بہت پے چیدہ ہے خالی پیٹ نہیں سمجھا سکتا۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں اسے لے کر شادمان کے بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ وہاں ایک اسپیشل ریسٹورنٹ تھا، ہم دونوں اس ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ باوردی ہیرا آیا تو میں نے اسے چار پلیٹ سینڈویچ اور چائے کا آرڈر دیا۔ ہیرا منہ سے تو کچھ نہ بولا لیکن اسکی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے بالکل سمجھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد ناشتہ آ گیا۔ میں نے چائے بنائی۔ ایک پیالی مسکرائیل کے سامنے رکھی اور سینڈویچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اتنی دیر میں مسکرائیل دو پلیٹیں صاف کر چکا تھا۔

”چلو..... کچھ سہارا تو ہوا۔“ تیسری پلیٹ صاف کر کے اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”کوئی فکر نہ کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ہم سارا دن یہاں بیٹھ سکتے ہیں اور تم بار بار بار کھانا بھی منگوا سکتے ہو۔“

وہ بے حد خوش نظر آنے لگا۔ لیکن فوراً ہی اس کے چہرے پر تردد کے آثار نظر آئے۔ ”مجھے تمہاری دنیا بہت اچھی لگی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ ساری عمر یہیں رہوں لیکن اب ڈر لگنے لگا ہے۔ تم لوگ بہت خطرناک ہو۔“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔
 ”اب وہی معاملہ لے لو..... بوتل میں جن کو بند کرنے کے عمل والا۔“ وہ گمبیر لہجے میں دلا۔ ”کل میں بال بال بچا ہوں۔ اگر تم مداخلت نہ کرتے، میں تو گیا تھا، بوتل میں۔“
 ”ارے ہاں..... کیا قصہ تھا، وہ؟ کیا محسوس کر رہے تھے تم؟“

”محسوس کیا کرنا تھا..... جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا، میرا جسم بے جان سا ہوتا گیا۔ پھر جسم

مذاق میں ڈھونگ رچایا ہو۔ میں کیسے یقین کر لیتا کہ وہ سنجیدہ ہے۔ پھر مجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ مختلف دواؤں کے کپسول، میں اب ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ میں نے دوائے صداقت کا کپسول نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”لو..... یہ کھالو۔“

”یہ کیا ہے؟“ اس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”اگر تم مجھے دوست سمجھتے ہو تو اسے فوراً کھالو۔ کیا میں تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں؟“ میں نے آنکھیں نکالتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

وہ ایک دم شرمندہ ہو گیا۔ ”معاف کرنا عمران بھائی۔ میں نے صدق دل سے تمہیں دوست کہا ہے۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔“ اس نے مجھ سے لہجے میں کہا اور کپسول منہ میں رکھ کر نگل لیا۔ میں پندرہ بیس منٹ اس سے ادھر ادھر کی گفتگو کرتا رہا۔ پھر میں نے دوا کے اثر کی آزمائش کے لیے اس سے دو چار ذاتی سے سوال کیے۔ جواب واقعی سچے تھے وہ اپنے باپ سے محبت کرتا تھا، لیکن وہ اسے زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے۔ البتہ امی بہت زیادہ اچھی تھیں۔ منگیت پہلے سینگ چھوئے ہونے کی وجہ سے ناپسند تھی، لیکن اب زیتون کی وجہ سے، وہ سرے سے قابل قبول ہی نہیں رہی تھی۔

”زیتون تمہیں کسی لگتی ہے؟“ میں نے تحقیقات کا آغاز کیا۔
”بہت اچھی..... اس جیسا تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کی دوسری بات سے تو میں بھی کلی طور پر متفق تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو..... اور دوسرے لوگوں کو وہ بد صورت کیوں لگتی ہے۔“ اس نے مزید کہا۔
”تمہیں اس سے بہت محبت ہے؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔
”بہت زیادہ..... میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

اب میں کم از کم اس کی محبت کا تو قابل ہو گیا تھا وہ جھوٹ ہرگز نہیں بول رہا تھا۔
”اب تو تم میری مدد کرو گے؟“

”کر سکتا ہوں، لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”تمہارے طبشت حضور اور تمہاری پوری برادری سے دشمنی مول لے کر میں تو کہیں کا نہیں رہوں گا۔ وہ یہ تمام ذمے داری مجھ پر ڈال دیں گے اور پھر میرا بیڑا غرق۔“

”نہیں..... ایسا نہیں ہوگا۔“ اس نے بڑی یقین سے کہا۔ ”تمہیں ہماری خاندانی روایتوں کا علم نہیں ہمارے والدین کو لڑکی کتنی ہی ناپسند کیوں نہ ہو، شادی ہو جانے کی صورت میں اسے صدق دل سے بہو تسلیم کر لیا جاتا ہے..... اور شادی کرانے والے کی تو بڑی عزت کی

میں شدید انتہیں ہونے لگی۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہا۔ سوچنے سمجھنے کی قوت بھی مفلوج ہو گئی تھی۔ مجھے یقین ہے، عمل کچھ دیر اور جاری رہتا تو میں دھواں بن کر بوتل کا رخ کرتا..... اور پھر وہ مردود مجھے کہانیاں سنانے پر مجبور کرتا اور خود بیٹھ کر ان کہانیوں پر ناول لکھا کرتا۔“

مجھے اس کے انداز پر بہت زور کی ہنسی آئی۔ ”پھر..... اب کیا چاہتے ہو تم؟“
”میں کسی بھی طرح جلد از جلد اپنی دنیا میں لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ یہاں رہا تو کسی دن کوئی بھی شخص مجھے بوتل میں بند کر دے گا۔ مجھے تم لوگ اس قسم کے کاموں میں بہت ماہر معلوم ہوتے ہو۔ محنت نہیں ہوتی تم لوگوں سے..... شارٹ کٹ ڈھونڈتے پھرتے ہو۔“

”خیر، ہم سب تو ایسے نہیں ہیں۔“ میں نے صفائی پیش کی۔ ”لیکن تم اس طرح واپس بھی نہیں جا سکتے؟“

”یہی تو مشکل ہے۔ بری طرح پھنس گیا ہوں، میں۔ واپس جانے کا موقع مل بھی جائے تو مجھے یقین ہے کہ میں زیتون کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کروں گا۔“ اس کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی۔ ”یار عمران بھائی، اس سلسلے میں تو تم میری مدد کر سکتے ہو۔“
”وہ کس طرح؟“

”طمطر اقیل بن کر میرے حق میں فیصلہ دے دو۔ تمہیں تو اس سے محبت نہیں ہے نا؟“
”ہاں یہ بات تو ہے۔ یہ ممکن ہے۔ لیکن اس طرح میں بہت سے مسئلوں میں پھنس جاؤں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں اسے تمہارے قابل ہی نہیں سمجھتا۔“
”اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟“ اس کا لہجہ بگڑنے لگا۔

”وجہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کے لیے اسے دیکھ لینا ہی کافی ہے۔ ارے..... وہ انتہائی بد شکل لڑکی ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ شادی تو بہت دور کی بات ہے۔“

”بس بہت ہو چکی عمران بھائی۔“ وہ میز پر ہاتھ مار کر غرایا۔ ”میں اس کی تو ہین برداشت نہیں کر سکتا۔“

میں بوکھلا گیا۔ ریسٹورنٹ میں زیادہ رش نہیں تھا۔ لیکن جوتھوڑے بہت لوگ موجود تھے، وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ”دیکھو بھائی! ہوش میں رہو، یہاں کوئی ہنگامہ نہ کر بیٹھنا۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”بس تو آپ ایسی باتیں نہ کریں۔“
میری سمجھ میں اس کا عشق نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمجھ میں آنے والی بات تھی بھی نہیں..... خاص طور پر اس لیے کہ اس کا مطلوب، زیتون جیسی لڑکی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ وہ مذاق ہی

جاتی ہے۔ طبعت حضور، تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔“
میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے، تمہارے لیے جو مجھ سے بن پڑا ضرور کروں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ بے حد خوش نظر آنے لگا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھٹی پڑ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے ایک دل دوز آہ بھری اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ عمران بھائی کھانا منگو آؤ نا۔“

میں نے وقت دکھا دو بیچ رہے تھے۔ مجھے تو کوئی خاص بھوک نہیں تھی، لیکن بہر حال میں کھانا چکھ سکتا تھا۔ میں نے بیرے کو بلا کر کھانے کا لبا چوڑا آؤر دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے تین بیچ چکے تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے منگوائی۔

”اور وہ تمہارا ریشماں والا معاملہ؟“ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہوئے مسکرائیل نے پوچھا۔

میں نیکخت بے حد اس ہو گیا۔ ”وہ..... وہ تو میرے نصیب میں ہی نہیں ہے۔“
مسکرائیل چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بات کا رخ بدل دیا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بس، چائے پی کر یہاں سے اٹھتے ہی میں سوچ رہا ہوں، آج تمہیں سیر ہی کرا دی جائے۔“

”نیک خیال ہے۔“ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”اور ہاں..... کیوں نہ آج جگے سے ملو آؤ، مجھے۔“

”ٹھیک ہے، ملو آؤں گا۔“ میں نے بچھے بچھے لمحے میں کہا۔
چائے پینے کے بعد میں نے بل منگوائی۔ مسکرائیل نے جیب سے سوکا نوٹ نکالا۔ کچھ دیر بعد بیرا پلیٹ میں بارہ روپے ساٹھ پیسے لے کر واپس آیا۔ میں نے دس روپے کا نوٹ اٹھالیا۔ بیرے نے جھک کر سلام کیا اور واپس چلا گیا۔ مسکرائیل یہ سب کچھ بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ نوٹ کیوں چھوڑ دیے تم نے؟“ بالا خراس سے نہرہا گیا۔
”بڑے ریسٹوران میں یہی ہوتا ہے۔ بیرے کو نوپ دی جاتی ہے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”اسی میں اپنی عزت ہے۔“

اس کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا لیکن میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس نے یہ بات گرہ میں باندھ لی ہے۔ ہم ریسٹوران سے نکل آئے۔ باہر آ کر ہم نے رکشہ لیا اور جگے کے اکھاڑے جا

پہنچے۔ جگا اکھاڑے میں چند پٹھوں کو زور کرانے میں مصروف تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے ایک پیچھے لوگردن سے پکڑ کر ایک طرف پھینکا اور تیزی سے ہماری طرف لپکا۔ میرا ننھا منہ ہاتھ اس نے اپنے اکھاڑے کی مٹی میں لتھڑے ہوئے ہاتھ میں لے کر بڑی گرجوٹی سے دبایا۔ ”کیا حال ہے عمران بابو؟“ اس نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ میں نے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

اس وقت مجھے اس کے گھر پر بڑی چلمن روشن روشن دکھائی دینے لگی۔ لیکن میں نے فوراً ہی نظریں ہٹالیں۔ ”جگے بھائی، ان سے ملو۔“ میں نے مسکرائیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے دادا زاد بھائی اسماعیل ہیں۔ ولایت سے آئے ہیں۔“

جگے نے مسکرائیل سے بھی بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ”عمران بابو کا بھائی میرا بھائی۔ ان کا بڑا احسان ہے مجھ پر۔“ پھر اس نے پٹھوں کو آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ ”ابے..... جلدی سے لسی لاؤ..... تین بڑے گلاس۔“ ہم منع کرتے رہ گئے اور ہمارے ہاتھوں میں لسی کے گلاس تھما دیے گئے۔

لسی نوشی کے دوران، جگا مسکرائیل سے ولایت کے متعلق پوچھتا رہا اور مسکرائیل گڑ بڑا گڑ بڑا کر ایران توران کی ہانکتا رہا۔ میری نظریں بار بار دھنک رنگ چلمن کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”آؤ بابو..... اندر چلو۔ ریشماں ہر روز تمہارا انتظار کرتی ہے۔“ اچانک جگے نے کہا۔ میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ ”پڑھنے کے لیے۔“ جگے نے جملہ پورا کیا۔ اور میرا دل دوبارہ اپنے مقام پر پہنچ گیا۔

”آج تو میں اسماعیل کو شہر کی سیر کرانے نکلا ہوں۔“ میں نے بچھے بچھے لمحے میں معذرت کی۔ ”پھر کبھی سہی۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔“ میں نے جگے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ضرور آنا۔“ جگے نے میرا ہاتھ زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں اکھاڑے سے نکل آئے باہر آ کر ہم دیر تک مرکزی سڑک پر کھڑے رکشہ ٹیکسی کی جستجو کرتے رہے، لیکن لگتا تھا کہ ہم رکشہ ٹیکسی والوں کو نظر ہی نہیں آ رہے ہیں۔ ”اب کہاں چلیں؟“ مسکرائیل نے پوچھا۔

”ساحل سمندر۔“ میں نے رکشہ کو روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ خوش قسمتی سے رکشہ رک گیا۔

”کہاں جاؤ گے؟“ رکشہ والے نے بڑی رعونت سے پوچھا۔

”ساحل سمندر۔“

تھیں کہ پلٹنا بھی دو بھر تھا۔ منہ میں بھی رومال ٹھنسا ہوا تھا..... گویا چیخنا بھی فارغ از امکان تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن تاریکی بہت گہری تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے میں یہ کیسے پیہ چل سکتا کہ میں کہاں قید ہوں، وہ کیسی جگہ ہے۔ مایوس ہو کر میں نے ذہن پر زور ڈالا تو تصور میں اپنے اغوا کا دھندلا سا منظر لہرا گیا..... اور بس، پھر تاریکی..... سناتا.....

وہ تاریکی اتنی گہری تھی کہ اس میں کچھ سوچنا بھی ممکن نہیں تھا۔ بہت سے لوگ اس بات پر چونکیں گے، لیکن میں دنیا میں واحد آدمی نہیں ہوں، جس کی آنکھیں پٹی سے باندھ دیں تو وہ سوچنے سے محروم ہو جائے۔ میرے ساتھ شروع ہی سے یہ مسئلہ تھا۔ دماغ، آنکھوں کی مدد کے بغیر مفلوج ہو جاتا تھا۔ اس اندھیرے میں جہاں کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا، سوچنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

چاروناچار مجھے تن بہ تقدیر ہونا پڑا۔ اندھیرے میں یہ تعین بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ پھر مجھے باہر سے قدموں کی آہٹیں اپنے قفس کی طرف بڑھتی محسوس ہوئیں۔ یہ آواز ضرور ہو گیا کہ آنے والے دو افراد ہیں..... پھر مجھ پر پہلی بار احساس ہوا کہ قفس میں ایک روزن بھی ہے۔ دروازہ کھلا تو باہر سے مدھم روشنی کمرے میں در آئی۔ دروازے کے نیم تاریک فریم میں دو آدمی ایک لمحے کے لیے نظر آئے اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خود کو بے ہوش ظاہر کرنا ہی مناسب تھا۔ پہلے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ لوگ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ ویسے ان دونوں میں سے ایک مجھول شخص مجھے جانا پہچانا لگا تھا۔ اچانک ہلکی سی آواز سنائی دی اور روشنی ہو گئی۔ غالباً ان میں سے کسی ایک نے سوچ آ کر دیا تھا۔ ایک دم اندھیرے میں ہونے والی روشنی میں، مجھے اپنی پلکوں پر قابو پانا دشوار ہو گیا، جو کھلنے کے لیے پھٹی جا رہی تھیں۔

”ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔“ ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ یہ آواز سن کر میرے تلوؤں سے لگی، سر میں جا بکھی، مجھے خود پاقابو پانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ جی تو چاہا کہ آنکھیں کھول کر بے بھاد کی سناؤں، لیکن منہ میں تو کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ تجسس بھی بھڑک گیا تھا، چنانچہ میں نے بے ہوش بنے رہنا ہی مناسب سمجھا۔

”کیا گڑبڑ ہے۔ اب تک تو اسے ہوش میں آ جانا چاہیے تھا۔“ دوسرا شخص بولا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

”کچھ زیادہ ہی نازک مزاج ہیں، اہل میاں۔“ مرزا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”میٹر سے پانچ روپے زیادہ لوں گا۔“ میں اسے کوئی سخت بات کہنے ہی والا تھا کہ مسکرائیل رکشہ میں تشریف لے گیا۔ مجھے بھی بیٹھنا پڑا۔ رکشہ والے نے میٹر گھمایا اور سرپٹ ہولیا۔ مسکرائیل میٹر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”تماشا دیکھتے رہو عمران بھائی۔“

اور وہ تماشا قابل دید تھا۔ سات میل سفر کرنے کے باوجود میٹر ایک روپے بیس پیسے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ میں نے ساحل تک جانے کی بجائے چوک پر رکشہ رکھوایا۔ پھر میں نے جب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپے بیس پیسے نکال کر رکشہ والے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ بڑبڑا کر بولا۔

”اپنے میٹر سے پوچھو۔ اور اوپر کے پیسے لینے ہوں تو چوکی پر چل کر بات کرنا ہوگی۔“ ”لیکن..... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رکشہ والے نے میٹر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ”بدنیتی کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور مسکرائیل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جا کر ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ رکشہ وہیں کھڑا تھا اور ڈرائیور بار بار آنکھیں مل مل کر اب بھی میٹر کو گھورے جا رہا تھا۔

ساحل سمندر ایک قابل دید تفریح گاہ تھی۔ اس شام وہاں کچھ زیادہ ہی رش تھا۔ مسکرائیل بچوں کی طرح ہر چیز کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ پھر اس نے بجلی سے چلنے والے جھولے میں بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے اس جھولے میں بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، ایک دفعہ بیٹھا تھا تو چکروں کے مارے برا حال ہو گیا تھا۔

”تم تفریح کرو، میں کچھ دیر پلٹنا چاہتا ہوں۔ یہیں ملوں گا۔“ میں نے اس سے کہا اور ساحل کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ریشماں کے سوا کوئی تصور نہیں تھا۔ میرا دل اداسی کے بیکراں سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں ساحل پر بنی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کہ میں ٹہلتے ٹہلتے ساحل کے بارونق حصے سے سناں حصے کی طرف نکل آیا ہوں۔ جب احساس ہوا تو میں نے پلٹنا چاہا۔ اسی وقت کسی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے ہاتھ پیر چلانا چاہے لیکن ایک رومال پوری قوت سے میرے منہ اور ناک پر جمادیا گیا۔ ناک کے راستے عجیب سی بو میرے وجود میں اترتی گئی۔ آخری احساس جو مجھے ہوا یہ تھا کہ ہر طرف تاریکی ہے اور اس گھور اندھیرے میں، مجھے اغوا کیا جا رہا ہے۔

ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کرسی پر بیٹھے..... بلکہ بندھے ہوئے پایا۔ بندشیں اتنی سخت

مجھے بوتل میں بند کرنے کے در پے تھے۔ میں نے بھی ٹھان لی کہ انہیں قرار واقعی سزا دے کر رہوں گا۔ البتہ اب میں مطمئن ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، میں کوئی سچ جج کا جن تو تھا نہیں کہ مجھے بوتل میں بند ہونے کا خدشہ ہوتا۔

”تو اب اسے بے ہوش کر دو۔“ مرزا نے اپنی مکروہ آواز میں فرمائش کی۔

”بے ہوش کرنا کیوں ضروری ہے؟“ سلطان نے پوچھا۔

”ہوش میں ہوا تو عمل کے دوران مزاحمت کرے گا، اس طرح ہم دونوں ہی مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔“ مرزا نے گل افشانی کی۔

”ٹھیک ہے۔“ سلطان نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں نے خاموشی سے بے ہوشی کا انجکشن لگوا لیا۔ اس دوران میں خود کو یہ بھی یاد دلاتا رہا کہ ان دنوں طوطا چشموں کا تختی سے احتساب کروں گا۔ یہ سوچتے ہوئے میرا ذہن ایک بار پھر اندھیروں میں ڈوب گیا۔

اس بار ہوش آیا تو میں اندھیرے میں نہیں تھا، بلکہ اندھیرے پر سوار تھا اور وہ اندھیرا متحرک تھا۔ چند لمحے بعد میرا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو آواز سے پتہ چلا کہ میں کسی دین میں سفر کر رہا ہوں، ہاتھ پیر بدستور بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ تاہم تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اب تک میرے ان دونوں نام نہاد دوستوں کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میں جن نہیں ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے کھٹن کے ساحل پر چھوڑ بھاگیں گے اور بعد میں یوں بن جائیں گے جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو۔ ان کی دانست میں تو میں بے خبر ہی رہا ہوں گا۔

دین کا سفر کچھ دیر جاری رہا، پھر گاڑی رک گئی۔ غصی دروازہ کھلا اور کسی نے مجھے بوری کی طرح اٹھا کر کندھے پر لا دیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن کچھ بھائی نہ دیا۔ مجھے اٹھانے والا چلتا رہا حتیٰ کہ اچانک ہی ہم روشنی میں آ گئے۔ وہ راہداری مجھے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اٹھانے والے نے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے کسی بوری کی طرح پٹخ دیا۔ اس بار بے ہوش ہونے کے لیے کسی دوا کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ ظاہر ہے، ٹھوس جسم اور آٹے کی کسی بوری میں بہت فرق ہوتا ہے۔

اس مرتبہ حواس ٹھکانے آئے تو ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے، لیکن اپنا جسم مجھے ہڈیوں سے بھری ہوئی کوئی گٹھری ہی معلوم ہو رہا تھا۔ خدا جانے وہ کیسی منخوس شام تھی۔ میں بے ہوش ہوتے ہوتے تنگ آ چکا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے میرا جوڑ جوڑ الگ ہو گیا۔ اگر اس وقت مجھ سے کوئی پوچھتا کہ انسانی جسم میں کتنی ہڈیاں ہوتی ہیں تو شاید میں یہی جواب دیتا کہ ایک بھی نہیں..... کیونکہ مجھے اپنی کھال میں ہڈیوں کا سفوف بھرا

میں سلگ کر رہ گیا۔

”اب کیا کیا جائے؟“ یہ انسپکٹر سلطان تھا۔ ”ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے۔“

”کیا ضرورت ہے۔“ مرزا دہشت بیگ نے بے نیازی سے کہا۔ ”اسی عالم میں بے

ہوشی کا ایک ڈوز اور دے دیں۔“

”کوئی گڑبڑ ہوگئی تو؟“

”یارت تم عجیب پولیس والے ہو۔“ مرزا جھل گیا۔ ”لگتا ہے، پہلے تمہارے ہاتھ سے کوئی

مراہی نہیں۔“

”او، احق ناول نویس۔“ سلطان دھاڑا۔ ”زیادہ بے تکلفی کی ضرورت نہیں۔ اور یہ تو کسی

عام آدمی کی بات نہیں کر رہا..... یہ میرا پیرا بھائی ہے۔ تجھ پر بھی اس کے بڑے احسانات ہیں۔

اگر یہ نہ ہوتا تو اس روز تو براہ راست عالم بالا کی طرف پرواز کر گیا ہوتا۔“

”ہنہ..... مجھ پر احسانات ہیں، اس کے۔“ مرزا گبڑ گیا۔ ”اور دیکھو انسپکٹر..... اگر اس کا

اتنا ہی خیال ہے تو اس معاملے کو ختم سمجھو۔ مجھے آنکھیں نہ دکھاؤ۔ میں تمہارا پانثر ہوں۔“

”ارے بار..... میں تو بس یونہی کہہ رہا تھا۔“ سلطان ایک دم موم ہو گیا۔ ”تم تو ہر بات

پر خفا ہو جاتے ہو۔“

”اور ہاں..... اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ قبضے میں آ گیا تو تم مجھ سے نگا ہیں نہیں

پھیر لو گے اور پانثر شپ ختم نہیں کر دو گے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو۔“ سلطان نے احتجاج کیا۔ ”بوتل میرے پاس رہے

گی۔“ سلطان نے احتجاج کیا۔ ”بوتل میرے پاس رہے گی۔ تم جب اور جو کام بھی کہو گے،

میں کر دیا کروں گا۔“

”ہرگز نہیں، بوتل میرے پاس رہے گی۔“ مرزا دہشت نے کہا۔

”تاکہ تم مجھے دودھ سے ٹکھی کی طرح نکال کر پھینک سکو۔“ سلطان نے طنزیہ لہجے

میں کہا۔

”عمل بھی تو میں ہی کروں گا..... خطرہ میں مول لوں گا۔ یقین کرو، میں معاہدے کے

خلاف وزری نہیں کروں گا۔“ مرزا نے اسے اطمینان دلایا۔

”خیر دیکھیں گے۔ یہ بعد کی بات ہے۔“ سلطان نے لاپرواہی سے کہا۔ ”اب تم اپنا

کرتب شروع کرو۔“

اب میری سمجھ میں پوری بات آ گئی تھی۔ گزشتہ رات مسکرائیل میرے روپ میں تھا۔

اسے عمل سے بے خود ہوتے دیکھ کر ان مردودوں نے اپنے طور پر مجھے جن سمجھ لیا تھا اور اب وہ

ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ چارونا چار میں نے کمرے میں پڑے پڑے ہی کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور نہ جانیکیوں جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ معاً آہیں سنائی دیں اور اگلے ہی لمحے گامے شاہ کا مخوس چہرہ میرے سامنے تھا۔

”کیا بات ہے، میاں جی..... اس طرح کیوں بکھرے ہوئے ہیں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت تو اس کی مسکراہٹ مجھے زہر ہی لگی..... لیکن یہ دھچکا بھی لگا کہ اب میں سلطان کے قبضے میں نہیں بلکہ اس کے قبضے میں ہوں۔ سارا سکون غارت ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ یہ کیا طریقہ ہے، شاہ جی۔“ میں نے جی کڑا کر کے سخت لہجے میں کہا۔

”تمہارے آدمی مجھے کیوں اٹھلائے ہیں؟“

”کیا بتاؤں میں تو خود آپ کی روحانیت کا قائل ہو گیا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”آپ سے انسپکٹر کا روحانی تعلق بہت گہرا معلوم ہوتا ہے میں جب بھی اسے اٹھواتا ہوں، مال غنیمت میں آپ ہی ہاتھ لگ جاتے ہیں۔“

مجھے لفظ مال غنیمت پر سخت اعتراض تھا، لیکن میں اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ”تمہیں سلطان سے آخر پر خاش کیا ہے؟“ کچھ توقف کے بعد میں پوچھے بغیر نہ سکا۔

”یہ تو آپ اپنی روحانی قوت کی مدد سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔“ اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”پولیس والوں سے تو ہر شریف شہری کو پر خاش ہوتی ہے۔“

”لیکن سلطان ایسا پولیس والا نہیں ہے اور میں تمہیں بھی شریف شہری تسلیم نہیں کر سکتا۔“

”تو نہ کریں۔“ اس نے کا ندھ جھٹکے۔ ”سلطان کو تو خیر میں نے اس لیے اٹھوایا تھا کہ وہ اب بھی ہمارے کاموں میں مداخلت کرنے کے چکر میں ہے۔ لیکن فی الحال یہ الجھن ہے کہ میں آپ کا کیا کروں!“

”مجھے واپس جانے دو۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”یہ تو ممکن نہیں۔ میں بہت بزرگ پرست آدمی ہوں۔ آپ کی خدمت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ اس نے بڑے معتقدانہ انداز میں کہا۔ پھر اچانک ہی اس کے تیور بدل گئے۔ ”لیکن پہلے تمہیں اپنی بزرگی ثابت کرنی ہوگی، ورنہ جتنی بنوادوں گا تمہاری۔“

میں اندر ہی اندر دہل کر رہ گیا، لیکن بظاہر اکڑ کر بولا۔ ”بزرگی اس لیے نہیں ہوتی کہ آدمی اسے ثابت کرتا پھرے۔ ویسے بھی میں نے کب بزرگی کا دعوا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بزرگی ثابت نہ ہوئی تو میں تمہیں قتل کروا کے تمہاری لاش گٹر میں ڈلوادوں گا۔“ اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

عجیب آدمی تھا۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ، اور میں اس مردود سلطان کی وجہ سے اس کے چنگل میں آچھنسا تھا۔ اس وقت اگر سلطان میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی بوٹیاں اڑا دیتا۔ بہر حال، اس کے سامنے کمزوری ظاہر کرنا، موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے سے سراسیمگی ظاہر نہ ہونے پائے۔ ”گامے شاہ..... بزرگی دیکھنے کے لیے چشم بیٹا بھی ہونی چاہیے۔“ میں نے بے حد پروقار لہجے میں کہا۔

”اور وہ میرے پاس ہے نہیں۔“ اس نے پھر میرا مضحکہ اڑایا۔

”تمہیں شاید یاد نہیں کہ میں جگے کی بہن رہنماں کو کس طرح تمہارے قبضے سے نکال کر لے گیا تھا۔“ میں نے اس کا تبصرہ نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”تمہارے یہ تمام غنڈے مل کر بھی مجھے نہیں روک سکے تھے۔“

”بے پرکی مت اڑاؤ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”وہ کوئی اور بزرگ رہے ہوں گے۔ بہر حال، میں تمہیں اس وقت تک بزرگ ہستی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جب تک تم اسے ثابت نہیں کر دیتے..... اور بزرگ ثابت نہ ہونے کی صورت میں تمہیں قتل کروادوں گا۔“

”اچھا، اپنی بزرگی ثابت کرنے کے لیے بھی مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے مصالحانہ لہجہ اختیار کرنا مناسب سمجھا۔

”بھول گئے۔“ وہ چکا۔ ”رستم سے پچھلے مقابلے کے دوران تو تم بھاگ گئے تھے۔ وہ اب بھی میرے لیے مصیبت بنا ہوا ہے۔ بس، اس کا غرور خاک میں ملا دو۔ تم بزرگ ثابت ہو جاؤ گے۔ پھر دیکھنا..... میں کتنی قدر کرتا ہوں، بزرگوں کی۔“

اس کے یہ کہتے ہی رستم کا برا عظم نما جسم میرے تصور میں لہرایا اور میں ایک جھڑپ جھری لے کر رہ گیا۔ ”میں نے تمہیں پہلے بھی یہ سمجھایا تھا کہ ہم بزرگ لوگ جسمانی مقابلے بھی نہیں کرتے۔ ویسے بھی میں کرامت کے سخت خلاف ہوں۔“

”یہ سب دامن بچانے والی باتیں ہیں۔“ گامے شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو تمہاری ابھی چھٹی کر دیتا ہوں۔“

میں لرز کر رہ گیا۔ عجیب مصیبت تھی۔ ”میں تیار ہوں۔“ بالاخر میں نے کہا۔

”اوہ..... یہ ہوئی نابات۔“ اس نے انکڑوں بیٹھ کر میرے پیر دباننا شروع کر دیے۔

”اوائے فخر..... میاں جی کو ان کے کمرے میں لے جا۔“ اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے بد معاش کو حکم دیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”پچھلی دفعہ کی طرح آپ کا مقابلہ کل صبح ہوگا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔

فخر و مجھے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں لے گیا۔ ”آپ نہادھولیں۔ آدھے گھنٹے بعد

کھانا ہوگا۔“ یہ کہنے کے بعد وہ بھی رخصت ہو گیا۔
اس کے جاتے ہی میں نے اپنا تفصیلی جائزہ لیا تاکہ اس کی روشنی میں آئندہ کالائج عمل ترتیب دے سکوں۔ لیکن جیسے ہی میں نے اپنا سینہ ٹٹولا، میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ دواؤں والی کٹ غائب تھی۔ گویا میرے کچھ کرگزر نے کے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔ اب میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے سوا، عملاً کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دواؤں کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا، پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ میں نے باہر جھانکا لیکن راہداری بالکل سنسان تھی۔ گامے شاہ غیر محتاط آدمی نہیں تھا، چنانچہ میں نے جان لیا کہ فرار ناممکن ہوگا، ورنہ وہ مجھے یوں کھلا ہرگز نہ چھوڑ دیتا۔ میں کمرے میں پلٹ آیا۔ مسہری کے سرہانے ایک پش بین لگا ہوا تھا۔ وہ یقیناً کسی ملازم کو بلانے کے لیے تھا۔ میں نے وہ بین دبا دیا۔

گھنٹی بجی اور چند ہی لمحے بعد فخر و کمرے میں داخل ہوا۔“ کیا بات ہے، میاں جی؟“ اس نے پوچھا۔

”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ میں نے کمزوری آواز بنا کر کہا۔ ”میری اندرونی جیب سے تم نے جو دوائیں نکالی ہیں، وہ لے آؤ۔“

وہ چند لمحے مجھے حیرت سے دیکھتا رہا، پھر بولا..... ”یہاں تو کسی نے آپ کی تلاشی نہیں لی..... ٹھہریے میں شاہ جی سے معلوم کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو گامے شاہ اس کے ساتھ تھا۔

”کیا ہوا میاں جی؟ خیریت تو ہے؟“ گامے شاہ نے لہک کر پوچھا۔
”مم..... میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے میری دوائیں واپس کر دو۔“

واپس کر دوں..... لیکن یہاں کسی نے تمہاری دوا نہیں لی۔ ویسے نام بتا دو، میں منگوا لوں گا۔“

اب میں اسے دواؤں کے نام کیا خاک بتاتا، اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ دوا میں ان دو مرد دوست نما دشمنوں نے نکال لی تھیں۔ اب گامے شاہ کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا، چنانچہ میں نے کہہ دیا کہ میرے لیے بسکو پین ٹیبلٹس منوادے۔

”ٹھیک ہے۔ میں منگوا دوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”آؤ..... کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔“ میں اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہاں کا منظر میرے لیے

بے حد خوش کن تھا۔ انسپکٹر سلطان اور مرزا دہشت بیگ پیروں کی وردی پہنے کھانا لگا رہے تھے۔
”ارے..... ابھی تک کھانا نہیں لگایا تم نے..... کابلو۔“ گامے شاہ دباڑا۔
”بس جی..... لگ گیا۔“ مرزا نے مسکسی صورت بنا کر کہا۔ جب کہ سلطان کینہ تو ز نظروں سے گامے شاہ کو دیکھ رہا تھا۔

”لگتا ہے تمہارا دماغ ابھی ٹھکانے نہیں آیا۔“ گامے شاہ نے اسے مخاطب کیا۔ ”جھاڑو لگواؤں گا تم سے، تب سدھرو گے۔“

سلطان نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کیسے ہو، پیر بھائی۔“
”بس کرم ہے، تمہارا۔“ میں نے چھتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ نظریں چرانے لگا۔
”ویسے سچ رہے ہو۔“ میں مزید کہا۔

پہلے تو وہ جھینپ گیا، پھر شکایت آمیز لہجے میں بولا۔ ”پیر بھائی..... مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

”تو تم ہی کون سا میری امیدیں پوری کرتے رہے ہو۔ تمہاری ہی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں۔“ میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔
”مطلب بھی سمجھا دوں گا۔ ذرا یہاں کے معاملات سے نمٹ لوں۔“ میں نے جواب دیا اور پھر گامے شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ویسے شاہ جی، یہ زیادتی ہے سلطان کے ساتھ۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”اسے اس کی اوقات یاد دلانا چاہیوں۔“
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ ہر بار بھول جاتا ہے کہ یہ تو م کا خادم ہے۔ قوم کی خدمت کرنے کی بجائے قوم کو اپنی خدمت پر لگا لیتا ہے۔ دو چار دن میرے گھر میں جھاڑو برتن کر لے گا تو شاید یہ بات اسے آئندہ بھی یاد رہے۔“

”پھر بھی یہ سلوک نامناسب ہے۔“
”اوئے تم چپ رہو۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے۔“ گامے شاہ اچانک بھر گیا، جب تک تم رستم کو زیر نہیں کرو گے، تمہاری حیثیت قیدی ہی کی سی ہوگی، سمجھ گئے؟“

”رستم کو زیر.....“ سلطان نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مرزا بڑی سعادت مندی سے کچن سے ڈشیں لالا کر میز پر سجا رہا تھا۔ وہ بظاہر اس گفتگو سے بے نیاز تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے کان اسی طرف لگے ہوئے ہیں۔

”ہاں..... میاں جی صبح رستم سے مقابلہ کریں گے۔ پچھلا مقابلہ ان کے فرار کی وجہ سے برابر رہتا تھا، لیکن اب میں نے دیوار پر خاردار تاروں کی باز لگوا دی ہے۔ اس بار یہ فرار نہیں ہو سکیں گے۔“

”اناللہ وانا الیہ راجعون۔“ سلطان نے میری طرف دیکھتے ہوئے پر خلوص لہجے میں کہا۔ مجھے اس پر بہت زور کا غصہ آیا، لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی غصے کے اظہار کا وقت نہیں آیا، چنانچہ میں نے تمام غصہ کھانے پر اتار دیا۔ کھانے کے دوران گامے شاہ، سلطان اور مرزا سے جس طرح چاکری کروا تا رہا، اس بے بسی کے عالم میں، وہ بھی میری دل بستگی کے لیے بہت تھا۔ کھانے کے بعد گامے شاہ نے مجھے اپنے کمرے میں چلے جانے کا کہا۔ ”باقی معاملات کا فیصلہ صبح خود بخود ہو جائے گا۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے اپنے کمرے میں، لائٹ آف کی اور دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ رستم سے مقابلہ کا تصور سونے ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں کروٹیں بدلتا رہا، بس، مجھے یہ انتظار تھا کہ کونسی اور اس کے کینوں پر رات حاوی آجائے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کم از کم فرار ہونے کی کوشش تو ضرور کروں گا۔ وقت کا کسی طور اندازہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ میری کلائی والی گھڑی بھی غائب تھی۔

دیر تک کروٹیں بدلتے ہوئے اکتا گیا تو میں بستر سے اٹھ بیٹھا..... میں نے کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا، راہداری میں پہنچنے کے بعد سوچوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ لیکن مجھے وہاں تک پہنچنا ہی نصیب نہیں ہوا کیونکہ اس بار کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں جھلا کر کھڑکیوں کی طرف پلٹا لیکن کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ وہاں سے نکلنے کی یہی صورت تھی کہ دھواں بن کر نکلا جائے اور میں سچ سچ چاک کا کوئی جن تو تھا نہیں۔

میں پریشان ہو گیا۔ رستم سے پچھلے مقابلے کی ریل، تصور کے پردے پر چل رہی تھی اور میں خود کو کسی چٹنی کی طرح لچلی محسوس کر رہا تھا۔ رستم سے مقابلے کی صورت میں، میرا مستقبل یہی ہو سکتا تھا..... چٹنی! میرے تصور میں مختلف قسم کی چٹنیاں دندانے لگیں۔ میں جاگتا رہا، لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ نیند تو کانٹوں کی سیج پر بھی آ جاتی ہے۔ نہ جانے کس وقت مجھے بھی نیند آ گئی۔ آنکھ تب کھلی جب کوئی ہتھوڑ کر جگا رہا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی مرزا دہشت کی منحوس صورت نظر آئی۔ یہ ایک اور منحوس شگون تھا۔ کم بخت پکا منافق تھا، بڑی محبت تھی اس کے لہجے میں۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔

”ابھی نہیں۔“ میں نے اکر کر کہا۔ ”میاں بیرے! ابھی تو ہم سوئیں گے۔ رات بہت دیر سے سوئے تھے۔ ناشتہ گول سمجھو، ہم دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔“

میرے انداز تنخاطب سے اس کا منہ بن گیا۔ مردود چاہتا تھا کہ اتنا کچھ ہونے پر بھی اس سے آپ جناب کروں۔

”تب تو آپ کو بھوکا ہی لڑنا پڑے گا۔“ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”عالی مرتبت، ہر ہائیس، جناب گامے شاہ کا حکم ہے کہ آپ آدھے گھنٹے کے اندر تیار ہو کر لان میں پہنچ جائیں ورنہ رستم کو داگ اودردے دیا جائے گا۔“

رستم کا نام سنتے ہی میرا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، ناشتہ لے کر آؤ۔“ میں تیار ہوں۔“ میں نے مردہ سے لہجے میں کہا اور ہاتھ کی طرف بڑھ گیا۔ ہاتھ روم سے نکلا تو مرزا ناشتہ لے آیا تھا۔ لیکن موت سامنے ہو تو ناشتہ کسے یاد رہتا ہے۔ میں نے جیسے تیسے دو چار لقمے زہر مار کیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا عمران بھائی..... تم تو بڑے خوش خوراک ہو کر تے تھے!“ مرزا نے مجھے چھیڑا۔

”رستم سے نمٹ لوں۔ پھر تمہاری خبر لوں گا۔“ میں نے گرج کر کہا۔ لیکن رستم سے کس طرح نمٹوں گا، یہ خود مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔

میں دل ہی دل میں کلمہ شہادت کا ورد کرتا ہوا لان کی طرف چل دیا، جہاں میلے کا سا سماں تھا۔ منظر تقریباً پہلے ہی جیسا تھا، جب میں انہیں جل دے کر فرار ہو گیا تھا۔ لیکن اس بار ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

گامے شاہ سب کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ سلطان اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر اس وقت بھی بیرے کی وردی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔ ”آؤ..... آؤ، پیر بھائی آؤ۔“

میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور گامے شاہ کی طرف بڑھ گیا۔

”تم خدا کے نیک بندوں سے غنڈہ گردی کرو اتے ہو۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ میں نے رودینے والے لہجے میں کہا۔

”آپ جیسے بزرگوں کی دعائیں ساتھ ہوں گی تو یقیناً معاف کر دے گا۔“ اس نے بڑی بھلائی سے کہا۔ ”آپ نے اگر رستم کو شکست دے دی تو میں آپ کی روحانی قوتوں پر ایمان لے آؤں گا۔ اور آپ نے شکست کھائی تو فراڈ سمجھ کر آپ کو جاں بحق کرادوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اکثر کر کہا۔ کمزوری دکھانا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا جب لڑنا ہی ہے تو کیوں نہ شان سے مرا جائے۔

”فیص اتاریں.....“ گامے شاہ نے فرمائش کی..... اور میں نے فیص اتا دی۔ اس

وقت سلطان جھپٹ کر میرے پاس آیا اور دوزانو بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں میرے سینے پر جمی ہوئی تھیں۔ ”ایک..... دو..... تین..... چار.....“ وہ زیر لب گنتی گنتی گنتے لگا۔

”کیا بکو اس ہے؟“ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”پسلیاں گن رہا ہوں پیر بھائی۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ ”خدا کی قسم اتنی آسانی سے کسی کی پسلیاں نہیں گنی جاسکتیں۔ میں نے بار بار کوشش کی ہے۔ لیکن ناکام رہا ہوں..... پیر بھائی، کیا چیز چھپا رکھی تھی، کپڑوں میں..... واللہ..... کیا باڈی ہے۔“

میں اکر گیا اور پھر سینہ پھلایا۔ گامے شاہ اور اس کے آدمی ہنس رہے تھے۔

”واہ..... تن کر کھڑے ہو تو ایک ایک رگ..... ایک ایک سانس واضح ہو گئی ہے۔ اف، میں تو گنتی بھی بھول گیا ہوں۔ ایک..... دو..... تین.....“ اس نے پھر گنتی شروع کر دی۔ میں بدستوار اکر اکھڑا رہا۔

”ارے، پیر بھائی..... یہ کیا۔“ اچانک سلطان نے کہا۔ لہجے میں تشویش تھی۔

”کیا ہوا؟“

”تمہاری تو پسلیاں پوری ہیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

”بات یہ ہے، ہر انسان کی بیوی اس کی پسلی سے بنتی ہے۔ کسی کی ایک پسلی کم ہو تو سمجھو، ایک شادی ہوگی۔ دو کم ہوں تو دو..... تین کم ہوں تو تین۔ تمہاری تمام پسلیاں پوری ہیں۔“ گامے شاہ بری طرح ہنسنے لگا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ”تو اس کا کیا مطلب ہوا؟“ میں نے سلطان سے پوچھا۔

”خدا نا خواستہ..... میرے منہ میں خاک، اس کا مطلب ہے، تمہاری شادی نہیں ہوگی۔“

”پھر سے گنو..... شاید گنتی میں بھول ہو گئی ہو۔“ میں نے کہا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پیر بھائی، غلطی کا کیا سوال ہے۔ تمہاری باڈی تو آئینہ ہے، آئینہ۔ ایکسرے بھی اتنا صاف نہیں آتا ہوگا۔ ہر چیز بالکل کلیئر ہے۔“

مجھے بہت زور کا غصہ آیا۔ بد بخت میرا مذاق اڑا رہا تھا۔ لیکن پسلی سے بیوی کا تعلق سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اماں حوا کو بابا آدمی کی پسلی ہی سے تو تخلیق کیا تھا۔ چنانچہ مجھے تشویش لاحق ہو گئی۔

”پیر بھائی..... سینہ پھلائے رکھنا، اس سینے پر تو کوہِ ہمالیہ بھی قربان کیا جاسکتا ہے۔“

سلطان نے ہانک لگائی۔

غیر ارادی طور پر میں نے سینہ پھلایا۔ اسی وقت شور بلند ہوا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس باسکی رستم ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ ایک لخت مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

”ہنہ..... پہاڑ..... کوہِ ہمالیہ۔“ گامے شاہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے تحارت سے کہا۔ ”دیکھ تو..... پہاڑ کیسے لرز رہا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں پہاڑ؟“

”ہاں یہ آتش فشاں پہاڑ ہے۔“ سلطان نے دلیل دی۔ ”اور یہ زلزلے کا سماں ہے۔“ اتنی دیر میں رستم آ پہنچا۔ ”رستم..... دیکھ، اگر تو نے میاں جی کو شکست دے دی تو میں تجھے آزاد کر دوں گا، ورنہ تجھے ہمیشہ کے لیے میری اطاعت قبول کرنا ہوگی۔“ گامے شاہ نے رستم سے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔“ رستم نے اپنی رسیلی آواز میں کہا۔ مجھ پر طاری لرزہ اور شدید ہو گیا۔ اب تو میرے دانت بھی بری طرح بج رہے تھے۔

”پیر بھائی کا غصہ برداشت سے باہر ہوا جا رہا ہے۔“ سلطان نے گامے شاہ کو آگاہ کیا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”پیر بھائی، بتیسی نکال کر مجھے دے دو۔ کہیں یہ شدید غصہ تمہارے دانتوں کو نقصان نہ پہنچا دے۔“

گامے شاہ نے پھر زوردار قہقہہ لگایا۔ لیکن اب مجھ میں کسی کی بات کا برا ماننے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔

”چلو بھئی میاں صاحب، مقابلہ شروع۔“ گامے شاہ نے مجھے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں، لان کے درمیان چلے جاؤ۔“

رستم تیزی سے پیچھے ہٹا اور لان کے وسط میں چلا گیا۔ ”آؤ میاں جی..... آ جاؤ۔“ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھے دعوت دی۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کس طرح لان کے وسط میں پہنچا۔ میں خود کو یاد دلاتا رہا کہ مقابلہ نہ کرنے کی صورت میں گامے شاہ مجھے یقیناً قتل کروادے گا۔ جب کہ مقابلہ کرنے میں بہر حال، بچت کا امکان تھا۔ لیکن جب سے میں نے رستم کو دیکھا تھا، یہ دوسری دلیل بھی میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اب میرا ذہن میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ بہر حال، اب میں رستم کے روبرو تھا اور اپنی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”پیر بھائی! ذرا اچھی طرح چٹنی بنانا اس رستم کی۔“ سلطان نے ہانک لگائی، پھر گامے شاہ کا قہقہہ سنائی دیا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی بھاگنے کا راستہ نظر آ جائے، لیکن بے سود.....

گیٹ کی طرف تماشائی تھے اور باؤنڈری وال بہت اونچی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، لیکن بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

رستم نیمری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اپنے ننھے منے ہاتھ پر، دل ہی دل میں فاتحہ پڑھ ڈالی اور اسے رستم کے ہیلچا نما ہاتھ کے سپرد کر دیا۔ یہ گویا مقابلہ شروع ہونے کا اشارہ تھا۔ میں خوب جانتا تھا کہ یہ مقابلہ یک طرفہ ہوگا۔ میری طرف سے مقابلے یا مدافعت کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں..... اچانک رستم جھکا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے میری کمر تھام لی۔ پھر وہ مجھے دھکیلتا ہوا، باؤنڈری وال کی طرف لے گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں پریشان تھا کہ رستم نے میری مرمت کی بجائے یہ دھکم پیل کیوں شروع کر دی ہے۔ میں دیوار سے ٹک گیا۔ اب پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں تماشائیوں کے سامنے والے رخ تھا۔ لیکن درمیان، رستم نامی وہ پہاڑ حائل تھا، مجھے تماشائی تو کیا، آسمان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”میاں جی۔“ اچانک رستم نے سرگوشی کی۔ ”تم سچ جج اللہ والے ہو یا نہیں۔ دیکھو، مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔“

”بڑے بھائی..... میں تو بہت آفت زدہ اور یتیم سا آدمی ہوں۔“ مجھ پر رقت طاری ہوگی۔ ”ان لوگوں نے زبردستی مجھے اللہ والا بنا دیا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ اس نے پھر سرگوشی کی۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھوں سے اس طرح زور لگایا جیسے میری گردن توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کم از کم اس کی پشت پر موجود تماشائیوں کو یہی لگ رہا ہوگا۔ ان کے اور میرے درمیان، فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ہماری سرگوشیاں ان تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ ”غور سے سنو۔“ رستم نے دھیرے سے کہا۔ ”میں تم سے شکست کھانا چاہتا ہوں۔“ تم اپنی نگاہوں میں ایسا جلال پیدا کرنا، جیسے نگاہوں کے ذریعے مجھے پھونک ڈالنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن میرے دل نے سماعت کو ڈانٹا کہ اس پر فوراً یقین کر لے۔ خدا خدا کر کے بچت کی صورت نکل رہی تھی۔ لیکن پھر میں شبہ میں مبتلا ہو گیا۔ کیوں..... آخر کیوں؟ رستم کو مجھ سے ہمدردی کیوں ہونے لگی ہے۔ میں نے فوراً اپنا شک رستم پر ظاہر کر دیا۔

”بات یہ ہے میاں جی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”..... کہ میں گامے شاہ کا لہجہ پہچانتا ہوں۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ اگر میں جیت گیا تو وہ مجھے آزاد کر دے گا۔ میں اس آزادی کا

مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ وہ مجھے ختم کر دے گا۔ اس کی اطاعت ہی میں میری بہتری ہے۔ سمجھ گئے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”تو یہ بات ہے۔“ میں نے سوچا کہ رستم صرف اپنی ذات سے ہمدردی کر رہا ہے۔

”تو اب جادو جگاؤ اپنی آنکھوں میں۔“ اس نے دوبارہ کہا۔ میں نے آنکھیں بھیچ کر ان میں جلال کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اسے گھورنے لگا۔

”اے میاں جی..... ایسے موت دیکھو۔“ رستم نے سرگوشی میں مجھے ڈپٹا۔ ”یہ کسی فلم میں محبت کا منظر نہیں فلما یا جا رہا ہے۔“

اس بار میں نے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ بری طرح بھنا گیا۔ ”بھینگے ہو جاؤ گے۔“ اس نے جھلا کر کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ خود مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے میری آنکھیں بھیچ دیں اور انہیں بری طرح رگڑنے لگا۔ میری چیخیں نکل گئیں۔ تماشائیوں کی جانب سے داد و تحسین کا غلغلہ بلند ہوا۔ وہ سب رستم کو داد دے رہے تھے۔

رستم نے ہاتھ ہٹائے اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ لیکن مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”ہاں..... اب بتی بات۔“ اس نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ ”اب ان آنکھوں سے مجھے گھور گھور کر دیکھنا اور میں الٹ الٹ جاؤں گا۔“

”ابے مردود..... تو نے مجھے اندھا کر دیا۔“ میں نے سکتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے، اب تجھے تو کیا، دنیا میں کسی بھی چیز کو نہیں دیکھ سکوں گا۔“

”کوئی بات نہیں، زندگی آنکھوں کے بدلے مہنگی نہیں..... ہاں، ہاں گھورو.....“

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ مجھے دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا۔ گویا میری بینائی برقرار تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اچانک رستم دھاڑا اور اٹل قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ دور تک ہٹا گیا۔ میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انہیں ہاتھ لگا کر دیکھ لیتا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ہاتھ خون سے لتھڑ جائیں گے۔ بہر حال، میں اپنی چیخیں ضبط کرتا ہوا آگے بڑھا۔ رستم اب ایک جگہ ٹھہر گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک زوردار چیخ مار کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

”اف..... اف.....“ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ”اف، یہ آنکھیں..... اف، آگ ہیں،

یہ آگ..... یہ تو مجھے تھلا دیں گی۔“

اب گامے شاہ اور اس کے گرگے خاموش تھے۔ صرف سلطان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ”ہاں، ہاں پیر بھائی، جہنم کر دو، اس مردود کو۔“ وہ چیخ رہا تھا۔ ”پھر ذرا گامے شاہ کی بھی خبر لینا۔“

اب میری آنکھوں کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ میرا حوصلہ بھی بڑھ گیا تھا، چنانچہ میں تیزی سے رستم کی طرف بڑھا۔ وہ بدستور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے، دردناک انداز میں چیخے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے ایک آدھ ہاتھ بھی جمادوں۔

جیسے ہی میرا ہاتھ اس کے پیٹ سے ٹکرایا، اس کے ہاتھ خود بخود آنکھوں سے ہٹ گئے۔ وہ بری طرح اچھلا۔ میرے ہاتھ حیرت کی شدت سے اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اچھلتے اچھلتے اس کا پیٹ مزید تین چار مرتبہ میرے ہاتھ کی پھیلی ہوئی انگلیوں سے ٹکرایا۔ اس کی اچھل کود میں اضافہ ہو گیا، بلکہ اب تو وہ ہنس بھی رہا تھا۔

پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ اسے گدگدی محسوس ہو رہی ہے۔ میرا دل خوش ہو گیا۔ کتنی دلچسپ بات تھی۔ گویا میں ایک معاملہ میں اسے برتر تھا۔ میں نے اس کے پھر گدگدی کی۔ وہ اچھلا۔ میں نے احساس برتری کے زیر اثر گامے شاہ کو گھور کر دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ گامے شاہ نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ پھر میں رستم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بری طرح اچھل رہا تھا۔ میں نے پھر اس کے پیٹ میں اپنی انگلی گھسیڑ دی۔ وہ دوہرا ہو گیا۔ چیخ چیخ کر وہ پاگل ہوا جا رہا تھا، اس کے علاوہ مسلسل اچھل کود نے اسے متحمل بھی کر دیا تھا۔ اس نے قبر بھری نگاہوں سے مجھے گھورا، جیسے دھمکی دے رہا ہو، لیکن مجھے اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا۔ میں گدگدیاں کرتا رہا، اس کا برا حال ہو گیا، حتیٰ کہ وہ زمین پر گر گیا۔ میں بھی گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں حرکت کرتی رہیں۔ وہ بری طرح لوٹ لوٹ پوٹ ہوتا رہا۔ اس کے ہاتھ پیر بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں گدگدی کرتا رہا اور دل ہی دل میں خود پر فخر کرتا رہا۔ پہاڑ جیسے انسان کا میں نے کیا حشر کر دیا تھا۔ اسی وقت اس کی ٹھوک میرے سینے پر پڑی..... اور پھر، چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے احساس ہوا کہ رستم نے مجھے ہاتھ لگایا ہے..... پھر اس کی دردناک چیخ سنائی دی اور..... میرے ذہن میں سنائے اترتے گئے۔ مجھے سینے کی تکلیف کا احساس بھی نہیں رہا۔

☆.....☆.....☆

ہوش آیا تو میں بستر پر دراز تھا اور سلطان میرے سامنے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے بے

ساختہ ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ ہنسی میرے سینے کے لیے قیامت خیز ثابت ہوئی۔ ایسا لگا، جیسے سینے میں بہت سی چیزیں ٹوٹ چھوٹ گئی ہوں۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو گئے۔ میں نے جلدی سے نظریں چرائیں۔ مجھے ڈر تھا کہ سلطان کو دیکھوں گا تو ہنسی ضبط نہ کر سکوں گا۔

”ہنس رہے ہو پیر بھائی!“ سلطان نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

”تم نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟“ میں نے بمشکل تمام پوچھا۔

”سب اس مردود گامے شاہ کا کیا دھرا ہے.....“ سلطان نے بھنا کر کہا۔ ”خیر، اب تم ہوش میں آ گئے ہو تو سب ٹھیک کرادو گے۔“

میں نے پھر اس کی طرف دیکھا، میرے پیٹ میں قہقہے مچنے لگے۔ لیکن پہلی بار ہنسنے کی تکلیف یاد بھی، اس لیے میں نے خود پر قابو پالیا۔ پھر مجھے اپنی بد نصیبی کا احساس ہوا۔ میرا دل بھرا آیا۔ مقابلے سے پہلے سلطان نے میرا بہت مذاق اڑایا تھا۔ اس نے میری پسلیاں گنی تھیں۔ اب مجھے اس پر ہنسنے کا موقع ملا تھا تو ہنسنا میرے لیے ایک اذیت ناک عمل بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے پھر سلطان کی طرف دیکھا اور اس مرتبہ ہنسی روکنا مشکل ہو گئی۔ اس کے سر پر سفید رومال تھا، جس کے نیچے لمبے بالوں والی وگ تھی۔ سفید رومال کے نیچے، اس کے بال کمر تک لہرا رہے تھے، جسم پر نرسوں والی وردی تھی، یعنی سفید جمپر، سفید شلوار اور کندھوں پر پن کیا ہوا سفید دوپٹہ..... اور ہاتھ میں تھرمائیٹر..... میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں ورنہ یقیناً ہنسی چھوٹ جاتی اور نتیجتاً میرے سینے پر قیامت گزر جاتی۔

”اب کیا حال ہے؟“ اس نے خالص نرسوں کے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”ابھی تو مجھے کچھ پتہ ہی نہیں۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”البتہ تم اس کمرے میں موجود رہو تو میرا کباڑا ہو جائے گا۔“

”اڑالو..... میرا مذاق.....“ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”لیکن تم ہی مجھے اس حلیے سے نجات دلا سکتے ہو۔ گامے شاہ تمہارا مرید ہو گیا ہے۔“

”ہوا کیا تھا؟ میں نے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا، پہلے تو تمہاری آنکھوں نے رستم پر قیامت ڈھائی، بعد میں اس نے بتایا کہ تمہاری نگاہوں سے اس کے جسم میں آگ لگنے لگی ہے۔ پھر تم نے اسے گدگدیاں کر کے اُدھال کر دیا۔ جب اس کی لات تمہارے سینے پر پڑی تو اس نے سنبھل کر تمہاری گردن دبانا پائی لیکن تمہیں ہاتھ لگاتے ہی یوں اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ بری طرح دھاڑ رہا تھا۔“

باتیں ہی کرو۔“

”بس جن بادشاہ کا خیال آتا ہے۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔ ”ورنہ تمہارا مینوا ہی دبا دیتا۔“

میں بوکھلا کر خاموش ہو گیا۔ اس سے زیادہ الجھنا ٹھیک نہیں تھا۔ چنلنکوں کے بعد دروازہ کھلا اور گامے شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور انداز فدویانہ تھا۔ وہ میرے بستر سے کچھ فاصلے پر دست بستہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”کیا حکم ہے..... عالی جناب؟“

اس کے لہجے سے مجھے اپنی پوزیشن کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ رستم کے حشر نے گامے شاہ کے تمام کس بل نکال دیے تھے۔ وہ مجھ سے بری طرح مرعوب ہو گیا تھا۔ اب مجھے اس صورت حال سے پوری طرح فائدہ اٹھانا تھا۔ ”یہ تم نے میرے پیر بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اس کا لباس تبدیل کراؤ اور خیال رکھو اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔“

”بہت بہتر۔“ اس نے کہا اور اپنے آدمی کو پکارا وہی آدمی کمرے میں آ گیا جو میرے پہلی مرتبہ بلانے پر آیا تھا۔ ”سلطان صاحب کو لے جاؤ اور ان کے کپڑے انہیں دو۔“ اس نے اپنے آدمی کو ہدایت دی۔ ”ان کا خیال رکھنا ہر طرح، کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔“ سلطان نے ممنونیت سے میری طرف دیکھا اور اس شخص کے ساتھ چلا گیا۔

”اور کچھ، عالی مرتبت؟“ گامے شاہ نے پوچھا۔

”نگاہیں اٹھا کر بات کرو۔“ میں نے ڈپٹ کر کہا۔

”ایسا..... ایسا حکم نہ دیں جناب۔“ وہ لرز کر رہ گیا۔ ”میری کیا مجال کہ آپ سے نگاہیں ملا سکوں۔ میرے جسم میں سونیاں سی جھبھے لگتی ہیں۔“

میں نے اسے بغور دیکھا۔ ”تم اب بھی مجھ پر شک کر رہے ہو؟“ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”وہ بری طرح بوکھلا گیا۔“ ”جج..... جی..... میں آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن اس..... اس لمحے سے مجھے آپ پر یقین آ گیا ہے۔“

”اس میں میرا نہیں، تمہارا ہی فائدہ ہے۔“ میں نے بارعب لہجے میں کہا۔

”جی ہاں..... جی ہاں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”اب بتاؤ، یہ سارا کیا چکر ہے؟“

”وہ جی آپ سے کیا پوشیدہ۔“ وہ گڑ بڑا گیا۔ ”میں نے آپ کے ساتھ گستاخی کی، لیکن

بدبخت، لوٹیں لگا رہا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آنے پر اس نے سارا حال سنایا۔“

”اور میرا کیا حال ہے؟“ میں نے نظریں نیچی کیے ہوئے پوچھا۔

”ارے ہاں..... مبارک ہو، پیر بھائی۔“ سلطان لہک کر بولا۔ ”تمہاری شادی کا

بندوبست ہو گیا ہے۔ اللہ پاک نے تم پر نظر عنایت کر دی۔“

”کیا بکواس ہے؟“ میں بوکھلا گیا، لیکن میں نے نظریں نہ اٹھائیں۔

”ارے پیر بھائی..... دودو۔“ وہ پھر چکا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

”ایکسرے ہوا تھا تمہارا۔“ اس نے بے حد خوش ہو کر بتایا۔ ”دو پلسیاں صاف ہو گئی

ہیں۔ اب فرشتے ان سے دولڑکیاں بنائیں گے..... اچھا، اب میں ذرا ٹیپر پیچ لے لوں۔“

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس بار میں ہنسی نہ روک سکا۔ اس کی بیبت کدائی

ہی کچھ ایسی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے سینے پر پھر قیامت گزر گئی۔ دیر تک میں سانیں رو کے پڑا

رہا۔ ”یار تم چلے جاؤ یہاں سے۔“ قدرے طبیعت سنبھلنے کے بعد میں نے سلطان سے کہا۔

”ورنہ میں مرجاؤں گا۔“

”میں کون سا اپنی خوشی سے یہاں بیٹھا ہوں۔“ وہ بھنا گیا۔ ”کم بخت نہ مجھے نکلنے دیتے

ہیں اور نہ ہی یونیفارم اتارنے دیتے ہیں۔“

”لیکن میں تمہیں برداشت نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا اور پھر شور مچا دیا۔ ”کوئی ہے.....

ارے کوئی ہے۔“

”ایک دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آ گیا۔“ ”کیا حکم ہے، عالی مرتبت؟“

”اس نرس سے میرا پیچھا چھڑا دو ورنہ میں ہنستے جاں بحق ہو جاؤں گا۔“

وہ بے چارہ احمقوں کے سے انداز میں مسکرا دیا۔ ”جناب، یہ تو آپ کی خدمت پر مامور

ہے۔“ اس نے کہا۔

”ارے میں کہتا ہوں، یہ میرے لیے ملک الموت ثابت ہوگی۔ اسے نکالو یہاں سے۔“

یہ کہہ کر میں نے کن انکھیوں سے سلطان کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ ندامت سے سرخ ہو گیا

تھا۔ میں نے جلدی سے منہ پھر لیا۔ ”جج جج کی کوئی نرس لاؤ۔“ میں نے گر گے سے کہا۔

”صاحب، یہ بھی جج جج کی ہی ہے۔ اچھا..... میں شاہ جی کو بھیجتا ہوں۔“ گر گرے نے

کہا اور کمرے سینکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے چٹنی لگا دی.....

سلطان ایک طرف منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

”یار نرس۔“ میں نے اسے چھیڑا۔ ”تم تو میری دیکھ بھال بھی نہیں کر رہے ہو۔ اچھا، کچھ

”زبان سنبھال کر بات کرو۔“ میں نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا پیر بھائی ہے۔ اور جہاں تک تمہیں نقصان پہنچانے کا تعلق ہے تو میں، تمہیں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لوگ بہت منظم ہو۔ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”آپ غلط نہیں کہہ سکتے۔“ اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن باس.....“

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا در دوسرے۔ میں جو کچھ تمہیں سمجھانا چاہتا تھا، سمجھا چکا ہوں۔ آگے تم جانو۔“

”مم..... میں..... میں باس سے بات کروں گا۔“

”ضرور کرو۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے بے خبر ہوں۔ میں تم ہیروئن فروشوں سے خوب واقف ہوں۔ وہ تو ہم لوگ دنیوی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے ورنہ میں تمہاری تنظیم کو ہی اکھاڑ پھینکتا۔“ میں نے پھر اندھیرے میں تیر چلایا۔

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”شاہ صاحب..... مجھے یقین ہے کہ باس رضا مند ہو جائے گا۔“

اس نے کہا۔ ”اب میں جاؤں؟“

”ہاں..... جاؤ.....“ میں نے شاہانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن مجھے جلد از جلد کوئی مثبت اطلاع چاہیے۔ اور ہاں، میری نگہداشت کے لیے ایک نرس کا بندوبست کر دو۔“

”بہت بہتر۔“ اس نے کہا اور اٹھ قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس مرتبہ دروازے کی چنجی نہیں لگائی گئی تھی۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا اور صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ معاملات سطح پر جتنے معمولی نظر آ رہے تھے، اتنے معمولی نہیں تھے۔ گامے شاہ تو محض شوکیس میں رکھی ہوئی ایک ڈمی تھا۔ پس پردہ کوئی اور ہی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ بالکل جاسوسی ناولوں اور فلموں کا سا معاملہ تھا۔ لیکن میں بھی اس میں ملوث ہو گیا تھا، اس لیے وہ سب کچھ مجھے قصے کہانیوں کی طرح پر لطف نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ بد قسمتی سے میرے پاس دوائے غیاب بھی موجود نہیں تھی۔ یعنی میں پوری طرح بے بس تھا۔ لے دے کر رستم کی بنائی ہوئی ساکھ تھی، جس کے زور پر میں اپنا اور سلطان کا تحفظ کر سکتا تھا۔ سلطان کی رہائی میرے لیے بہت اہم تھی۔ میں جانتا تھا کہ پولیس والے جن کے دشمن ہو جائیں، انہیں پاتال میں بھی نہیں چھوڑتے۔ وہ رہا ہونے کے بعد یقیناً چھاپے مارے گا اور اس طرح میری جان ان لوگوں سے چھوٹ جائے گی۔

میری سوچ کا سلسلہ، نرس کی آمد سے منقطع ہوا۔ وہ خاصی حسین، طرح دار اور نونیز تھی۔ اسے دیکھ کر میں جس طرح بوکھلایا، اس پر مجھے خود بھی حیرت ہوئی، کیونکہ وہ میری فرمائش پر بھیجی گئی تھی۔ یہ بھی عجیب بات تھی۔ میں حسین لڑکیوں کی رفاقت کا منہی رہتا تھا اور جب رفاقت

آپ سے کیا چھپا ہوا ہے۔ آپ میری مجبوری تو جانتے ہی ہیں۔“

میں اس سے استفسار کرتے کرتے رہ گیا، کیونکہ مجھے وہ کہیں سے مجبور دکھائی نہیں دے رہا تھا..... تاہم وہ بڑے یقین سے کہہ رہا تھا اور اپنی نام نہاد روشن ضمیری کی وجہ سے میں اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ”ٹھیک ہے، میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”کس سلسلے میں؟“ اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

میرا خون کھول کر رہ گیا، لیکن میں نے خیل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ”میرے اور سلطان کے سلسلے میں؟“ میں نے وضاحت کی۔

”کرنا کیا ہے جی..... آپ تو ہمارے سر آنکھوں پر رہیں، البتہ سلطان کا پتہ صاف سمجھیں۔“

میں دہل کر رہ گیا۔ وہ سلطان کی موت کا تذکرہ بڑے سکون اور لاپرواہی سے کر رہا تھا، جیسے دوپہر کے کھانے کا پروگرام بنا رہا ہو۔ ”کیا بکواس ہے؟“ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”جج..... جی، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ وہ ہکھلایا۔

”تم سلطان کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔“

”آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔ لیکن باس.....؟“

”باس؟“ میں چونک گیا۔ ”ذرا تفصیل سے بتاؤ، اپنے باس کے بارے میں۔“

”کیا بتاؤں، شاہ صاحب۔ باس کے متعلق تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تو بس دکھاوے کا باس ہوں۔ تمام احکامات باس کے ہوتے ہیں۔ ان پر عمل درآمد کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میں نے آج تک باس کی صورت نہیں دیکھی۔“

”اس کے احکامات تم تک کیسے پہنچتے ہیں؟“

”فون کے ذریعے..... اور فون بھی ہمیشہ باس ہی کرتا ہے۔“

”میرے اور سلطان کے سلسلے میں ہدایات اسی نے دی ہیں؟“

”جی ہاں.....“ اس نے جواب دیا۔

”خیر، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم سلطان کو فوری طور پر آزاد کر دو۔“

”یہ..... یہ کیسے ممکن ہے، عالی مرتبت؟“ وہ بوکھلایا گیا۔ ”وہ ہمارا بیڑا غرق کر دے گا۔ آپ نہیں جانتے کہ وہ کتنا خبیث آدمی ہے۔“

میسر آتی تھی تو بوکھلانے لگتا تھا۔ شاید یہ بھی اس دوا ہی کا کرشمہ تھا۔

نرس نے میرا نمپر پچر چیک کیا..... اور پھر تشویش آمیز انداز میں سر ہلایا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا نمپر پچر کم ہو گیا ہوگا۔ مجھے اپنے ہاتھ پاؤں سرد ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

”اب کیا حال ہے جناب؟ تکلیف میں کچھ کی ہے؟“ نرس نے پوچھا۔
 ”ٹھنڈ..... ٹھیک ہوں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا اور پھر سنبھالا لیا۔ ”انہی تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلے، مجھے یہ پتہ چلنا چاہیے کہ میری ٹوٹ پھوٹ کس قدر ہوئی ہے۔“

”ٹوٹ پھوٹ؟“ نرس نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں..... یعنی میری کتنی پسلیاں ٹوٹی ہیں۔“

”یہ کس نے کہا کہ آپ کی پسلیاں ٹوٹی ہیں؟“ نرس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”پسلیاں ٹوٹی ہوتیں تو آپ اس طرح باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ البتہ آپ کی دو پسلیوں پر ہلکا سا درم ضرور آ گیا ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ گویا سلطان مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ شادی کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جس کے لیے میں اپنی پسلیاں تڑوانا پسند کرتا۔

”میں ابھی سکاٹی کر دوں گی۔ آپ کو آرام آ جائے گا۔“ نرس نے پیش کش کی۔

”نن..... نہیں..... آپ کا شکریہ۔“ میں پھر بوکھلا گیا۔ ”مجھے سامان لادو میں خود سکاٹی کر لوں گا۔“

نرس حیرت سے مجھے دیکھتی رہی۔ بہر حال، اس نے مجھے نکور کا سامان دے دیا۔ میں نے سکاٹی شروع کر دی۔ شروع میں تو میری چیخیں نکل گئیں۔ لیکن کچھ دیر بعد میری حالت خاصی بہتر ہو گئی۔ میں نے بہتر سے اٹھ کر چہل قدمی کی۔ یہ بات خاصی حوصلہ افزا تھی کہ میں چل پھر سکتا تھا۔ ابھی میں چہل قدمی کر ہی رہا تھا کہ گامے شاہ آ گیا۔ وہ مجھے چلتے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

”آ..... آپ ٹھیک ہیں شاہ جی!“ اس نے حیرت سے کہا۔

”بالکل ٹھیک..... تم سناؤ، کیا خبر لائے؟“

”باس نے آپ کی بات مان لی ہے۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ”آج ہی سلطان کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اتنا ہوگا کہ ہم ایک ٹھکانے سے محروم ہو جائیں گے اور مجھے کچھ دنوں کے لیے روپوش ہو جانا ہوگا۔ لیکن یہ کوئی اتنی بڑی دشواری نہیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ واقعی میرے لیے خوش خبری لایا تھا۔ ”اور میرا کیا ہوگا؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”ایسا لگتا ہے، باس کو آپ سے بہت عقیدت ہو گئی ہے۔“ گامے شاہ کے لہجے میں کچھ عقیدت نہیں تھی۔ ”ان کا کہنا ہے کہ آپ نصرت چچا کے گھر قیام کریں گے۔ کچھ دن آپ باہر بھی نہیں نکل سکیں گے کیونکہ سلطان آپ کی تلاش میں ہوگا۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ”نصرت چچا کون ہیں؟“ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

”اجی، بڑے نیک آدمی ہیں، وہ۔“ گامے شاہ نے بے حد احترام سے کہا۔ ”میں انہیں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ باس نہیں جانتے، ان کو..... لیکن باس نے مجھ سے کہا کہ شاہ جی کو اچھے ماحول میں رکھنا ضروری ہے اور جگہ مجھے تجویز کرنا ہوگی۔ آپ کو وہاں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ نصرت چچا کا ہمارے دھندوں سے کوئی تعلق نہیں۔“

”اور میرا سامان؟“

”جو کچھ آپ کہیں گے، نصرت چچا کے بنگلے پر پہنچا دیا جائے گا۔“ گامے شاہ نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”آپ فہرست بنا دیتے جیے گا۔ بس آپ کو اتنی تکلیف ہوگی کہ کچھ روز آپ مظہر عام پر نہیں آ سکیں گے۔“

”خیر..... باہر نکلنے سے تو مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔“ میں نے دوائے غیاب کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

”بے شک..... بے شک.....“ گامے شاہ نے جھومتے ہوئے تائید کی۔

اسی وقت اس کے ایک گرو گے نے آ کر اطلاع دی کہ نصرت چچا آ گئے ہیں۔ ”انہیں یہیں لے آؤ۔“ گامے شاہ نے حکم دیا۔

چند لمحے بعد میں نصرت چچا کے دیدار سے فیض یاب ہو رہا تھا۔

نصرت چچا عجیب مسسے سے بزرگ ثابت ہوئے۔ ان کا سر انڈے کی طرح صاف تھا۔ جثہ ایسا تھا کہ انہیں دیکھ کر سیٹی بجانے کو جی چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے، وضاحت بھی کر دوں۔ وہ اتنے نحی سے تھے کہ انہیں سیٹی کے زور پر آگے پیچھے کھسکا جاسکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ بے تکلفی ہوتے ہی ان کی پسلیاں گٹنے کی کوشش کروں گا۔ انکے چہرے سے کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم میرا اندازہ تھا کہ ان کی عمر چالیس اور اسی برس کے درمیان ہوگی۔ ان کی شخصیت میں عجیب سی بے چارگی تھی۔ انہیں دیکھ کر دل میں ان کے سر پر چپت لگانے کی تمنا پیدا ہوتی تھی..... لیکن ساتھ ہی ان پر ترس اور خود پر غصہ بھی آنے لگتا تھا۔ ان کے چہرے پر مظلومیت چھا جوں برس رہی تھی۔ آنکھوں میں دہی دہی حماقت کی جھلکیاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر بلا کھٹکے کہا جاسکتا تھا کہ وہ یتیم و سیر ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت ایک کھلا دعوت نامہ تھی۔ جو میرے خیال میں ہر شخص کو زیادتی پر اکساتا تھا۔

دیکھتے رہتے۔ ”مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولے۔ ”تو اب تم اکیلے ہو؟“
 ”مجھ پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ مجھے ایسا لگا، جیسے تازہ تازہ ہی یتیم ہوا ہوں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔“

”لیکن غم نہ کرو عیدو..... میں ابھی زندہ ہوں۔“

”جناب..... میں اب عید محمد ہوں، نہ عیدو..... اب میں ابو العمران ہوں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”اوہ اچھا..... میں سمجھ گیا۔“ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”تم نے بھی ہمیری طرح نام بدل لیا ہے..... ہے نا یہی بات؟“

میں احمقوں کی طرح منہ کھول کر رہ گیا۔

”ہاں بھی، اللہ بخشے تمہارے دادا ابا کو یقینی ابا حضور کو..... انہوں نے میرا نام شبرات خان رکھا تھا، جو بڑ کر شبرات ہی ہو گیا تھا۔“

میرے پیٹ میں قیمتی پھلتے لگے۔ جی تو چاہا کہ دادا مرحوم کو ان کی فہم و فراست پر بہ آواز بلند خراج تحسین پیش کروں، لیکن کچھ مصلحت اور کچھ ان کی بزرگی کا خیال کر کے چپ رہا۔ ان کے حلیے پر شراتی واقعی جتا تھا۔ بہر حال، میں نے کوشش کی کہ دادا مرحوم کے حوالے سے ان کا اور اپنا رشتہ سمجھ لوں۔ لیکن میں ارتھمیک میں شروع ہی سے کمزور تھا۔

”آپ کا ابا جان سے کیا رشتہ ہے؟“ بالآخر میں نے پوچھ لیا۔

”رمضان بھائی، میرے بڑے بھائی تھے۔“ انہوں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”یعنی میں تمہارا چچا ہوں۔“

گامے شاہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ وہ حیرت بھری نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی نصرت چچا کی طرف..... یہ پورا معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”اور بھئی گامے شاہ..... تم سناؤ، کیا حال ہے؟“ نصرت چچا کو اچانک اس کا خیال آیا۔
 ”معاف کرنا بھئی..... میں تمہیں تو بھول ہی گیا۔ دراصل کچھڑا ہوا خون ملا ہے۔ ہاں تو..... تم نے مجھے کیسے یاد کیا؟“

گامے شاہ کچھ دیر تو گنگ کھڑا رہا، پھر بولا۔ ”انہی حضرات کے سلسلے میں آپ کو زحمت دی تھی۔“

”کیا مطلب؟“ نصرت چچا چونکے۔

”جی وہ..... در..... دراصل ان کی روحانی قوتوں کی وجہ سے، ان کے کچھ دشمن بھی بن گئے ہیں۔“ گامے شاہ نے نصرت چچا سے نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری۔ ”اور وہ دشمن بے

گامے شاہ نے لپک کر ان کا استقبال کیا اور اس سے زیادہ لہک کر ان سے میرا تعارف کرایا۔ ”یہ بڑے پچنے ہوئے بزرگ ہیں۔“ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”قہر کی نگاہ ڈال دیں تو جسم میں آگ سی لگنے لگتی ہے۔ یہ شاہ صاحب ہیں..... ان کا نام لے کر میں گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔“

”تو صاحب، آپ ہی اپنا تعارف کرانے کی زحمت کیجیے۔“ نصرت چچا میری طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی آواز ان کی شخصیت کے برعکس بہت بھاری تھی۔

”جی..... میں بھی گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔“ میں نے نہ جانے کس جھونک میں جواب دیا۔

”جی..... ای..... ای!“ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔ ان کی نگاہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بارے میں ان کی بھی وہی رائے ہوگی، جو میں نے ان کے بارے میں قائم کی تھی۔

پھر مجھے اپنی حماقت کا خیال آیا۔ ”خادم کو ابو العمران کہتے ہیں۔“ میں نے سنبھل کر کہا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے بغور دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کڑ بڑا کر ان کی طرف دیکھا اور بوکھلا کر نظریں چرا لیں۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”تت..... تم..... تم محمد رمضان کے بیٹے ہو نا؟“ چند لمحوں بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”جی..... جی ہاں۔“ میں نے بے اختیار جواب دیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ..... یہ میاں مجھے کیسے جانتے ہیں۔

”عید محمد..... عیدو..... میرے چاند۔“ انہوں نے والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا۔ میں بالکل ہی بوکھلا کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں، مجھے مسلسل عیدو کے نام سے پکارتے ہوئے بری طرح بھیجنے جا رہے تھے۔ میرا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ اس پر ان کا بھیجنے..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کے منحنی بدن میں اتنی طاقت بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اب تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی طاقت انہوں نے کہاں چھپا کر رکھی ہوگی۔ مجھے تو وہ ان کے جسم سے علیحدہ کوئی بیرونی قوت معلوم ہوتی تھی۔

”عیدو..... رمضان بھائی کیسے ہیں؟ کیا حال ہے، ان کا؟ کہاں رہتے ہیں، وہ؟“ انہوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”جج..... جی، ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔“

انہوں نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا، لیکن میرے دونوں ہاتھ تھام کر مجھے غور سے

حد خطرناک ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں کچھ عرصہ اپنے گھر میں پناہ دے دیں۔ ویسے یہ اپنی روحانی قوت کے زور پر خود بھی ان سے نمٹ سکتے ہیں، لیکن اس طرح خلق خدا کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔“

”بس بس..... گا مے صاحب۔“ نصرت چچا نے اسے ٹوک دیا۔ ”ارے میاں..... یہ تو میرا پناخون ہے۔ میں اسے اکیلا نہیں رہنے دوں گا۔ اب تو یہ ہمیشہ میرے ہی ساتھ رہے گا۔“

”ان کے لہجے میں بے پناہ شفقت تھی۔“

”ایک منٹ..... میرا مطلب ہے، چچا جان۔“ میں نے انہیں ٹوک دیا۔ ”میں نے بی ایس سی کیا ہے اور سائنس سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ میرے اپنے گھر میں ایک تجربہ گاہ ہے، جس میں مختلف تجربات کرتا رہتا ہوں.....“

”کوئی بات نہیں بیٹے۔“ چچا نصرت نے مجھے اطمینان دلایا۔ ”تمہارے چچا کے غریب خانے میں تمہارے لیے کسی چیز کی کمی نہیں۔ میں تمہارے لیے ایسی تجربہ گاہ بناؤں گا کہ تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔“

”جی ہاں..... اور کیا۔“ گانے شاہ نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”آپ مجھے ان تمام اشیاء کی فہرست بنا دیجیے۔ جو آپ کو درکار ہیں۔ میں آپ کے گھر اپنے کسی آدمی کو بھیج دوں گا۔“

میں لا جواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور بھلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ مجھے اپنے نومولود چچا کے حدود اور بچہ پر بھی غور کرنا تھا۔ لیکن حالات کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دے رہے تھے۔

”ہاں میاں..... بس اب لے ہی چلو۔“ نصرت چچا نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

تمہاری چچی اور نو زیہ دونوں تمہیں دکھ کر بہت خوش ہوں گی۔“

میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ کاش میں بھی انہیں دیکھ کر خوش ہو سکوں۔

میں نصرت چچا کے ساتھ لان تک چلا آیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی، جہاں رستم سے میرا مقابلہ ہوا تھا۔ پورچ میں ایک لمبی سی کار کھڑی تھی۔ نصرت چچا میرا ہاتھ تھامے اس کی طرف بڑھ گئے۔ گویا وہ انہی کی کار تھی۔

”ایک منٹ چچا..... میں ذرا گانے شاہ سے کچھ بات کر لوں۔“ میں نے کہا اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر داخل دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اندر پہنچا تو گانے شاہ نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے شاہ صاحب؟“

اس نے پوچھا۔

”تم سلطان کو کب رہا کرو گے؟“

”آپ کے جانے کے دو گھنٹے بعد۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں ابھی اپنے گھر سے ہوتا ہوا چلا جاؤں۔ ضرورت کی تمام چیزیں میں خود ہی لے لوں گا۔“

”جی ہاں..... بہت مناسب خیال ہے۔“ گانے شاہ نے تائید کی اور پھر میرا ہاتھ تھام کر بڑی گرم جوشی سے دباتے ہوئے بولا۔ ”شاہ صاحب خدا کے لیے میری ہر زیادتی معاف کر دیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“

”کوئی بات نہیں گانے شاہ۔“ میں نے کہا۔ ”اور ہاں..... سلطان کو بغیر کوئی تکلیف پہنچائے رہا کر دینا۔“

”ضرور عالی مرتبت۔“ اس نے کہا۔ میں خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔

باہر نکل کر میں کار کی طرف چلا آیا۔ نصرت چچا کار میں میرے منتظر تھے اور خاصے بے چین نظر آ رہے تھے۔ مجھے دروازے سے نکلتے دیکھ کر انہوں نے انجمن اشارت کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے دوسری طرف جھکتے ہوئے میرے لیے دروازہ کھولا۔ میں اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے انہیں اپنے گھر کا پتہ سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”چچا..... میرے گھر ہوتے ہوئے چلیے۔ مجھے کچھ چیزیں لینا ہیں۔“

”اور وہ تمہارے دمن؟“ وہ اچانک ہی پریشان نظر آنے لگے۔

”فی الوقت تو وہ میرے متعلق پوری طرح اندھیرے میں ہیں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”البتہ دو گھنٹے بعد وہ خونخوار کتوں کی طرح میری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے ابھی میرے پاس کافی وقت ہے۔“

”پھر بھی، میں نہیں چاہتا کہ تم کسی خطرے میں پڑو۔“ انہوں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

”آپ بے فکر ہو کر چلیے۔ ابھی مجھے کوئی خطرہ نہیں۔“ میں نے انہیں یقین دلایا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ انہوں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ گاڑی ہنگلے کے گیٹ سے نکلی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کم از کم ایک مصیبت سے تو نکل ہی آیا تھا۔ دوسری مصیبت کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کب ختم ہوگی۔

”چچا..... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ راستے میں، میں نے نصرت چچا سے کہا۔ ”ابا جان نے کبھی اپنے کسی رشتے دار کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہی حال امی کا تھا آخر انہوں نے آپ

”آہ..... عید و میاں.....“

”اب میرا نام ابوالعمران ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔
 ”کیا کروں۔ ہر بار تمہارا اصل نام زبان پر آ جاتا ہے۔“ انہوں نے بے چارگی ظاہر کی۔

”ٹھیک ہے۔ تب میں آپ کو شہر آتی چچا کہا کروں گا۔“ میں نے بھنا کر کہا۔
 ”نہ..... نہ..... ایسا غضب نہ کرنا۔“ وہ بوکھلا گئے۔
 ”بس تو پھر آپ میرا نام یاد رکھیں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہاں..... تو آپ کچھ بتا رہے تھے۔“

”بس میاں..... رمضان بھائی دل کے بڑے کھرے آدمی تھے، لیکن بہت حساس اور زور درنج تھے۔ کسی بات پر اختلاف ہو گیا تھا، مجھ سے۔ اصول کی بات تھی۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ ان سے اڑ گیا۔ دھیرے دھیرے سارا خاندان اس میں ملوث ہوتا گیا۔ رمضان بھائی کو سبکی کا احساس ہوا۔ ایک دن وہ اچانک ہی غائب ہو گئے۔ اس دن کے بعد میں انہیں کبھی نہ دیکھ سکا۔ میں انہیں تلاش ہی کرتا رہ گیا۔ تم اس وقت بہت چھوٹے سے تھے۔“ نصرت چچا کی آواز بھرا گئی۔

میں احمقوں کی طرح منہ کھولے انہیں دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ تقریباً رونے ہی لگے تھے۔
 ”خیر، اب تم مل گئے ہو تو دل کو قرار آ گیا ہے۔“ انہوں نے سنبھلتے ہوئے کہا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی میرے محلے میں پہنچ گئی۔ اس وقت تک اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں نے نصرت چچا سے کہہ کر گاڑی اپنے گھر کے سامنے رکوائی۔ خوش قسمتی سے محلے کا کوئی فرد اس وقت باہر موجود نہیں تھا۔ میں گاڑی سے اتر آیا۔ چچا جی اتر آئے۔

”آپ گاڑی ہی میں رہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی پانچ منٹ میں لوٹ آؤں گا۔“
 ”اتنے عرصے کے بعد ملے ہو۔ میں تمہارا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ نصرت چچا افسردہ ہو کر بولے۔

میں الجھن میں پڑ گیا۔ انہیں باہر روکے رکھنے کا کوئی بہانہ نہیں سوچ رہا تھا۔ دراصل میرا ارادہ تھا کہ اندر داخل ہو کر دوائے غیاب کا استعمال کروں گا اور کسی دوسرے شہر کا رخ کروں گا۔ اس شہر کی حماقتوں اور ہنگاموں سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ لیکن فی الحال کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے تالا کھولا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ نصرت چچا میرے پیچھے پیچھے تھے۔ اندر سے کسی بلی کی وحشت زدہ آواز سنائی دے رہی تھی..... میرا مطلب ہے کہ بلی کی آواز میں

پریشانی کا تاثر تھا۔ بلیاں عام طور پر ایسی آوازیں اس وقت نکالا کرتی ہیں، جب وہ خود کو بری طرح گھرا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ آواز میری خواب گاہ کی طرف سے آرہی تھی۔ میں خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

خواب گاہ میں مجھے کوئی بلی دکھائی نہیں دی، لیکن اس کی آواز بھی معدوم ہو گئی تھی۔ میں نے بلی کو ذہن سے جھٹکا اور جلدی جلدی اپنے کپڑے، شیو کا سامان اور دیگر ضروری چیزیں ایک سوٹ کیس میں رکھنا شروع کر دیں۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میں گامے شاہ، اس کے گروہ اور پراسرار باس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان بدبختوں نے بلاوجہ مجھے تکلیف دی تھی۔ مجھے ان کا پتہ چلا کہ ان کا بیڑہ غرق کرنا تھا، لیکن نصرت چچا آڑے آ رہے تھے۔ دوسری طرف میں جانتا تھا کہ سلطان کا بیڑہ پکڑے گا۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال نصرت چچا کے ساتھ ہی قیام بہتر رہے گا۔ سلطان سے بھی پیچھا چھوٹ جائے گا اور تفریح بھی رہے گی۔ نصرت چچا نے اپنی بیوی کے ساتھ میری عم زاد کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ عم زاد تو یوں بھی ہمارے ہاں بے حد رومینٹک قسم کی چیز ہوتی ہے۔ عم زاد کا تصور کر کے میرا دل بڑی خوش گوار سی تیزی کے ساتھ ڈھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ ابھی مجھ سے ناشکرا پن سرزد ہوتے ہوئے رہ گیا ہے۔ رشتوں ناتوں کے اعتبار سے میں ایک بے آب و گیاہ صحرا کی مانند تھا۔ جس میں دور دور تک کوئی شجر سایہ دار تو کیا اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ اب آقائے گل، راز و رزق نے مجھے ایک عمر زاد عطا کی تھی اور میرا ارادہ اس سے راہ فرار اختیار کرنے کا تھا۔ واقعی یہ تو بہت بڑا ناشکرا پن تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوائے غیاب کی بڑی بوتل اور اپنے تجربات کا تمام سامان لے کر نصرت چچا کے ہاں منتقل ہو جاؤں گا۔ چچا کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

اچانک بلی پھر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ آواز بہت قریب سے آرہی تھی، لیکن بلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ممکن ہے بیڈ کے نیچے چھپی ہوئی ہو۔ لیکن آواز اسٹیل کی الماری کے قریب سے آرہی تھی۔ ”میاں عیدو..... یہ بلی کہاں ہے؟“ نصرت چچا نے متوجش انداز میں پوچھا۔
 ”یہیں کہیں ہوگی۔ شہرانی چچا۔“ میں نے ترکیب نہ کر کے کہا۔

”معاف کرنا میاں ابوالعمران..... آہستہ آہستہ تمہارے نام کا عادی ہو جاؤں گا۔“ نصرت چچا نے معذرت کی پھر بلی کی وحشت زدہ آواز سنائی دی تو وہ تقریباً اچھل پڑے۔
 ”میاں کہاں ہے، یہ بلی؟“ وہ پھر متوجش ہو گئے۔

میں نے بوسیدہ فلمی نسخہ سوٹ کیس میں رکھا اور ڈریس کی طرف بڑھا۔ دوائے غیاب کی بڑی بوتل میں نے ڈریس پر رکھی تھی۔ نصرت چچا غالباً آئینہ گیر الماری میں اپنا عکس دیکھنے کے

لیے بڑھے۔ اچانک بلی کی جارحانہ میاؤں سنائی دی۔ نصرت چچا بری طرح اچھلے اور پھر انہوں نے فرش پر بیٹھتے ہوئے پا جامے کا پانچہ اٹھایا اور اپنی پنڈلی سہلانے لگے۔ ”کیا ہوا چچا؟“ میں نے پوچھا۔

”بل..... بل..... لی..... لی..... بلی۔“ وہ لرزیدہ آواز میں بولے۔

”کہاں ہے بلی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہیں تھی۔ اس کی دم پر میرا پاؤں پڑ گیا تھا۔“ وہ بوکھلا کر بولے۔

”کیا کہہ رہے ہیں۔“ میں مزید حیران ہو گیا۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ وہ برہم ہو گئے۔ یہ ”دیکھو۔“ انہوں نے اپنی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بڑے زور کا پانچہ مارا ہے، کم بخت نے۔“ میں نے دیکھا۔ واقعی، ان کی پنڈلی پر ایک خراش تھی، جس سے خون رس رہا تھا۔ ”لیکن بلی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نظر نہیں آئی۔ مجھے تو تمہارا گھر آسب زدہ محسوس ہوتا ہے۔“

میں نے ان کا سوال گول کر دیا اور ڈریس کی طرف توجہ کی، لیکن دوا کی بوتل مجھے کہیں نظر نہیں آئی، میں بوکھلا کر رہ گیا۔ اچانک میرے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ ٹوٹی ہوئی بوتل کا ایک ٹکڑا تھا۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ دوائے غیاب ہی کی ٹوٹی ہوئی بوتل کا ٹکڑا تھا۔

”کیا تمہارا گھر آسب زدہ ہے؟“ نصرت چچا نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اچانک پوری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ بلی نے دوائے غیاب کی بوتل گرا دی تھی۔ بوتل ٹوٹنے کے بعد دوا ابہر نکلی ہوگی۔ کچھ دوا اب بھی فرش پر نظر آ رہی تھی۔ کچھ دوا یقیناً بلی نے چاٹ لی ہوگی اور..... غائب ہو گئی ہوگی۔

”جی ہاں..... جی ہاں..... یہاں آسب ہے۔“ میں نے نصرت چچا کو جواب دیا۔

”تو تم یہاں رہتے کیسے ہو..... جلدی نکلو، یہاں سے۔“ وہ بوکھلا کر بولے۔

”جج..... جی..... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور تجربات میں استعمال

ہونے والی جڑی بوٹیوں کا لفافہ اور تمام کپسول سوٹ کیس میں رکھ کر سوٹ کیس بند کر دیا۔ خیر نسخوں والی کتاب بھی میرے پاس تھی..... اور تمام ضروری جڑی بوٹیاں بھی۔ یہ میرے حق میں اچھا ہی تھا۔ میں نصرت چچا کے گھر فرصت سے دوا پر مزید تجربات کر سکتا تھا۔ اس عرصے میں مجھے سلطان سے بچنا تھا اور پھر دوا تیار کر کے اس کی مدد سے گامے شاہ کے گروہ کا میز اغرق بھی کرنا تھا۔

میں نے سوٹ کیس لاک کیا اور اسے اٹھا کر باہر نکل آیا۔ اس بار چچا میرے آگے آگے تھے۔ باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کیا، کنڈی لگا کر قفل ڈال دیا۔ میں مسکرائیل کے متعلق پریشان تھا۔ پتہ نہیں، وہ کہاں ہوا اور کیا کر رہا ہو۔ محلہ اس وقت بھی سنسان تھا میں اس مرتبہ عقبی نشست پر بیٹھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میرا یہاں سے کھسک لینا اچھا ہی ثابت ہوگا۔ خدا جانے، بلی کتنی دوا ڈکار گئی ہو۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کم بخت کتنا عرصہ غائب رہے گی۔ بہر حال، یہ بات طے تھی کہ اس عرصے میں وہ محلے میں زبردست خوف و ہراس پھیلا دے گی۔

نصرت چچا نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی۔ پھر وہ اپنے اور ابا جان کے قصے سنانے لگے۔ مجھے ان قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو عم زاد کے شہد آ گیس تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ڈوبا ہی رہنا چاہتا تھا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد گاڑی شام نگر کے علاقے میں داخل ہوئی۔ مجھے حیرت ہوئی..... کیونکہ وہ متمول لوگوں کا علاقہ تھا۔ وہاں کوئی بنگلہ چار سو گز سے کم رقبے پر بنا ہوا تھا، چچا نے میری حیرت بھانپ لی۔ بولے۔ ”مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنے چچا کا غریب خانہ پسند آئے گا۔“

میں جھینپ کر رہ گیا۔

نصرت چچا نے ایک بنگلے کے گیٹ پر کار روک دی۔ اور ہارن بجانے لگے۔ گیٹ کے دائیں جانب سنگ مرمر کی پلیٹ پر فوزیہ پیلس تحریر تھا۔ وہ نام پڑھ کر پھر میری دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں۔

پھر چوکیدار نے گیٹ کھول کر نصرت چچا کو فوجی انداز میں سلیوٹ کیا۔ چچا گاڑی اندر لے گئے۔ گاڑی پورچ میں پارک کر کے انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”چلو، بھئی بر خوردار..... اترو، تمہارا گھر آ گیا۔“ ان کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔

میں اپنا سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلا۔ اتنی دیر میں نصرت چچا اندر داخل ہو چکے تھے۔ میں بھی کٹھنی میں داخل ہو گیا۔ چچا مجھ سے کچھ آگے تھے۔ راہداری کے پہلے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے چیخے۔ ”ارے بھئی بیگم..... فوزیہ، دیکھو تو کون آیا ہے ارے بھئی اپنا عیدو آیا ہے۔“

میں اتنا پیچھے تھا کہ اپنے نام کی بے حرمتی پر احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”کون عیدو؟ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ایک نسوانی آواز سنائی دی، جس سے پختگی ظاہر ہو رہی تھی۔

”ارے بھئی..... رمضان بھائی تھے نا، ان کا اکھوتا بیٹا عید محمد۔ یاد ہے، سب پیار سے

”تم..... تم بہت شریر ہو۔“ چچا بوکھلا کر بولے۔ ”چچی کو سلام تو کر لو۔“
میں نے چچی کی طرف دیکھ کر انہیں سلام کیا۔ ”سلام علیکم، چچی صاحبان۔“ دراصل میں
اپنے خوابوں کا تاج محل سمار ہونے پر بری طرح بھنا گیا تھا۔

جمع کا صیغہ استعمال کرنے پر خفت سے ان کا سرخ چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ لیکن مجھے یہ
جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اپنے ظاہر کے برعکس بہت متحمل مزاج بلکہ نرم خو معلوم ہو رہی تھیں۔
کچھ سنہلنے کے بعد وہ مسکرائیں۔ ”تم واقعی شریر ہو۔“ انہوں نے کہا۔ ”لیکن میں نے برا نہیں
مانا۔“

میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا، لیکن میں اب بھی بھنایا ہوا تھا۔ وہ چڑیل تمثال بڑی دلاویز
اور محبت پاش نگاہوں سے چچی جان کو دیکھ رہی تھی، لیکن اس کی نگاہوں میں کچھ الجھن بھی تھی۔
شاید اس لیے کہ چچا نصرت کی مملکت وسیع و عریض یعنی میری چچی کے حدود اربعہ کا مکمل طور پر
احاطہ کرنے سے قاصر تھیں۔ پھر اس نے بڑی ادا سے سر کو ختم دیتے ہوئے انہیں سلام کیا۔ میں
شد زور رہ گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر چچی مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ”سلام کر رہی ہے۔“ انہوں نے
لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو جواب دے دیجیے۔“ میں نے نہایت اطمینان سے مشورہ دیا۔

”بڑے کاہل معلوم ہوتے ہو۔“ چچی نے چوٹ کی۔ ”لیکن یاد رکھو، میں تمہاری طرف
سے سلام کا جواب کبھی نہیں دوں گی۔ مجھ سے یہ امید نہ رکھنا۔“

میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ ”کیا مطلب؟“ میں نے بوکھا کر پوچھا۔
”مطلب یہ کہ یہ تمہیں سلام کر رہی ہے۔“ چچا نے وضاحت کی۔

”جی..... ی..... ی.....“ میں ہکا کر رہ گیا۔ لڑکی اب بھی ویسی ہی نظروں سے چچی کو
گھورے جا رہی تھی۔

”اور یہ دیکھ کیسے رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے بھئی..... تمہیں دیکھ رہی ہے۔ عجیب احق ہو۔“ چچا نے جواب دیا۔

میں نے دل ہی دل میں انا اللہ کا ورد شروع کر دیا۔ اگر وہ ان نظروں سے مجھے دیکھ رہی
تھی تو..... تو..... میں تو ان نظروں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ چچا کے گھر آتے

ہی مجھ پر اور مصیبتیں ٹوٹ پڑنے کو تیار ہو گئی ہیں۔ میں آنکھوں میں کیسے کیسے خوبصورت
رومانوی خواب بسائے یہاں آیا تھا اور تقدیر مجھے کیا دکھ دے رہی تھی۔

میں نے کمر ہمت کس کر ایک بار اس پر تفصیلی نظر ڈالی۔ رنگ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا..... بلکہ

اسے عیدو کہتے تھے۔“

”اچھا..... اچھا، کہاں ہے، عیدو۔“ خاتون کے لہجے میں لہک تھی۔

اسی وقت میں سوٹ کیس اٹھائے دروازے میں داخل ہو گیا۔ لیکن میرا سلام کے لیے
اٹھا ہوا ہاتھ پیشانی پر جم کر رہ گیا۔ میں نے انتہائی مردہ سے لہجے میں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ خاتون نے لہکتے ہوئے جواب دیا۔ جب کہ لڑکی غالباً شرم کے مارے
دہری ہو گئی۔ اس کا رد عمل مناسب تھا۔ اسے شرم آتی ہی چاہیے تھی۔ میں نے ڈرائنگ روم کا
جائزہ لیا۔ بہت آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا۔ بے حد وسیع بھی تھا۔ لیکن خاتون کو دیکھتے ہوئے کچھ
تنگ محسوس ہونے لگتا تھا اور لڑکی پر نظر پڑتی تو ہر چیز الٹی نظر آنے لگتی۔ فرش، چھت کی جگہ.....
صوفے اور میزیں الٹی رکھی ہوئی..... ہر کھڑا ہوا شخص لیٹا ہوا معلوم ہوتا تھا..... کچھ ایسی ہی
کیفیت تھی ان آنکھوں کی.....

”بیٹھو بیٹھے عیدو..... اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ کوئی تکلف نہ کرنا۔“ نصرت چچا بولے۔

اس بار میری کھوپڑی بالکل ہی آؤٹ ہو گئی۔ ”میں بہت بے تکلف آدمی ہوں شہزادی
چچا۔“ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ میں ذرا بھی تکلف نہیں کروں
گا۔“

نصرت چچا نے جھینپ کر خاتون کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولے۔ ”بھئی بیگم، وہی
خاندانی معاملہ ہے۔ میری طرح یہ بھی باپ کے عطا کردہ نام سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ اب
یہ ابوالعمران ہے۔“

خاتون نے غور سے مجھے دیکھا اور گل افشانی فرمائی۔ ”ویسے عید محمد بھی برا نام نہیں
ہے..... بلکہ میں کہوں گی، اچھا نام ہے۔“

میں نے خونخوار نظروں سے انہیں دیکھا لیکن فوراً ہی سہم کر رہ گیا۔ وہ چہرے سے بہت
خوفناک نظر آئی تھیں۔

”بیٹے..... یہ تمہاری چچی ہیں۔“ نصرت چچا نے خاتون سے تعارف کرایا اور میں نے
دل ہی دل میں دعا مانگنا شروع کر دی کہ صاحبزادی سے بھی تعارف نہ کرا بیٹھیں۔

”جی..... ای..... ای.....“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلانے کی کوشش کرتے
ہوئے کہا۔ ”یہ چچی..... نہیں..... میں نہیں مان سکتا۔“

”وہ کیوں بھئی۔“ چچا اور چچی بے یک آواز بولے۔

”جی..... یہ..... آپ کی پسلی سے بنی ہوئی تو نہیں لگتیں۔“ میں نے چچی کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے چچا سے کہا۔

میں تو کہوں گا اس کی رنگت بے حد مناسب تھی۔ اتنا گہرا سیاہ رنگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔ نگاہ ٹٹولنے کے باوجود اس کے نقوش کا جائزہ نہیں لے سکتی تھی۔ اندھیرے میں تو اس کے نظر آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لیے اس کا رنگ مجھے بھلا لگا۔ لیکن اس کی دونوں آنکھوں میں نفاق تھا..... بلکہ ان کی آپس میں نفی ہی نہیں تھی۔ ان آنکھوں کی وجہ سے ان کا چہرہ جیومیٹری کی ایک ایسی شکل بن کر رہ گیا تھا جس پر تحقیق کی جاسکتی تھی۔ کیونکہ اس کے اضلاع کی گنتی نامکن تھی اور یقینی طور پر وہ دائرہ بھی نہیں تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں مختلف زاویے بناتی تھیں۔ ایک زاویہ منفرد اور دوسرا حادہ تھا۔ میں زمانہ تعلیم میں، جیومیٹری میں بہت دلچسپی لیتا رہا تھا۔ چنانچہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے دونوں زاویوں کا مجموعہ زاویہ مستقیم کے برابر ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا تھا کہ ایک آنکھ کا زاویہ تیس درجے اور دوسرا ایک سو پچاس درجے کا تھا۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس لڑکی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنا کیسا خوفناک تجربہ ہوگا۔ میں سوچتا رہا اور لرزتا رہا۔ پھر مجھے دوائے غیاب کا خیال آیا اور میں مطمئن ہو گیا۔ مجھے تو دوا پر کام کرنا تھا۔ اس لڑکی کی بھول بھلیاں آنکھوں میں الجھنے کی فرصت ہی کہاں ملتی۔

”بیٹھنا بیٹے۔“ اس بار چچی نے فرمائش کی۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ لیکن اپنی عم زاد سے نظریں چرا رہا تھا۔

”بھئی چائے بناؤ نا۔“ چچا نے چچی سے کہا۔ پھر انہیں کچھ خیال آ گیا۔ انہوں نے

پوچھا۔ ”فوزیہ کہاں ہے۔“

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے حیرت سے اس لڑکی کی طرف دیکھا، جواب بڑی وارفتگی سے نصرت چچا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ میری طرف متوجہ نہ ہو۔ میں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

”ابھی بلواتی ہوں اسے۔“ چچی نے کہا اور اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو گئیں، جواب صوفے کا بھانہ بنا کر نہ جانے کسے دیکھ رہی تھی۔ ”جاؤ نور العین، چائے بنا کر لاؤ اور اس سے پہلے فوزیہ کو بھیج دینا۔ اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہے۔“

مجھے وہ سب کچھ خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس لڑکی کا نام سن کر (خدا معاف کرے) مجھے والد مرحوم پر غصہ آ گیا۔ عجیب بات تھی۔ میں خاصا معقول اور خوب رو جوان ہو کر بھی عید محمد..... بلکہ عید و بنادیا گیا جب کہ وہ بلیکی لڑکی نور العین کہلائی۔ سو پہلے مجھے والد مرحوم پر غصہ آیا، پھر اس لڑکی کے والدین پر پیارا آیا اور اس کے بعد مجھے اس لڑکی پر رشک آ گیا۔ وہ کج نگاہ نور العین چلی گئی تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ غنچہ شوق لگا ہے کھلنے..... یعنی

میرے خوابوں کا مسہر تاج محل پھر سے زندہ ہو گیا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بھیگتی لڑکی میری عم زاد نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھ جیسے خوب رو جوان کی عم زاد یقیناً بہت حسین ہوگی۔ لیکن چچی جان کا حدود اور بعد دیکھ کر میرا دل پھر اندیشوں سے بھر گیا۔

ڈرائنگ روم کے اندر کی جانب کھلنے والے دروازے پر آہٹوں کی گونج سنائی دی..... پھر کوئی اندر آ گیا۔ ”جی امی..... آپ نے بلوایا ہے مجھے؟“ ایک بے حد سریلی نسوانی آواز سنائی دی، لیکن میری ہمت نہ ہوئی کہ نظر اٹھا کر ہی دیکھ لیتا۔ خدا جانے سُننے کیا منظر ہو۔ آج صبح ہی سے میری آنکھوں پر عذاب اتر رہا ہے تھے۔ ویسے بھی دودھ کا جلا چھاپھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔

”ہاں بیٹے، میں نے بلوایا تھا تمہیں۔“ چچی جان نے کہا۔ ”ان کو آداب کرو۔ یہ

تمہارے تایا زاد بھائی عید وہیں۔“ پھر انہوں نے گویا صحیح فرمائی۔ ”عید محمد.....“

میں نے احتجاج کرنے کی نیت سے نظریں اٹھائیں، لیکن اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ میری نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ میری عم زاد ہو سکتی ہے۔ میں مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اس ایک نظر کا تاثر تو میں بیان ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ چچی اور نصرت چچا میری شاہ میں کیا کیا گل افشائیاں کر رہے ہیں اور میرا جغرافیہ کس کس طرح بیان کر رہے ہیں۔ میں تو ایک طلسم میں گرفتار تھا۔

پھر اس کی سریلی آواز ہی نے اس کے حسن کا طلسم توڑا۔ ”آداب عرض ہے، عید و بھیا۔“ میں یک لخت ہوش میں آ گیا۔ ایک تو بھیا اور پھر عید..... میرا سارا وجود غصے میں پھنک کر رہ گیا۔ لیکن اس نازنین پر غصہ اتارنا حماقت کی بات تھی۔ ”فوجیہ..... میرا نام ابو العمران ہے۔“ میں نے چچا جان کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا نام فوجیہ نہیں..... فوزیہ ہے۔“ وہ بے حد چڑ کر بولی۔

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس نام کو ہمیشہ ایسے ہی ادا کرتا ہوں۔ یوں بھی آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے، جیسے کوئی لشکر جہاں صرف آ رہا ہو کر پیش قدمی کر رہا ہے..... تسخیر کرتا جا رہا ہے۔“

”کس قسم کا لشکر۔“ اس نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ وہ اور زیادہ برا مان گی تھی۔ ”اس کی میں وضاحت نہیں کر سکتا۔“ میں نے خوشگوار لہجے میں معذرت کی۔ میں اسے کیسے سمجھا سکتا تھا کہ میں جلوؤں کے لشکر جہاں کی بات کر رہا ہوں۔

”دیکھیں عید و بھائی..... میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی میرا نام اس طرح بگاڑے۔“ اس کے لہجے میں اب بھی برہمی تھی۔

”میرا نام ابو العمران ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ اب لہجہ نرم رکھنا خاصا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

”لیکن آپ پر یہی نام چلتا ہے۔“ اس نے شریر لہجے میں اصرار کیا۔

مجھے بہت زور کا غصہ آیا چچا اور چچی بھانپ گئے، چنانچہ انہوں نے میرے دونوں ناموں کی تاریخ بیان کرنا شروع کر دی۔

”لیکن امی.....؟ عید و بھائی کا کہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔“

”اس کے اس نام معقول اصرار نے مجھے اس سے خاصا متنفر کر دیا۔ میں غصے کی شدت سے کانپنے لگا۔

”نہیں بیٹے، تم انہیں اس نام سے نہیں پکارو گی۔“ نصرت چچا نے سمجھایا۔

”پھر میں انہیں کیا کہہ کر پکاروں۔“ اس نے ٹھنک کر پوچھا۔ ”ابو العمران تو بہت بڑا نام ہے۔“

میرا جی چاہا، کہوں کہ کسی نام سے پکارنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اجی، سنتے ہیں..... کہہ کر پکار لیا کرو۔ لیکن میں نے بروقت اپنی زبان پر قابو پایا۔

”نام سے پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔“ چچی نے گویا میرے خیالات بڑھ لیے لیکن اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کہا، وہ میرے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ ”تم انہیں بھائی جان کہہ لیا کرو۔“ انہوں نے گویا میرے سر پر تھوڑا بجایا۔

میں نے نصرت چچا کی مداخلت پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ”نہیں بھئی..... اتنا فرق تھوڑا ہی ہے، ان کی عمروں میں۔“ وہ بولے۔ ”زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال کا فرق ہوگا۔“

”فرق تو ایک دن کا بھی فرق کہلائے گا۔“ چچی نے دلیل پیش کی، جسے چچا نے نظر انداز کر دیا۔

”اچھا..... ابو بھائی کیسار ہے گا؟“ انہوں نے فوزیہ سے پوچھا۔

”دیری فائن۔“ فوزیہ نے خوش ہو کر کہا۔

”اور عمر میں کوئی زیادہ فرق تو ہے نہیں..... ابو ہی جو کہہ لیا کرو۔“ چچی جھنجھٹا کر بولیں۔ چچا جزیب ہو کر رہ گئے۔ میرا یہ حال تھا کہ جل جل کر سارا خون خشک ہو گیا ہوگا۔ عجیب لوگ تھے مجھے یقین ہو گیا کہ اس چار دیواری میں تو میں اپنے آپ میں ہی جھلس کر مرنے جاؤں گا۔

”ہاں تو ابو..... بھائی۔“ اس نام معقول لڑکی نے مجھے اس طرح مخاطب کیا کہ ابو اور بھائی واضح طور پر الگ الگ ہو کر رہ گئے۔ ”کیا مشاغل ہیں آپ کے؟“

میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس سوال کے لیے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ پھر میری مشکل نور العین نے آسان کر دی۔ وہ ٹرائی پر چائے کے لوازمات اور کئی قسم کے کسکٹ سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”بسکٹوں کی کیا تک ہے۔“ نصرت چچا نے اسے ڈانٹا۔ ”ایک گھنٹے بعد کھانا کھایا جائے گا۔“

”تو بس کسٹ نہیں لیجئے۔“ نور العین منمنائی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ موصوفہ ناک کے زور پر بولنے کی عادی ہیں اور ان کے ادا کیے ہوئے ہر لفظ پر نون غنہ کا اثر غالب رہتا ہے۔

”اچھا..... اچھا، ٹھیک ہے۔“ چچی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اب یہ عید و میاں..... میرا مطلب ہے، عمران میاں کا سوٹ کیس اوپر لے جاؤ اور ان کے لیے اوپر کا کمرہ صاف کر دو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے معذرت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ان کا انداز مخاطب یعنی عمران بھائی پسند آیا تھا، لہذا میں نے دل ہی دل میں صدق دل سے انہیں معاف کر دیا۔

چائے کے دوران خاموشی رہی۔ پھر چچی نے فوزیہ سے کہا۔ ”جاؤ، عمران کو ان کا کمرہ دکھا دو جا کر۔“ فوزیہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس کے انداز سے ناگواری عیاں تھی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”آئیے۔“ اس نے کہا اور اندر والے دروازے کی طرف چل دی میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دروازے سے نکلتے ہی سامنے زینے تھے۔ زینوں پر چڑھ کر ہم اوپری منزل پر پہنچے۔ ”یہ رہا آپ کا کمرہ۔“ فوزیہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو مجھے دکھائیے ناکمرہ۔“ میں نے شریر لہجے میں کہا۔ ”کیا مطلب، آپ کا۔“ اس کا موڈ بگڑ گیا۔ ”خود دیکھ لیں نا..... یا اندھے ہیں۔“ چچی جان نے آپ سے کہا تھا.....

”ارے وہ تو محاورہ تھا آ: تو بالکل ہی بے وقوف ہیں۔“ اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”میں فیضو سے کہہ کر آپ کا سامان اوپر بھجوانی ہوں۔“ ”یہ تو بتاتی جائیں، آپ کا کمرہ کہاں ہے۔“

”کیوں..... میرے کمرے سے آپ کو کیا دلچسپی ہے؟“ اس نے آنکھیں نکالیں۔ ”میرا مطلب ہے، پڑوسی اچھے ہوں تو زندگی جنت بن جاتی ہے۔“ ”تب تو سمجھ لیں، جنت کچی ہوگئی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”آپ کی پڑوسن امی ہیں۔“ پھر وہ واپس چلی گئی۔

میں نے دل ہی دل میں سر پیٹتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ کمرہ خاصا کشادہ اور ہوا

میں ان کا مطلوبہ برف ہوں..... اور پھر مجھ سے والہانہ انداز میں لپٹ گئے۔ ”کہاں مر گئے تھے، عمران کے ابا؟“ انہوں نے دردناک لہجے میں پوچھا۔

ابو العمران کا اس سے سلیس ترجمہ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ لیکن ان کی اس بے تکلفی کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کسی آفت ناگہانی کی طرح نازل ہوئے تھے۔ میرے لیے خاموشی ہی میں عافیت تھی۔

پھر نصرت چچا نے سنبھالا لیا۔ ”کہو بھی خان صاحب، کیسے زحمت کی۔“ انہوں نے خان صاحب کے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق کو دیکھ کر پوچھا۔

”شکار کرنے نکلا ہوں۔“ خان صاحب نے بندوق کی نال میری طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کس کا؟ میرا؟“ میں بوکھلا گیا۔

”نہیں..... مرغابیوں کا۔“ انہوں نے نال نیچی کر لی۔ ”نصرت صاحب کو مدعو کرنے آیا ہوں۔ لیکن اب تم بھی ساتھ چلو گے“

”کہاں چلیں گے؟“ نصرت چچا نے پوچھا کیونکہ میں تو دم بخود ہو گیا تھا۔

”تھر پار کر۔“

ان کا جواب سن کر میری سٹی گم ہو گئی۔ اس سردی میں تھر پار کر..... اور مرغابیوں کا شکار۔ اتنی زحمت کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے احتجاج کیا۔ ”آپ جتنی مرغابیاں کہیں، میں یہیں سے خرید دوں گا۔“

”ہم خود نہیں خرید سکتے کیا؟“ خان صاحب براہمان گئے۔ ”بس میاں..... ہم نے ارادہ کر لیا ہے تھر پار کر ضرور چلیں گے۔“

”لیکن ہفتہ بھر تو انتظام میں صرف ہو جائے گا۔ پھر ریل کا ٹکٹ حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔“ میں نے دلیل دی۔

”تمام انتظامات مکمل ہیں۔“ انہوں نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ”ٹکٹ موجود ہیں۔ رہائش کا انتظام ہولو کے سپرد ہے وہ پہلے ہی جا چکا ہے اور اب ہماری آمد کا منتظر ہوگا۔“

”یہ ہولو کوئی نیا جاناور ہے؟“

”ارے وہی ہمارا ملازم خاص جھدو۔ چھید کو انگریزی میں ہول کہتے ہیں نا۔ بس ہم نے اس کے نام کو جدید کر دیا ہے۔“

میں سرد ہنسا رہ گیا۔ ”لیکن میں تو نہیں چل سکتا۔“ میں نے انکار کر دیا۔

”کیا حرج ہے؟“ اس بار نصرت چچا نے مداخلت کی۔ ”تفریح ہو جائے گی۔ کچھ دل

دار تھا، ایک طرف آرام دہ مسہری لگی ہوئی تھی۔ دوسری طرف خوبصورت صوفہ سیٹ تھا اور چند کرسیاں بھی تھیں۔ گھر کا ماحول خاصا پرسکون تھا۔

میں مسہری پر دراز ہو گیا۔ واقعات بہت تیزی سے گزرے تھے اور اب تک مجھے سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ پہلے تو میرا ذہن گامے شاہ..... اور پھر اس کے باس میں الجھا رہا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ گامے شاہ کا باس مجھے سلطان سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں میں یہاں..... نصرت چچا کے ہاں مقیم تھا۔ یعنی باس کی خواہش کے مطابق..... دوسری طرف

نصرت چچا، میرے چچا ثابت ہوئے تھے۔ کم از کم ان کا دعوا تو یہی تھا۔ لیکن میں اتنا بھولا بھی نہیں تھا کہ اس بات پر یقین کر لیتا۔ مجھے تو یہ بھی اس پر اسرار باس ہی کا کوئی چکر معلوم ہوتا تھا۔

اس دوران فیضو میرا سامان اوپر چھوڑ گیا تھا پھر کھانے کا باوا آ گیا۔

نصرت چچا نے کھانے کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ کھانے کے دوران خاموشی رہی، کھانے سے فارغ ہو کر ہم چائے پی رہے تھے کہ ملازم نے کسی خان صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔

چچی جان اور فوزیہ اوپر چلی گئیں اور نصرت چچا نے خان صاحب کو وہیں بلوایا۔ خان صاحب آئے اور انہوں نے چچا سے مصافحہ کیا۔ پھر وہ میری طرف جھپٹے اور مجھ سے معاف کر ڈالا۔

”ارے بلبل میاں..... تم یہاں کیسے؟“ انہوں نے لہک کر پوچھا۔

”تو تم انہیں جانتے ہو۔“ نصرت چچا نے مداخلت کی۔ ”ارے میاں..... یہ میرا بھتیجا ہے..... میرے مرحوم بھائی کی اکلوتی اولاد۔“ ان کا لہجہ فخریہ تھا۔

ادھر خان صاحب کو دیکھتے ہی میرے دیوتا کوچ کر گئے تھے۔ خان صاحب سے میری پرانی یاد اللہ تھی۔ شکار کے شوقین تھے اور انیون کی پڑیا ہر وقت ان کی جیب میں رہتی تھی۔ میں نے انہیں ہر وقت عالم بے خودی میں ہی دیکھا تھا۔ خود یعنی ہوش سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

کئی بار سندھ کے ریگزاروں میں ان کے ساتھ مرغابیوں کا شکار کھیلنے کا اتفاق ہوا۔ میں تو خیر کسی شارق طار میں نہیں تھا، مگر انہیں بھی اس معاملے میں صفر ہی پایا۔ البتہ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ مرغابیاں خود ان کی بندوق کی نال کے سامنے کیوں آ جاتی ہیں۔ کم از کم میں نے آج تک

انہیں دانستہ شکار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دراز قامت اور قوی الجشہ تھے اور اپنا سلسلہ نسب چنگیز خاں سے جوڑتے تھے ان کی تحقیق تھی..... کہ صحرائے گوبی کا وہ فرزند عظیم بنی انیون سے شغف رکھتا تھا۔ سند کے طور پر اس کا کئی کئی دن گھوڑے پر بیٹھے رہنا پیش کرتے تھے۔ ان کے خیال

میں آدمی صرف عالم مدہوشی ہی میں ایسا کر سکتا ہے۔

انہوں نے ایک بار پیچھے ہٹ کر مجھے بغور دیکھا۔ گویا اس امر کی تصدیق کر رہے ہوں کہ

بہل جائے گا۔“

”چچا..... میں ملازمت کرتا ہوں۔“

”اب نہیں کرو گے۔ کس چیز کی کمی ہے یہاں۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ بس کل ہی

استعفا بھجوا دو۔“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس فیصلہ ہو گیا۔ اب تم ملازمت نہیں کرو گے اور کل ہم بسلسلہ

شکار تھر پار کر روانہ ہو رہے ہیں۔“

”کل؟“ خان صاحب چلائے۔“ ارے صاحب..... ایک گھنٹے بعد ٹرین روانہ ہونے

والی ہے، ابھی چلنا ہے۔“

”ابھی تو ممکن نہیں۔“ میں شکار پر جانے کے موذ میں نہیں تھا۔

”کیسے ممکن نہیں۔“ خان صاحب نے نال کا رخ میری طرف کر دیا۔

نال سے زیادہ میری نظر ٹریگر پر تھی۔ جوش جذبات میں انہوں نے اس پر کچھ زیادہ ہی

دباؤ ڈال رکھا تھا۔ پھر میں دیکھ رہا تھا کہ دباؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ایسے میں اقرار کرنے ہی

میں بہتری تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ان دنوں اس علاقے میں فوجی مشقیں ہو رہی ہیں۔ ”ممکن

ہے، کوئی گولی بہک کر ہمارا مزاج پوچھ لے۔“ میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا تو خان صاحب

بولے۔ ”ہم اس علاقے میں نہیں جائیں گے۔“

”لیکن گولیاں سفر کرتے وقت سمتوں کا تعین نہیں کرتیں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”ارے..... تو مشقوں کے دوران اصلی گولہ بارود تھوڑا ہی استعمال کرتا ہے۔“ انہوں

نے مجھے تسلی دی۔

”میں نے تو یہی سنا ہے۔“

”تمہاری معلومات بے حد ناقص ہیں۔“ انہوں نے مجھے حقارت بھری نظروں سے

دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر یہ سچ بھی ہے تو فوجیوں نے اپنے علاقے کی حد بندی کر رکھی ہوگی۔

ہم اس طرف جائیں گے ہی نہیں۔“

جب ایک ایک کر کے انہوں نے میرے تمام اعتراضات مسترد کر دیے اور چار پانچ

مرتبہ مجھے اپنی بندوق کی زد میں لے چکے تو میں نے سر تسلیم خم کر لیا اور خود کو ان کی تحویل میں

دے دیا کہ جان ہے تو جہان ہے۔

خان صاحب نے ہمیں تیار ہونے کی مہلت ہی نہیں دی۔ میں نے بمشکل دوائے غیاب

اور اس کے چند تریانی کپسول رکھ ہی لیے۔ پھر ہم شکار کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

ایک رات ریل میں گزری۔ دوسرے روز ہم ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہ گاؤں، ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ منزل مقصود نہیں ہے بلکہ ابھی ہمیں مزید سفر کرنا ہے۔ غالباً خان صاحب، انگریزی فلموں جیسا حقیقی ایڈوینچر چاہتے ہیں۔ ناچار رات کو نیل گاڑی پر سفر کرنا پڑا۔ اگلی شام کو ہم ایک اور گاؤں میں پہنچے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد خان صاحب اپنے ملازم خاص ہولو کی تلاش میں نکلے۔ بعد تلاش بسیار وہ ملا۔ اور اس نے انکشاف کیا کہ ہمارا قیام گاؤں کے وڈیرے اللہ بچا یوار بانی کے ہاں ہوگا۔

سراے سے ہم لوگ وڈیرے کے ہاں پہنچے۔ وڈیرا مہمان نوازی کے سلسلے میں خطرناک حد تک روایت پرست ثابت ہوا۔ پہلے روز تو اس نے زبردست خاطر مدارت کی دوسرے روز حال احوال پوچھا اور تیسرے روز آمد کی غرض و غایت دریافت کرنے کی نوبت آئی۔ اس دوران کم از کم میں سخت بور ہوتا رہا۔ وڈیرے کو جب بھی آمد کا مقصد بتانے کی کوشش کی جاتی، وہ کہتا۔ ”ابھی نہیں، سائیں..... ابھی میرے کو تھوڑی سی کھاطر تو کرنے دو۔ پھر دیکھیں گے۔“ تیسرے روز اس نے خود دریافت کیا۔ ”کہو سائیں..... کیسے نواز اہم لوگوں کو۔“

”بس شہر میں دل نہیں لگ رہا تھا۔“ خان صاحب نے بے نیازانہ کہا۔ ”اس لیے یہاں چلے آئے۔“

اس جملہ معترضہ پر وڈیرے کو غصہ آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن غالباً احساس مہمان نوازی آڑے آ گیا۔

”پھر بھی سائیں..... کوئی مقصد تو ہوگا۔“ اس نے خان صاحب کو نگاہوں سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”مقصد شکار کھیلنا ہے۔“ خان صاحب نے عادتاً بندوق کی نال اس کے سینے کی طرف کر دی۔

”کیا کہتے ہو سائیں۔“ وڈیرے نے بوکھلا کر بندوق کی نال پکڑ لی۔ ”ہمارا شکار کھیلو گے کیا؟“

”نہیں..... نہیں..... مرغابیوں کا۔“

”اوہ۔“ وڈیرے نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”لیکن آپ تو مرد ہے، سائیں۔“

”تو پھر؟“ خان صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”شیر شکار کرونا سائیں۔ مرغابیوں کا شکار تو بچوں کے لیے ہوتا ہے۔“

میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ فلموں اور تصویر یوں ہی میں یہ جلیل القدر درندہ خاصا ڈراؤنا نظر آتا ہے۔ حقیقت میں دیکھنا، خدا جانے کیسا ثابت ہو۔ ویسے بھی میں خطرے

کے اور اپنے درمیان معقول فاصلہ برقرار رکھنے کا قائل تھا، لیکن احتجاج کر کے اپنی مردانگی کی توہین بھی نہیں کرا سکتا تھا، چنانچہ خاموش رہا۔ ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ خان صاحب اس بلا کو نال ہی دیں گے نصرت چچا کا تو شکار سے پہلے ہی حال خراب ہو گیا تھا۔ انہیں بخار تھا۔

”شیر یہاں کہاں؟“ خان صاحب نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔
 ”ہے کیوں نہیں، سائیں؟“ وڈیرہ بولا۔ ”کل ہی اس نے گوٹھ میں گاؤں کے ایک بچے کو مار ڈالا۔ آپ اس کا شکار کھیلو سائیں۔ مرغابی آپ کے شایان شان نہیں آپ تو مرد ہے نا۔“

اس نے پھر خان صاحب کی مردانگی کو لاکار دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے جن چٹوں پر تکیہ کیا تھا، وہی ہوا دینے لگے خان صاحب، مردانگی کے معاملے میں خاصے حساس واقع ہوئے تھے، بولے۔ ”ٹھیک ہے، ہم اس شیر کا شکار کھیلیں گے۔“
 ”آپ کا جملہ بہت خوبصورت ہے۔ خان صاحب۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ”البتہ آپ واحد کی بجائے جمع کا صیغہ استعمال کر گئے ہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“

”آپ شاید یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ میں بھی شیر کا شکار کھیلوں گا۔“
 ”نہیں۔ میں ہم ہی نہیں کہا چاہ رہا تھا۔“ انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔
 ”لیکن غلطی میری ہی ہے۔“ میں نے ان کی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ایسے کڑیل مرد..... آہا، کیا بات ہے، آپ کی۔ آپ تو اکیلے دس بیس پر بھاری ہیں۔ آپ کے لیے تو جمع کا صیغہ ہی استعمال ہونا چاہیے۔ آپ واقعی خود کو ہم کہہ سکتے ہیں۔ میں آئندہ آپ کو خانان صاحبان کہا کروں گا۔“ میں نے الفاظ کا جس قدر مکھن دستیاب ہو سکا، خان صاحب پر تھوپ دیا۔

خان صاحب کا سینہ قدرے پھول گیا، لیکن فوراً ہی وہ معمول پر آ گئے۔ ”میرا مطلب تھا تم اور ہم شیر کا شکار کھیلیں گے۔“ انہوں نے کہا۔
 ”اس جملے میں لفظ تم فالتو ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ انہوں نے آنکھیں نکالیں۔ ”تم شکار نہیں کھیلو گے؟“
 ”جی..... دو..... دراصل میں کلنڈر انہیں ہوں۔ بچپن میں گلی ڈنڈا تک نہیں کھیلا۔“

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔
 ”تو تم شکار کھیلنے کی بجائے شکار کرنا۔“ انہوں نے تبصیح کر ڈالی۔
 ”میں اسے ظلم سمجھتا ہوں۔“

”بزدل کہیں کے تمہیں چلنا پڑے گا۔“ انہوں نے بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا۔
 ”دو..... دیکھئے خان صاحب..... بات یہ ہے کہ مجھے بخار ہو گیا ہے۔“ میں گھگھایا۔
 ”بخار ہوا تو تمہیں چھوڑ جائیں گے۔“ خان صاحب نے جواب دیا۔
 وڈیرہ شاید بری طرح میری جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً تھرما میٹر منگوالیا۔
 میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ میاں سے بخار طلب کرتا رہا۔ تھرما میٹر آنے کے بعد ٹمپرچر چیک کیا گیا تو نارمل سے بھی چار درجے نیچے تھا۔
 ”تمہیں بخار نہیں ہے۔“ خان صاحب نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔
 ”ٹھنڈ..... ٹھنڈا بخار ہے۔“ میں نے فریاد کی۔

”بخار نانوے درجے سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ تمہارا ٹمپرچر چورانوے ہے۔“
 خان صاحب نے دلیل دی۔ ”بس، صبح تمہیں شکار پر چلنا ہے۔“
 ”صبح کیوں سائیں..... ابھی رات کو مزہ رہے گا۔“ وڈیرے نے ٹانگ اڑائی۔ ”شیر رات کو بچا کھپا گئے کا بچہ ہکانے کے لیے ضرور آئے گا۔ جیہی مار کرانا اس کو۔“
 خان صاحب بھی خاصے جزبہ ہوئے لیکن مردانگی کے ایک اور چیلنج نے انہیں یکا کر دیا۔
 میں دل ہی دل میں اپنی تقدیر کو کوست رہا۔ شہر میں ایک رستم کو بھگت کے بیٹھا تھا کہ اب جنگل کے رستم سے پالا پڑ گیا۔ اس بار معاملہ البتہ مشکل تھا۔ جنگل کے رستم سے تو مصالحت بھی ممکن نہیں تھی۔ اور نہ ہی خوشامد کا اس پر کوئی اثر ہو سکتا تھا۔

طے یہ پایا کہ رات کا کھانا کھا کر شکار پر چلیں گے۔ اس دوران، میں بار بار تھرما میٹر آزما تا رہا لیکن اب پارہ جس مقام پر تھا، اس سے نیچے جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کھانے کا وقت آ گیا۔ لیکن مرنے والے کو کھانے سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں سیدھا شیر کے منہ میں جا رہا تھا..... اور شیر بھی کیا؟ آدم خور..... میرے ذہن میں وڈیرے کے الفاظ گھوم گئے۔
 اس نے کہا تھا کہ شیر گزشتہ رات کسی بچے کو اٹھا کر لے گیا تھا۔

”کیا بات ہے، سائیں ابھی کھانا نہیں کھا رہے۔“
 خان صاحب نے اکڑ کر کہا۔ ”اب تو یہ شیر ہی کھائیں گے۔“

میری جان جل کر رہ گئی۔ بہر حال، میرے چاہنے، نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔
 روانگی کا وقت آ ہی گیا۔ وڈیرے نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اسے پچائیت کا ایک اہم معاملہ نمٹانا ہے۔ البتہ اس نے ایک مقامی شکاری ہمارے ساتھ کر دیا۔ مقامی شکاری پرائمری اسکول کا ماسٹر تھا۔ جو شکاری تو کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا۔ ممکن ہے وڈیرے نے اسے ڈرا دھمکا کر ہی ہمارے ساتھ کر دیا ہو۔ خان صاحب کے بارے میں تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ جہاں تک

میرا تعلق ہے۔ میرے ہاتھ میں بارہ نمبر والی چھرے کی بندوق تھی۔ کم از کم مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ میں شیر کو شکار کرنے نہیں بلکہ ڈرانے کے لیے جارہا ہوں۔ تاکہ وہ کسی طرح خان صاحب کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ میں نے اعتراض کیا کہ چھرے کی بندوق کی وجہ سے میں عدم تحفظ کا شکار ہو گیا ہوں۔ خان صاحب کا کہنا تھا کہ مجھے بیک گراؤنڈ میں رکھا جائے گا۔ مقصد صرف نفری بڑھانا ہے تاکہ شیر پر رعب پڑ سکے۔

شکار پارٹی کا چوتھا نمبر چھدو تھا، جواب اس حد تک انگریز ہو گیا تھا کہ چھدو کہلوانا اسے گوارا نہیں تھا..... اصرار کرتا تھا کہ اسے ہولو کہہ کر پکارا جائے۔ اس کے شکاری تجربے سے تو میں واقف تھا۔ البتہ اس کی تیاری کا یہ عالم تھا کہ اس کے پاس بندوق تو کیا، چھرے بھی نہیں تھے کہ شیر کو روہر دیا کر ہاتھ سے ہی ایک آدھ چھرا دے مارے۔ اس سلسلے میں استفسار کیا تو خان صاحب نے فرمایا کہ ہولو کا جسم ایک مکمل ہتھیار ہے۔ ضرورت پڑنے پر اسے شیر پر کھینچ کر مارا بھی جاسکتا ہے۔

جب ہم اس جگہ پہنچے، جہاں شیر نے واردات کی تھی تو وہاں پھڑے کی ادھ کھائی لاش دکھائی دی۔ دائیں جانب خشک پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جو آگے جا کر دیوار کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ہم پھڑے کی لاش سے دور ہی رہے کہ مبادا صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع ہو اور شیر ہوشیار ہو جائے۔

اس لائق و قدح صحرا میں یہ مسئلہ آکھڑا ہوا کہ ہم چنان کہاں باندھیں۔ درختوں کا وہاں نام و نشان تک نہیں تھا اور پہاڑی پر چھپنا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وڈیرے سے ہمیں جو قیمتی معلومات حاصل ہوئیں، وہ یہ تھیں کہ شیر کا ٹھکانا پہاڑی ہی کی سمت میں ہے۔ گڑھا کھودنا اس اعتبار سے دشوار تھا کہ زمین سنگلاخ تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

پھر ماسٹر صاحب کے چہرے پر نزع کا سا عالم نظر آیا۔ کافی غور و فکر کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ درپیش مسائل کے سلسلے میں ذہن پر زور ڈال رہے ہیں۔ اسی طرح خاصی دیر ذہن پر زور ڈالنے کے بعد انہوں نے ایک تجویز برآمد کی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسکول سے بلیک بورڈ منگوا لیے جائیں۔ اندھیرے میں بلیک بورڈ، تاریکی ہی کا ایک حصہ معلوم ہوں گے اور شیر دھوکا کھا جائے گا۔

یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ متفقہ طور پر یوں کہ چھدو المعروف یہ ہولو کی حیثیت ہتھیار کی سی تھی اور ہتھیار رائے دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو مجھے صرف نفری بڑھانے کے ساتھ لایا گیا تھا..... گویا میں دوسرے درجے کا شہری تھا اور دوسرے درجے کے شہریوں کو رائے دہی کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا تنہا خان صاحب نے ماسٹر

صاحب کی تجویز متفقہ طور پر منظور کر لی۔ چھدو..... میرا مطلب ہے ہولو کو گاؤں روانہ کیا گیا اور وہ اونٹوں پر لدوا کر بلیک بورڈ لے آیا۔ چاروں بورڈ برابر برابر کھڑے کر دیے گئے..... پھر لردو پیش کی خالی جگہ کو کائنات دار جھاریوں اور خود رو پودوں سے پر کر دیا گیا۔ دوطرف وزنی غروں کی دیوار بھی بنائی گئی تو وہ جگہ ایک چھوٹا موٹا سا قلعہ محسوس ہونے لگی۔

قلعہ بند ہونے کے بعد میں نے ایک بار پھر دبا دبا سا احتجاج کیا۔ ”خان صاحب..... مجھے آپ شیر کے شکار پر لائے ہیں اور میرے ہاتھ میں وہ بندوق ہے جو پرندوں کو ڈرانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔“

ان گولیوں کو کچھیل اور گھس کر انہوں نے قابل استعمال بنا لیا۔ ماسٹر صاحب اور خان صاحب کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں۔ دونوں کا کہنا تھا کہ یہ بندوقیں ان کے آباؤ اجداد کو ریزوں نے تحفہً پیش کی تھیں، اس لیے وہ انہیں خود سے ہرگز جدا نہیں کر سکتے۔ خان صاحب نے دونوں بندوقوں میں بارود بھر کر گولیاں ڈالنا چاہیں تو گولیوں نے اندر جانے سے انکر دیا۔ گولیاں سائز کے مطابق نہیں تھیں۔ خان صاحب نے لوہے کی ایک سلاخ سے گولی اندر دھکیلا اور وزنی پتھر کی مدد سے اسے ٹھونک دیا۔ مجھے ان خود ساختہ گولیوں پر اعتراض تھا، ن اس سلسلے میں خان صاحب کی دلیل سن کر خاموش ہو گیا۔

”میاں..... ملاوٹ کا دور ہے لیکن یہ شہر نہیں، گاؤں ہے۔ یہاں ابھی تک ملاوٹ کی وبا نہ پھیلی۔ شیر کو اگر مرنے کے لیے خالص سیسہ بھی نہ ملا تو ہماری جان کو آجائے گا۔“ خان صاحب نے کہا تھا۔

ساتھ، صحرا کی راتیں بے حد حسین ہوتی ہیں، لیکن میں اس رات کو خوفناک قرار دوں گا۔ بھاریوں سے الجھ کر جو آوازیں نکال رہی تھیں، اسے بدروحوں کی سرگوشیاں بلکہ آہیں ہی کہا جاتا تھا۔

اب شیر کی آمد کے لیے اسٹیج تیار ہو چکا تھا کہ ہمارے مجسم ہتھیار یعنی ہولو کو اچانک یاد با کہ وہ تو تہجد گزار ہے۔ اس کی اس موٹنگانی پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نے رخت سفر باندھا اور بڑے خلوص سے یہ وعدے کر کے رخصت ہو گیا کہ فجر پڑھتے ہی آجائے گا اور شیر کی دم میں منہ کس دے گا۔ اگر منہ میسر نہ ہوا تو خود ہی شیر کی دم سے جائے گا۔ میں بھی خلوص قلب کے ساتھ فرار کا کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا کیونکہ خان صاحب سے تو نہیں..... البتہ ان کی بندوق سے ڈر لگتا تھا۔ بلکہ اب تو خوف بھی بڑھ گیا تھا۔ جس طرح بندوق میں ٹھونکی گئی تھی، مجھے یقین تھا کہ وہ بے حد مضطرب ہوگی اور بندوق میں مبتلا ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہوگی ادھر خان صاحب کا یہ حال تھا کہ عام گفتگو کے

دورانہ ہی ان کی بندوق کی نال میرے سینے کی طرف یوں اٹھ جاتی تھی، جیسے میرے سینے میں بندوق کے لیے مقناطیسی کشش رہی ہو۔

اب ہم تینوں قلعہ بند ہو بیٹھے تھے۔ انتظار اس بات کا تھا کہ تیندو اڈنر کے لیے کب نازل ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ ہم اوڑھنے بچھانے کے لیے تو کوئی چیز ساتھ لائے ہی نہیں۔ سردی بڑھنے کی صورت میں ہماری لفلی جم جانا یقینی تھا۔

تاریکی بہت تھی۔ خان صاحب نے اپنی بندوق سے سامنے کی جھاڑیاں ہٹا کر کھڑکی کی بنالی تو پیچہ چلا کہ اس اندھیرے میں بھی تیندو کے نظر آنے کے روشن امکانات موجود ہیں۔ خان صاحب نے وقت گزاری کے لیے اپنی اس جوانی کے قصے چھیڑ دیئے، جو میرے خیال میں اب تک ان پر آئی نہیں تھی۔ ڈاکوؤں سے مقابلے..... لاگو شیر کا شکار..... ہاتھی دانت کی تجارت اور تسخیر قلب و جسم، نفی قلب کے ان گنت افسانے..... البتہ میں نے اور ماسٹر صاحب نے جب بھی بولنے کی کوشش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ چپ رہو، تیندو اس نلے گا۔ بہت چوکنا ہوتا ہے۔ اس قلعے میں کچھ دیر بیٹھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہمارے لیے تیندو کا شکار ناممکن ہے۔ البتہ تیندو ہمارا شکار ضرور کرے گا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ خان صاحب نے جنگی حکمت عملی مرتب کرتے وقت، ہماری قوتوں کا صحیح تجزیہ نہیں کیا تھا۔ ہم میں جارحانہ محرک کی کمی تھی۔ لیکن اس زور سے ہم میں حملہ کرنے کی صلاحیت تو نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف ہم مؤثر دفاع کر سکتے تھے۔ لیکن خان صاحب نے دفاع پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ چنانچہ ہم نہ تو حملہ کرنے کی پوزیشن میں رہے اور نہ ہی دفاع کا کوئی امکان رہا تھا۔

وہ جگہ بے حد تنگ تھی۔ تاریکی میں سردی یوں بھی زیادہ ہی لگتی ہے۔ دوسری طرف نیند کا دباؤ۔ پلکیں تھیں کہ جھکی جا رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ ٹانگیں پسار کر لیٹ جاؤں لیکن پہلو بدلتے ہی کانٹے چبھنے لگتے تھے۔ خان صاحب سروی کے احساس سے بے نیاز تھے۔ انہوں نے روٹی کی واسکٹ پہن رکھی تھی..... اس پر مزید گرمی، ایفون کی چٹکی نے پیدا کر دی تھی۔ اب وہ ہسمن کے واقعات اپنی جوانی سے منسوب کر کے سنار ہے تھے۔ اور ادھر یہ حال تھا کہ میری کھوپڑی گھوم رہی تھی۔ اور ذہن کسی بھی طرح جاگنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ پھر خان صاحب کے قصوں میں وقتاً فوقتاً خراٹوں کے ڈلیش لگنے لگے۔

اسی وقت ہمیں غراہٹ سنائی دی۔ سب سے پہلے میں ہی چونکا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو تیندو نے نظر آئے۔ وہ تعداد میں تین تھے اور ادھ کھائے پھنڑے کے پاس اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ میرے دیوتا کوچ کر گئے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ..... جھٹ دوائے غیاب کا ایک کپسول نگل لیا۔ میری بلا سے..... تیندوے ان دونوں کو چیرتے پھاڑتے یا اپنے غار میں لے

جا کر بیگا کر دواتے..... کم از کم میری تو جان بخشی ہو جاتی۔ اپنی قوم کی جذباتیت تو ایسی ہے کہ مجرموں کو بھی فوراً شہید کا درجہ عطا کر دیتی ہے..... میں بھی شیر کا لقمہ بناؤ تو شہید ہی کہلاتا، لیکن میں جانتا تھا کہ شہید کہہ دینے سے آدمی شہید نہیں ہو جاتا۔ باہر قوم آدمی کو شہادت کا درجہ دے رہی ہو اور ادھر قبر میں منکر نکیر چھتر رسید کر رہے ہوں تو مرنے والے بے چارے کو کیا فائدہ..... اس کنوارے بن میں حرام موت مرنے کا کم از کم مجھے تو شوق نہیں تھا۔

خان صاحب نے جلدی سے بندوق سنبھالی اور اس کی نال کھڑکی سے نکال کر تیندوؤں کا نشانہ لینے لگے۔ اس وقت منکشف ہوا کہ موصوف کے ہاتھوں میں رعشہ بھی ہے۔ ان کی بندوق محض بل نہیں رہی تھی، بلکہ رقص کے انداز میں تھرک رہی تھی۔ مجھے تو اس بات کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ گولی کھڑکی سے باہر بھی جاسکے گی۔

”خان صاحب..... آپ کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔“ میں نے انہیں آگاہ کیا۔
”میاں..... وہ تین تین ہیں۔“ خان صاحب نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔ لیکن ان کی آواز بھی تھر تھرا رہی تھی۔ ”میں ٹریپل مانیٹڈ ہو رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے کس ماروں۔“

”خان صاحب، آپ کی آواز بھی ٹریپل ٹریک ہو رہی ہے۔“ میں نے انہیں ایک اور اطلاع دی۔

”مجھے سوچنے دو۔“ وہ غرائے۔
”خدا کے لیے..... سوچے نہیں، گولی چلائیے، نہیں تو میں چلاتا ہوں چھرا۔“
”تم بھول رہے ہو کہ تم صرف شیر پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے اور نفری بڑھانے کے لیے یہاں موجود ہو.....“ انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔

”کیسا دباؤ، کہاں کی نفری..... شیروں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم کتنے ہیں۔“ میں نے احتجاج کیا۔ ”لہذا میری یہاں موجودگی کا مقصد فوت ہو چکا ہے۔ کیوں نہ میں چپکے سے کھسک بی لوں، یہاں سے۔“

”ہرگز نہیں۔“ انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”اب تک شیر ہم تینوں کو سونگھ چکے ہیں۔ انہیں ہمارے تمام کوائف معلوم ہو چکے ہوں گے..... مثلاً یہ کہ کس کا وزن کتنا ہے..... کس کا کتنا قد ہے، وغیرہ۔“

”کیا یہ انٹیلی جنس کے شیر ہیں۔“ میں گھگھکیا۔ کم بخت دوانے اب تک اثر نہیں دکھایا تھا۔ ”اور وڈیرے نے مروایا ہمیں۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ ایک شیر ہے۔ یہ تو تین ہیں۔“ اچانک مجھے خیال آ گیا۔

”تین چھوٹے شیر ایک بڑے شیر کے برابر ہوتے ہیں۔“ خان صاحب نے مجھے سمجھایا۔

وہ تیندوے مردہ بچھڑے کے پاس بیٹھ کر ڈنر میں مصروف ہو گئے۔ ان کی چیز چڑکی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ ہم تینوں نے باری باری اپنی بندوقیں باہر نکالیں، لیکن نشانہ خطا ہونے کے ڈر سے فائر نہیں کیے۔ میں تو ویسے بھی چھروں والی بندوق سے مسلح ہونے کے باعث شیروں کا حامی تھا، لہذا فائر کرتا بھی تو شیروں کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں تھا۔ البتہ میرے فائر سے انہیں ہماری موجودگی کا ضرور پتہ چل جاتا، چنانچہ خان صاحب نے مجھے منع کر دیا۔ ماسٹر صاحب نے عذر پیش کیا کہ تاریکی بہت زیادہ ہے اور نشانہ خطا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہاں تیندوں کی موجودگی ہی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ چیز چڑکی آواز ہوا کی مرہون منت ہے اور شیر ابھی آیا ہی نہیں ہے۔

گیند اب خان صاحب کے کورٹ میں تھی۔ وہ پہلے تو نشانہ لینے کی کوشش کرتے رہے، بالآخر مستقل طور پر ٹریپل مائنڈ ہونے کے بعد انہوں نے فائر جھونک ہی مارا تو گولی کی ہیبت ناک آواز گونجی اور پھر تو گویا فائرنگ کا طوفان ہی آ گیا۔ پہاڑی بازگشت کے انتہائی اعلیٰ نمونے پیش کر رہی تھی۔

تیندوے سہم گئے اور ایک جگہ مل کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہماری طرف رخ نہیں کیا۔ پہاڑی پر ہونے والی بازگشت غالباً انہیں پریشان کر رہی تھی۔

اب خان صاحب نے اپنی بندوق میں دوبارہ بارود بھرا اور پھر گولی کو اندر ٹھونسنے کی کوشش کی، لیکن گولی داخل ہونے سے انکار ہی تھی۔ خان صاحب نے ہمیں کہا کہ پھر ڈھونڈ کے لائیں۔ بالآخر میں ایک بھاری پھر ڈھونڈ کے لایا اور انہوں نے پھر سلاخ پر مار کر گولی کو اندر ٹھونسا لیکن بد قسمتی سے سلاخ بھی نال میں پھنس گئی۔ ہم تینوں زور لگا لگا کر ہار گئے، لیکن سلاخ نہ نکل سکی۔ خان صاحب نے طے کیا وہ ضرورت پڑنے پر اسی طرح فائر کر دیں گے۔

”دل..... لیکن اس طرح تو بندوق پھٹ جائے گی۔“ ماسٹر صاحب نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”کیسی بات کرتے ہو آپ۔“ خان صاحب نے برامانتے ہوئے کہا۔ ”بندوق نہ ہوئی، کاغذ ہو گیا۔ ہنہ..... پھٹ جائے گی۔“

ماسٹر صاحب چپ ہو گئے۔ میری جزل نالچ ویسے ہی کمزور تھی۔ البتہ بندوق پھٹ جانے کا تصور میرے لیے بے حد روح فرسا تھا۔

تینوں تیندوے پہلے تو سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ پھر بازگشت معدوم ہونے پر انہوں نے

اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ اس بار انہوں نے پہاڑی کا بھی رخ کیا اور ہمیں خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ عقب سے حملہ نہ کر بیٹھیں۔ پھر ان میں سے ایک ہمارے نزدیک آ گیا اور سامنے پڑی ہوئی جھاڑیاں اور پتھر کریدنے لگا۔ چار بلیک بورڈوں میں سے ایک، ناگلوں سے محروم تھا۔ ہم نے ناگلوں کی جگہ پتھر رکھ کر کام چلایا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ شیر تیندو وہ پتھر نہ کھسکا دے۔

پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بلیک بورڈ گر پڑا۔ تاریکی میں دودھکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں۔

”گرا..... گرا..... ارے روکو..... میری بندوق..... اس ناخنار کی آنکھیں تو دیکھو۔“ خان صاحب اضطرابی انداز میں چیخے۔ ان کے جملے مربوط نہیں تھے لیکن ان سے یہ مطلب اخذ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ حواس باختہ ہو رہے ہیں۔ ”عمران..... ابو..... ابے ال..... ابا..... ابے عمران کے ابا..... تم کہاں ہو، بیٹھے۔“ انہوں نے اندھوں کی طرح مجھے ٹٹولا۔ اس کا کوش گوار مطلب یہ تھا کہ میں غائب ہو چکا ہوں اور اب تیندوے کے شکم کی زینت نہیں بن سکوں گا۔

..... پھر خان صاحب کو احساس ہوا کہ وہ تنہا ہیں اور تمام تر ذمہ داری انہی پر عاید ہوتی ہے تو انہوں نے سلاخ ٹھکی نال کا رخ تیندوے کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہولناک دھماکہ ہوا اور بارود پھٹنے سے نال سے چنگاریاں سی برس پڑیں۔ میں وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔ ایسے میں یہ کون دیکھتا کہ خان صاحب کا کیا حشر ہوا ہے۔ ماسٹر صاحب مجھ سے بھی پہلے کھسک لیے تھے۔

اب دشواری یہ تھی کہ میں اس علاقے سے نا آشنا تھا۔ اندھیرے میں یوں بھی سمتوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ پتہ بتانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو میں پتہ پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت واحد غائب ہو رہا تھا۔ تریاتی کپسول کھانے کی ہمت اس لیے بھی نہیں ہو رہی تھی کہ کسی درندے کا لقمہ نہ بن جاؤں۔

مختلف سمتوں میں سفر کرتے کرتے خدا جانے کتنی دیر ہو گئی۔ پیر دیکھنے لگے۔ راستے میں کسی درندے سے ملاقات نہ ہوئی تو حوصلہ قدرے بڑھ گیا تھا۔ میں نے تریاتی کپسول حلق سے اتار لیا، لیکن اس وقت اپنی حضوری کا اندازہ لگانے کا کوئی ذریعہ میسر نہیں تھا۔ چنانچہ میں حاضر غائب ہونے کی پروا کیے بغیر سرگرداں رہا تھا، لیکن لگتا تھا کہ میں بری طرح بھٹک گیا ہوں۔

بالآخر پوچھتے مجھے ایک دیہاتی مل گیا۔ اس سے استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ ہمیں ہی تلاش

کر رہا ہے۔ وہ مجھے گوٹھ جا کر انی لے گیا۔ گوٹھ کے لوگوں تک ہماری بزدلی اور فرار کے قصے پہنچ چکے تھے۔ ماسٹر نے یہ کہہ کر دامن بچا لیا تھا کہ اس کی نظر کمزور ہے اور اسے تاریکی میں کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا..... اور جو شہر سے آئے تھے..... جنہیں نظر آ رہا تھا، انہوں نے موقع پر پیٹھ دکھادی۔ چونکہ ماسٹر نے تمام تر ذمہ داری شہر والوں پر ڈال دی تھی، اس لیے میرا استقبال ویسا ہی ہوا جیسا کہ ہزیمت خوردہ فوجوں کا ہوتا ہے۔

”سائیں، کیا شکار کھیلنے آیا تھا، تم۔“ وڈیرے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہارے لیے تو وری مرغیاں ہی ٹھیک تھیں۔“

میں اس کی بات سن کر بھنا گیا۔ ماسٹر نے فوراً ہی جلتی پر تیل چھڑکا۔ ”ہاں وڈیرا سائیں۔“ اس نے کہا۔ ”اس بابو نے تو ایک فائر بھی نہیں کیا۔“

”مجھے دیا کیا تھا انہوں نے۔“ میں نے بندوق لہراتے ہوئے کہا۔ ”چھروں والی بندوق۔“

وڈیرے نے ملائمت آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ”چلو سائیں، اب قرآن خوانی میں ہی شریک ہو جاؤ۔“

”کیوں.....“ اس کی بات سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔

”خان سائیں واپس نہیں آیا ہے۔“ وڈیرے نے انکشاف کیا۔

میرے ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ ”پھر بھی..... اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ خان صاحب گزر رہی گئے ہیں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”ہم تو یہی سمجھیں گے سائیں۔“ وڈیرے نے کہا۔

”انہیں تلاش بھی کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، اگر وہ زندہ ہوتا تو آ جاتا۔“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ تو تیندوں کا گڑھ تھا۔ چار آدمی ساتھ لے کر جاتا تو وہ صرف شیروں کی داڑھ گرم کرنے کا بہانہ بن جاتے۔ گوٹھ کی ساری آبادی وہاں جا نہیں سکتی تھی۔ وڈیرے اللہ بچاؤ نے تجویز پیش کی کہ میں بندوق بردار ماسٹر اور پندرہ بیس کنوں کو لے کر جائے وقوعہ کا معائنہ کروں۔ جائے وقوعہ اس لیے کہ ہم نے خان صاحب پر فاتحہ وغیرہ پڑھ لی تھی۔ اور اب مسئلہ خان صاحب کی باقیات کا حصول تھا۔ میری سمجھ میں کوئی تدبیر نہیں آ رہی تھی۔ کتوں والی تجویز سے میں متفق نہیں تھا، کیونکہ میرے اور ان کے ستارے میل نہیں کھاتے تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی اور سورج نکل آیا تو یہ طے پایا کہ پندرہ بیس آدمیوں کا ایک وفد ڈھول تاشے لے کر وہاں جائے گا تاکہ درندے پس منظر موسیقی کی وجہ سے دور ہی

رہیں۔ قافلہ تیار ہوا تو ماسٹر نے بندوق کی موجودگی کے باوجود ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے بچوں کو نہ صرف پڑھانا ہے..... بلکہ منہ زبانی پڑھانا ہے۔ کیونکہ بلیک بورڈ ہماری گزشتہ رات کی قلعہ بندی کی نذر ہو چکے ہیں۔

جائے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں شیروں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ قلعہ بھی منہدم ہو چکا تھا اور خان صاحب کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ البتہ بورڈ ہٹائے گئے اور جھاڑیاں کھنگالی گئیں تو ان سے ملتی جلتی ایک صورت دکھائی دی۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ خالص احب ہی ہیں۔ وہ گٹھری بنے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ بندوق پاس ہی پڑی تھی۔ جب کہ نال کئی نالوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ قریب ہی ایک بجی سی چیز پڑی تھی۔ الٹا سیدھا کر کے دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ گیدڑ ہے۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ رات کو جو تیندوے نظر آ رہے تھے، دراصل گیدڑ تھے اور ان میں سے ایک بد نصیب گولی کا تو نہیں البتہ بندوق کی نال کا نشانہ بن گیا تھا۔

خان صاحب کو ہلا جلا کر بیدار کیا گیا تو وہ مغالطات بکتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ میرا خیال تھا کہ ٹریگر دباتے ہوئے وہ فرط دہشت سے بے ہوش ہوئے ہوں گے جب کہ ان کے اپنے خیال میں، وہ بلا ارادہ سوئے تھے۔

وہ سر تاپا مجروح تھے لیکن کوئی زخم گہرا نہیں تھا، سوائے ناک کی چوٹ کے۔ وہ بھی اس طرح کہ عینک جس میں جابجا دھاگے لگے ہوئے تھے۔ اس کی کمائی کا حصہ ناک میں پیوست ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے نہایت کندھتھیرا سے اُن کی ناک کاٹنے کی کوشش کی ہو۔

”تیندوے کہاں گئے؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

”جی..... وہ تو دراصل گیدڑ تھے۔“ میں نے بے حد نادام ہو کر کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ برہم ہو کر بولے اور پھر غیر ارادی طور پر بندوق مجھ پر تان لی، جواب کسی قابل نہیں رہ گئی تھی۔

”یہ..... بہ چشم خود ملاحظہ فرمائیے۔“ میں نے گیدڑ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ..... یہ تیندوں کے جانے کے بعد آیا ہوگا۔“

”اور شاید ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے یہاں گر گیا ہوگا۔“ میں نے ٹکڑا لگایا۔

وہ چپ ہو گئے۔ یہ بات نہیں کہ ان کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہیں تھا بلکہ وہ جواب اتنے سارے لوگوں کے درمیان نہیں دیا جاسکتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس وقت انکی زبان کثافت اگلنے والی ہے۔

وہ ہمارے ساتھ واپس آ گئے۔ گوٹھ پہنچ کر اپنے پرستاروں بلکہ نادقوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ناکفی کی ذمہ داری گیدڑوں پر ڈال دی، جو مدخلت بے جا کے

مرتب ہوئے تھے۔

جوش جذبات میں یا شرمندگی میں..... بہر حال، وہ دوسری رات بھی تیندوؤں کے شکار کو نکلنے کے موڈ میں تھے، مگر وڈیرا اللہ بچاؤ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر خان صاحب اس دوران خرچ ہو گئے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ جذبہ مہمان نوازی الگ رسوا ہوگا۔

دو پہر کو خان صاحب کو اچانک سوجھ گئی۔ ”سنا ہے، ان اطراف میں ہریل بہت ملتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”میں نے خود ایک شخص کو ہریل لاتے دیکھا ہے۔“ انہوں نے اصرار کیا۔

”ممکن ہے وہ کہیں اور سے خرید کر لا رہا ہو۔“

”ابے یار، تم چلو تو سہی۔“ انہوں نے اصرار کیا۔ ”کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔“

میں شکار کے موڈ میں نہیں تھا۔ نصرت پچا اب بھی مبتلائے بخار تھے۔ بالآخر مجھے رضامند ہونا پڑا۔ رات کی طرح اس بار بھی میرے حصے میں چھروں والی بندوق آئی۔ جب کہ خان صاحب کے حصے میں ماسٹر والی توڑے دار بندوق آئی۔ خود ان کی بندوق تو کسی لوہار کے مصرف ہی کی رہ گئی تھی کہ وہ اسے گلا کر کوئی کارآمد چیز بنالیتا۔

تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ہریل ایک نخلستان کے پاس ملتے ہیں جو گوٹھ سے چار میل دو ہے۔ لوگوں نے اطمینان دلایا تھا کہ وہاں درندے نہیں ہوتے، لیکن میں نے دوائے غیاب احتیاطاً ساتھ رکھ لی تھی۔ ویسے بھی اب میں شکار کرنے کے موڈ میں آ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پرندے غائب حالت میں زیادہ آسانی سے شکار کیے جاسکتے ہیں۔

اب انجھن یہ تھی کہ میں خان صاحب کی موجودگی میں غائب نہیں ہو سکتا۔ بالآخر مجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم مختلف سمتوں میں شکار کھیلیں گے۔ خان صاحب نے تجویز منظور کر لی۔ طے یہ پایا کہ ہم شکار کھیلنے کے بعد شام سات بجے ایک مقررہ مقام پر ملیں گے۔ ان کے جاتے ہی میں نے دوائے غیاب کا ایک کپسول نکالا اور مجوزہ سمت کی طرف روانہ ہو گیا۔

نخلستان کے قریب ایک قدرتی چشمہ تھا اور قرب و جوار میں لوگوں نے چشمے بھی کھود رکھے تھے۔ گھنے درختوں میں پہنچ کر مجھے ہریل دکھائی دیے۔ میں نے نشانہ لینا چاہا لیکن فائر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی، کیونکہ وہ میری آہٹ پا کر اڑ گئے تھے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھے غصہ کس بات پر آیا۔ ان کی ہوشیاری پر اپنی نا تجربہ کاری پر، بہر حال اب میں غائب ہونے کا

منتظر تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اپنے غائب ہونے کا علم کیسے ہو۔ اپنا سایہ تلاش کیا، لیکن وہ نادر تھا۔ یہ کوئی دلیل نہیں تھی کیونکہ مطلع ابر آلود تھا۔ ایسے میں سایہ نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ناچار میں نے اس کی پروا کیے بغیر شکار کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ پھر ایک ہریل میری بندوق کی سیدھ میں آ ہی گیا۔ میں نے ٹریگر دبانے کا قصد کیا، لیکن اس لمحے وہ دائیں جانب سرک گیا اور کیڑے مکوڑے ٹھونکنے لگا۔ اس کے دائیں جانب ہونے کی وجہ سے مجھے بائیں جانب ہونا پڑا، لیکن ایسا کرتے ہی میں وبال میں پھنس گیا۔ میں غڑاپ سے ایک کنویں میں جا گرا۔ اسی اثناء میں فائر ہو چکا تھا، مجھے یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ ناہنجار ہریل شکار ہوا کہ نہیں..... البتہ میں خود شکار ہو گیا۔

میں اس غلیظ پانی میں سر کے بل گرا، پہلے تو دو چار ڈبکیاں کھائیں، تب کہیں جا کر ترہہ میں پاؤں نکلے کنویں میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ میرے سینے تک آ رہا تھا۔ البتہ وہ پانی بے حد بدبودار، سرد اور غلیظ تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے بلبے تیر رہے تھے۔ تعفن اس قدر تھا کہ دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ جسم تو جسم میرا چہرہ تک سیاہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد حادثے کے اثرات کچھ کم ہوئے تو میں نے کنویں کا جائزہ لیا۔ اس کی دیواروں میں بہت سے سوراخ تھے، لیکن درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ان کی مدد سے کنویں سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ غور و خوض کے بعد میں نے مدد کے لیے چیخنا چلانا شروع کر دیا، لیکن کوئی بھی مدد کے لیے نہیں آیا..... مسلسل چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا۔ میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ بالآخر میری ثابت قدمی رنگ لائی اور مجھے ایک آہٹ سنائی دی..... پھر کسی نے کنویں میں جھانکا۔

”باہر نکالو، ورنہ مجھے نمونہ ہو جائے گا۔“ میں نے فریاد کی۔

”کون ہو تم؟“ آنے والے نے کنویں کے چاروں طرف گھومتے ہوئے پوچھا، جیسے مجھے دیکھنا چاہتا ہو۔

”ابوالعرمان..... گوٹھ کے وڈیرے اللہ بچاؤ کا مہمان۔“

”پیر سائیں..... تم ہو کدھر، نظر کیوں نہیں آتے۔“

مجھے کنویں کی تاریکی پر یقین آ گیا۔ میں نے پانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں ہوں۔“

”پانی کے نیچے؟“

میرے ہوش اڑ گئے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ میں غائب ہو چکا ہوں۔ دوانے مجھے

بہت بے تکا پھنسا دیا تھا۔ ”نہیں..... نہیں، میں یہاں ہوں۔“ میں چلایا۔ ”میرے لیے کوئی رسہ پھینکو۔“

”تم جہاں بھی ہوسائیں، خوش رہو۔“ اس نے کہا اور کنویں سے ہٹ گیا۔
 ”بچاؤ، بچاؤ۔“ میں حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”تم مجھے اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“
 ”کیوں نہیں جاسکتا۔“ اس شخص نے پلٹ کر کہا۔ ”میں تیرے کونکالوں کا تو میرا کچھ بگاڑے گا، نا؟ پر میں تجھ کو نکالوں گا ہی نہیں۔ میرے کو معلوم ہے سائیں، تو شیخ سدو ہے۔“ اس نے ڈر کے مارے شیخ سدو سمجھنے کے باوجود سائیں کی عزت سے نوازا تھا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں چیختا رہا۔ اب پانی کی ٹھنڈ بھی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ میرا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ آواز پر بھی زکام کا اثر غالب آ رہا تھا۔ بالآخر میں آواز سے بھی محروم ہو گیا۔ اب میں دوائے غیاب کو کوسنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

خدا جانے اس جال میں کتنی دیر گزر گئی۔ بالآخر میں پھر اپنی آواز آزما نے پر مجبور ہو گیا۔ اپنی آواز..... بلکہ چنگھاڑ سن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب یہی ایک سہارا رہ گیا تھا۔ چنانچہ میں مسلسل چیختا رہا۔

کچھ دیر بعد کسی نے کنویں میں جھانکا۔ ”خون ہوں تم اوڑانس کنویں میں کیاں کنر رہیں ہوں؟“ کسی نے پوچھا۔

مجھے آواز پہچاننے میں کچھ دیر لگی..... بہر حال وہ خان صاحب تھے اور نون غنہ کے بکثرت استعمال سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے ایفون کا فل ڈوز لے رکھا تھا۔ ”میں ابو العمران ہوں خان صاحب۔“ میں نے دردناک لہجے میں کہا۔ آواز پھر بیٹھ گئی تھی۔ لہذا لہجہ مزید دردناک ہو گیا۔

”میں نہیں مان سکتا۔“ انہوں نے شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ابو العمران ہنریل شکار کرنے نکلیں تھیں..... اوڑانس کنویں میں نہیں ملتیں۔“ وہ منمنائے۔

”مجھے باہر تو نکال لیے۔ پھر میں آپ کو پورا واقعہ سناؤں گا۔“
 ”ہرگز نہیں۔ پہلے آپ نے آپ کو ابو العمران ثابت کروں۔“
 میں نے انہیں چنگیز خان کے خاندانی کوائف سنا دیے۔

”بنس..... ہنس، ٹھینک ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ میرے خاندان سے انتہی واقفیت ثابت کرتی ہیں کہ تم ابو العمران ہی ہوں۔ لیکن تمہاری آواز کو کیا ہوا؟“

”پانی میں بھیگ کر ساؤنڈ سٹم خراب ہو گیا ہے۔“

”اچھا..... تم یہیں رکو، میں کچھ بندوں بست کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا، جیسے میں کنویں سے نکلنے پر قادر ہوں۔ شاید ان کا ایفون زدہ ذہن اب تک صورت حال نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں اگر خود نکل سکتا تو مجھے اپنے حلق میں دراڑیں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔

ان کے جانے کے بعد مجھے کچھ خیال آیا۔ دوا کی مہربانی سے میں کبھی ایک وقت میں ایک مسئلے سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ ہر بار کم از کم دو مسئلوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ اب مجھے یہ بھی سوچنا تھا کہ میں غائب ہوں۔ خان صاحب تو پیٹنگ میں تھے..... لیکن ان کے ساتھ آنے والے..... خیر، اب میں اس بات کا بھی عادی ہو چکا تھا کہ جو مسئلہ حل ہو رہا ہو صرف اس پر توجہ دوں۔ باقی مسائل کو بعد میں دیکھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک رسا برادر آدمی لے کر آئے۔ کنویں میں رسا پھینکا گیا۔ میں نے رسا تھاما اور کنویں کی دیواروں کے سوراخوں میں ہاتھ رکھتا ہوا اوپر چڑھتا گیا۔ اوپر رسا ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا گیا تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ خان صاحب اور ان کے ساتھ گاؤں والے مجھے نہ دیکھ سکے۔ اسے مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اب بھی غائب ہوں۔

”سائیں، رسا تو وری تن گیا تھا مگر اوپر کوئی نہیں آیا۔“ ایک دیہاتی نے پر تشویش لہجے میں اظہار خیال کیا۔

”تم نہیں جانتے، عمران کے ابا بڑے ہونلوں ہیں۔ پھر گر گئے ہوں گے۔“ خان صاحب نے کہا اور فوراً دونوں ہونٹ بھیجے لیے جیسے کوئی نازیبا بات منہ سے نکل گئی ہو۔
 مجھے ان پر غصہ تو بہت آیا، لیکن ان کی پیشانی دیکھ کر درگزر کر گیا۔

خان صاحب نے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹائے اور بولے۔ ”شکر ہے، ہونٹوں موجود نہیں، ورنہ سخت برا مانتا۔“

میرے غصے کا گراف اوپر چڑھ ہی رہا تھا کہ دوسرا دیہاتی بول پڑا۔ ”سائیں، وہ گرتا تو پانی میں آواز تو ہوتی۔“

”تو پھر وہ ابھیں چڑھیں ہی نہیں ہوں گے۔“
 ”لیکن سائیں..... رسا تو وری تاق تھا۔“

”انرے..... ابھی عمران کے اباں پائیں میں ڈوبنے ہوئے ہیں۔“ خان صاحب منمنائے۔

”نہیں سائیں..... پانی تو بہت تھوڑا ہے کنویں میں۔“ پہلے دیہاتی نے نفی میں سر

ہلاتے ہوئے کہا۔
'پانگل نہ بنو، دوں شخص تو چلوں پھر پانی میں بھی ڈوب سکتا ہے۔'
ان کے استدلال سے دیہاتی بھی مطمئن نہ ہوئے اور میرا اشتعال بھی ضبط کی حدیں
کر اس کر گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک دوہتر خان صاحب کے سینے پر رسید کر دیا۔
وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ ”کک..... کون ہے۔“ وہ منمنائے۔
”میں ہوں طمطر اقل جن۔“ میں نے آواز بھاری بنا کر کہا۔
میری آواز سنتے ہی دیہاتی تو ریس ہو گئے..... خان صاحب کچھ ٹھٹھکے..... لیکن
دوسرے تھپڑ نے انہیں بھی مہیز کر دیا۔

بھپڑ چھٹنے کے بعد میں نے اپنا جائزہ لیا۔ کپڑے کچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ حال
تباہ تھا۔ بد قسمتی سے میں تریاتی کپسول لانا بھول گیا تھا۔ ویسے بھی اس ہیئت کذا کی میں وہاں
جاتا تو بھید کھل جاتا کہ میں درحقیقت کنویں میں موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب
ایک ہی صورت تھی کہ اسی حال میں گوٹھ جا کرانی جاؤں اور کپڑے اور تریاتی کپسول نکال
لاؤں۔ اس میں بھی ڈر تھا کہ کہیں اچانک ہی حاضر نہ ہو جاؤں۔ لیکن مجھے یہ خطرہ تو مول لینا
ہی تھا۔

میں یہ سوچ کر چلا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ مجھے قدرتی چشمے کا خیال آ گیا تھا۔ اس
میں غوطہ لگا کر میں بدن اور کپڑوں کی غلاظت سے تو نجات حاصل کر سکتا تھا، پھر مسئلہ صرف
کپڑے سوکھ جانے کا رہ جاتا..... اور یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

میں قدرتی چشمے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے چشمے کے پانی سے رگڑ رگڑ کر اپنا بدن اور
کپڑے دھوئے۔ کپڑوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہاں سے ہٹا۔ لیکن خود کو
سکھانے کے لیے دھوپ میسر نہیں تھی۔ بھگی بھگی ہوا چل رہی تھی۔ ایسے میں کپڑے گھنٹوں میں
نہ سوکھ پاتے۔ میں دل ہی دل میں دھوپ نکلنے کی دعا مانگنے لگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ دعا
خاصی نامعقول ہے۔ آسمان پر چھائی ہوئی گھٹا، قدرت کے فیصلے کی نمائندگی کر رہی تھی..... اور
میں دھوپ کی نکلنے کی دعا مانگ کر غلطی کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر دعا کی نوعیت
تبدیل کر ڈالی۔ اب میں گڑگڑا کر بارش کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس صورت میں کپڑے
بھیکنے کا جواز مل جاتا۔

میری دعا فوراً ہی قبول ہو گئی۔ بارش اس قدر تیزی اور تندی سے شروع ہوئی کہ میں بوکھلا
کر رہ گیا۔ بوندیں اتنی موٹی تھیں کہ کنکر برستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں جلد ہی کسی پناہ
گاہ کی تلاش میں بھاگا، لیکن وہاں درختوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور درخت اتنے چھدرے

تھے کہ بارش سے پوری طرح امان نہیں دے سکتے تھے۔ پھر بھی غنیمت تھا کہ اتنی تیز بارش میں
گرمی گاوؤں کی طرف جانے کی کوشش کرتا تو گاؤں پہنچتے پہنچتے آدھا بھی نہ رہتا۔ آخر انسان
کا خمیر مٹی ہی سے تو اٹھا ہے۔

بارش تقریباً ایک گھنٹے تک ہوتی رہی۔ بارش رکتے ہی میں نے گوٹھ جا کرانی کا رخ کیا،
لیکن خان صاحب راستے میں مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف جھپٹے۔ میں بوکھلا گیا۔
..... یہ سمجھنے میں مجھے چند لمحے لگے کہ میں حاضر ہو چکا ہوں۔

”ارے عمران کے ابا، تم زندہ ہو؟“ انہوں نے کہا اور میرے بھیکے کپڑوں کی پروا کیے
بغیر مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ ”میں تو سمجھا تھا، تمہیں کوئی ہریل کھا گیا۔“
میں بھنا گیا۔ ”ہریل، درندے نہیں ہوتے، دانہ دنگا کھاتے ہیں۔“

”تمہاری بات اور ہے۔ تم کوئی دانے دنگے سے کم تھوڑا ہی ہو۔“ انہوں نے جواب دیا
اور پھر اچانک تنھے پھڑکانے لگے۔ ”ارے..... یہ سڑانڈ کیسی آ رہی ہے؟“ انہوں نے برا سا
منہ بنا کر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ تم کئی دن پہلے مر چکے ہو۔ سخت سڑانڈ اٹھ رہی ہے، تمہارے بدن
سے۔“

اب کے مجھے اس شدت کا غصہ آیا کہ گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔

”اور ہاں..... کچھ شکار بھی کیا؟“

”اٹھارہ ہریل شکار کیے ہیں۔“

”اچھا.....“ انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ ”آخر شاگرد کس کے ہو..... چنگیز خان کے سگڑو

نواسے کے! ہاں..... تو کہاں ہیں وہ ہریل؟“

”وہ تو مجھ سے طمطر اقل نامی ایک جن نے چھین لیے ہیں۔“ میں نے بڑی معصومیت

سے کہا۔

طمطر اقل کا نام سنتے ہی ان کی سٹی گم ہو گئی، شاید وہ دوہتر اور دو تھپڑ یاد آ گیا تھا، جو
میں نے ان کے رسید کیا تھا۔ ”ارے باپ رے.....“ ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”اس
خس..... میرا مطلب ہے، اس عزت مآب جن نے مجھے مارا تھا۔“ انہوں نے چاروں طرف
دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”تمہیں اس نے مارا تو نہیں؟“

”ہرگز نہیں..... اس نے مجھ سے تمام ہریل لے لیے اور مجھے بیٹا بنا کر رخصت ہو گیا۔“

”بہت خوش قسمت ہو۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”پھر انہیں کچھ خیال

آ گیا۔“ اور بندوق کہاں ہے تمہاری؟“

میں گڑبڑا گیا۔ بندوق کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ میں کچھ دیر بندوق کے بارے میں یاد

تازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ”وہ تو کنویں..... میرا مطلب ہے وہ بھی جن لے گیا۔“
 ”اور ہاں..... تم کنویں میں گرے تھے؟“ انہوں نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کون؟ میں.....؟ میں نے تو کسی کنویں کی شکل بھی نہیں دیکھی۔“
 ”نہیں..... وہ تم ہی تھے۔“ انہوں نے اصرار کیا۔ ”تم نے میرا شجرہ نسب سنایا تھا۔“
 ”کہاں تک سنایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے آپ کے والد صاحب اور پردادا..... حضور تک تو نہیں سنایا تھا۔“

”نہیں بھئی، جد محترم چنگیز خان، ان کی اولاد اور ان کی اولاد کی اولاد تک ہی تک پہنچا تھا کہ میں نے روک دیا۔“
 ”تب تو کوئی خاص بات نہیں۔ خانوادہ چنگیزی کے متعلق تو تاریخ میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ لوگ آپ کے والد حضور اور دادا حضور کی طرح گمنام تھوڑا ہی تھے۔ کسی نے فراڈ کیا ہے، آپ کے ساتھ۔“

وہ خفا ہو گئے۔ ”ہمارے خاندان میں کوئی بھی گمنام نہیں گزرا۔ مجھے ہی دیکھ لو..... ملک کے وزیر اعظم کے ساتھ میری تصویر موجود ہے۔“ انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا۔
 ”جی ہاں، اور ان کی وزارت عظمیٰ چوبیس گھنٹے بھی نہیں چلی۔ اس کے علاوہ میں نے سنا ہے کہ انہوں نے جب آپ کے ساتھ تصویر کھینچوائی تھی، اس وقت لالوہیت میں ڈرائی کلین کی دکان کرتے تھے۔“

”بکواس ہے یہ۔“ خان صاحب دونوں ہاتھوں سے گھٹنے پیٹتے ہوئے دباڑے۔ وہ نواب آدمی تھے۔ فرصت ہی فرصت تھی۔ وقت کاٹے نہیں کنتا تھا، اس لیے روز صبح سے شام تک دکان کے باہر بیٹھتے تھے۔ دکان تو شہرانی کی تھی۔“
 ”کون شہرانی؟“

”ارے، وہی تمہارے چچا..... جنہیں شکار کا سن کر بخار چڑھ آیا ہے۔“
 میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

”اچھا تو کنویں میں تم نہیں تھے؟“ کچھ توقف کے بعد انہوں نے دوبارہ اشارت لیا۔
 ”ہرگز نہیں..... کیا آپ نے مجھے نکالا تھا.....؟“ میں نے الٹا سوال کر ڈالا۔
 ”نہیں..... البتہ رسا ضرور لٹکا یا تھا۔ پھر وہ جن آ گیا۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا اور ہم سب وہاں سے بھاگ لیے۔“

”آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ وہ میں تھا۔ کیا آپ میری آواز نہیں پہچانتے؟“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔ آواز تمہاری نہیں تھی، لیکن تم نے کہا تھا کہ پانی میں رہنے کی وجہ سے بھیگ گئے ہو۔ خیر چھوڑو..... بات یہ بھی ہے کہ میں پینک میں تھا۔“ وہ کچھ جھینپ کر بولے۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔ خیر، اب چلیں۔“
 ہم دونوں گوٹھ کی طرف چل دیے۔ ”آپ کا شکار کیسا رہا؟“ میں نے راستے میں استفسار کیا۔

”بہت شاندار..... انتہائی کامیاب۔“ وہ بڑے پر جوش لہجے میں بولے۔
 گوٹھ پہنچ کر خان صاحب کے شکار کی تفصیلات پتہ چلیں۔ وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے اور ان میں سے کچھ مشتعل بھی تھے۔ پتہ چلا کہ خان صاحب نے دو آوارہ کتے، دو بلیاں، چار پالتو بکریاں اور تین مرغائیاں شکار کی تھیں۔

گاؤں والوں کا رد عمل بالترتیب یوں تھا۔ خان صاحب کا شکار، خدمت خلق کے ذیل میں آتا تھا، کیونکہ وہ آوارہ کتے بے حد شریر اور کٹ کھٹے تھے..... خان پر خدا کا عذاب نازل ہوگا، کیونکہ بلی کو مارنا گناہ ہے۔ بکریوں اور مرغیوں کی قیمت خان صاحب کو دینا ہوگی، کیونکہ وہ پرائیویٹ پر اپنی تھیں۔ مجموعی طور پر دو شریر کتوں سے نجات دلانے کی وجہ سے رائے عامہ خان صاحب کے حق میں تھی، لیکن وہ انتہائی غیر جمہوری معاشرہ تھا۔ بکریوں اور مرغیوں کے مالک تعداد میں کم سہی، لیکن برہمی میں بہت زیادہ تھے، جب کہ خان صاحب کے حامی اکثریت میں ہونے کے باوجود پرامن تھے۔

”اور میری بکری تو سائیں گیا وں تھی۔“ ایک دیہاتی نے وڈیرے کے سامنے فریاد کی۔
 ”دو بچوں کا بھی نقصان ہوا۔ فوراً مرگئی۔ حلال بھی نہیں کی جاسکتی۔“

”تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔“ وڈیرے نے شاہانہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔
 ”..... تمہاری بکریوں کی قیمت ملے گی، لیکن پہلے مہمان کی بھی سن لو۔“ یہ کہہ کر وہ خان صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”آپ کیا کہتے ہو سائیں؟“

خان صاحب نے ایک طویل سانس لے کر چاروں طرف دیکھا، جیسے بھاگنے کا راستہ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی جو اس بات کی غمازی تھی کہ فرار ناممکن ہے۔ پھر وہ پہلے تن بہ تقدیر اور اسکے چند لمحے بعد پوزم دکھائی دینے لگے۔

”جہاں تک کتوں کا تعلق ہے، مجھے فخر ہے کہ میں نے آپ لوگوں کو ان سے نجات دلائی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ احسان فراموش نہیں ہیں۔ اگر میں انہیں شکار نہ کرتا تو وہ خلق خدا کو مزید نقصان پہنچاتے۔ بلیوں کا معاملہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ہے،

”لیکن وہ ہماری پالتوں بلایاں تھیں۔“ دونوں دیہاتیوں نے احتجاج کیا۔

”تب بھی معاملہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ہے۔“ خان صاحب نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”تاہم اگر آپ چاہیں تو میں تلافی کر سکتا ہوں۔ میں آپ کو ہریلی کے عوض چھ چھ بلایاں لاکر دوں گا۔“

دیہاتیوں کے منہ لٹک گئے۔ ”ہم یہ معاملہ خدا پر چھوڑتے ہیں۔“ انہوں نے بیک آواز کہا۔

خان صاحب نے پہلے اطمینان کا سانس لیا، پھر برتشویش نگاہوں سے حاضرین کا جائزہ لیا۔ اب ان کا بیان مقدمے کے نازک مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ ”بکریوں کی ہلاکت میں میری غلطی نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”دو صورتیں ممکن ہیں، یا تو شریر ہریل ان کی اوٹ میں جا چھپے تھے، یا وہ خود ہریل اور بندوق کے درمیان آ گئی تھیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے فاتحانہ انداز میں بکریوں اور مرغیوں کے مالکان کی طرف دیکھا، جو ان کی دلیل سن کر سنائے میں آ گئے تھے۔

”پہلی صورت میں شریر ہریل، بکریوں کی ہلاکت کے ذمے دار ہیں۔“ انہوں نے مزید کہا۔

”کیونکہ ہریلوں سے میرا کوئی تعلق نہیں، اس لیے ان کے حصے کا ہر جانہ مجھ سے وصول کرنا سراسر زیادتی ہوگی۔“

دیہاتیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بڑی مشکل سے وڈیرے نے انہیں خاموش کرایا۔

”ابھی مہمان کو بولنے دو..... ہاں سائیں آگے بولو۔“ اس نے خان صاحب سے کہا۔

”دوسری صورت میں خود بکریاں اپنی ہلاکت کی ذمے دار تھیں اور میں ہرگز ان کا سرپرست نہیں ہوں۔“ خان صاحب نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

اس مرتبہ بکریوں کے مالکان نے زبردست واویلا شروع کر دیا اور انہیں خاموش کرنے میں اس دفعہ وڈیرے کو بھی خاصی دیر لگی۔ ”اور مرغیوں کے بارے میں کیا کہتے ہو، آپ؟“

اس نے خان صاحب سے کہا۔

”مرغیوں کے سلسلے میں مرغیوں کے مالکان کی غلطی ہے۔“ خان صاحب نے کہا۔

”انہوں نے محبت میں مرغیوں پر ہرا رنگ کر دیا۔ میں نے ہریل سمجھ کر انہیں شکار کر لیا۔“

”میری مرغی ہری نہیں تھی۔“ ایک دیہاتی غرایا۔

”اچھا، تم دونوں کی مرغیاں تو ہری تھیں نا؟“ خان صاحب دوسری مرغیوں کے لواحقین

سے مخاطب ہوئے۔ ان بے چاروں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔

”ٹھیک ہے، تمہاری مرغی مجھے ہریل لگی، یہ میرا قصور ہے۔“ خان صاحب نے تیسرے دیہاتی سے کہا اور جیب سے دس کانوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا سائیں..... میری مرغی کم از کم پچیس روپے کی تھی۔“ دیہاتی نے احتجاج کیا اور دوسرے دیہاتیوں نے پھر واویلا شروع کر دیا۔

”اچھا..... بس، بند کرو یہ شور۔“ وڈیرے نے شاہانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ابھی میں فیصلہ سناتا ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے ملازم کو آواز دی اور بندوق لانے کو کہا۔ چند لمحے بعد بندوق آ گئی۔ وڈیرے نے بندوق تھامی اور اپنے ملازم کو دیکھتے ہوئے خان صاحب کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔

”ابھی سائیں لوگ میں اپنے اس ملازم کو گولی مارتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر یہ کسی کے پیچھے چھپ گیا اور گولی اس دوسرے آدمی کو لگ گئی تو وری ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بندوق سیدی کی اور اس کا ملازم تیزی سے خان صاحب کے پیچھے چھپ گیا۔ خان صاحب بوکھلا گئے۔ وہ ادھر ادھر بھاگے، لیکن وڈیرے کا ملازم سائے کی طرح ان کے پیچھے چھپا رہا۔ خان صاحب ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، ان کے حلق سے ڈری ڈری چیخیں نکل رہی تھیں۔ انہی چیخوں کے درمیان وہ وڈیرے سے اپیلیں کیے جا رہے تھے۔ وڈیرا تھا کہ اس کی بندوق کی نال کار رخ ہر بار خان صاحب کی طرف ہو جاتا تھا۔ بالآخر خان صاحب ہانپ گئے۔ اب وہ ایک جگہ کھڑے تھے اور ملازم ان کی کمر تھامے کھڑا تھا۔ وڈیرے نے نال کار رخ ان کی طرف کیا اور پھر لہلی پر انگلی رکھ دی۔ ”میں تیرے کو گولی مار رہا ہوں۔ خیر لے۔“ اس نے ملازم کو لاکارا۔

”بس..... سنیں..... تو سہی۔“ خان صاحب گھگھکیا۔ ”ابھی گولی نہ چلائیں۔ میں مارا جاؤں گا، وڈیرا سائیں۔“

”میرے کو اس سے مطلب نہیں۔“ وڈیرا سخت لہجے میں بولا۔ ”خیر، میرا نوکر ہے۔ میں اسے مار سکتا ہوں۔“ لہلی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔

”مم..... میری بات تو سنیں۔“

”ابھی بکریوں کے بارے میں کیا خیال ہے.....؟“ وڈیرے نے پوچھا۔

”میں..... میں ہر جانہ دوں گا۔“ خان صاحب نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

پوری چوپال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھی۔ تمام حاضرین وڈیرے کی دانش مندی کو سراہ رہے تھے۔ خان صاحب کو نوٹ ڈھیلے کرتے ہی بنی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا، شکار کا موڈ

بھی چوہٹ ہو گیا۔ یوں ہماری بھی جان چھوٹی۔ نصرت چچا کا بخار اتر گیا تھا، البتہ وہ نقاہت محسوس کر رہے تھے۔

اگلی صبح ہم لوگوں نے رخت سفر باندھا۔۔۔۔۔ اور اس دفعہ بھی نیل گاڑی کا تکلیف دہ سفر مقدر ہوا۔ البتہ خان صاحب نے فیصلہ کیا تھا کہ واپسی کا سفر بس کے ذریعے کریں گے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ مشورہ چھدو۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ہولو کا تھا۔

لاری اڈے پہنچ کر ہم بس میں بیٹھ گئے۔ وہ سفر نیل گاڑی کے سفر سے زیادہ ازیت ناک تھا۔۔۔۔۔ البتہ اگلی نشست پر تیکھے نقوش والی ایک خوردل کی بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا، لیکن وہ بہت سہمی ہوئی دکھائی دے رہے تھے۔

بس ایک ویران مقام سے گزر رہی تھی کہ ایک شخص نظر آیا۔ وہ سڑک کے بچ کھڑا، بس کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ بس رکی اور وہ شخص بس میں گھس آیا۔ اندر آتے ہی اس نے ریوالبور نکال لیا۔ ”بس اس وقت تک نہیں چلے گی، جب تک میں نہ کہوں۔“ اس نے ریوالبور لہراتے ہوئے ڈرائیور کو دھکی دی۔

بس رکی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد بہت سارے گھڑ سوار نظر آئے۔ وہ سب مسلح تھے۔۔۔۔۔ اور انہوں نے ڈھالے باندھ رکھے تھے۔ ان میں سے تین آدمی بس میں گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ انہوں نے تمام مسافروں کو اپنی نقدی نکالنے اور عورتوں کو زیور اتارنے کا حکم دیا۔ اس دوران آگے بیٹھی ہوئی لڑکی نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا، جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔

میں نے نصرت چچا اور خان صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بہت زیادہ خوف زدہ تھے۔۔۔۔۔ خان صاحب کے تو ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر نقدی اور زیور جمع کرنے والا ڈاکو ہماری نشست کی طرف آیا۔ نصرت چچا اور خان صاحب نے اپنی جیبیں خالی کر دیں۔ ڈاکو نے میری طرف دیکھا اور غرایا۔ ”مال نکالو۔“

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں تو ان کے ساتھ ہوں۔“ میں نے اپنے دونوں سر پرستوں کی طرف اشارہ کیا۔

ڈاکو چند لمحے کھانچا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر شاید اسے میری بات پر یقین آ گیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اگلی نشست سے خراج وصول کرنے کے بعد اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا۔ لڑکی کا بدن کسی سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”مم۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دے۔“ لڑکی نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

”کیسے چھوڑ دوں۔“ ڈاکو نے جواب دیا۔ ”زینت۔۔۔۔۔ آج تو یہ ڈاکہ ہی تیرے نام کا

ہے۔“

میرا خون کھول گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ تمام مسافر دم بخود تھے۔ لڑکی کی پروا کسی کو بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی جیب تھپتھپائی اور دوائے غیاب کا ایک کپسول نکال کر ٹھٹھی بند کر لی۔ پھر میں دل کڑا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ ”بیٹھ جا بے، چڑی کے۔“

نصرت چچا نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”بیٹھ جاؤ عیدو بیٹا۔۔۔۔۔ بلا وجہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔“

ڈاکو نے مجھے چڑی کا کہا تھا۔ میں پہلے ہی چڑا ہوا تھا۔ اس پر نصرت چچا نے مجھے عیدو کہہ کر تاؤ دلا دیا۔ ”نہیں شہرانی چچا۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”میرے جیتے جی یہ ظلم نہیں ہو سکتا۔“

ڈاکو نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا۔ ”تجھے مارنے میں دو منٹ بھی نہیں لگیں گے، لیکن ب تو جو کچھ بھی ہوگا، تیرے جیتے جی ہی ہوگا۔ اس لیے تجھے زندہ رکھنا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے زینت نامی اس لڑکی کو اپنے ساتھی کی طرف دھکیلا اور مجھے پیچ کر بس کے دروازے کی طرف لے چلا۔ میں نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ البتہ بس سے اترتے ہی میں نے وہ کپسول نگل لیا۔

زینت کو ایک ڈاکو نے اپنے گھوڑے پر بٹھالیا۔ میرے ہاتھ باندھ کر انہوں نے مجھے بھی ایک گھوڑے پر بٹھا دیا۔ پھر وہ قافلہ رہزناں روانہ ہو گیا۔ ادھر ڈرائیور نے بھی بس بھگادی۔

گھوڑا سدھا ہوا تھا، لہذا بغیر کسی اشارے کے مطلوبہ سمت میں بڑھتا رہا۔ البتہ مجھے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ کچھ آگے جا کر ایک جنگل شروع ہوا۔ وہ لوگ جنگل میں داخل ہو گئے۔ مجھے ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ میں غائب ہوا ہوں یا نہیں پھر یک ڈاکو نے میرے گھوڑے کی طرف اشارہ کر کے شور مچا دیا۔ تمام ڈاکو اچھے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ آنکھیں پھار پھار کر مجھے گھور رہے تھے۔۔۔۔۔ لیکن شاید میں انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے سے اترا نامناسب نہ سمجھا۔۔۔۔۔ ورنہ پردیس میں پیدل ہو جاتا۔ پھر انہوں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے مجھے تلاش کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ اچانک گھوڑا ایسے درختوں کے جھنڈ سے گزرا، جن کی شاخیں بہت نیچی تھیں۔ میں متوجہ نہیں تھا، اس لیے مجھے زبردست جھٹکا لگا اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ بمشکل میں نے اپنی چیخ رو کی۔ میں پٹخیاں کھاتا ہوا دور جا گرا تھا۔ قافلہ آگے

بڑھا چلا جا رہا تھا اور میں زمین پر پڑا بے بسی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

پھر مجھے اپنی چونوں کا خیال آیا۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں لڑھک کر رہ گیا تھا۔ پھر میں نے ہاتھوں کی بندشوں پر دانت آزمائے۔ انہوں نے مجھے باندھتے ہوئے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس لیے کچھ دیر بعد میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔

میں اٹھا اور میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ ہر طرف درخت ہی درخت تھے اور سمتوں کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ ناچر میں اسی طرف بڑھ گیا، جس طرف ڈاکو گئے تھے۔ مجھے اس لڑکی کی فکر تھی، جس کی ہمدردی میں، میں اس حال کو پہنچا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں حماقت کر رہا ہوں۔ کیا پتہ، ڈاکو کتنی دور گئے ہیں۔ میں بہر حال پیدل تھا..... اور پیدل چلنا دوائے غیاب کے ساتھ تھی ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے جیب سے تریاتی کپسول نکالا اور حلق سے اتار لیا۔ اب حاضر ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ غائب حالت میں، اگر کوئی راہ گیر مل جاتا تو اس سے ڈاکوؤں کے بارے میں پوچھا بھی نہیں جاسکتا تھا..... اور سواری ملنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

تریاتی کپسول کھانے کے بعد میں پھر اسی سمت میں چل دیا، جس طرف ڈاکو گئے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک بستی کے آثار دکھائی دے، لیکن چہل پہل نہیں تھی..... زندگی نہیں تھی۔ میں بستی میں داخل ہو گیا۔ وہ اجڑی ہوئی بستی تھی۔ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں بستی کا چکر کاٹ کے واپس آ رہا تھا کہ مجھے ایک بندوق بردار آدمی نظر آ گیا۔ میں اس کے سامنے تھا، لیکن اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا ہے۔ شاید میں ابھی تک غائب تھا۔ اس کے باوجود میں بڑے محتاط انداز میں ایک قریبی دیوار سے چپک گیا۔ میں اس کی نگاہوں کے عین سامنے تھا..... لیکن وہاں سے ہٹنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر وہ اندھا دھند گولی بھی چلا سکتا تھا۔

پھر اچانک بیک وقت دو ہاتھیں رونما ہوئیں۔ میں نے اپنا وزن یکجہت بڑھتا محسوس کیا..... وزن اتنا بڑھ گیا کہ میں کوشش کے باوجود ہاتھ پاؤں تو کجا سر بھی نہیں ہلایا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ زمین نے مجھے جکڑ لیا..... یا میں پتھر کا ہو گیا ہوں۔ دوسری طرف بندوق بردار نے مجھے دیکھ کر بندوق تان لی۔ گویا میں حاضر ہو گیا تھا..... اور بد بخت دوانے مزید کارستانی یہ دکھائی تھی کہ مجھے پتھر بنا دیا تھا۔ اس پرستم یہ کہ حسب سابق اس نے مجھے نازک ترین موقع پر حاضر کر دیا تھا۔

”یہاں آؤ۔“ بندوق بردار نے مجھے حکم دیا۔

میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی ناکام کوشش کی، پھر بولنا چاہا..... تو پتہ چلا کہ زبان بھی

نہیں مل رہی۔ اب میں اسے کسی طرح بھی نہیں سمجھا سکتا تھا۔

اس نے پھر مجھے بلایا۔ پھر وہ دھمکیاں دینے لگا، لیکن میں اپنی جگہ بے بس تھا۔ وہ دانت پیتا رہا، اور مجھے بلاتا رہا۔ میں اپنی جگہ بندھا کھڑا رہا۔

”ٹھیک ہے۔ اب میں دس تک گنتی گنوں گا۔ اگر تم میرے پاس نہ آئے تو گولی مار دوں گا۔“

اسی وقت میرے ہاتھ اس منحوس گرفت سے آزاد ہو گئے اور زبان بھی کھل گئی۔ میں نے مدافعالہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”بھائی..... یقین کرو، میں مجبور ہوں۔ تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔ تم خود آ جاؤ۔ یقین کرو، میں بھاگوں گا نہیں۔“

وہ بھی بہت ضدی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے میری سنی سنی کردی..... اور گنتی شروع کر دی۔ اب ہاتھ تو آزاد ہو چکے تھے..... اور ایسی خطرناک صورت حال میں مجھے دوائے غیاب ہی کا سہارا سوچتا تھا۔ میں نے جھٹ جیب سے دو کپسول نکالے اور حلق سے اتار لیے۔ وہ پانچ تک پہنچ چکا تھا اور اسکے تیور بتا رہے تھے کہ دس تک گنتی ہی وہ گولی چلا دے گا۔ اب میں پوری طرح دوا کے رحم و کرم پر تھا۔

پھر میں نے اس آدمی کو حیران نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے پایا۔ یقیناً میں غائب ہو چکا تھا۔ ”اے..... تم کہاں چلے گئے؟“ اس نے مجھے پکارا۔

میں خاموش کھڑا اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے بندوق چھپائی اور ایک طرف چلا گیا۔ گویا ایک بڑی مصیبت ٹل گئی تھی..... لیکن ایک مصیبت ابھی باقی تھی۔ مجھے ابھی تک زمین نے پکڑا ہوا تھا۔ میں نے زیر لب وہ تمام دعائیں دہرانا شروع کر دیں، جو بچپن میں مولوی صاحب نے مار مار کر یاد کرائی تھیں۔ لیکن منحوس دوا کے اثرات سے چھٹکارا نڈل سکا۔

پھر ایک اور آفت کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ کوئی کتا تھا..... اور بھونکتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ دوسری طرف بندوق بردار شخص اپنے جیسے ایک آدمی کے ساتھ چلا آیا تھا۔ خیر، مجھے ان دونوں کی تو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

اچانک کتا میرے سامنے آ گیا۔ وہ بہت خوفناک شکل کا جسیم کتا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گیا اور نتھنے پھڑکانے لگا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ نامعقول جانور نہ جانے کیسے غائب حالت میں بھی مجھ پر جھپٹ پڑتا تھا۔ خصوصاً کتوں کے سلسلے میں تو مجھے بہت تلخ تجربات ہوئے تھے۔ پھر کتے نے میری طرف منہ اٹھاتے ہوئے بھونکنا شروع کر دیا..... اور میں بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

”کیا بات ہے شیردل؟“ ڈاکو نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

”شاید اسے وہ آدمی دکھائی دے گیا ہے۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

”مجھے تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔“

کتے نے ایک نوازش کی، وہ ان دونوں کی طرف چلا گیا..... لیکن اس کا رخ میری ہی طرف رہا اور بھونکنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

”مجھے تو لگتا ہے، وہ یہیں کہیں ہے۔“

”تو پھر دیوار کی طرف بندوق اٹھا کہ دو چار گولیاں چلا دو۔“

یہ نامعقول مشورہ اسے پسند آ گیا۔ اس نے اپنی بندوق اٹھائی..... عین اسی لمحے دوا بھی مہربان ہو گئی۔ زمین نے ایک جھٹکے سے مجھے جھوڑ دیا۔ میں اوندھے منہ زمین پر گرا۔ گولی میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ گولیاں چلانے کے بعد وہ دونوں مطمئن ہو گئے اور کتے کو برا بھلا کہتے ہوئے ایک طرف چلے گئے۔ کتا بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

کتے کے خوف سے کچھ دیر تک میری ہمت نہ ہوئی کہ وہاں سے اٹھوں۔ ان لم سختوں کی سماعت بہت حساس ہوتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد میں دھیرے دھیرے اٹھا۔ تب مجھ پر زمین کی گرفت کا حال کھلا۔ میری رگیں اور پٹھے جام ہو کر رہ گئے تھے۔ سارا جسم اینٹھ رہا تھا۔ اس کی علاوہ جھٹکے سے میں سر کے بل گرا تھا۔ وہ چوٹ الگ تکلیف دے رہی تھی۔ پھر بھی دوانے مجھ پر احسان کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس مصیبت میں چھپنے کا سبب بھی وہی دوا تھی۔

میں دھیرے دھیرے آگے بڑھ گیا۔ بس میں سفر کے دوران میں نے سنگ میل پر دیپال پور..... امیل، لکھادیکھا تھا۔ گویا وہاں قریب ترین بستی وہی تھی۔ وہاں سے مجھے بس مل سکتی تھی۔ زینت کو آزاد کرانے کا بھوت اتر چکا تھا۔ مجھے تو اپنی فکر تھی کہ دوا میرے ساتھ غریب الوطنی میں اور نہ جانے کیا سلوک کرے گی۔

میں قسمت پر صابر و شاکر ہو کر چلتا رہا۔ نہ سمت کا اندازہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ دیپال پور ہے کس طرف۔ دوا کی دو خاص عنایات مجھ پر شروع ہی سے تھیں..... پیدل چلنا اور چوئیس کھانا۔

چلتے چلتے اچانک میں اوپر اٹھا اور فضا میں معلق ہو گیا۔ ایسا بڑے خود کار طریقے سے ہوا تھا۔ شاید یہ دوا کی کوئی اور کارستانی تھی۔ اب صورت ہال یہ تھی کہ میرے پیروں پر تھے اور سر نیچے۔ میں یقیناً قضا کی دکان پر لٹکے ہوئے بکرے کی طرح نظر آ رہا ہوں گا۔ میں نے بے ساختہ چیخنا شروع کر دیا۔ میرے چیختے ہی اک اور چیخ سنائی دی، لیکن وہ چیخ یقینی طور پر کسی جانور کی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دائیں جانب دیکھا۔ وہ ایک لومڑی تھی اور میری طرح

الٹی لٹکی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنے حال پر صابر و شاکر تھی، لیکن میری قربت نے شاید اسے اور پریشان کر دیا تھا۔

لومڑی کے جائزے سے فارغ ہو کر میں نے یہ جاننے کے لیے نگاہیں دوڑائیں کہ ہمارے الٹے لٹکنے کا سبب کیا ہے۔ جلد ہی وہ سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ کسی شکاری نے لومڑیاں پکڑنے کے لیے پھندے لگائے ہوئے تھے..... اور میں بھی اسی کی زد میں آ گیا تھا۔

رات تک میں یونہی جھولتا رہا۔ وہ چاندنی رات تھی۔ لومڑی البتہ اپنے حال میں دم سادھے پڑی تھی۔ پھر اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ چار آدمی تھے اور چاروں سر کے بل چل رہے تھے۔ شاید یہ میرے الٹے لٹکے ہونے کا نتیجہ ہو۔ بہر حال وضع قلع سے وہ شکاری نظر آ رہے تھے۔ وہ سب درخت کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے۔

”صرف ایک۔“ ان میں سے ایک مایوسانہ لہجے میں بولا۔

پھر انہوں نے چھپنے والی لومڑی پر تبصرے شروع کر دیے اور اس کے خاندانی حالات کھول کھول کر بیان کرنے لگے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ لومڑی انتہائی نایاب نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ ادھر مارے تکلیف کے میرا برا حال تھا۔ الٹا لٹکنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

”ارے..... تم لوگ یونہی بکواس کرتے رہو گے یا مجھے اتار دے گی؟“ میں دہاڑا۔

وہ سب دہل کر رہ گئے۔ ”یہ کون بولا تھا؟“ انہیں سے ایک سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ممکن ہے، لومڑی ہی بولی ہو۔“ دوسرا گھگھایا۔

بس اتنا سننا تھا کہ وہ پیروں پر سر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے، سر پر پاؤں رکھ کر تو میں ہی بھاگ سکتا تھا، لیکن میں جال میں گرفتار تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر انہیں یقین دلایا کہ میں، لومڑی نہیں انسان ہوں۔ میری چیخوں نے انہیں اور تیز بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد لومڑی نے چیخ چیخ کر غالباً اظہارِ مسرت شروع کر دیا۔ اس وقت وہ مجھے زہر لگ رہی تھی حالانکہ اس سے پہلے اس کی تصویریں دیکھ کر مجھے اس معصوم اور حسین جانور سے انسیت محسوس ہوئی تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھ سے حماقت سرزد ہوئی تھی۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ میں اس وقت حالتِ غیاب ہوں۔ ایسے میں میری چیخیں سن کر ان کا بھاگنا فطری تھا۔ میں سوچ کر سن رہ گیا۔ اس حالت میں مجھے کون اتارے گا۔ دوسری طرف الٹا لٹکے لٹکے میرا جسم مثل ہو کر رہ گیا۔

میں ابھی صورتِ حال پر غور ہی کر رہا تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ لومڑی

نے زوردار چیخ ماری۔ چند لمحے بعد دو گھڑ سوار، درخت کے نیچے آ کر رک گئے۔ شاید لومڑی کی چیخ نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

”یہ کیا چکر ہے، وزیر خان؟“ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ انداز تحکمانہ تھا۔

”یہ شکار یوں کی حرکت ہے جناب۔“ دوسرے نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”یہ لومڑی ان کے پھندے میں پھنس گئی ہے۔“

”ابے بد تمیز..... ادب سے نام لے۔ لومڑی خانم کہہ انہیں۔“ پہلا آدمی ہلڑا۔ ”یہ متبرک مخلوق بہت محترم ہے۔ کیا تجھے ہمارے خاندان کی روایات کا علم نہیں۔“

”لا علمی کی وجہ سے غلطی ہو گئی حضور۔“ دوسرا آدمی گڑ گڑا کر بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں۔“

”چلو، اب لومڑی خانم کو اس پھندے سے نجات دلاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔

وزیر خان یہ سنتے ہی گھوڑے سے اتر گیا۔ پھر اس نے نیپے سے چاقو نکالا۔ لومڑی کی آزادی کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ لیکن میری گلو خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ بولنا میرے لیے مخدوش تھا۔ میں سوچتا رہا..... لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وزیر خان نے درخت پر چڑھ کر چاقو سے پھندا کاٹ دیا۔ رسی کٹتے ہی لومڑی دھڑ سے نیچے گری اور اس نے بوکھلا کر کھوڑے پر چھلانگ لگا دی۔ اس آدمی نے زوردار چیخ ماری، لیکن مستحیل نہ سکا۔ لومڑی اسے لیتی ہوئی دور جا گری۔ لومڑی نے نیچے چلا چلا کر اسے لبو لبان کر دیا۔ اس موقع پر اس آدمی کا خیال بھی نہیں رہا کہ لومڑی خانم متبرک و محترم ہیں۔ اس نے لومڑی کو عجیب عجیب ناموں سے نوازا شروع کر دیا۔ شاید لومڑی خانم اس طرز تخاطب کی عادی نہیں تھیں، اس لیے خفا ہو کر ایک طرف دوڑ لیں، اور وہ آدمی کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسری طرف لومڑی خانم کی عنایات دیکھ کر وزیر خان کی روح فنا ہو گئی تھی۔ گستاخی لومڑی نے کی تھی اور حالت اس کی خراب ہو رہی تھی۔ میں اپنی جگہ حیران و پریشان ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ میری آخری امید تھے اور تم یہ تھا کہ میں انہیں پکار بھی نہیں سکتا تھا۔

”اچھا..... اب ایسا کرو کہ دوسرا پھندا بھی کاٹ ڈالو۔ میں اپنے علاقے میں اس قسم کی حماقتیں برداشت نہیں کر سکتا۔“ لومڑی کے رشتے دار نے حکم دیا۔

چند لمحے تو مجھے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔ پھر مجھے اس آدمی کے خاندان پر پیار آنے لگا۔ جس کی لومڑی نوازی میری مشکل آسان کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

”جج..... جناب..... لومڑی نے..... میرا مطلب ہے، لومڑی خانم نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“ وزیر خان بولا۔ مجھے اس پر بڑی شدت سے غصہ آیا۔ بد بخت میرا بننا کام بگاڑنے پر تلا ہوا تھا۔

”نہ کیا ہو؟“ لومڑی نواز آدمی غرایا۔ ”تمہیں اس سے کیا؟ یہ لومڑی خانم کا اور میرا، آپس کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے، خاندانی معاملہ ہو۔ ہو سکتا ہے، میرے آباؤ اجداد نے لومڑی خانم کے بزرگوں کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو..... اور اس کی سزا مجھے ملی ہو۔“

”جج..... جی ہاں..... جناب۔“ وزیر خان بوکھلا گیا۔ ”میں تو بس یوں ہی.....“

”تو کیا اب درخت پر ہی چڑھ رہے ہو گے؟“ لومڑی نواز کا غصہ کم نہیں ہوا۔

وزیر خان نے تیزی سے میرا پھندا کاٹ ڈالا۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا، چنانچہ سر کے بل گرا۔ البتہ اضطراری طور پر میرے دونوں ہاتھ آگے آ گئے تھے، جس کی وجہ سے خاصی بچت ہو گئی۔ میں قلابازی کھا کر چپٹ گرا۔ تاہم میرے گرنے سے اچھا خاصا دھماکہ ہوا تھا۔ وہ دونوں چونک گئے۔

”یہ کیسی آواز تھی وزیر خان؟“ لومڑی پسند نے پوچھا۔

”میں تو خود حیران ہوا سرکار۔“ وزیر خان نے جواب دیا۔ ”مجھے تو وہ پھندا بھی بھاری لگا تھا۔“

”اچھا، اب چل دو یہاں سے۔ مجھے یہ جگہ مخدوش لگتی ہے۔“

ان دونوں نے واقعی وہاں سے کھسکنے میں دیر نہیں لگائی۔ ان کے جانے کے بعد میں دیر تک بے سدھ پڑا رہا۔ مسلسل لٹکے رہنا..... اس پر گرنے کا جھٹکا..... میرے جسم کا برا حال ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد حالت بہتر ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک تو جسم کی حالت ناگفتہ بہ تھی..... اس پر یہ فکر کہ جاؤں کدھر کو میں..... البتہ ایک بات کا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وزیر خان کا آقا، جس نے مجھے پھندے سے رہائی دلوائی تھی، اسی علاقے میں رہتا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ میں اگر بلوچستان میں نہیں تو سندھ کے اس علاقے میں ضرور ہوں، جو بلوچستان کے قریب ہے۔ میرا محسن یقیناً بلوچ تھا، اور وہ خاصا ذی حیثیت معلوم ہوتا تھا۔

اب میں تریاتی کپسول استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا، مادا وہ کوئی اور بلا مجھ پر مسلط کر دے۔ بہتر یہی تھا کہ دوائے غیاب کا اثر زائل ہونے کا انتظار کروں۔ بہر حال، یہ فیصلہ کر کے میں اندازے سے اس سمت بڑھنا شروع کر دیا، جس طرف میرا لومڑی نواز محسن گیا تھا۔ رات کا وقت تھا اور میں جنگل کا عادی نہیں تھا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو میرا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ پیدل چلنا تو خیر دوا کے ساتھ مشروط ہو کر رہ گیا تھا۔ میں چلتا رہا، یہاں تک کہ آسمان پر سپیدہ سحر نمودار ہو گیا۔ اسی وقت مجھے ایک عظیم الشان حویلی نظر آئی۔ اس کا پھانک لکڑی کا تھا اور اس وقت بند نظر آ رہا تھا۔

میں پھانک کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ اندر داخل ہونے کی کیا ترکیب کروں۔ اس وقت

ایک نرم گرم بستر کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ دشواری یہ تھی کہ میں حالتِ غیاب میں تھا۔ پھر میری نگاہ ایک پتھر پر پڑی اور مجھے ترکیب سوچ گئی۔ میں نے پتھر اٹھایا اور پھانک کے اوپر سے حویلی کے اندر پھینک دیا۔ کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ میں نے دوسرا پتھر پھینکا۔ پتھر حویلی میں گرتے ہی ایک غیر معمولی خطاب میری سماعت کو جھنجھنایا۔ اس کے ساتھ ہی اندر سے پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ میں بوکھلا کر حویلی کی دیوار کی طرف کھسکا۔ اس کے باوجود ایک پتھر میرے گھٹنے پر لگا اور میں ناچ کر رہ گیا۔ جیسے تیسے میں دیوار کی اوٹ میں پہنچا اور پھانک سے بالکل لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پتھروں کی برسات کچھ دیر تک جاری رہی..... پھر مطلع کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی پھانک بھی کھل گیا اور تین افراد باہر نکل آئے۔ ان میں ایک تو وہی لومڑی نواز تھا۔ البتہ اس کے ساتھیوں کے چہرے میرے لیے نئے تھے۔ ان دونوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ فدا و باندہ تھا۔

”سب بھاگ گئے سرکار۔“ ان میں سے ایک نے چاہوں طرف دیکھتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”آپ کے سر کی قسم، بیس آدمی تھے..... اور ایک سے ایک خطرناک.....؟“ جی چاہا کہ بیچ کر اس کا جھوٹ کھول دوں..... لیکن اس میں بھی میرا ہی نقصان تھا۔ وہ بھاگ لیتے اور پھانک بند ہو جاتا۔

”تم بڑے دلیر ہو سکندر خان۔“ لومڑی نواز نے پرستائش لہجے میں کہا۔ ”صرف پتھروں سے بیس آدمیوں کو مار بھگا گیا۔“

”آپ کا خادم ہوں سرکار۔“ سکندر خان اتر کر بولا۔ ”پتھر چلانا ایک فن ہے..... اور جناب، میں نے یہ فن سب سے بڑے استاد سے سیکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے کل میں گلشن ڈاکو اور اس کے انیس ساتھیوں کو بلاؤں گا۔ تم سب کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرو گے۔ کامیاب ہوئے تو مالامال، ورنہ تمہارا جسم ہی لال۔“

یہ نادر شاہی حکم سن کر سکندر خان بوکھلا گیا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لومڑی نواز پھانک کی طرف پلٹ گیا۔ میں بھی تیزی سے لپکا اور اس سے پہلے ہی حویلی میں داخل ہو گیا۔ ان تینوں کے اندر آنے کے بعد پھانک بند کر دیا گیا۔ اب سکندر خان اپنے آقا کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ مصر تھا کہ پتھر چلانے کے فن کا مظاہرہ ضرور ہوگا۔ مجھے لطف آ گیا۔ اس نے جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

پھر میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور خود حویلی کا جائزہ لینے لگا۔ اندر سے وہ حویلی بہت شاندار تھی۔ بڑے بڑے ستون، طویل برآمدہ، بہت بڑا احاطہ..... اور نہ جانے اندر سے کیسی ہو۔ بہر حال مجھے تو اس وقت ایک بستر درکار تھا۔

خوش قسمتی سے وہاں کوئی کتا نہیں تھا..... ورنہ میں مصیبت میں پھنس جاتا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ کچھ تلاش کے بعد مجھے اپنے مطلب کا کمرہ مل ہی گیا۔ وہ آراستہ کمرہ تھا۔ ایک جانب ایک میز اور تین چار کرسیاں رکھی تھیں، لیکن مجھے تو خوش آرام دہ بستر دیکھ کر ہوئی تھی۔ پائنتی کی طرف تہہ کی ہوئی رضائی بھی رکھی تھی۔ مجھے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ وہ کمرہ کس کا ہے۔ میں تو سکون کی نیند اور جسمانی آرام کو ترسا ہوا تھا۔ میں فوراً بستر پر دراز ہو گیا اور رضائی تان لی، لیکن میں سونہ سکا۔ اب یہ بے چینی ہونے لگی کہ کمرہ کس کا ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آ گئی اور میں بے سدھ ہو گیا۔

نیند کے عالم میں مجھے رونے کی آواز سنائی دی۔ میری نیند اچٹ گئی۔ واقعی کوئی رو رہا تھا، لیکن آواز بھینچی بھینچی سی تھی۔ اس پر مزید ستم یہ کہ وہ مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کے آنسوؤں اور رال سے میرا چہرہ تھڑ گیا تھا۔ میں نے جھٹکے سے رضائی الٹ دی۔

وہ سکندر خان تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، ہاتھوں سے اس نے منہ دبایا ہوا تھا اور وہ مجھ سے لپٹ کر روئے جا رہا تھا وہ اپنی گریہ وزاری میں اتنا منہمک تھا کہ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک غائب آدمی سے ہم آغوش ہے۔

”سلطانہ..... تم ہی بتاؤ سلطانہ، میری شریکِ حیات، میں کیا کروں۔“ اس نے گریہ و زاری میں بریک لگا کر کہا۔

غصے کی شدت سے میرا برا حال ہو گیا..... وہ بد بخت نہ صرف مجھے شریکِ حیات کہہ رہا تھا بلکہ مجھے سلطانہ کہہ کر پکار بھی رہا تھا۔ یعنی اس کے نزدیک میں عورت تھا۔ اس کے باوجود اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور بدستور روتا رہا۔ سلطانہ کا ورد بھی جاری رہا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ دلاور تمہیں نہیں آنے دے گا، لیکن تم آگئیں سلطانہ۔“ اس نے پر درد لہجے میں کہا۔

میں بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی میں نے اس کے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

”ٹھیک ہے سلطانہ۔ اب تم مجھے اور مارلو۔“ اس کی گریہ وزاری اور بڑھ گئی۔

اس بد بخت نے تھپڑ کھانے کے باوجود آنکھیں نہیں کھولیں۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینا شروع کر دیے۔ بالآخر اس نے آنکھیں کھول دیں اور سلطانہ کی تلاش میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سلطانہ وہاں ہوتی تو نظر آتی۔ اسے دیکھنے میں ناکامی کے بعد اس نے تھڑ تھڑ کانپنا شروع کر دیا۔ پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔

”اب کہاں چھپ گئیں سلطانہ۔“ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ”کیوں ستار رہی ہو مجھے؟“

وہ بدستور مجھے سلطانہ کہہ جا رہا تھا۔ اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا۔

”ارے مردود..... کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں سلطانہ نہیں ہوں..... تیری شامت ہوں بد بخت۔“

میرا خیال تھا کہ غائب حالت میں میری آواز سن کر وہ بے ہوش ہو جائے گا، لیکن وہ مردود الٹا مسکرانے لگا۔ ”اب تم آواز بدل کر بول رہی ہو۔ تم شرارتیں کرنا کب چھوڑو گی۔ سلطانہ؟“ اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”بد بخت، میں سلطانہ نہیں ہوں۔“ میں دھاڑا۔ ”میں کون ہوں، یہ ابھی تیری سمجھ میں آ جائے گا۔ ذرا اس میز کی طرف دیکھو۔“ یہ کہہ کر میں نے میز سے گلاس اٹھایا اور اسے چند لمحے ہاتھ میں تھامے رکھا۔ اسے وہ یقیناً معلق نظر آ رہا تھا۔ پھر میں نے وہ گلاس دیوار پر دے مارا۔ ”کچھ فائدہ نہیں سلطانہ۔ تم مجھے ڈرا نہیں سکو گی۔“ وہ بھی ڈنار ہا۔ ”یہ سب کچھ میں بہت دیکھ چکا ہوں۔“

میں نے بڑے بڑے ڈھیٹ دیکھے تھے، لیکن ایسا ایک بھی نہیں دیکھا تھا۔ کم بخت کسی طرح ڈر رہی نہیں رہا تھا۔ اس بار میں نے جھلا کر اس کی گردن پکڑ لی میرا خیال تھا کہ وہ اسے بھی سلطانہ کا مذاق سمجھے گا، لیکن اس بار وہ ڈرا..... اور ایسا ڈرا کہ اس کی کمر کھٹکی بندھ گئی۔ میرے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے پہلے اس کی کھٹکی کھولنا تھی اور کھٹکی کھولنے والا کوئی آلہ آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ مجھے ڈرتا تھا کہ وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ بے ہوشی کی صورت میں وہ میرے لیے بے مصرف ثابت ہوتا۔ اس کے حلق سے لایعنی آوازیں نکل رہی تھیں۔

”اگر تو بے ہوش ہوا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے اسے دھمکی دی۔ ”میں بے ہوش نہیں ہوں گا۔“ وہ گھگھیا نے لگا۔ ”پر تم میری گردن تو چھوڑو..... اور تم ہو کون؟“

”میں جن ہوں اور تیری مدد کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میرا نام طمطراقیل ہے۔“ میں نے اس کی گردن چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ اس نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ اس کی باجھیں کھل گئیں۔ ”لیکن تمہارا نام بہت ثقیل ہے۔ اجازت ہو تو میں تمہیں قرقوش کہہ لیا کروں۔“

اب یہ بات کچی ہوئی کہ وہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ہے۔ اب تک وہ پہلا آدمی تھا، جو مجھے جن سمجھنے کے باوجود بے تکلفی پر آمادہ تھا۔ مجھے تو یہ خوف بھی محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ مجھے بوتل میں بند کر کے فروخت نہ کر دے۔

”نہیں..... میں اپنا نام نہیں بدلوں گا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی تمہیں میرا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے جن بادشاہ کہہ لیا کرو۔“

”واہ..... دوستوں کو کہیں ایسے پکارا جاتا ہے۔ میں تو تمہیں قرقوش ہی کہوں گا۔“

”دوست! کون دوست؟“

”تم اور میں اب دوست ہیں۔“ خوشی سے اس کی بتیسی نکلی پڑ رہی تھی۔ ”میری آرزو تھی کہ کسی جن سے دوستی کروں۔“

”یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔“ میں نے اسے ڈپٹا۔ ”میں تیری مدد کرنے کے لیے آیا ہوں، لیکن دوستی کا چکر نہیں چل سکتا۔“

”کیوں نہیں چل سکتا۔ میں تو تم سے دوستی ضرور کروں گا۔ آزما کے دیکھو۔ مجھ جیسا جاں نثار دوست تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔“ وہ چپکا۔

ناچار مجھے پھر اس کی گردن تھامنا پڑی۔ دو چار جھٹکے دیے تو وہ بری طرح گھگھیا نے لگا۔ ”اچھا جن بادشاہ..... جیسے تمہاری مرضی، لیکن تم نے ایک اچھا دوست گنوا دیا ہے۔“

”دوست کی ایسی بتیسی۔“ مجھے پھر غصہ آ گیا، لیکن پھر اس کے چہرے پر برستی ہوئی بتیسی دیکھ کر ترس آنے لگا۔ ”خیر..... یہ بتاؤ، تم روکیوں رہے تھے؟“

”تم تو جن ہو۔ تم سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے؟“

میں نے پھر اس کی گردن پکڑ لی۔ اسے راہ راست پر لانے کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔ حسب سابق گردن پر ہاتھ پڑتے ہی وہ فوراً الف ہو گیا۔

”ہاں، تو اب بتاؤ۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“

”کیا بتاؤں جن بادشاہ۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”دلاور نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں گلشن ڈاکو اور اس کے بیس آدمیوں کو محض پتھر مار مار کر بھگا دوں۔ ورنہ وہ میری کھال کھینچ لے گا۔“

”لیکن وہ تمہاری بدبودار کھال کا کیا کرے گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیڑے پالے گا اس میں؟“

”میری کھال بدبودار نہیں جن۔“ وہ بھڑک کر بولا۔ تو ہین کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”میں روزانہ کس صابن سے نہاتا ہوں، لیکن آپ کو کیا معلوم۔“ اس کے لہجے میں تاسف در آیا۔ ”آپ کیا جانیں کس صابن۔ آپ تو آنٹی مخلوق ہیں۔ زندگی میں کبھی نہاتے ہی نہیں ہو گئے۔“ اس خبیث نے مجھ پر جوابی چوٹ کی تھی۔

میرا ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھا، لیکن میں نے بروقت خود کو روک لیا۔ وہ از حد سرکش آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جاندار بھی تھا۔ اگر غصے میں آ کر میرے جن ہونے کی پروا کیے بغیر مجھے دبوچ لیتا تو میں کیا کر لیتا۔ وہ میرے بس کا تو نہیں تھا۔ ایسوں سے غائب حالت میں بھی

دور رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

”تم نے پھر فضول باتیں شروع کر دیں۔“ میں غرایا۔ ”یہ دلاور کون ہے؟ اور یہ گلشن ڈاکو کہاں رہتا ہے؟ تم دلاور کے حکم پر اسے اور اس کے ساتھیوں کو سنسار کرو گے تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ یہی بات ہے نا؟“

”آپ تو حالاتِ حاضرہ سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ آپ جیسا جن تو پوری برادری کے لیے مصیبت بن جاتا ہوگا۔ معاف کرنا، جن بادشاہ..... آپ نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“

وہ بد بخت میرا خون جلانے پر تلا ہوا تھا۔ اس بار میں نے بے قابو ہو کر اس کے پیٹ میں زبردست گھونہ رسید کر دیا۔ اس گھونے نے اس کی ہوانکاں دی۔

”بتاتا ہوں جناب..... بتاتا ہوں۔“ اس نے پیٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”دلاور خان..... میرے آقا اس علاقے کے سب سے بڑے جاگیردار ہیں۔ ان کے پاس بڑی دولت ہے اور مجھ جیسے سینکڑوں نوکر چاکر ہیں، ان کے..... اس علاقے کے سب ڈاکو انہیں اپنا پیر تصور کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خان صاحب کے دادا اپنے زمانے کے بہت نامی گرامی ڈاکو گزرے ہیں اور یہ ساری دولت انہی کی جمع کی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ خان صاحب کا اثر رسوخ بے پناہ ہے۔ وہ جب چاہیں، کسی بھی ڈاکو کو گرفتار کرادیں۔ گلشن ڈاکو کی مثال دوسرے ڈاکوؤں کے درمیان ایسی ہے، جیسے ستاروں کے درمیان چاند، لیکن وہ بھی خان صاحب کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ بس یہ ہے میری کہانی..... کل مجھے گلشن اور اس کے انیس ساتھیوں کو صرف پتھر مار کر بھگانا ہے..... اور یہ میری ایک ڈینگ کا نتیجہ ہے۔ مجھے اپنا حشر معلوم ہے۔ میں یقیناً مارا جاؤں گا۔“

”مجھے گلشن کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“

”صورتِ حرام ہے جناب۔ اس کی آنکھ کے اوپر تل ہے اور آنکھ میں ایک بال..... آپ خود سمجھ لیں کہ بال کس کا ہو سکتا ہے۔ ویسے ہی بال اس کے سارے جسم پر ہیں، لیکن سر، بالوں سے محروم ہے۔ ناک کا بانسہ ٹوٹا ہوا ہے، جس کی وجہ سے ناک تیز ہوا میں دائیں بائیں ہلتی ہے اور شامیں شامیں کی آواز نکلتی ہے۔ ہونٹوں اور دانتوں کا معاملہ وہی ہے.....“

”کیا بکو اس ہے یہ؟“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”میں اس کا حلیہ نہیں پوچھ رہا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ اس کا گروہ کتنا بڑا ہے۔ اڈہ کہاں ہے اور وہ کس قسم کی وارداتیں کرتا ہے۔“

”کمال ہے۔ ایک جن کو یہ سب بتانا پڑ رہا ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”خیر..... سر پہ آئی ہے تو بھگتتا بھی پڑے گا۔ جن بھائی، وہ بے حد خطرناک ڈاکو ہے۔ اس کے ساتھیوں کی تعداد ستر کے

بھگ ہے۔ ہر طرح کے اسلحے سے لیس ہیں، وہ لوگ..... اور ہاں کل ہی انہوں نے ایک کولونا تھا..... دیپال پور سے کوئی آٹھ میل دور.....“

”کیا.....“ میں اچھل پڑا۔ ”وہاں اس نے کوئی لڑکی بھی اٹھائی ہے؟“

”ہاں..... اٹھائی ہے۔ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ میں نے اسے خود دیکھا ہے۔“

”اس کا اڈہ کہاں ہے؟“

”جن بھائی..... یہ تو تمہیں خود ہی معلوم کرنا ہوگا۔ میں تمہیں ہر بات نہیں بتا سکتا۔ اب اے تم مجھے ماری ڈالو، میں زبان نہیں کھولوں گا۔“

”کیوں نہیں کھولو گے زبان؟“

”یار..... کہیں تم بنا سستی جن تو نہیں ہو؟“

اس بار میں مصلحتاً غصہ پی گیا۔ اس بد بخت کے شک کو ہوا دینا مناسب نہیں تھا۔ یہی کیا کم ناکہ ٹھکانہ بھی مل گیا تھا اور اچھی خاصی معلومات بھی حاصل ہو گئی تھیں۔

”جن بھائی..... غائب تو نہیں ہو گئے۔ اس نے پر تشویش لہجے میں مجھے پکارا۔

”میں موجود ہوں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”بس ذرا سوچ رہا تھا۔“

”کمال ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ لوگ سوچتے بھی ہیں۔ جن بھائی..... مجھے بھی جن دادو۔ مجھے جن بننے کا بڑا شوق ہے۔“

دوائے غیاب کا ایک کپسول اسے بھی جن بنا سکتا تھا۔ لیکن ایک میان میں دولواریں ہیں رہ سکتیں۔ ”بکو اس مت کرو۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

”اچھا..... تو آپ میری مدد کیسے کریں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”تم بتاؤ..... مدد کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟“

”جن آپ ہیں اور صورت میں بتاؤ۔“ وہ بڑبڑایا۔

”..... خیر..... بتاتا ہوں۔ خان صاحب کی ایک بیٹی ہے دردانہ۔ اس پر جن آتا ہے۔ اس جن کو بھگادیں تو کام بن جائے گا اور آپ خان صاحب سے میری جان بخشی کر سکیں گے۔“

یہ ایک اور مسئلہ تھا۔ میں جنات سے اچھے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس تو صرف غائب ہونے کی صفت تھی۔ کوئی روحانی قوت تو تھی نہیں، میرے پاس۔ دوسری طرف نجات زدہ لڑکیاں عام طور پر نفسیاتی کیس ہوا کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے جن بھگانے کی ہامی جری جاسکتی تھی..... اور میں نے ایسا ہی کیا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ کام ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

تھی۔ پھر جب چیخنے سے کام نہ چلا تو میں نے چیخنے کے ساتھ ساتھ دروازہ بھی دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے نکالنے والے میرے بارے میں پوچھیں گے تو میں خود کو سکندر کا مہمان ظاہر کروں گا۔

اس چیخ و پکار اور دروازہ پٹینے کا نتیجہ جلد ہی نکل آیا اور سکندر کے کمرے میں بھگدڑی مچ گئی۔ میرے ہنگامے نے بہت سارے لوگوں کو اس کمرے کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ اب شاید وہ داویلا کا مقام تلاش کر رہے تھے، چنانچہ میں نے ایک فائل چیخ ماری..... اور ہاتھ روم کا دروازہ کھول دیا۔

وہاں سکندر موجود نہیں تھا۔ وہ تمام کے تمام میرے لیے نئے لوگ تھے۔
 ”کون ہوتا ہے؟“ ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں پوچھا۔
 ”میں سکندر کا دوست ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاتھ منہ دھوئے ہاتھ روم گیا.....“
 ”کہ باہر کی کنڈی خود بخود دگ گئی۔“ اس نے طنز یہ لہجے میں کٹڑ لگایا۔
 ”نہیں..... یہ تو میں نے سکندر سے کہہ کر بند کرائی تھی۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔ ”اندر چیختی نہیں ہے۔“ وہ سب ہنسنے لگے۔

”اچھا..... تو تم سکندر کے دوست ہو۔“ پہلے آدمی نے کہا۔ ”چلو ہمارے ساتھ۔“
 مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ہولیا۔ ہم مختلف کمروں اور رادار یوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے۔ وہاں چاروں طرف نشیمن لگی ہوئی تھیں اور درمیان میں وہی شخص بیٹھا تھا، جسے لومڑی نواز کہتا تھا..... اور جس کا نام دلاو تھا۔
 ”کون ہے یہ؟“ دلاو نے ان لوگوں سے پوچھا۔ ”کہاں سے پکڑ لائے ہو اسے؟“
 ”یہ سکندر کے ہاتھ روم میں بند تھا۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”بہت ہنگامہ کر رہا تھا۔“

”کون ہو بھی تم؟“ اب دلاو میری طرف متوجہ ہو گیا۔
 ”میں سکندر کا دوست ہوں۔“

”کیوں ہو بھی سکندر..... کیا چکر ہے یہ؟“ اس نے سکندر سے پوچھا، جو قریب ہی دست بستہ کھڑا تھا۔

”پتہ نہیں سرکار۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔“ سکندر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
 میرا خون کھول گیا۔ وہ عجیب طوطا چشم آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ ”پاگل ہوئے ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”ارے..... میں وہی ہوں۔ مجھے نہیں پہچانتے۔“

”میں نے تو تمہیں کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔“ سکندر نے ڈھٹائی سے کہا۔

”لیکن تمہیں زبان بند رکھنا ہوگی، کیونکہ ابھی میں تمہارے سامنے انسانی شکل میں آ جاؤں گا۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ وہ خوش ہو گیا۔
 ”لیکن انسان بننے کے بعد میری ضروریات اور میری نزاکتیں بھی انسانوں کی سی ہوں گی۔ پہلے تم جا کر میرے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔“

وہ بڑی سعادت مندی سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے ایک عدد تریاتی کپسول نگل لیا۔ سکندر کچھ دیر بعد کھانا لے کر واپس آیا۔ میرا بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ کھانا کھائے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں بری طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے کے بعد میں نے ہاتھ دھونے کے لیے استفسار کیا۔ سکندر نے ملحقہ ہاتھ روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں ہاتھ روم میں چلا گیا۔ دروازے کی اندرونی چیختی غائب تھی۔ میں خواج ضروریہ سے بھی فارغ ہونا چاہتا تھا اس لیے سکندر سے کہا کہ وہ باہر سے کنڈی لگا دے اور دستک سن کر اسے باہر سے کھول دے۔

اسی دوران کمرے میں ایک آدمی آ گیا۔ میں نے اس کی آواز بالکل صاف سنی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ خان نے اسے بلایا ہے۔

”تم چلو، میں آتا ہوں۔“ سکندر نے اسے ٹالنا چاہا۔
 ”نہیں ساتھ چلو۔ خان نے تم کو خاص طور پر طلب کیا ہے۔“

پھر جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور میں ہاتھ روم میں قید ہو کر رہ گیا۔ اب میں سکندر کی واپسی کے انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کافی دیر ہو گئی مگر سکندر واپس نہیں آیا۔ بے زار ہو کر میں نے اپنے طور پر دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ الجھن یہ تھی کہ میں آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ حویلی میں میری موجودگی کا علم سکندر کے سوا کسی کو نہیں تھا۔

میں اس حویلی میں سردی اور بے آرامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے آیا تھا اور اب ہاتھ روم جیسے سرد مقام پر سردی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اتنی طویل مدت تک کسی ہاتھ روم میں قیام کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ اس پر تم یہ کہ ہاتھ روم بے حد مختصر تھا۔ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں تختہ ہو گئیں۔ وہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں نہل سکتا۔ ادھر سکندر کی واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں نے ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دی اور زر زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ سردی کے علاوہ اب بدبو بھی پریشان کن ثابت ہونے لگی

”بد بخت..... تو مجھے بھول گیا۔“ میں دباڑا اور حقیقت مجھے اپنے غصے پر قابو پانا دو بھر ہو گیا تھا۔ ”ارے میں وہی ہوں، جسے تو قرقوش کہنا چاہتا تھا۔“

”یہ کیا نام ہوا۔“ دلاور نے کہا اور زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کی دیکھا دیکھی سب ہنسنے لگے۔ خفت اور شرمندگی کے احساس نے مجھے نیم جاں کر دیا۔ زبان پھسل گئی تھی۔ البتہ اب خاموشی ہی بہتر تھی۔ پتہ نہیں..... سکندر نے کیوں آنکھیں پھیر لی تھیں۔

”آپ خود ہی سوچیں سرکار۔“ سکندر نے کہا۔ ”میرے کسی دوست کا ایسا بے لگا نام ہو سکتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ دلاور سر ہلا کر بولا۔ ”یہ شخص مجھے پاگل معلوم ہوتا ہے۔ اسے لے جا کر سلیمان کے ساتھ بند کر دو۔“

میں احتجاج کرتا رہ گیا اور وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے چلے۔ نہ جانے یہ سلیمان کون تھا، جسے میری ہم نشینی کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔ وہ لوگ مجھے کھینچ کر ایک تہ خانے میں لے گئے۔ تہ خانے کا آہنی گیٹ مقفل تھا۔ انہوں نے تالا کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا۔ اندر سیڑھیاں تھیں۔ میں نے انہیں اپنے قدموں سے طے کرنا مناسب سمجھا، ورنہ دوسری صورت میں لڑھکتا پڑتا۔ تہ خانے میں اندھیرا نہیں تھا، چنانچہ وہاں کے جغرافیائی حالات سے آگاہی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ابھی میں تہ خانے کا جائزہ لے رہا تھا کہ عقب سے ایک اور آفت ٹوٹ پڑی۔

کسی نے میری گردن دبوچ لی تھی۔ وہ بہت طاقتور آدمی تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے مجھے زمین پر پٹخ دیا اور فوراً ہی میرے سینے پر چھ بیٹھا۔ اسے دیکھ کر میری ہوا گزر گئی۔ وہ بہت خوفناک آدمی تھا، داڑھی بے تحاشہ بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں خون کبوتر کی طرح تھیں۔ اس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ شاید وہ مذکورہ سلیمان تھا اور میں اس کا بد نصیب مہمان۔

”تو میرا مرغا ہے۔“ اس نے میرے سینے پر گھٹنے کا دباؤ ڈالتے ہوئے زوردار تان لگائی۔ ”آہے تو..... اے وا تو..... تو تو میرا مرغا ہے..... میں تیری مرغی ہوں۔“

جان بچانے کے لیے میں مرغا بھی بن سکتا تھا۔ لیکن اسے اپنی مرغی کی حیثیت سے قبول کرنا اپنی قبر کھودنے کے مترادف تھا۔

”نہیں بھائی جان..... میں ہوں ابو العمران۔“ میں نے بے حد احترام سے کہا۔

”نہیں..... نہیں۔“ وہ پھر گنگنایا۔ ”تو میرا مرغا ہے..... اور بانگ بھی دے گا۔“ اس نے پھر ہانک لگائی۔

اب اپنے مرغے پن کا اقرار کرنے ہی میں عافیت تھی۔ شک ہے کہ اس نے مجھے اپنا مرغا

سمجھا۔ اگر مرغی سمجھتا اور اُندے دینے کا حکم صادر فرماتا تو میرا کیا بنتا۔

”ہاں میرے بھائی..... میں مرغا ہوں۔“ میں نے دردناک لہجے میں اعتراف کیا۔

”تو پھر بانگ دے۔“ اس نے فرمائش کی۔

میں ہچکچایا۔ جو اب اس کا گھٹنا کوئی ایک انچ سے قریب میرے سینے میں دھنس گیا۔ ذرا سا دباؤ پڑتا تو شاید میرے دل ناتواں کا اس کے گھٹنے سے وصل مکمل ہو جاتا..... بلکہ رنگ خوشبو میں حل ہو جاتا۔

میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی اور بانگ دے ڈالی۔ لیکن وہ میرے سینے پر اپنے گھٹنے کا مکدر رکھے بیٹھا تھا، اس لیے میری آواز اس کی تشفی نہ کر سکی۔

”ٹھیک طرح سے بانگ دے میرے مرغے۔“

”یہ..... یہ گھٹنا تو اٹھاؤ۔“ میں نے بمشکل کہا۔

نہ جانے کیسے میری بات اسکی کھوپڑی میں اتر ہی گئی۔ میرے سینے سے وہ غیر جذباتی بوجھ اٹھ گیا، میں نے خلوص اور شکرگزاری کے جذبے سے سرور ہو کر ایسی زوردار بانگ دی کہ خود میرا دل خوش ہو گیا اور پھر پھڑ پھڑانے کو جی چاہنے لگا۔ اس پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے جھوم رہا تھا۔ لیکن دوسری بانگ نے میرے حلق میں خراش ڈال دی۔ میں کھانسنے لگا۔

”وقفہ نہیں ضروری ہے..... زیادہ بچے اور خوشحال گھر انہ..... بانگ لگانا..... بانگ لگانا۔“ اس نے پھر گا کر فرمائش کی۔ لہجے میں خفیف سی تنبیہ بھی تھی۔

ناچار میں نے بانگ دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اس سے لڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں بانگ دیتا رہا۔ جب بھی میری آواز ہلکی ہو جاتی، وہ میری گردن تھام لیتا اور مجھے بانگ کا والیم بڑھانا پڑتا۔

لیکن کوئی انسان آخر کب تک مرغے کی بانگ دے سکتا ہے۔ میرا گلا بیٹھ گیا..... بیٹری ڈاؤن ہو گئی اور ساتھ ہی مجھ پر جھلا ہٹ کا زبردست حملہ ہوا۔ میں نے چپ سادھ لی۔

”اے، چپ کیوں ہو گیا۔“ وہ دباڑا۔

”میں تمہارا مرغا ہوں، نا؟“ میں نے کراہ کر پوچھا۔

”تو میرا مرغا ہے۔“ اس نے بھیرویں میں جواب دیا۔

”اور تم میری مرغی ہو؟“

”میں تیری مرغی ہوں۔“ وہ کھرج میں بولا۔ ”اب بانگ دے۔“

”پہلے تم انداؤ۔ آخر تم میری مرغی ہو۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے التجا کی۔

وہ منصف مزاج دیوانہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”ہاں..... یہ تو ہے۔ مجھے انڈا دینا چاہیے۔“ اس نے کچھ توف کے بعد کہا۔ پھر وہ یوں زور لگانے لگا، جیسے انڈا دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور جسم پر بخار طاری تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ روؤں یا نہوں۔ کانی دیر زور لگانے کے بعد اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ”نہیں بنتا..... میں شاید کڑک ہو گیا ہوں۔“ اس نے اعلان کیا۔ ”خیر..... تم بانگ دو۔“

”مجھ سے بانگ نہیں دی جائے گی۔ میں کڑک مرغی کا مرغا ہوں۔“ میں نے دلیل دی۔ وہ پھر سوچ میں پڑ گیا..... کچھ دیر بعد اس نے نعرہ لگایا۔ ”وہ مارا..... بات سمجھ میں آ گئی۔ ابھی میں نے کیا کہا تھا؟“

”کیا کہا تھا؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں نے کہا تھا..... میں کڑک ہو گیا ہوں۔“

”ہاں، کہا تو تھا..... پھر؟“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تیرا مرغا ہوں۔“ اس نے پھر تان سین کی روح کو تڑپایا۔ ”انڈا کیسے دے سکتا ہوں؟“ اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

میرے دیوتا کوچ کر گئے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ.....

”تو میری مرغی ہے۔“ میری سوچ مکمل ہونے سے پہلے اس نے الفاظ میں اس امر دل فراش کا اعلان کر دیا۔

اس بار میں نے پہل کرنا مناسب سمجھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے انڈا دینے کی فرمائش کرتا، میں نے اس سے بانگ دینے کی فرمائش کر ڈالی۔ ساتھ ہی اسے یہ مژدہ بھی سنایا کہ اگر وہ مسلسل ایک دن بانگ دینے میں کامیاب ہو تو میں انڈا دوں گی۔ ”میں تیری مرغی ہوں..... بانگ کے بعد انڈا دوں گی۔“ میں نے وعدہ کرنے کے سے انداز میں کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا، دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے اور بانگ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں خوش تھا کہ میں نے بلا ناال دی، لیکن بعد میں پتا چلا کہ میں نے تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی تھی۔

اس نے گردن کی رگیں پھیلائیں اور پھر جو بانگ دی ہے تو خدا کی پناہ اگر میں جنگل میں ہوتا تو اسے ہاتھی کی چنگھاڑ یا شیر کی دھاڑ ہی سمجھ سکتا تھا، البتہ الفاظ خالص مرغائی زبان میں تھے یعنی ککڑوں کوں..... تہ خانے کی دیواریں تک لرز کر رہ گئیں میرے خانوں کے پردے یقیناً پھٹ گئے ہوں گے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ میں ایک عذاب سے نکل کر دوسرے عذاب میں پھنس گیا تھا،

وہ میری حالت زار سے بے خبر بانگ کی صورت دھاڑے جارہا تھا اس کے اسٹیمپا پر مجھے رشک آنے لگا، وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا کہیں کرکٹ میں گھس جاتا تو بڑے بڑے بالرز کے چراغ گل ہو جاتے شاید اس کے پیچھے ہڈوں کی جگہ قدرت نے دوائی ری ایکٹر رکھ دیئے تھے، مجھے یقین تھا کہ وہ پچاس سال تک اسی طرح بانگ دے سکتا ہے۔

اسے بانگ دیتے کانی دیر ہو گئی تھی اور آواز میں ذرا بھی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی، میں اس حال کو پہنچ گیا تھا کہ دیواروں سے سر ٹکرانے کو جی چاہ رہا تھا، میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، اسے خدا کا واسطہ دیا لیکن مجال ہے جو اس کے کان پر جوں بھی رنگی ہو، وہ آنکھیں بند کیے بانگ مسلسل میں ہمہ تن مصروف تھا، وہ آنکھیں بند کیے بانگ مسلسل میں ہمہ تن مصروف تھا، وہ مصیبت ایسی تھی کہ دوائے غیاب بھی مجھے اس سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔

ابھی میں اس مصیبت سے نمٹنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ دوسری مصیبت سر پر ٹوٹی، اچانک ایسا لگا جیسے کائنات کی ہر چیز ٹھہر گئی ہو، ہر طرف بڑی سماعت شکن خاموشی چھا گئی وہ چپ ہو گیا تھا۔

لیکن وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہا، تو میری مرغی ہے، اس نے پہلے کی طرح گاکر کہا۔

لا..... اب انڈا دے۔“

”نل..... لیکن..... مم..... میرے بھائی تمہیں پورے ایک دن بانگ دینا تھی۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”اور مجھے بانگ دیتے پورے دو دن ہو گئے ہیں۔“ اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... تم غلط کہہ رہے ہو۔“ میں نے احتجاج کیا۔

اس نے فوراً میری گردن تھام لی اور جھٹکے دینے لگا۔ ”لا..... اب انڈا دے..... لا، اب انڈا دے۔“ وہ چیخے جارہا تھا، بالآخر جان چھڑانے کے لیے میں نے انڈا دینے کی ہامی بھر لی..... اور زور لگانے میں مصروف ہو گیا۔ درحقیقت میں یہ سوچے جارہا تھا کہ اس مصیبت کا کوئی حل بھی ہے۔

میں ابھی اس مصیبت پر قابو پانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، اور وہ مصیبت، لا اب انڈا دے، کی گردان کر رہی تھی..... کہ تہ خانے کا دروازہ کھلا اور سکندر داخل ہوا، میں اسے دیکھتے ہی اس کی طرف جھپٹا۔

”یہ تم نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔“ میں نے اس پر آنکھیں نکالیں ”تمہیں مہمان کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے شرم بھی نہیں آئی۔“

”مہمان سمجھ کر ہی تو یہ حرکت کی ہے۔“ اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا ”آپ جن ہیں اور ہر قسم کی مشکلات سے گزر سکتے ہیں۔“

میرا خون کھول کر رہ گیا۔ اس نے جن تک کو مذاق سمجھ رکھا تھا۔ مجھے تو اب وہ خود ایک جن معلوم ہونے لگا تھا۔

”دیکھئے نا جناب..... ہمارے خان صاحب بہت گرم مزاج آدمی ہیں اگر میں آپ کو اپنا مہمان تسلیم کر لیتا تو وہ بلا اجازت مہمان کو حویلی میں لانے کے جرم میں میری کھال کھینچوا دیتے۔“

”تمہاری کھال میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں بات بات پر تمہاری کھال کھینچنے لگتی ہے“ میں نے بھنا کر کہا، دفعتاً وہ پاگل میری طرف جھپٹا میں نے اچھل کر سکندر کی آڑ لے لی۔ وہ کم بخت سکندر کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کا نشانہ میں ہی تھا۔

”آپ بہت کمزور جن ہیں جناب۔“ سکندر نے رکھائی سے کہا ”آپ سے مل کر میں بہت مایوس ہوا ہوں۔“

”کبواس مت کرو۔“ میں پتیرا بدلتے ہوئے چیخا۔ کیونکہ پاگل پھر مجھ پر حملہ آور ہوا تھا اور بڑی شدت سے انڈے کا تقاضا کر رہا تھا ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ انسانی روپ میں آنے کے بعد میری صلاحیتیں بڑی حد تک کم ہو جاتی ہیں۔“

”پھر بھی آپ تو جن ہیں۔ اس بے چارے کو ایک انڈا دے ہی دیں۔“

”میں کہتا ہوں چپ رہو۔“ میں پھر دباڑا۔

”واقعی..... انسان بننا آپ کو راس نہیں آیا۔“

”خیر..... اب یہاں سے نکل چلیں۔“ اس نے خوش خبری سنائی۔

اس پاگل کے دوبارہ جھپٹنے سے پہلے ہی میں سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک پہنچ گیا۔ پھر میں سکندر کے ساتھ باہر آ گیا۔ سکندر نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور بولے۔ ”چلیے..... آپ پھر میرے کمرے میں قدم رنجہ فرمائیے میں مشغول و مگور ہوں۔“

”کیا ہو گئے تم؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”زبان پھسل گئی میں ممنون و مشکور کہنا چاہتا تھا۔“ اس نے صفائی پیش کی لیکن اس کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

”نہیں..... میں ہرگز وہاں نہیں رہوں گا، بس اب میں اپنی دنیا میں واپس جا رہا ہوں۔“ میں نے بے حد خفا ہو کر کہا۔

”خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”آپ یہ تو دیکھیں کہ

میں کن مشکلوں سے تہ خانے کی چابیاں لایا ہوں، ورنہ آپ اس پاگل کے ساتھ رہ کر انڈا دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ نے میری مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔“

”تم تم بہت گستاخ ہو۔“

”فطرت سے مجبور ہوں اس لیے درگزر کی عادت ڈال لیے، ماں باپ نے بچپن ہی سے غلط عادتیں ڈال دی تھیں شرمندہ ہوں۔“

میں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلا آیا کمرے میں پہنچتے ہی میں نے بستر پکڑا اور وہ کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گیا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں طم طم صاحب۔“ اس نے معذرت کی ”آپ نے خود کو باتھ روم میں بند کر والیا، پھر خان صاحب کا بلاوا آ گیا اور میں وہاں ڈانٹ سننے میں مصروف ہو گیا، اسی وقت آپ سامنے آئے، میں نے عقلمندی کی کہ آپ سے انجان بن گیا، ورنہ دونوں کا برا حشر ہوتا، بعد میں میں نے خان صاحب کو بتا دیا کہ آپ بہت پینچے ہوئے بزرگ ہیں، وہ تو مارے عقیدت کے آدھے رہ گئے۔“

”میری بزرگی کا کیوں بتایا انہیں۔“ میں نے آنکھیں نکالیں۔

”آپ ہی نے کہا تھا کہ خان صاحب کی بیٹی کا مسئلہ حل کر دیں گے دراصل آپ بھی عجیب ہوتے ہیں خان زادی پر تو کوئی اندھا بھی عاشق نہیں ہو سکتا، لیکن آپ کی برادری کا کوئی فرد ان سے حماقت کر بیٹھا ہے یا پھر کبیر شاہ اس کے چکر میں ہیں لیکن کبیر شاہ کو خان زادی سے زیادہ خان کی دولت سے پیار ہے اسی لیے وہ اس سے شادی پر رضامند ہیں بلکہ ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔“

”بہر حال، انہیں جہنم میں جھونکیں، آپ تو بس جن بھگا دیں۔“

”دیکھو، بھی..... میں برادری سے دشمنی مول نہیں لے سکتا۔“ میں نے پہلو بجانا چاہا۔

”ممکن ہے، وہ جن سردار سے میری شکایت کر دے۔“

”لیکن آپ تو خود جن بادشاہ ہیں۔“ اس نے نکھن لگایا

”پھر آپ مجھ سے وعدہ بھی کر چکے ہیں۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا ”اس وقت تو تمہاری مہربانی سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے آرام کی ضرورت ہے مجھے۔“

”ضرور..... ضرور..... اس بستر پر استراحت فرمائیں۔“ اس نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ ”یہ میری زندگی کا یادگار لمحہ ہے، میں ایک عظیم المرتبت اور قوی الجشہ جن کو آرام کرتے ہوئے دیکھوں گا واہ واہ.....“

میں اس کی زہریلی باتیں پی گیا کہ مناسب یہی تھا، بستر پر لیٹ کر وضائی میں گھس کر میں نے آنکھیں موندیں اور ہمیشہ کی طرح گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب پانی میری ناک اور کانوں میں داخل ہوا، میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں، اور جھرجھری لے کر رہ گیا اس وقت میں جس صورت حال سے دوچار تھا، اس کا تصور ہی میرے ہوش اڑانے کے لیے کام تھا، میں اس وقت کسی دریا میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔

میری حالت کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، تصور تو کیجئے کہ آپ بستر میں سوئیں اور آپ کی آنکھ دریا میں کھلے..... اور آپ تیرنا بھی نہ جانتے ہوں، تو آپ پر کیا گزرے گی۔ بس وہی کچھ مجھ پر گزر رہی تھی۔

مجھے اس حال میں اتنا احساس ضرور ہوا کہ قریب ہی کچھ لوگ موجود ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں، دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا میں اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، پانی منہ اور ناک کے راستے پیٹ میں اتر جا رہا تھا میں حسب توفیق سانس روکنے کی کوشش کرتا رہا، میرے مرنے میں کوئی کمی تو نہیں تھی، لیکن خدا کو شاید میری زندگی منظور تھی، اچانک ایک لکڑی میرے ہاتھ آ گئی۔ اور ساتھ ہی ڈبے کو تھکنے کا سہارا والے محاورے کا مفہوم بھی سمجھ میں آ گیا اللہ کی رحمت کی علامت وہ لکڑی مجھے کنارے تک لے آئی۔

میں پانی سے باہر آ کر بے سندھ پڑ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اب بھی اندھیرا تھا، اور پیٹ بھی بری طرح پھول گیا تھا پھر مجھے انکائی آئی اور آتی ہی چلی گئی۔ پیٹ کا تمام پانی باہر نکلتے ہی میری طبیعت بحال ہو گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر گرد کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، ان میں سکندر بھی موجود تھا میں غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم مجھے قتل کرنا چاہتے تھے؟“ میں نے دہاڑا کر سکندر سے کہا۔
”مبارک ہو سرکار“ سکندر نے کہا، لیکن وہ میری بجائے دلاور خان سے مخاطب تھا،
میں نے کہا تھا نا کہ یہ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔“

”تم نے ٹھیک کہا تھا میں ان کی بزرگی کا قائل ہو گیا ہوں۔“ خان نے کہا پھر وہ دیگر لوگوں کی طرف مڑا ”ارے بد بختو، کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو پیر صاحب کے گلے میں ہار ڈالو

میرے احتجاج سے پہلے ہی میرے گلے میں ہار ڈالے جانے لگے ان کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا، ہار بھی اُلٹے ڈال رہے تھے یعنی ہار پیچھے سے ڈالے جا رہے تھے ہاروں کی

تعداد اتنی زیادہ تھی کہ میری آنکھیں تک چھپ کر رہ گئیں، غصے کی شدت اور احساس بے بسی نے مجھے شل کر دیا تھا، پھر کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ غصے میں ہیں۔“ سکندر کی منجوس آواز سنائی دی۔ ”لیکن یہ ضروری تھا آپ تو روشن ضمیر ہیں۔ وجہ خود ہی معلوم کر لیں گے۔“
میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن ہاروں کے پھول منہ میں گھس آئے، دم الگ گھٹا جا رہا تھا۔

اب میں اندھا تھا اور سکندر میری لاشی، مجھے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے ایسا لگتا تھا کہ میں آنکھوں کی کسی بیماری میں مبتلا ہوں اور مجھے آپریشن کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ ایک بار میں نے رک کر ہار اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن سکندر نے مجھے روک دیا۔

”کیا غضب کرتے ہیں..... عقیدت مندوں کے دل ٹوٹ جائیں گے۔“ اس نے کہا۔
چارو ناچار میں اندھوں کی طرح اس کا ہاتھ تھامے چلتا رہا، پھر مجھے زوردار ٹھوکر لگی اور میری چیخ نکل گئی۔

”معاف کیجئے گا جناب میں میں آپ کو اس پتھر کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا۔“
اب یہ سب کچھ برداشت سے باہر تھا، میں نے اپنا ہاتھ چھڑا کر سکندر کو ایک طرف دھکیلا اور ہار اتارنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن دشواری یہ تھی کہ ہاروں کا رخ پیچھے کی طرف تھا، جیسے تیسے، خاصی دیر میں، میں نے ان ہاروں سے پیچھا چھڑایا۔
اب جو میں نے دیکھا تو سارے عقیدت مندوں بخود کھڑے تھے۔ دلاور خان کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔

”یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے تم نے؟“ میں دہاڑا ”تم میرے غصے کو بھڑکا رہے ہو؟“
”ہمیں معاف کر دیں، عالی جناب۔“ دلاور خان گڑ گڑایا۔

”یقین کیجئے ہم نے یہ سب کسی بری نیت سے نہیں کیا تھا، قصہ یہ ہے کہ میرے دادا مرحوم خدا انہیں جنت نصیب کرے، بڑے زبردست آدمی تھے ان کے قصے سنائے بیٹھوں تو عمر تمام ہو جائے اور ان کی باتیں ختم نہ ہوں ایک مرتبہ انہوں نے دعوت کے سلسلے میں باسمتی چاولوں کی کئی بوریاں منگوائیں مچھا باورچی نے جو پلاؤ پکایا تو چاولوں کی مہک آسمان سے باتیں کر رہی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ میں اس وقت حویلی کی چھت پر کھڑا کنکوے اڑا رہا تھا۔
آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پتنگ بازی کا جسے ایک بار چمکا لگ جائے.....“

”یہ کیا بکواس ہے۔“ میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رہ گیا ”ان باتوں سے میرا کیا

تعلق؟“

”ارے..... مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“ خان چونک کر بولا ”بس جناب، میری ذہنی روکھی کبھی بہک جاتی ہے، کبھی تو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے، ایک دفعہ کیا ہوا کہ ایک ڈپٹی کمشنر نیا نیا اس علاقے میں آیا تھا یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیا نودن، پرانا سودن پھر بھی نئی چیز نئی ہی ہوتی ہے لوگ اس کی طرف لپکتے ہیں لیکن لوگوں کا کیا ہے لوگ اگر کنویں میں گرے لگیں تو کیا میں بھی گر جاؤں کیوں گر جاؤں؟ مجھے پانی سے بہت ڈر لگتا ہے سچ تو یہ ہے کہ ڈرتا میں کسی سے بھی نہیں؟“

”خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔“ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، ”میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔“

”لیکن جناب، آپ کی تسلی تو ضروری ہے۔“ وہ گھبرا کر بولا ”آپ کے ساتھ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا ہے، بات صرف اتنی سی ہے کہ دادا مرحوم تے مردان بزرگ کی شناخت کی کچھ نشانیاں بتائی تھیں انہی کی رو سے میں آپ کو پرکھ رہا تھا، قدرت نے غیب سے آپ کے لیے تختہ بھجوا دیا تو میں آپ کو پہچان گیا۔“

”اچھا..... تو تم میرا امتحان لے رہے تھے۔“ میں نے دانت پیتے ہوئے کہا۔
”جی جناب، بزرگی اپنی جگہ، لیکن امتحان بہت ضروری ہے سچ پوچھیے تو میرا امتحان کے نام سے دم نکلتا ہے ایک بار چھٹی جماعت میں امتحان کا تذکرہ سنا تو.....“

”بس..... بس۔“ میں چلایا ”اب اگر تم نے کچھ کہا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا۔“
خان سہم کر چپ ہو گیا لیکن میرا انداز تھا کہ وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکے گا، رہ رہ کر اس کے ہونٹ لرزے لگتے تھے، خدا جانے میں کن پاگلوں میں آپھنسا تھا، مجھے یقین ہو گیا کہ اگر وہاں کچھ دیر اور رہا تو خود بھی پاگل ہو جاؤں گا۔

بہر حال مجھے حویلی کے ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا میں خود کو تو مضحکہ خیز لگ رہا تھا، لیکن لوگ مجھے عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ان میں سکندر پیش پیش تھا، اس نے سینہ پھلا رکھا تھا، اور گردن اکڑا رکھی تھی ایسا لگتا تھا کہ وہ خود کو لمبے اور مجھے امریکہ سمجھ رہا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ غصہ بھی اسی پر آ رہا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ میں وہاں سے بھاگ لینا چاہتا تھا اگر دلاور خان اپنے دادا کے فرمان کے مطابق ایسی دو چار آزمائشوں سے مزید گزار دیتا تو میرا صرف تہہ ہی چھپ سکتا تھا لیکن میں اب دوائے غیاب جی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا، پردیس میں اب مزید حادثات سے دو چار ہونے کا تصور ہی میرے لیے روح فرسا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں خود کوئی

تدبیر کروں گا۔

”سرکار..... آپ کی بزرگی تو ثابت ہو گئی۔“ سکندر نے مجھے چونکا دیا ”اب آپ ہمارے خان محترم کی ایک مشکل آسان فرمادیں تو کرم نوازی ہوگی۔“

”کہو..... کہو۔“ میں نے درویشانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ اب خان زادی سے جن کا عشق زیر بحث آئے گا۔“ ویسے میں جانتا ہوں کہ اس حویلی میں جن موجود ہیں، اور ایک صاحبزادی کے سر پر بھی ہے“ میں نے رعب جمایا ”لیکن جنوں کو بھی ہماری آمد کا پتا چل چکا ہے اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ہمیں ایک چلہ کرنا ہوگا، لیکن اس چھت کے نیچے نہیں۔“

”خان دوسری چھت ڈلوادیں گے آپ فکر نہ کریں۔“ سکندر نے جواب دیا اور دلاور خان زور سے زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

مجھے غصہ تو بہت زور کا آیا لیکن معاملہ وہاں سے نکل بھاگنے کا تھا، اس لیے ضبط کر گیا۔“ تم ہمارا مطلب نہیں سمجھے، وہ چلہ مجھے دیرانے میں کرنا ہوگا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔“ خان سر ہلا کر بولا ”بتائیں کس سمت جانا پسند کریں، یہاں چاروں طرف دیرانے ہی دیرانے ہیں، ان میں سے کچھ دیرانے دادا حضور کے پیدا کردہ ہیں ورنہ یہاں بستیاں ہوا کرتی تھیں ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔“

”تم پھر شروع ہو گئے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
”مجھے بس ایک سواری چاہیے اور کھانے پینے کا کچھ سا بان تمہارا کام ختم..... چلہ ختم کر کے میں جنوں سے نمٹ لوں گا۔“

”کہیں آپ غالب تو نہیں ہو جائیں گے۔ دیکھئے نا..... ہم نے بڑی دشواریوں کے بعد آپ کو حاصل کیا ہے۔“ سکندر نے مونہ گانی کی۔

جی تو چاہا کہ گھونہ مار کر اس کے سارے دانت اندر کر دوں، کم بخت میرا ارادہ بھانپ گیا تھا، لیکن خون کے سے گھونٹ پی کر چپ ہو گیا۔ میرے غصے کو محسوس کر کے خان نے سکندر کو ڈانٹنا چھوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن میری تسلی نہیں ہوئی پھر خان نے ایک آدمی کو سواری کا بندوبست کرنے بھیج دیا۔ البتہ اشیائے خورد و نوش کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ بزرگوں کو تمام حاجتوں سے ماورا سمجھتے ہیں بس وہ وہاں دوزانو بیٹھے مجھے عقیدت سے دیکھے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سواری کا بندوبست کرنے والا لوٹ آیا۔ اس نے آکر یہ مژدہ سنایا کہ سواری کا بندوبست ہو گیا ہے۔

”تشریف لائیے عالی جناب۔“ خان نے مجھ سے کہا۔

میں اس کے ساتھ کمرے سے نکل آیا وہ مجھے لے کر برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیوں کے پاس ایک زبردست اونٹ بیٹھا تھا۔ اس کے پہلوؤں کے ساتھ چمڑے کے تھیلے لٹک رہے تھے تھیلے خوب پھولے ہوئے تھے۔

”سواری کہاں ہے؟“ میں نے خان سے پوچھا

”یہ خاص طور پر آپ کے لیے منگوایا گیا ہے۔“

خان نے اونٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے شایان شان بھی ہے اور عالی نسب بھی۔“

میں بھنا گیا، زندگی میں کبھی تفریحاً بھی اونٹ پر بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہونے دیا تھا، کلفٹن کے ساحل پر بے شمار اونٹ والوں نے مجھے دعوت دی تھی لیکن میں نے اس بے ہنگم جانور کو سواری کے طور پر قبول نہیں کیا تھا، بلکہ میں تو اونٹ کو منظر فطرت میں شمار کرتا تھا، اونٹ، اونٹ نہیں لگتا تھا بلکہ پہاڑی، بے آب و گیاہ صحرا اور جانے کیسے کیسے منظر پیش کرتا تھا۔

”تم اس عالی مرتبت جانور کو سواری کہتے ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں آپ جیسے عالی مرتبت لوگوں کے لیے یہ سواری ہے، ویسے ہم اس پر سواری کرنے کی جرات نہیں کرتے۔“ خان نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔

اب مجبوری تھی وہاں سے نکلنے کی یہی ایک صورت تھی کہ اونٹ پر سوار ہو جاؤں چنانچہ میں دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتا اونٹ کی بڑھ گیا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں الجھ گیا کہ اس پر کہاں سے اور کس طرح چڑھوں کوہان پکڑوں یا گردن میں باہیں جمائیں کروں، ادھر اونٹ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر بری طرح بلبلانے لگا تھا۔ اس کی بلبلاہٹ اور میری جان نکالے دے رہی تھی۔

”تشریف لے جائیں جناب۔“ سکندر نے با آواز بلند کہا۔

”اونٹ آپ کی سواری کا شرف حاصل کرنے کو بے تاب ہو رہا ہے۔“

اس کی مکروہ آواز سن کر میں سلگ گیا میں نے ارادہ کر لیا کہ موقع ملتے ہی اس مردود کو معقول سبق دوں گا، اس وقت جھجکنا مناسب نہیں تھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے وہ سب میرے اونٹ پر سوار ہونے کا منظر دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا نام لیا اور اس ریگستانی جہاز کی طرف لپکا، اس کے کوہان کے گرد اپنے دونوں ہاتھ لپیٹتے ہوئے میں نے ایک پاؤں اس کی نمر کی دوسری طرف ڈالنا چاہا، لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ کوہان، اونٹ کے نزدیکی لیور ہوتا ہے۔ کوہان سے میرے ہاتھ مس ہوتے

ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

تب مجھے پتہ چلا کہ اونٹ کئی مرحلوں میں کھڑا ہوتا ہے، اور ہر مرحلہ کئی جھٹکوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

بہر حال اونٹ کھڑا ہو گیا اور میں لٹک کر رہ گیا۔ وہ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی، میرا برا حال تھا پھر اونٹ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور کوہان میری گرفت سے نکل گیا۔ المیہ یہ تھا کہ میں بیہوشاں باندھے ہوئے نہیں تھا، میرا اندازہ تو یہی ہے کہ میرے بدن کو زمین سے ملاقات کرنے میں ڈھٹائی منٹ لگے ہوں گے۔ لیکن میرا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ میں اس وقت عذاب سے گزر رہا تھا، بلکہ عذاب سے گزر رہا تھا، زمین سے ٹکراتے ہی میرا سورج غروب ہو گیا۔ یہ بات نہیں کہ میں بے ہوش ہو گیا تھا میں نے ان خبیثوں کے قہقہے سنے لیکن آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھنا شان بزرگی کے خلاف تھا۔

پھر اسی عالم میں میرے شانے پر ایک زبردست ٹھوکر لگی میں بھنا کر رہ گیا۔ ایک تو میری حالت زار اس پر وہ خبیث مجھے ٹھوکریں مار رہے تھے، لیکن جب میں نے آنکھوں میں غصہ پیدا کرتے ہوئے انہیں کھولا تو یہ دیکھ کر جان نکل گئی کہ وہ اونٹ کی کارستانی تھی دراصل اس نے ٹھوکر نہیں لگائی تھی بلکہ کسی طرح اس میں ریورس گئیر لگ گیا تھا۔ اور پیچھے ہٹنے کے عمل میں اس کا کھریا وہ جو بھی ہوتا ہو، میرے شانے سے ٹکرایا تھا۔

اچانک مجھ پر اونٹ کا ارادہ کھلا، وہ اپنے طور پر اطمینان کرنے کے بعد مجھ پر تشریف فرما ہونے کی نیت کر رہا تھا، اگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو میں یقیناً ابوالعران کی بجائے سفوف عمرانی کہلاتا اور شتر غمزے کی بیماری کا تیر بہدف علاج ہوتا، اس نے جیسے ہی اگلے گھٹنے موڑے میں نے تیزی سے پے درپے کئی کروٹیں بدلیں اور اس کی ریش سے دور نکل گیا۔ اسی وقت اونٹ بیٹھ گیا اور میرے عقیدت مندوں نے تالیاں پینٹنا شروع کر دیا۔ میں نے لیٹے لیٹے اونٹ کو دیکھا، تب پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے حد طویل و عریض اور بلند تھا۔ عقیدت مند دوڑتے ہوئے میری طرف چلے آئے اور انہوں نے سہارا دے کر مجھے کھڑا کر دیا۔ مجھے اچھی خاصی چوٹ آئی تھی، لیکن میں کراہ بھی نہیں سکتا تھا، اب پتہ چل رہا تھا کہ بزرگی کسی قدر مہنگے داموں ملتی ہے۔

”مبارک ہو سرکار۔“ سکندر نے مجھے دیکھتے ہی کہا

”آپ دوسرے امتحان میں بھی سرخرو ہوئے اب آپ کی بزرگی مستند ہوگئی۔“

”یہ بھی آپ کی بزرگی کا امتحان تھا۔“ اس مرتبہ دلاور خان بولا۔ ”اس اونٹ پر واقعی کوئی نہیں بیٹھا یہ بے حد شریر جانور ہے، ہم بزرگی کا دعو کرنے والوں کو اس پر سواری کرنے کی

دعوت دیتے ہیں، اور آخر میں یہ ان پر سواری کرتا ہے، آپ پہلے آدمی ہیں، جو بچ نکلے ہیں۔
میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، گویا وہ اونٹ لوگوں کو گرا کر ان پر بیٹھنے کا عادی تھا، میں
بال بال بچا تھا، مجھے خدا نے بچایا تھا، جی میں تو آیا کہ بزرگی کا کبمل اتار پھینکوں لیکن ڈر تھا کہ
کسی اور مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔

ادھر دلاور خان نے اونٹ کے حوالے سے اپنے دادا کے تذکرے کی گنجائش نکال لی تھی
اس کی بکواس میری برداشت سے باہر تھی، چنانچہ میں بھنا کر اونٹ کی طرف بڑھا اور اچھل کر
اس کی پشت پر سوار ہو گیا لیکن ٹکیل میرے ہاتھ نہ آئی۔ اونٹ شاید اسی موقع کا منتظر تھا، چنانچہ
سیلف اسٹارٹ ہنڈ انفنٹی کی طرح سے نہ صرف اٹھا بلکہ بگٹھ دوڑ لیا، میں نے اس کے کوہان کو
یوں دبوچ رکھا تھا، جیسے کوئی بچہ ماں کی گردن میں جھول رہا ہو، اگر میری گرفت مضبوط نہ ہوتی تو
وہ اونٹ مجھے گرا کر اپنے آقاؤں کی نظروں میں سرخرو ہو جاتا۔

یہ سوچنے کی مہلت کیسے تھی کہ اونٹ کس طرف جا رہا ہے، میں نے تو آنکھیں بند کر رکھی
تھیں اور نہ جانے کون کون سی دعائیں پڑھے جا رہا تھا، مجھے علم نہیں تھا کہ اونٹ کے بریک
کہاں ہیں، ٹکیل میرے ہاتھ میں ہوتی تو اس کے ساتھ کھینچا تانی کر کے آزماتا، پھر مجھے کار
کے بریک کا خیال آ گیا۔ اس اونٹ کی تمام حرکتیں کار ہی کی سی تھیں، چنانچہ میں نے اس کی
پسلیوں پر زور سے پیر مارا۔ میری بد نصیبی کہ وہ بریک کی بجائے ایکسیلر ثابت ہوا اور اونٹ
بالکل اڑنے لگا ناچار اپنا وجود اس کی پشت پر برقرار رکھنے کے لیے مجھے اس کے کوہان پر لیٹنا
پڑا۔ اور میری پسلیوں پر قیامت گزر گئی، خدا جانے کب اونٹ نے پھیری سی لی اور میں تو پ
سے نکلے ہوئے گولے کی طرح زمین پر گر اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو اونٹ کی دہشت بدستور مجھ پر قائم تھی، حالانکہ میرے چاروں طرف مقابلتا
معقول صورت والے لوگ موجود تھے، بس ان سبھوں کی مونچھیں بہت تھنی، آنکھیں خونخوار اور
سرخ تھیں، اونٹ کی دہشت کا یہ حال تھا کہ مجھے وہ سب لوگ اونٹ ہی دکھائی دے رہے
تھے۔

”اوئے کا کے..... اب اٹھ جاؤ۔“ معاً ایک کرخت آواز گونجی اور میں اٹھ بیٹھا..... لیکن
میری چیخیں نکل گئیں۔

وہ ایک کمرہ تھا اور میں فرش پر پڑا تھا۔ دس بارہ خونخوار آدمی مجھے دیکھ رہے تھے، ان کی
نگاہوں میں دلچسپی تھی۔

”کون ہے تو؟“ اسی کرخت آواز نے دریافت کیا اس بار میں نے اسے دیکھا وہ ان
سب میں ممتاز نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں طلائی زنجیر تھی اور اوپر کے دودانت بھی سنہرے

تھے۔

”میں ابوالعمران ہوں۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”یہ تو نے خان صاحب کا اونٹ کیوں چرایا؟“

”میں نے وہ اونٹ نہیں چرایا۔“ میں نے جلدی سے صفائی سے پیش کی ”مجھے وہ اونٹ
خود دلاور خان نے سواری کے لیے دیا تھا، مجھے تو بھائی اونٹ ڈرائیو کرنا بھی نہیں آتا، اسی لیے تو
اس حال کو پہنچا ہوں۔“

”یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟“ وہ شخص اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہو گیا۔

”شاید ٹھیک ہی کہہ رہا ہے سردار، اونٹ سے لٹکے ہوئے تو میں نے بھی دیکھا تھا اسے۔“
اس شخص نے جواب دیا۔

”اچھا..... خان نے تجھے وہ اونٹ کس خوشی میں دیا تھا۔“ سونے کے دانت والے سردار
نے پوچھا۔

”میں ان کی بیٹی کے سر سے جن بھگانے کے لیے چلہ کاٹنے نکلا تھا، مجھے سواری کی
ضرورت تھی۔ انہوں نے وہ شریر اونٹ مجھے دے دیا اور اس اونٹ نے میرا بیڑا غرق کر دیا لیکن
بھائی تم کون ہو؟“

”شاید تم نے میرا نام سنا ہو۔“ وہ اکڑ کر بولا ”میرا نام گلشن ہے..... گلشن ڈاکو۔“
میں اس کی لڑکی مناسبت سے سکڑ کر رہ گیا۔ اس سے ملاقات کی تمنا تو تھی۔ لیکن یوں
ناگہانی ملاقات کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے نگاہوں میں ستائش سمونے کی کوشش کرتے
ہوئے اسے دیکھا اور قصیدہ خوانی شروع کر دی۔

”اخواہ تو آپ ہیں، گلشن ڈاکو۔“ میں نے لہک کر کہا لیکن میری آواز لرز رہی تھی ”کہاں
چھپے ہوئے تھے آپ عالی جناب میری تو آنکھیں ترس رہی تھیں، آپ کی دید کو خان صاحب
نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں آپ جیسا گھبراہور حسین و جمیل نوجوان کوئی نہیں۔“

”واہ..... میں تو قائل ہو گیا۔ خان صاحب کا، آپ تو آپ ہی ہیں جناب کیا شان ہے
آپ کی آپ نے شب وصال کے بعد آئینہ کبھی نہیں دیکھا ہوگا، ورنہ آپ کو پتا چلتا کہ ہر بار
آپ کی دوشیزگی کچھ اور نکھر آتی ہے اور یہ آپ کے دودانت..... ایسے دانت تو میں نے کہیں
نہیں دیکھے، دانت نکالتے ہیں تو بجلی سی چمک جاتی ہے..... واہ۔“

”ابے..... یہ کیا بکواس ہے۔“ وہ پاؤں پیچ کر دھاڑا۔

”اونٹ سے گرتے ہوئے تیرے سر پر چوٹ لگی ہے، مجھے علاج کرنا پڑے گا۔“

”سرکار..... اس کا علاج پھر اسی اونٹ پر سواری کرنا ہے۔“ ایک ڈاکو نے مشورہ دیا۔

فلموں میں یہی ہوتا ہے جس ٹریکٹر کے نیچے آنے کی وجہ سے یادداشت گم ہوتی ہے اسی ٹریکٹر کے نیچے دوبارہ آنے سے بحال ہو جاتی ہے۔“

میں علاج بالمثل کی وہ خوفناک تجویز سن کر جان بچتے ہوئے بچا۔“ میں اب ٹھیک ہوں بھائی۔“ میں نے بوکھلا کر کہا ”اس اونٹ کو مجھ سے دور ہی رکھو۔“

میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ سب ہنس دیئے۔

مجھے برا تو لگا۔ لیکن میں صرف برداشت ہی کر سکتا تھا۔

”اگر یہ خان صاحب کا آدمی ہے تو اسے خان صاحب کے حوالے کر دینا چاہیے۔“ دوسرے ڈاکو نے مشورہ دیا۔

”بات تو ٹھیک ہے۔“ گلشن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”لیکن اس کا حال بہت خراب ہو رہا ہے، دو ایک دن آرام کر لے پھر بھجوا دیں گے۔“ پھر اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا ”ٹھیک ہے جوان، تم یہیں آرام کرو۔“

میں نے دو دن کی مہلت کا سن کر خدا کا شکر ادا کیا، اس دوران میں بھاگنے کی کوئی ترکیب کر سکتا تھا اگر وہ فوراً طور پر مجھے خان صاحب کے حوالے کرتے تو میں پھر اسی مصیبت میں پھنس جاتا۔

وہ سب کمرے سے چلے گئے لیکن جاتے جاتے دروازہ باہر سے بند کر گئے، خوش قسمتی سے کمرے میں بستر موجود تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور بستر بیٹھ گیا۔ قدرت نے خود مجھے گلشن ڈاکو تک پہنچا دیا تھا، اور وہ لڑکی زینت اسی کی قید میں تھی کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔ البتہ لڑکی کو وہاں سے نکالنا اب بھی مسئلہ تھا، ایک صورت یہی تھی کہ اسے بھی دوائے غیاب استعمال کراؤں پھر میں نے سوچا کہ پہلے لڑکی نظر تو آئے، پھر یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا۔

مجھے اب بھی جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا ہے نہ تو دو دن گزرتے دیر لگتی ہے، اور نہ ہی ان ڈاکوؤں کا ارادہ بدلتے یہ سوچ کر میں نے جیب سے دوائے غیاب کا کپسول نکالا اور اسے نگل گیا۔ کمرے میں روشنی تھی..... نتیجتاً میرا سایہ..... غائب ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں نثار ہو چکا ہوں، اب میں ان ڈاکوؤں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار تھا۔

کمرے میں باہر کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی تھی۔ جو اس وقت بند تھی میں نے اسے کھول دیا۔ میں ڈاکوؤں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں فرار ہو گیا ہوں، اور اس دوران مجھے لڑکی کو تلاش کرنا تھا لیکن دوا کے استعمال کے ساتھ ہی مصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔

کھڑکی سے باہر ملا ہوا شہد کی مکھیوں کا ایک بڑا چھتا تھا، کھڑکی کے پٹ سے وہ چھتا مل گیا اور مکھیاں یہ سمجھ کر کہ غنیمت ان پر حملہ آور ہوا ہے پھر گئیں۔ لاکھوں مکھیاں حرکت میں آئیں اور

مجھے کھڑکی بند کر کے قلعہ بند ہونے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس پرستم یہ کہ ان بدتمیز مکھیوں کے نزدیک حاضر اور غائب انسان میں کوئی فرق ہی نہیں تھا، وہ مجھ پر پل پڑیں اور جسم سے چسٹ کر رہ گئیں۔

میں دیوانہ وار اچھلنے لگا لیکن اچھلنے سے بھلا مکھیوں کے ڈنک سے نجات ملتی ہے، میرے حلق سے فلک شکاف دردناک چیخیں نکل رہی تھیں، پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور مکھیوں نے فوری طور پر دروازہ کھولنے والوں کی بھی تواضع شروع کر دی انہیں میری موجودگی یا عدم موجودگی پر غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی، انہیں سر پر پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔

دروازہ کھلتے ہی مکھیوں کو محاذ جنگ وسیع کرنے کا موقع مل گیا تھا، اس لیے کمرے میں مکھیوں کی نفی کچھ کم ہو گئی لیکن میری جان کو دس بارہ مکھیاں ہی کافی تھیں، کجا یہ کہ وہ اب سینکڑوں کی تعداد میں میری مزاج پر سی کر رہی تھیں پھر باہر سے بھی چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ مکھیوں نے ڈاکوؤں کے اڈے پر چھاپا مار کر کھرام برپا کر دیا تھا۔

لیکن میری حالت سب سے تباہ کن تھی ان کے نزدیک دشمن اول میں ہی تھا کیونکہ سب سے پہلے میں ہی انہیں نظر آیا تھا، انہوں نے مجھے بھٹھوڑ کر رکھ دیا تھا میرے سارے جسم میں بے پناہ سوزش ہو رہی تھی، مجھے یقین ہے کہ میرا جسم بری طرح سوج چکا ہوگا، ایسا لگتا تھا کہ بدن میں ہزاروں سونیاں اتری جا رہی تھیں جب میں اچھلتے اچھلتے تھک گیا تو میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

باہر بھی ہنگامہ ہو رہا تھا، ہر شخص اچھل پھاند میں مصروف تھا ڈاکوؤں پر ایسی افتادہ کہاں پڑی ہوگی انہیں تو یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ آئے ہیں، میں اس موقع پر حاضر ہوتا تب بھی فرار ہو سکتا تھا وہ سب یوں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے جیسے ان کی پیروں میں اسپرنگ لگے ہوں۔

اچانک ایک ڈاکو میری طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا ”وہ دیکھو..... مکھیوں کا چھتا دوڑ رہا ہے، ارے دیکھو کتنا بڑا چھتا ہے۔“

افراق فراقی کے باوجود ہر ڈاکو کو میری طرف متوجہ ہو گیا، وہ منظر ان کے لیے اس قدر حیرت ناک تھا کہ وہ اچھلنا کودنا بھی بھول گئے پہلے تو میں یہی سوچتا رہا کہ میں ان ڈاکوؤں کے لیے مکھیوں کا چھتا کیسے ہو گیا۔ پھر بات میری سمجھ میں آ گئی میں غائب ہونے کی وجہ سے انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ مجھ سے لپٹی ہوئی مکھیاں انہیں دکھائی دے رہی تھیں وہ یقیناً چھتے جیسا منظر ہوگا، اگر وہ منظر کسی فلم میں ہوتا تو میں اسے دیکھ کر یقیناً محفوظ ہوتا لیکن اس وقت یہ ممکن نہیں تھا میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار تھا، چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اذیت تھی

کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

آکھ حسب معمول ایک کوٹھڑی میں کھلی، جب سے دوا کا چکر چلا تھا ہر بے ہوشی کے اختتام پر میں خود کو کسی نہ کسی کوٹھڑی میں پاتا تھا یہ اٹھارواں موقع تھا کہ میرے ساتھ یہ ہوا تھا، البتہ ایک لحاظ سے مختلف تھا کیونکہ وہ تھانے کی کوٹھڑی تھی جس میں اس وقت میں استراحت فرما رہا تھا، دروازے میں لوہے کی سلاخیں تھیں جن سے یا تو بالا اقساط..... میرا مطلب ہے آسان قسطوں پر نکالا جاسکتا تھا، یاد ہواں بن کر خوشگوار پہلو یہ تھا کہ جسم پر سے مکھیوں کا مکمل ہٹ چکا تھا، اور نا خوشگوار یہ کہ اس پر خار مکمل میں لپٹنے کے نتیجے میں بے پناہ اذیت سے دوچار تھا، اس پر یہ فکر کہ آخر میں نے تھانے میں قدم رنجہ کیسے فرمایا ہوگا، ظاہر ہے میں از خود تو یہ حماقت نہیں کر سکتا پھر خیال آیا کہ ممکن ہے، ڈاکوؤں کے ساتھ میں بھی گرفتار ہو گیا ہوں۔

اذیت نے مجھے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تو ایک پولیس والے کی آمد پر پتہ چلا کہ میں درحقیقت چیخ رہا تھا، پولیس والے نے مجھے گھورا اور پوچھا ”کیا بات ہے؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟“

”ارے بھائی..... دیکھتے نہیں ہو، شہد کی مکھیوں کا ڈسا ہوا ہوں۔“ میں نے اپنی دانست میں کراہتے ہوئے جواب دیا۔

پولیس والے نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے ”تو کیا ہوا؟“ اس نے بڑی بے پروائی سے کہا ”کھیاں تو کاٹتی ہی رہتی ہیں۔“

اس کی بات سن کر میں بھنا گیا، میں مرا جا رہا ہوں اور اس کے نزدیک یہ کوئی خاص بات ہی نہیں تھی۔

”اب شور نہ مچانا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ اس نے مجھے ڈانٹا۔

”میں یہاں بند کیوں ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے معلوم نہیں انچارج صاحب کو پتا ہوگا۔“ اس نے جواب دیا اور چلا گیا۔

اس کی بے نیازی بھی اشتعال انگیز تھی لیکن اذیت، اشتعال پر غالب آگئی اور میں دوبارہ کراہنے میں مصروف ہو گیا پھر مجھے خیال آیا کہ میں حاضر کیسے ہوا، اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں نے دوا کی خاصیت اور دریافت کر لی ہے، شہد کی مکھیوں کے ڈنک اس کا اثر ازل کر دیتے تھے۔

کچھ دیر بعد وہی پولیس والا پھر نازل ہوا اس بار اس کے ہاتھوں میں چابیاں تھیں، اس نے دروازہ کھول دیا اور بولا ”چلو..... تمہیں انچارج صاحب بلارہے ہیں۔“

میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا، لیکن انچارج کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے

پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہاں سکندر اور دلاور خان موجود تھے انچارج ان کے آگے بچھا بچھا جا رہا تھا، میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ سب متوجہ ہو گئے۔

دلاور خان نے میرا انقباضی جائزہ لیا اور انچارج سے بولا ”یہ وہ بزرگ نہیں ہیں۔“ ”اچھا۔“ انچارج نے دانت نکال دیئے۔ پھر سپاہی کی طرف متوجہ ہوا ”جاؤ..... اسے بند کر دو۔“

”یہ کیا بد معاشی ہے۔“ میں سکندر خان کو دیکھتے ہوئے دباڑا۔ ”میں تم لوگوں ہی کی خاطر اس حال کو پہنچا ہوں، نہ چلہ کاٹنے نکلتا اور نہ مکھیاں مجھے کاٹتیں، اب تم مجھے پہچاننے سے بھی انکاری ہو۔“

”ارے..... عالی جناب۔“ سکندر نے کہا ”لیکن میں تو صرف آواز سے آپ کو پہچانتا ہوں، آپ اتنے فربہ تو نہیں تھے..... اوہ..... شاید شہد کی مکھیوں نے آپ کو جغرافیہ تبدیل کر کے تاریخ مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔“

میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، واقعی..... میری انگلیاں بھی اسے ابوالعرمان کا چہرہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھیں، ناک پھول کر کپا ہو گئی تھی، کان اتنے وزنی ہو گئے تھے کہ لٹکتے محسوس ہو رہے تھے اور دونوں رخساروں میں ہمہ وقت نظر آنے والے، ان خوبصورت اور بڑے بڑے گڑھوں کا دور دورہ۔ نام و نشان نہیں تھا، جنہیں شعرائے کرام غالباً چاہ زخنداں کہہ کر پکارتے ہیں، اوپر کا ہونٹ لٹک کر ٹھوڑی تک آ گیا تھا۔ اور نیچلا ہونٹ غالباً ناف کی بلا میں لینے کی کوشش میں مصروف تھا۔

”آپ کا تو برا حال ہو گیا عالی جناب۔“ اس مرتبہ دلاور خان نے زہر افشانی کی ”ایسا اندھیرا تو کسی کے ساتھ نہیں ہوا ہوگا، خیر اللہ پاک ہمیشہ اپنے برگزیدہ بندوں کو آزما رہا ہے، چیچ چیچ بد صورت تو آپ پہلے بھی کم نہیں تھے، لیکن اب تو آپ مقابلے میں حصہ لیں تو یقیناً اول آئیں گے۔ ویسے ایک بار میرے دادا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، اس دن وہ اپنے ایک دوست سے ملاقات کے لیے جانے والے تھے، جسے اچانک دردِ گردہ کی شکایت ہو گئی تھی، دوست کا بیٹا اسپتال میں داخل تھا، دادا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عیادت کے لیے گھر جائیں یا اسپتال، دردِ گردہ کی شکایت تو آپ جانتے ہی ہیں..... تھانے داروں سے کی جائے تب بھی بات نہیں بنتی.....“

”بس..... خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔“ میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ اس کی اتنی تقریر بھی میں نے اس لیے سن لی تھی کہ تھانہ خاصی مخدوش جگہ ہوتی ہے، لیکن پوری کہانی سننے سے بہتر تھا کہ اسی کوٹھڑی میں واپس چلا جاؤں، دوسری وہ مردود انچارج وہ کہانی سن کر جھوم رہا

تھا۔

خان سہم کر خاموش ہو گیا۔ اب تو اس کا سہنا بھی مجھے ادا کاری محسوس ہوتا تھا۔
 ”چلیں جناب!“ سکندر نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
 ”میں خود بھی چل سکتا ہوں، اندھا نہیں ہوں۔“

میں نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ”پہلے اس بات کی وضاحت ہونی چاہیے کہ میں
 تھانے کس سلسلے میں لایا گیا ہوں۔“

”کوئی خاص بات نہیں تھی جناب۔“ انچارج نے مودبانہ لہجے میں کہا، ”ہمیں اطلاع ملی
 تھی کہ ڈاکوؤں نے کراچی جانے والی بس کو لوٹ کر ایک لڑکی کو اغوا کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں
 کارروائی ہونے ہی والی تھی کہ جنگل کی طرف شور شرابے کی اطلاع ملی۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ
 ڈاکوؤں کی خفیہ پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ خدا جانے ڈاکوؤں پر کیا افتاد ٹوٹی تھی، بہر حال ہمیں ہمیں
 دیکھ کر وہ بھاگ لیے، کوئی ڈاکو ہاتھ نہیں آیا۔ آپ وہیں بے ہوش پڑے تھے، ہم آپ کو
 اٹھالائے، خان صاحب کو اطلاع دی تو انہوں نے بتایا کہ ان کے ایک بزرگ اگر فوت نہیں
 ہوئے تو کہیں کھو گئے ہیں، انہیں گمان گزر رہا کہ کہیں آپ ہی وہ بزرگ نہ ہوں اور اتفاق سے ہوا
 بھی یہی۔“

”اور وہ لڑکی..... وہ کہاں ہے؟“

”وہ بھی مل گئی تھی، اسے ہم نے اس کے گھر پہنچا دیا۔“

میں بہت مایوس ہوا کیونکہ اسی کی خاطر تو میں نے یہ صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ لیکن مایوسی کا
 اظہار میری بزرگی کے پس نظر نامناسب تھا اور بزرگی ہی میری ڈھال تھی، میں اسے کیسے گنوا
 سکتا تھا اب تو یہی جی چاہ رہا تھا کہ ان لوگوں سے پیچھا چھڑا کر سرپٹ بھاگوں اور کراچی جا کر
 ہی رکوں۔

”اب چلیے بھی..... کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔“ سکندر نے میرا ہاتھ پکڑ کر
 کھینچا۔

ناچار میں اس کے ساتھ چل دیا مکھیوں کا سونپا ہوا عذاب ابھی جاری تھا، قدم اٹھانا بھی
 دو بھر ہو رہا تھا، جسم اس حد تک سوچ گیا تھا کہ اپنا توازن برقرار رکھنا بھی مسئلہ بن گیا تھا میں اور
 سکندر آگے آگے تھے اور دلاور خان اس کے چند ملازم پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

”اب پول کھل گیا آپ کا۔“ سکندر نے دھیرے سے کہا ”آپ جن نہیں ہیں۔“

میں چونک گیا ”وہ کیوں؟“

”کوئی جن اتنا کمزور نہیں ہو سکتا کہ شہد کی مکھیاں اسے نڈھال کر دیں، مجھے تو یہ کوئی اور ہی

چکر معلوم ہوتا ہے، کچ بچ بتائیں آپ کون ہیں اور حقیقت کیا ہے۔“

”ہوں..... اور وہ وقت بھول گئے، جب مجھ سے لپٹے ہوئے سلطانہ..... سلطانہ چیختے
 ہوئے روئے جا رہے تھے، حالانکہ میں تمہیں نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت اندھے ہو گئے
 تھے کیا؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ممکن ہے وقتی طور پر میری بینائی ہی زائل ہو گئی ہو۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
 میں خود سوچ میں پڑ گیا، وہ بڑا ڈھیٹ آدمی تھا اور ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کا قائل
 تھا۔ اس کو مطمئن کرنا بہت ضروری تھا۔ خدا نخواستہ وہ مجھے آدمی سمجھ لیتا تو شاید میرا حشر ریڈیو
 پاکستان سے نشر کر دیتا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ انسانی روپ میں آنے کے بعد ہم بہت ساری قوتوں سے
 محروم ہو جاتے ہیں اور بہت سی کمزوریاں ہم پر حاوی آ جاتی ہیں۔“
 میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مجھے یقین نہیں آتا۔“ اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔

”تو تمہارے یقین نہ کرنے سے مجھ میں کوئی کمی آ جائے گی؟“ میں نے بھنا کر جواب
 دیا۔

”البتہ ایک صورت ہے، مجھے یقین دلانے کی۔“ اس نے میری بات نظر انداز کرتے
 ہوئے کہا۔

میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا، خدا جانے، اس کا شکی ذہن اب کیا گل
 کھلانے والا تھا۔

”آپ کو آگ میں کودنا ہو گا۔“ اس نے اتنے اطمینان سے کہا، جیسے مجھے کھانا کھانے کی
 نوید سنارہا ہو۔

”کیوں کودوں گا، کیا میں پاگل ہوں۔“ مجھے غصہ آ گیا۔

”اس سلسلے میں میری خان صاحب سے بھی بات ہوئی ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں آپ کو جن
 سمجھتا ہوں اور دوسرے برگزیدہ ہستی، خود آپ کا کہنا بھی یہی ہے کہ آپ جن ہیں آگ کو
 آگ جلا نہیں سکتی، پھر آگ میں کودنے میں قباحت کیا ہے، خان صاحب ہو جائے گا کہ آپ
 جن نہیں بلکہ بزرگ تھے۔“

میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے بد بخت ابھی سے میرے لیے ماضی کا صیغہ استعمال
 کر رہا تھا۔ اور میرے کریم کرم کا بندوبست بھی کر دیا تھا، میں تیزی سے سوچنے لگا کہ اسے کس
 طرح قائل کروں، وہ شروع ہی سے میرے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔

”بزرگ کیسے ثابت ہوں گا۔“ میں نے پہلا نکتہ اٹھایا ”وہ تو میں پہلے ہی ثابت ہو چکا ہوں دو آزمائشوں سے کامیاب گزرا ہوں۔“ میں نے سینہ بھلایا۔

”بے شک..... بے شک۔“ اس نے جھومتے ہوئے کہا ”لیکن یہ تو ثابت نہیں ہوا کہ آپ جن نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے اب خود کہہ رہا ہوں کہ میں جن نہیں ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو شرط لگا چکا ہوں۔“

”تب بھی ٹھیک ہے میں آگ میں کود کر خود کو جن ثابت ضرور کروں گا، لیکن ساتھ ہی ایک ثبوت اور دوں گا۔“ میں اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔

”وہ کیا؟“

”میں تمہیں ساتھ لے کر آگ میں کودوں گا اور تمہارا بال بھی بریک نہیں ہوگا۔“

”اس کی سٹیگم ہوگی“ یہ..... یہ کیسے ممکن ہے“ وہ ہکلا یا ”مجھ پر رحم کیجئے۔“

”بس..... میں نے فیصلہ کر لیا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”اگر خان یہ مظاہرہ دیکھے گا تو میں خود اس سے بات کر کے اسے ڈبل پروگرام دکھاؤں گا۔ اگر تمہارا دل آگ میں خود نہ کو نہ چاہے تو خان کو سمجھاؤ ورنہ یاد رکھو، خان میری تجویز سے اختلاف نہیں کرے گا۔“

”خان صاحب کو اب کون سمجھا سکتا ہے۔“ اس نے یاس انگیز لہجے میں کہا ”آپ ہی مجھ پر رحم کیجئے۔“

”بس..... اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ میں نے بے رخی سے کہا۔

اس کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو خون نہیں، میں نے دوا استعمال کرنے کی ٹھان لی تھی، لیکن اس سے پہلے اس مردود کا خون خشک کرنا بھی ضروری تھا، پھر میرا دل ڈرنے لگا کہ دوا کہیں عین موقع پر دغا نہ دے جائے۔

خان کی حوصلی پہنچتے ہی مجھے بڑی عزت اور احترام سے اندر پہنچایا گیا، سکندر میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا، لیکن اب وہ بہت بجا بجا نظر آ رہا تھا اس کی طبیعت کی شوخی ہوا ہو گئی تھی۔

”مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے، کھانا لاؤ۔ میرے لیے۔“ میں نے کمرے میں پہنچتے ہی اسے حکم دیا۔

”کیا..... یہ کون سا وقت ہے کھانے کا عالی جناب!“

”کیا یہاں کھانے کے وقت مقرر ہیں؟“ میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”جی ہاں..... اس اور اس کے علاوہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، آپ نے کل ہی تو چھ سات روٹیاں مع سالن کی قاب کے اپنے شکم بے پناہ میں اتاری تھیں۔“

مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے، سخت خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ فطرت کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ”ابے..... تو کیا کھانا ہفتے میں ایک دن کھایا جاتا ہے۔“ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”آپ کھانا کھاتے ہیں، یہی بہت ہے۔“ اس نے منطق بگھاری ”کیا ہماری طرح تین وقت کھائیں گے؟“

”نہیں..... ایسا بھی نہیں ہے۔ البتہ میں ہر روز کھانا کھاتا ہوں۔“ میں نے کہا ”اب جلدی سے کھانا لے آؤ۔“

وہ چلا گیا اور میں کھانے کے متعلق سوچنے لگا۔ جب سے پردیس میں دوا کا ساتھ ہوا تھا، کھانا واقعی روز کے روز ہی مل رہا تھا، لگتا تھا کہ میں سچ سچ جن ہو گیا ہوں، عموماً کھانے کے اوقات عالم بے ہوشی میں گزرتے تھے۔

کچھ دیر بعد سکندر کھانا لے آیا اور میں حسب سابق مریضوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ سکندر اس دوران پر تشویش نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ لیکن میں نے اسے پوچھا بھی نہیں، کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ دھوئے، واپس آیا تو وہ ٹرے اٹھائے برتن لے جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

”ایک بات پوچھوں جن صاحب۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”پوچھو..... کیا بات ہے۔“ میں نے شاہانہ انداز میں کہا، کھانا پیٹ میں پڑتے ہی طبیعت چونچال ہو گئی تھی۔

”وہ ٹھہری..... وہ..... آپ رفع حاجت کے لیے بھی جاتے ہوں گے۔“ اس نے جھجک جھجک کر پوچھا۔

میں نے بڑی مشکل سے ابکائی روکی، بری طرح جی متلا گیا تھا، وہ عجیب ناہنجار آدمی تھا۔ چوبیس گھنٹے بعد مجھے کھانا میسر آیا تھا اور اس نے یہ گفتگو شروع کر دی تھی۔ ”گندی باتیں مت کرو مجھے گھن آتی ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔

وہ ہنسنے لگا ”یہ تو فطرت ہے جناب بتائیں نا..... اتنا سارا کھانا کھانے کے بعد تو.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ہی ہی کرنے لگا۔

”یہ سب کھانا تو اب تک جزو بدن ہو گیا ہوگا۔“ میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”جزو بدن۔“ وہ پھر زور سے ہنسنے لگا۔

”میں کھانا تلوا کر لایا تھا جناب، میرا دعوا ہے کہ اتنا وزن تو آپ کا جو توں اور کپڑوں سمیت بھی نہیں ہوگا۔“

اب غصہ برداشت سے باہر ہو گیا تھا، ”فکر نہ کرو..... تمہاری بس میرے ساتھ آگ میں کودنے کی تیاری کرو۔“ میں نے اسے یاد دلایا ”اور برتن لے جاؤ جلدی سے۔“
اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ ”وہ جی..... میں نے خان صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ جو ایک دفعہ کہہ دیں اس پر عمل ضرور کرتے ہیں، انہوں نے تو منوں لکڑی منگوالی ہے۔ زبردست الاؤ تیار کر رہے ہیں۔“

اس پر جو گزر رہی تھی، وہی جانتا تھا، یہ روح فرسا خبر سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ لیکن کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ میں وہ جیب تھپتھا کر رہ گیا۔ جس میں دوائے غیاب کے کپسول موجود تھے۔ سکندر فوراً ہی لوٹ آیا۔ ”چلیے جناب!“ اس نے میرا ہاتھ متھے ہوئے کہا، لیکن خود اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا ”آگ خوب بھڑک اٹھی ہے، آپ کے معتقدین آپ کے منتظر ہیں۔“
اب کیا ہو سکتا ہے میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا، ڈھول کی آوازیں دور ہی سے سنائی دے گئیں، بہت سارے لوگ ایک دائرہ بنائے کھڑے تھے۔
”بچ میں الاؤ ہے جناب عالی۔“ سکندر نے مجھے مطلع کیا۔ ”یہ تمام انتظام آپ ہی کے لیے کیا گیا ہے۔“

”نہیں..... میرے اور تمہارے لیے۔“ میں نے تصحیح کی اور اس کا رنگ فق ہو گیا۔
میں دلاور خان کی طرف بڑھ گیا۔ میری کوشش تھی کہ گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کروں۔ دوا ئے غیاب کے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کی فکر تھی۔
”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سکندر کو ساتھ لے کر آگ میں کودوں گا۔“ میں نے خان سے کہا ”اور میرا ہاتھ تھامے ہونے کی وجہ سے سکندر کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔“
”یہ ظلم ہے خان..... یہ زیادتی ہے۔“ سکندر نے واویلا شروع کر دیا۔
”بکواس مت کرو۔“ خان نے اسے ڈانٹ دیا۔

”وہی ہوگا جو یہ بزرگ ہستی چاہے گی۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔
میں نے مجمع کا جائزہ لیا، کھڑے ہوئے لوگوں کے آگے کرسیاں بھی دائرے کی صورت چھٹی ہوئی تھیں۔ ان پر علاقے کے ذی اثر لوگ بیٹھے تھے، الاؤ دیکھ کر میرے دیوتا کوچ کر گئے پھر مجھے وہ زبردست کتا نظر آیا، قد کاٹھ میں وہ لگ بھگ گدھے کے برابر تھا۔
”یہ ناپاک جانور یہاں کیوں ہے۔“ میں نے خان سے کہا ”اسے ہٹاؤ۔“
”اوہ..... یہ تو جاگیردار جمو کا کتا ہے، خیر آپ فکر نہ کریں، جناب اسے ہٹا دیا جائے گا

میں نے نفرت آمیز نگاہوں سے اس مجمع کو دیکھا وہ سب میرے سستی ہونے کا تماشا

دیکھنے آئے تھے۔ حالانکہ میں بیوہ نہیں تھا، پھر میں صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اب مجھے فوری طور پر داؤ استعمال کرنا تھا میں نے ایک نظر سکندر کو دیکھا، جسے خان کے دوپٹے کے ملازم پکڑے کھڑے تھے۔ اس کا حال اس اس بکرے کا سا تھا، جس کی آنکھوں کے سامنے قصائی چھری تیز کرنے میں مصروف ہو۔
اب وقت عمل آ پہنچا تھا۔

”میں وضو کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے خان سے کہا۔
”سبحان اللہ سبحان اللہ۔“ اس نے داؤد کے ڈوگرے برسا دیئے۔ ”بس اسی لیے تو میں آپ کا قائل ہوا ہوں، بزرگی آپ کی شخصیت سے جھلکتی بلکہ برستی ہے، ایک بار کا ذکر ہے کہ دادا مرحوم۔“

”بس..... اب دادا حضور کا نام لیا تو میں تمہیں لے کر آگ میں کود جاؤں گا۔“ میں دھمکی دی اور وہ سہم کر رہ گیا۔

”میں..... میں ابھی وضو کا بندوست کراتا ہوں۔“ اس نے گھگھاتے ہوئے کہا۔
”کوئی ضرورت نہیں، میں غسل خانے جا کر وضو کر لوں گا۔“
”بہیں سب کے سامنے کر لیجئے، یہ سب لوگ بھی خوش ہو جائیں گے۔“ اس نے فرمائش کی۔

”بے وقوف..... کیا میں انہیں خوش کرنے کے لیے وضو کر رہا ہوں۔“ میں نے اسے ڈانٹ دیا ”میں سب کی نگاہوں سے چھپ کر وضو کروں گا۔“
”جیسی آپ کی مرضی۔“

”اور ہاں..... میری والہی تک کتا یہاں سے ہٹا دینا۔“
”بہت بہتر جناب، اب میں اعلان کر دوں۔“ اس نے کہا اور پھر مجمع کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

”سرکار اب وضو فرمائیں گے۔“ اس نے چیخ کر کہا۔
تمام لوگ یہ سن کر تلایاں بجانے لگے، ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی پکنک پر آئے ہوئے ہیں، میں حویلی کی طرف بڑھ گیا، لیکن انہوں نے مجھے تنہا نہیں جانے دیا۔ مجھے جلوس کی شکل میں غسل خانے لے جایا گیا۔

”اب ہر شخص واپس چلا جائے۔“ میں نے حکم دیا ”پانی گرنے کی آواز بھی کسی کے کانوں میں نہیں پہنچنی چاہیے۔“

وہ سب چلے گئے۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر میں نے جیب سے

کپسول نکال کر حلق سے اتار لیا۔ کچھ سوچ کر میں نے احتیاطاً ایک اور کپسول کی فضول خرچی کر ڈالی۔ کچھ دیر بعد میں غائب ہو گیا۔

میں نے دروازہ کھولا..... اور میرے اوسان خطا ہو گئے، سامنے وہی مردود کتا کھڑا غرار ہاتھا، جسے میں باہر نکالنے کی ہدایت دے کر آیا تھا، خان نے میری ہدایت کے مطابق کوشی کے جائے واردات سے ہٹا لیا تھا..... لیکن حویلی میں بھیج دیا تھا..... اور اب وہ مجھے دیکھ کر غرار ہا تھا۔

میں نے تیزی سے پلٹ کر بالٹی اٹھالی، وہ اسی وقت مجھ پر لپکا اور میں نے اس کے منہ پر بالٹی دے ماری، کتا غراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اس بار وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور میں نے بالٹی اٹھاتے ہوئے دوڑ لگا دی۔ میں برآمدے میں پہنچا تو متحرک بالٹی نے بگڑ چادی۔ ظاہر ہے، میں تو اُن لوگوں کو نظر آ نہیں رہا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا ہوگا، جیسے بالٹی اڑی جا رہی ہو، بالٹی کے پیچھے پھرا ہوا کتا تھا۔

وہاں سراپسنگی پھیل گئی۔ خان اور سکندر بھی اضطراری طور پر کرسیوں کے پیچھے جا چھپے تھے۔

پھر سکندر کو کچھ خیال آیا اور اس نے کرسی کے پیچھے سے نکل کر زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔

”رک جاؤ..... رک جاؤ ڈرو نہیں، یہ وہی بزرگ ہیں، اس وقت وہ غائب ہیں..... اور کتے کے ساتھ کھیل رہے ہیں، تم لوگ گھبراؤ نہیں، وہ تو جانوروں سے بھی پیار کرتے ہیں۔“ وہ خدا جانے کیا کیا بانکتا رہا۔ مردود کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ کتے کو اس کمینگی سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے اسی کی طرف رخ کر لیا اور اس کے قریب پہنچ کر بالٹی کھینچ کر اس کی کمر پر دے ماری۔ وہ بلبلاتا ہوا ایک طرف بھاگتا چلا گیا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر حاضرین الگ خوفزدہ ہوئے اور عذر کا سا سماں برپا ہو گیا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ، لیکن اس مستقل مزاج کتے نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، اب تو بالٹی بھی میرے پاس نہیں تھی، گویا میں غیر مسلح تھا، چنانچہ میں نے برآمدے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ بد قسمتی سے چھلانگ لگانے کے بعد میں اپنی رفتار پر کنٹرول نہ پاسکا اور الاؤ میں جا گرا۔ کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔

میں بہت تیزی سے آگ سے نکلا اور زمین پر لوٹیں لگانا شروع کر دیں، جسم تو زیادہ نہیں جلا تھا، البتہ شلوار کا نیفہ جل گیا تھا۔ یوں میں شلوار سے محروم ہو گیا۔ یہ میرے لیے ایک حادثہ جانکا تھا، کیونکہ میں بہت شرمیلا ہوں، ہاتھ روم بند کر کے نہاؤں، تب بھی جانگاہ ضرور

پہنتا ہوں، مانا کہ میں غائب تھا لیکن دوا کے رحم و کرم پر تھا اور کسی بھی وقت حاضر ہو سکتا تھا۔ بہر صورت لوٹ پوٹ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور کراہتے ہوئے ایک طرف چل پڑا، اس وقت ان لوگوں پر لعنت بھیجے کودل چاہ رہا تھا، جنہوں نے اپنی فلموں میں غائب انسانوں کو عیش کرتے دکھایا تھا، مجھے تو اس دوا نے تکلیف اور درد بردی کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔

دشواری یہ تھی کہ میں حویلی سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ پہلے مجھے ایک ایک عدد شلوار حاصل کرنا تھی۔ میں حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچتے ہی میں سکندر کے کمرے کی طرف لپکا، وہی اس وقت میرے کام آ سکتا تھا۔ بد قسمتی سے سکندر وہاں موجود نہیں تھا۔ میں وہاں سے نکلا اور ہر کمرے میں جھانکتا پھرا کہ شاید وہ کہیں نظر آ جائے۔

اسی چکر میں میں ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا، جہاں بہت سے اوزار پڑے تھے کمرے میں روشنی تھی۔ دیواروں میں جا بجا کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔

پھر ایک طرف مجھے بہت سی روغنی تصاویر نظر آئیں، ان میں دلاور خان کی تصویر بھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس کمرے میں اپنے بزرگوں کی تصاویر آویزاں کرانا چاہتا ہوگا، وہاں میرا مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی میں واپسی کے لیے پلٹا لیکن ایک بڑی سی کیل سے الجھ گیا۔ چرکی آواز سنائی دی اور میری قمیض بھی مجھے داغ مفارقت دے گئی۔

میرے لیے وہ ایک بے حد خوفناک چویشن تھی، دوا کی کج ادائیگوں سے میں خوب آشنا تھا،..... اور جانتا تھا کہ کسی بھی لمحے ظاہر ہو سکتا ہوں، میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اب تو میرے لیے غائب حالت میں بھی ادھر ادھر پھرنا محال ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ میں نے دوائے غیاب اور تریاقی کپسولوں کی بوتل الٹا کر مٹھی میں دبالی۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے دوائے غیاب کا ایک اور کپسول نگل گیا۔ کپڑے میسر آنے تک مجھے حاضر ہونے سے بچنا تھا۔

میں بڑی دل جمعی کے ساتھ سکندر کی تلاش میں دوبارہ نکل کھڑا ہوا۔ دوسری طرف آبلوں نے پریشان کر رکھا تھا، ابتدا میں تو شلوار کی فکر میں مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا، اب پتا چل رہا تھا کہ آگ نے میری پوری طرح سے جان بخشی نہیں کی تھی۔ میں کئی جگہ سے جلا تھا، اور اب وہاں آبلے ابھر آئے تھے۔ دوا کے حصول کے لیے حاضر ہونا ضروری تھا..... اور اس عالم میں، میں حاضر نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ پہلا کام کپڑوں کا حصول تھا۔

میں بہت سے کمروں میں جھانکتا پھرا، سکندر کا کہیں پتہ نہیں تھا، بلکہ مجھے تو تمام کمرے ہی خالی ملے، نہ خان نظر آیا اور نہ ہی اس کے ملازمین میں سے کوئی البتہ ایک کمرے میں مجھے کپڑے کی الماری ضرور دکھائی دے گئی۔ میں بے تابانہ الماری کی طرف لپکا، کھول کر دیکھا تو

مایوسی کی حد نہ رہی۔

اس الماری میں صرف زنانہ ملبوسات تھے، تلاش کے باوجود مجھے اپنے مطلب کا کوئی کپڑا نہ مل سکا۔ میں دہشت زدہ ہو گیا۔
دوا کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی تھی۔ کوئی اور صورت نہیں تھی، چنانچہ میں نے جلدی سے ایک جیمبر اور شلوار نکالی اور پہن لی۔

اب تن ڈھانپنے کا سامان ہو گیا تھا، اگر ہنگامی طور پر حاضر ہو بھی جاتا تو کم از کم رسوا کن صورت حال سے بچ جاتا، اب مجھے مردانہ کپڑے تلاش کرنا تھے۔ اور پھر حاضر ہو کر آبلوں کا بھی کچھ بندوبست کرنا تھا، لیکن اس لمحے آبلوں میں ہونے والی سوزش اتنی بڑھ گئی کہ میں نے زنانہ لباس کے باوجود ان لوگوں کے سامنے آنے کا خطرہ مول لیا، میں نے دو تریاتی کپسول کھائے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس وقت اگر کوئی مجھے دیکھتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ کوئی حسین و جمیل طرح دار لڑکی ہار سنگھار میں مصروف ہے، جب کہ درحقیقت میں دوا کا رد عمل دیکھ رہا تھا۔ آئینے میں عکس نظر آتے ہی پتہ چل جاتا کہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے آئینے میں اپنا عکس نظر آنے لگا۔ میں اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ میں ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس اجنبی کمرے میں تاریکی سے مذاق کرنا مناسب نہیں تھا، پھر اچانک کسی نارنج کی روشنی مجھ پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور میرے بدن پر چھائی گئی۔ میں اس میں بڑی طرح الجھ کر رہ گیا۔ میں نے بری طرح ہاتھ پاؤں چلائے..... لیکن پھر میں معلق ہو کر رہ گیا۔ ساتھ ہی میں خود کو حرکت میں محسوس کر رہا تھا کافی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے اپنے کندھے پر اٹھائے بھاگا جا رہا ہے۔

میں انخواہو رہا تھا اب یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ پھر مجھے اٹھا کر کہیں رکھ دیا گیا۔ وہ جگہ مجھے خاصی تنگ محسوس ہو رہی تھی۔ پھر جب وہ جگہ مخصوص آواز کے ساتھ حرکت میں آئی تو پتہ چلا کہ وہ کوئی گاڑی تھی پھر لوگوں کی چیخ و پکار اور اس کے بعد گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں، لیکن گاڑی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

دھیرے دھیرے گولیوں کی آواز کم ہوتی گئی۔ اور بالاخر معدوم ہو گئی، گاڑی ناہموار راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی بڑے زور کا دھچکا لگتا۔ لیکن میرا منہ بھیچتا ہوا تھا، میں کمبل میں بری طرح سے لپٹا ہوا تھا، پھر میں نے بری طرح سے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیئے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح مجھے آواز کا جادو جگانے کا موقع مل جائے۔

”آخر ہم لوگ دختر خان کو لے ہی آئے۔“ کسی کی آواز سنائی دی۔

تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے خان کی بیٹی دردانہ کے دھوکے میں اٹھالائے ہیں، میں

نے جدوجہد ترک کر دی اور دل ہی دل میں ان نامعقول کپڑوں کو کونے لگا۔ زندگی میں پہلی بار نسوانی لباس پہننے پر مجبور ہوا تھا اور پسینے ہی مغویہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ کمرہ خان زادی دردانہ کا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ میں چیخ کر انوا کنندگان کی یہ غلط فہمی بلکہ خوش فہمی دور کر سکتا ہوں کہ وہ کسی لڑکی کو نہیں بلکہ ایک مرد کو لیے جا رہے ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے پھر کمبل میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ کچھ دیر بعد اتنی گنجائش نکل آئی کہ میں چیخ سکتا تھا۔ میں نے فوری طور پر زوردار چیخ ماری لیکن اتنی دیر تک منہ بھیچنا رہنے کی وجہ سے آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”ارے یہ دردانہ کی آواز کیسی ہو گئی؟“ کسی نے کہا لہجے میں حیرت تھی۔
”اجمق ہو تم..... بس ذرا آواز بھرا گئی ہے۔“ دوسرے کی آواز ایسی ہی ہو جاتی ہے
”شادی کے بعد تو آواز ٹھیک ہو جائے گی نا؟“ پہلے آدمی نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

”بالکل ہو جائے گی۔“ دوسرے نے جواب دیا۔
”ویسے بھی شاہ جی دیر تھوڑا ہی لگائیں گے شادی آج ہی ہو جائے گی۔“

میں کمبل کے اندر پہلو بدل کر رہ گیا۔ میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں جب شاہ جی اپنی دلہن کو دیکھے گا۔ میں نے شور مچا دیا۔ ”ارے کم بختو..... میں دردانہ نہیں ہوں..... ابو العمران ہوں۔“

”دیکھ رہے ہو لڑکی کی چالبازیاں۔“ کسی نے تبصرہ کیا۔

میں شور مچاتا رہا، اور وہ مذاق اڑاتے رہے۔ تنگ آ کر میں خاموش ہو گیا۔ وہ لوگ میری آواز کو مردانہ تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔

گاڑی دیر تک چلتی رہی، سفر کا فی طویل ثابت ہوا، ادھر میں کمبل میں لپٹا اپنی تقدیر کو رو رہا تھا، میرے ساتھ سر منڈاتے ہی اولے پڑے والا حساب ہوا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ مجھے کسی معاملے میں سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔

اچانک گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی، پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کسی نے مجھے کمبل سمیت کھینچا، وہ کمبل بھی میرے لیے محاورے والا ہی ثابت ہو رہا تھا، میں نے اس سے جتنی جان چھڑانا چاہی، وہ اتنا ہی مجھ سے لپٹتا جا رہا تھا، میں گاڑی سے نیچے اتر گیا، لیکن کمبل میں الجھ کر ایک طرف ڈھیر ہو گیا۔

”یہ کیا حرکت ہے۔“ کسی نے کسی کو ڈانٹا۔ ”لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو۔ چلو اٹھاؤ اسے۔“

کسی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے کھڑا کیا۔ اسی وقت مجھے روشنی سی نظر آئی..... گویا کمبل میں رخنہ ل گیا۔ میں نے جھلا کر کمبل کو ایک طرف پھینک دیا، مجھے دیکھتے ہی ان سب کے یوں منہ بن گئے، جیسے انہیں ناگہانی قبض کی شکایت ہوگئی ہو، اتنی مکروہ حیرت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”کون ہو تم؟“ ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”تم اغواء کرنے سے پہلے یہ بات پوچھتے تو کیا میں انکار کرتا۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

”بکواس مت کرو۔“ وہ گلا پھاڑ کر چیخا اور اس نے مجھے پھنسر سید کر دیا۔

اس کا نشانہ تو میں ہی تھا، لیکن اتفاق سے اس وقت میرے گھٹنے میں خارش ہونے لگی تھی۔ میں گھٹنا کھجانے کے لیے جھک گیا۔ اس کا ہاتھ میرے سر کے اوپر سے گزرا، چناخ کی زوردار آواز سنائی دی۔ اور اس کے ہی ایک ساتھی کا چہرہ گھوم گیا۔

میں اپنے گھٹنے کو مطمئن کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اندازے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ جو کچھ ہوا ہے، مجھے اس کا علم ہے، وہ شخص جو پھنسر کا نشانہ بنا تھا، درشت چہرے والے کو برا بھلا کہتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

درشت چہرے والا پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”بتاؤ تم کون ہو؟“ اس نے پوچھا اور اس کا ہاتھ دوبارہ گھوم گیا۔ بہت ہاتھ چھٹ معلوم

ہوتا تھا،

میں وہ ترکیب سمجھ گیا تھا جس پر عمل کر کے اس کے حملے سے بچا جاسکتا تھا، چنانچہ فوراً ہی دوسرے گھٹنے کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن میں جھکا ہی تھا کہ میرا رخسار جھنجھنا کر رہ گیا۔ وہ شخص میری چال سمجھ چکا تھا۔ اس نے عین وقت پر پھنسر کا رخ تبدیل کر دیا تھا۔

میں چکراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

”اب بولو رستم کو دھوکہ دے رہے تھے۔“

”میں نے کسی رستم کو دھوکہ نہیں دیا۔“ میں نے مضروب رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”یہ رستم جو کوئی بھی ہے، انتہائی ذلیل آدمی معلوم ہوتا ہے، اس نے مجھ پر بہتان لگایا ہے

”ابے..... وہ رستم میں ہی ہوں۔“ وہ یاؤں بیخ کر دھاڑا۔

”تو بھائی انصاف سے کہو، میں نے تمہیں کب دھوکا دیا ہے، میں نے تمہاری پیاری پیاری صورت ہی پہلی بار دیکھی ہے، میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں ہوں۔“ میں بگڑی بات بنانے کی کوشش کی۔

”یہ تم کے اٹھالائے ہو۔“ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا ”یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔“

میں نے تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی، پاگل بن کر ان لوگوں سے پیچھا جھوٹ جاتا تو بھی خسارے کا سودا نہیں تھا۔

”ہم کیا جانیں دادا، یہ لڑکی کے کمرے میں موجود تھی..... میرا مطلب ہے، موزو تھا، صورت دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

”یہ تم نے عورتوں کے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟“ درشت چہرے والے نے پوچھا۔

”جلدی میں یہی کپڑے مل سکے تھے، مجھے تو تن ڈھانپنا تھا، ویسے میں مردانہ کپڑے ہی ڈھونڈتا پھر رہا تھا،“ میں نے صفائی پیش کی۔

”اب اس کا کیا کریں؟“ اغوا کنندگان میں سے ایک بولا۔

”ظاہر ہے، مجھ سے نکاح تو نہیں کر سکتے، جو دردانہ سے کرتے، اغوا ہونے سے ٹھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔“ میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ شاید یہ لباس کا اثر تھا۔

”ایسا کرو، اسے شاہ جی کے سامنے پیش کرو۔“ رستم نے کہا ”وہی اس کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔“

میں شاہ جی کے سامنے پیش نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن کون سنتا ہے فغان درویش..... مجھے نہایت عزت اور احترام سے ترک و احتشام کے ساتھ دھکے دیتے ہوئے شاہ جی کے روبرو پہنچا دیا گیا۔

شاہ جی ایک تنومند شخص تھا اس کی عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ ہوگی۔

”ارے بد بختو..... کیا شادی میں بیجورے نچوا کر میری ناک کٹواؤ گے؟“ وہ مجھے دیکھتے ہی دھاڑا، مخاطب میرے پیش کاروں سے تھا۔

”وہ جی..... وہ جی.....“ پیش کاروں میں سے ایک بولا لیکن ہکلا کر رہ گیا۔

”کیوں جی کون لایا ہے تمہیں؟“ شاہ جی مجھ پر الٹ پڑا تو میں بوکھلا گیا۔

”یہ لوگ مجھے زبردستی اٹھا کر لائے ہیں۔“

اس نے آنکھیں نکال کر رستم کو دیکھا تو اس نے جلدی جلدی پوری کہانی سنادی۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ شاہ جی میری طرف متوجہ ہوا ”کون ہو تم؟“

”میں..... میں تو جناب ایک کیمیا گر ہوں۔“ بوکھلا ہٹ میں میرے منہ سے نکل گیا۔

”اوہ! لیکن نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ شاہ جی اٹھ کھڑا ہوا۔

اب پیچھے ہٹنا مخدوش تھا، اور مردوں کی شان کے خلاف بھی تھا۔ مردانگی کا خیال مجھے نسوانی لباس کی وجہ سے آیا تھا..... ”میں بھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ میں نے اکر کر کہا۔
”چلو مان لیتا ہوں۔“ اس نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب ذرا تفصیل بیان کر چلو۔“

”بات یہ ہے جناب کہ میں کیمیا گر ہوں، یہ بات دلاور خان کو معلوم ہو گئی اور اس نے مجھے اٹھوایا۔ اور دباؤ ڈالا کہ میں اس کے لیے سونا بناؤ، لیکن جناب، ہم فنکار لوگ پیار و محبت سے تو کام کر سکتے ہیں، دھونس دھڑلے سے نہیں، میرے انکار پر اس نے مجھے جلویا۔ یہ دیکھیں۔“ میں نے شلوار کے پانچنے اٹھا کر اپنے آبلوں کی نمائش کی۔ ”کیا بتاؤں جناب..... سخت تکلیف میں ہوں، بھاگنے کا موقع ملا تو کپڑوں کی ضرورت پڑی۔ جلدی میں یہی کپڑے پہن لیے اور پھر نہی کپڑوں کی بدولت آپ کی سرکار میں آپہنچا۔ آپ مجھے قدر شناس معلوم ہوتے ہیں۔“

اس کا سینہ پھول گیا ”ہاں..... ہم کیمیا گروں کی بہت قدر کرتے ہیں، لیکن تمہیں خود کو کیمیا گر ثابت کرنا ہوگا، ہم تمہیں مالامال کر دیں گے۔“
”میں سونا بنا کر دکھاؤں گا جناب، لیکن پہلے میرے آبلوں کا علاج ہو جائے..... اور کچھ آرام کر لوں۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے مجھے یقین دلایا..... اور پھر رستم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”رستم..... آج سے تم ان کی خدمت پر مامور ہو، انہیں کسی بات کی تکلیف نہ ہو، حکیم کو بلو اگر ان کا علاج کراؤ سمجھ گئے؟“

”جی سمجھ گیا۔“ رستم نے سرخم کرتے ہوئے کہا۔ ”جو حکم سرکار کا۔“
”آپ رستم کے ساتھ چلے جائیں، آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“ شاہ جی نے مجھ سے کہا۔

رستم نے کھا جانے والی نگاہوں سے مجھے گھورا اور پھر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا، میں اس کے ساتھ ہو گیا۔ مجھے اس کی نگاہوں کی فکر نہیں تھی۔ بس اپنا کام نکالنا تھا، آرام کرنے کو وقتی ٹھکانہ بھی میسر آ گیا تھا اور آبلوں کے سلسلے میں کوئی حکیم آنے والا تھا، کیمیا گری تو بعد کا درد سر تھا، اور میرا ارادہ تھا کہ اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی فرار ہو جاؤں گا۔
”لو..... مرو اس کمرے میں۔“ رستم نے ایک کمرے کے سامنے رکتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

”اے حسین و خوبرو نوجوان..... آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں۔“ میں نے شیریں

لہجے میں اس سے پوچھا۔ میں بلاوجہ اسے دشمن نہیں بنانا چاہتا تھا۔
”مجھ سے کہو اس کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“ اس نے آنکھیں نکالیں۔

اس بار مجھے غصہ آ گیا۔ ”اب..... کیا پاگل ہو گیا ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”شاہ جی سے شکایت کر دی تو وہ تیری کھال کھنچوا دیں گے۔“

اس کے ہاتھ میری طرف بڑھے..... لیکن وہ مٹھیاں بھیج کر رہ گیا۔ ”کچھ دنوں کی بات ہے وہ غرایا۔“ پھر تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو اوروں کا ہوا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”تم سے پہلے تم جیسے آٹھ آچکے ہیں اور اس حویلی میں بند ہیں۔“
”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“

”سیدھی سی بات ہے، شاہ جی کو سونا بنوانے کا خط ہو گیا ہے، حالانکہ اللہ کا دیا ہوا سبھی کچھ ان کے پاس موجود ہے، لیکن جب اللہ نوازے تو بعض بندوں کو ہوس بھی ہو جاتی ہے، اسی لیے وہ دلاور خان کی بیٹی سے شادی کرنے کے چکر میں ہے، کیمیا گر جتنے بھی آئے ناکام ہو گئے اب سب حویلی میں بند ہیں۔“

”خیر تم میری فکر نہ کرو، میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اب تم جلدی سے میرے لیے کوئی معقول لباس مہیا کرو اور حکیم کو بلا لاؤ۔“
”اس ساز کا لباس ڈھونڈنے میں تو دیر لگے گی۔“

اس نے میرے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے توہین آمیز لہجے میں کہا پھر اس نے میرے تیور بدلتے دیکھے تو جلدی سے بولا، ”خیر میں کوشش کرتا ہوں۔“

میں اس کمرے میں داخل ہو گیا کافی کشادہ کمرہ تھا، ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ لیکن مجھے اب کوئی چیز متاثر نہیں کر سکتی تھی۔

میں تو ایک بار اس لقا دوق صحرا سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرتا یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گیا۔

میں ہاتھ منہ دھو کر فارغ ہوا ہی تھا کہ رستم میرے لیے لباس لے آیا۔ میں نے فوری طور پر ان نسوانی کپڑوں سے نجات حاصل کر لی۔ مردانہ لباس اگرچہ میرے بدن پر کچھ ڈھیلا تھا لیکن تھا تو مردانہ..... دوائیں، مردانہ لباس کی جیبوں میں منتقل کر کے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی آبلوں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا مسائل کی وجہ سے اس اذیت نے خود کو روک رکھا تھا، اب ذرا سی فراغت ملی تھی تو شورش پر آمادہ ہو گئی۔ میں دھیرے دھیرے کراہنے لگا۔ کسی پہلو چین نہیں پڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد رستم ایک مہول سے حکیم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

حکیم ناوقت بلائے جانے پر سخت ناخوش نظر آ رہا تھا، پھر اس نے برملا اس کا اظہار بھی شروع کر دیا۔ وہ جاگیر داری اور سرمایہ داری کے خلاف خاصی موثر تقریر کر رہا تھا۔ لیکن وہ تقریر میرے لیے بے موقع تھی۔ وہ حکیم بھی کچھ عجیب آدمی معلوم ہوتا تھا مجھے ایسے گھور رہا تھا جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔

”اچھا بس زیادہ بکواس مت کرو“ رستم نے اسے ڈانٹا۔

”اس کا علاج کرو“ رستم نے میری طرف اشارہ کیا۔

رستم کی ڈانٹ سنتے ہی وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ رستم کمرے سے چلا گیا۔ میں نے حکیم کو اپنے آبلے دکھائے۔ وہ ان کا معائنہ کرتا رہا، پھر اس نے بالترتیب میری نبض، زبان آنکھیں اور ہاتھ کی لکیریں دیکھیں اور ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”بہت پرانا قبض معلوم ہوتا ہے۔“

اس کی بات سن کر میں بھنا گیا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ میں نے جھلا کر کہا ”میں آبلوں کا علاج کرنا چاہ رہا ہوں اور آپ قبض کی کہانی لے بیٹھے۔“

”خدا کے لیے میرے آبلوں کا علاج کیجئے۔“

”آبلے تو میں نے دیکھ لیے۔ لیکن پہلے قبض کا علاج کرنا ہوگا۔“ حکیم نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ”قبض کا علاج کیے بغیر کوئی مرہم کارگر نہیں ہوگا۔ آگ اور قبض میں خدا واسطے کا بیر ہے۔“

”خدا کے واسطے حکیم صاحب۔“ میں نے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے کہا۔ ”مجھ پر رحم کریں، قبض پر لعنت بھیجیں، اور میرے آبلوں کی فکر کریں۔ مجھ سے کروٹ بھی نہیں بدلی جارہی۔ بہت تکلیف میں ہوں۔“

”میں سمجھتا ہوں، لیکن علاج دونوں امراض کا ہوگا۔ آبلوں کے لیے مرہم دے دوں گا، لیکن تمہیں قبض کشادہ بھی کھانا ہوگی۔“

مجھے منظور ہے حکیم صاحب۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”مجھے ایسا لگا جیسے میں نے قبض کشادہ کے استعمال کی بجائے کسی اور چیز کی منظوری دے دی ہو۔ حکیم نے فوراً سرمایہ داری نظام کے خلاف ایک اور تقریر کا آغاز کیا، اور تقریر کے بعد وہ پاؤں پختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس نوعیت کا کوئی حکیم پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزرا تھا کچھ دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں دوا میں تھیں، رستم بھی اس کے ساتھ تھا، حکیم نے پہلے تو میرے زخموں پر مرہم لگایا اس کے بعد رستم کی مدد سے بالجر مجھے دوا

پلا دی۔ میں نے بہت شور مچا دیا۔ بہت ہاتھ پاؤں چلائے لیکن رستم کے سامنے میری ایک نہ چلی، ایسا لگتا تھا کہ رستم مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا، اور حکیم نے اسے موقع فراہم کر دیا تھا، مجبوراً وہ کروی کیل دو مجھے حلق سے اتارنا ہی پڑی، مرہم بہر حال بہت اچھا تھا، میرے آبلوں میں فوری طور پر ٹھنڈی پڑ گئی۔

”کل تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ حکیم نے کہا ”دونوں مرض دور ہو جائیں گے۔“ ان دونوں کے رخصت ہوتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ مرہم دوبارہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا، میرا کام بن گیا تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں نے دوائے غیاب کا کپسول استعمال کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں غائب ہو گیا۔ اب مجھے اس مخوس علاقے سے نکلنا تھا میں نے مزید آرام کرنا ضروری سمجھا تا کہ سفر کی صعوبتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں، بستر پر لیٹتے ہی مجھے تیند آ گئی اور میں بے سدھ ہو کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں نے بیدار ہوتے ہی پہلے اپنے آبلوں کا جائزہ لیا حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اب کسی آبلے کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ وہ حکیم واقعی باکمال تھا احتیاطاً میں نے آئینے میں جھانکا یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بدستور غائب تھا، اب مجھے وہاں سے نکلنے سے کوئی نہیں روک سکتا، میں نے دروازے کی چٹخنی گرائی اور کمرے سے نکل آیا۔

اس کمرے سے باہر ایک راہداری تھی۔ اس کے بعد ایک غلام گردش، غلام گردش کے بعد ایک بڑا سا کمرہ بڑے کمرے کے بعد ایک چھوٹا کمرہ، نہ جانے یہ جاگیر دار ثانیپ لوگ اپنے مکان اس قدر پے پیچہ کیوں بنواتے ہیں، درحقیقت ان کے مکان ان کی الجھی ہوئی شخصیتوں کا عکس پیش کرتے ہیں، اس وقت اس مکان نے مجھے بھی چکرا کر رکھ دیا، میں جلد از جلد وہاں سے نکلنے کے چکر میں تھا..... اور ادھر حال یہ تھا کہ ہر کمرے کی کوکھ سے ایک اور کمرہ برآمد ہو رہا تھا مکان تھا کہ اچھی خاصی بھول بھلیاں..... بالآخر نہ جانے کہاں تک گھوم کر میں پھر وہیں آ گیا۔ جہاں سے چلا تھا۔

وہاں حکیم کے ساتھ رستم اور ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ سب بے حد سراسیمہ دکھائی دے رہے تھے۔

”میں پوچھتا ہوں آخر وہ کہاں گیا؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں۔“ وہ شخص بولا ”ویسے کیا وہ اسی کمرے میں تھا۔“ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

تیز کیے تاکہ اسے پکڑ لوں۔

قدم تیز کرتے ہی اس نامعقول دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ ایسا لگا جیسے پیٹ کی دیواروں سے کوئی آتش گولانگراتا پھر رہا ہو، وہ ایسی شدید تکلیف تھی کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے چیخا جاہا، لیکن میری چیخیں حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئیں، میرے قدموں نے میرا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا اور میں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ تکلیف تھی کہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

میں تڑپ رہا تھا اور بے بسی سے دور ہوتے ہوئے حکیم کو دیکھے جا رہا تھا جو اپنی دھن میں مست بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ایسی اذیت سے دوچار تھا جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اذیت میں پریشانی نے اضافہ کر دیا۔ کیونکہ حکیم کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔

قسمت نے ایک بار پھر مجھے عین موقع پر دھوکہ دیا تھا یہ بات طے ہو گئی تھی کہ میں ایک عام آدمی ہوں اور عام لوگوں ہی کی طرح خوش اور مطمئن زندگی گزار سکتا ہوں، غیر معمولی پن مجھے راس نہیں، ہر بار دوا کی وجہ سے ملنے والی اذیتوں نے مجھے یہی سمجھایا تھا لیکن میں غیر معمولی بننے کے چکر میں عام آدمی بھی نہیں رہا تھا، اس لمحے مجھے دوا سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔

مجھے علم نہیں کہ وہاں پڑے، تڑپتے ہوئے مجھے کتنی دیر ہوئی تھی، اچانک ایسا محسوس ہوا کہ تکلیف میں کچھ کمی واقع ہو گئی ہے۔ لیکن اتنی کمی بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا۔ پھر مجھے قریب آتے ہوئے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں، میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ مقامی لوگ تھے، میں نے انہیں مخاطب کرنا چاہا لیکن اس بار بھی میری آواز نہ نکل سکی۔ ناچار میں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیے۔ لیکن ایک بات میں نظر انداز کر گیا تھا وہ یہ کہ میں غائب ہوں۔

میرے ہاتھ پاؤں چلانے سے گردوغبار کا ایک بادل سا اٹھتا، وہ لوگ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ”ارے جلدی نکل چلو۔“ ان میں سے ایک نے کہا: ”یہ تو بگولہ ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ سب کئی کاٹ کر نکلے چلے گئے اور میں بے بسی سے ہاتھ پاؤں چلاتا رہ گیا۔ پھر قسمت نے ایک اور ادا دکھائی مجھے احساس ہوا کہ میں چیخ سکتا ہوں، میں نے ان لوگوں کو زور سے پکارنا شروع کر دیا۔ البتہ ان لوگوں کا رد عمل پہلے سے بھی خراب تھا میری آواز نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ان سب نے بری طرح دوڑ لگا دی۔ جلد ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

کچھ دیر بعد تکلیف اس حد تک کم ہو گئی کہ میں اٹھ کر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔

”ہاں ہاں اسی کمرے میں تھا۔“ رستم نے پاؤں پیچ کر کہا۔ ”میں حکیم صاحب کو یہیں لایا تھا۔“

”ارے واہ..... وہ کوئی لڑکی ہے، جو میں چکر چلاؤں گا۔“ حکیم نے عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر جواب دیا۔ ”میں تو اسے دوا کا توڑ دینے آیا تھا۔“

”کون سی دوا کا توڑ؟“ رستم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا بتاؤں رستم صاحب۔“ حکیم نے دھیرے سے کہا۔

”کبھی کبھی میری یادداشت بڑی گڑبڑ کر جاتی ہے میں نے اسے جن بھگانے والی دوا

کھلا دی تھی۔“

”جن بھگانے والی دوا..... وہ کیسی ہوتی ہے؟“

”بس بھائی..... یہاں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے جن کسی نہ کسی پر سوار رہتے ہیں، درحقیقت

یہ آدمی کا دماغی فتور ہوتا ہے، ورنہ جنوں کو اتنی فرصت کہاں کہ انسانوں کے سر پر تصنیع اوقات کرتے پھریں۔ سو میں نے اس دماغی فتور کے لیے دوا ایجاد کر رکھی ہے۔“

”تو اس کیسیاگر سے جن والی دوا کا کیا تعلق؟“

”غلطی سے قبض کشادوا کی جگہ میں نے اسے وہ دوا کھلا دی تھی۔“ حکیم نے انکشاف

کیا۔ ”دوا کا اثر بارہ گھنٹے بعد ہوتا ہے، اور پیٹ میں ایسا خوفناک درد ہوتا ہے کہ جن والا خود میرے پاس آ کر ہاتھ جوڑ کے کہتا ہے کہ جن بھاگ گیا۔ پھر میں اسے اس دوا کا توڑ کھلا دیتا ہوں۔“

”اوہ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ مزہ آ جائے گا۔“ رستم خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

”مزہ کیا آئے گا۔ بارہ گھنٹے بعد وہ شخص لوٹن کبوتر کی طرح تڑپ رہا ہوگا۔“

”یہی تو مزے کی بات ہوگی۔“

میں بری طرح بوکھلا گیا۔ اگر حکیم کا کہنا درست تھا تو دوا کا اثر شروع ہونے ہی والا تھا،

گویا اسی مردود حکیم کی وجہ سے میری فرار کی اسلیم خطرے میں پڑ سکتی تھی اب مجھے سائے کی طرح حکیم کے پیچھے لگے رہنا تھا کیونکہ اس شخص دوا کا توڑ حکیم کے پاس تھا۔

حکیم کے پیچھے چلنے سے میری ایک مشکل آسان ہو گئی یعنی مجھے باہر کا راستہ مل گیا۔ اب سمجھ میں آیا کہ پہلی دفعہ بھٹکنے میں بھی اللہ کی رحمت شامل تھی۔ ورنہ دوا خدا جانے کہاں اثر کرتی

ہے، اور میں تو اس حکیم کو زندگی بھر نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔

میں حکیم کے ساتھ حویلی سے نکل آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ حکیم اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے تھا حویلی دور رہ گئی تو میں نے قدم

میں کھڑا ہو گیا..... لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، صورت حال کے تجزیے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس تکلیف سے پیچھا چھڑائے بغیر میں اس مخدوش علاقے سے نہیں نکل سکوں گا۔ تکلیف سے پیچھا چھڑانے کے لیے حکیم تک پہنچنا ضروری تھا، یہ بات طے تھی کہ حکیم کسی قریب ترین بستی کا رہنے والا تھا۔ ورنہ پیدل نہ ہوتا۔ اب مجھے پہلی فرصت میں حاضر ہونا تھا۔

اس وقت میں ایک کچے راستے کے ایسے موڑ پر کھڑا تھا جسے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا میں دوا نکال ہی رہا تھا کہ درد کا ایک شدید جھٹکا لگا اور میں دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام کر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے باوجود میں نے تریاتی کپسول نگل ہی لیا، پیٹ کے درد میں یوں ایک دم کمی ہوئی جیسے تریاتی کپسول ہی اس کا توڑ رہا ہو۔

میں اٹھ کر کھڑا ہونے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا، بس اتنا احساس تھا کہ میں زمین اور کسی نامعقول قسم کی چھت کے درمیان معلق ہوں، بلکہ گھسٹنا جا رہا ہوں میرے حواس جواب دینے لگے۔ آنکھوں کے سامنے کچھ بانس اور لکڑیاں سی لہرائے لگیں اور کانوں میں گھنٹیوں اور چرخ چوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

اچانک میری سمجھ میں آ گیا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ جس وقت درد کی شدت نے مجھے بیٹھنے پر مجبور کیا تھا اسی وقت ایک بیل گاڑی میرے اوپر سے گزر گئی تھی۔ خوش قسمتی سے گاڑی میں دو بیل جتے ہوئے تھے اگر ایک ہوتا تو میں اللہ کو پیارا ہو چکا ہوتا، غائب ہونے کی وجہ سے گاڑی بان کو میری وہاں موجودگی کا پتا نہیں چلا تھا بیل گاڑی کے نچلے حصے میں لگے ہوئے آنکڑے نے مجھے پھنسا لیا تھا اور اب میں اس بیل گاڑی کے ساتھ گھسٹتا چلا جا رہا تھا چیخنے کی ہمت یوں نہ ہوئی کہ مجھے اپنے حاضر ہونے کا یقین نہیں تھا، غالب حالت میں چیخنے کا نتیجہ بے حد خوفناک نکل سکتا تھا، یوں بھی میں غائب حالت میں پیدل چل چل کر عاجز آیا ہوا تھا قدرت نے مجھ پر مہربانی کی تھی کہ مجھے سواری عطا کر دی تھی۔

لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ میں خود سواری کو اپنے اوپر سوار کرائے ہوئے تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میری فیض آنکڑے میں پھنسی ہوئی تھی میں سر کو انتہائی مخدوش زاویے پر رکھنے کے لیے مجبور تھا۔ ورنہ سر پر چرچ قیامت گزر جاتی۔ گھنٹیوں پر تو اب بھی قیامت گزر رہی تھی۔ اور وہ مسلسل گھسنے کے نتیجے میں چھلے جا رہے تھے میں ہاتھ پاؤں مارنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

وہ سفر..... مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مہینوں پر محیط تھا۔ پھر ایک افتاد اور آ پڑی، پہلے راستہ

رہتا تھا پھر کنکر پلا راستہ آیا اور اس کے بعد گاڑی پانی میں اتر گئی۔ پانی زیادہ نہیں تھا، پانی سے نکلنے کے بعد خاردار جھاڑیوں کا سامنا کرنا پڑا، ان تمام مرحلوں کے بعد میری حالت تباہ ہو چکی تھی۔ دوسری طرف بیل گاڑی تھی کہ کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

پھر بیل گاڑی رکی..... اور میں بڑی مشکلوں کے بعد اس آنکڑے سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور ریٹکتا ہوا بیل گاڑی کے نیچے سے نکل گیا۔

اب جسم کا حال دیکھنے کا موقع ملا میں سر پا زخم ہو رہا تھا، گھٹنے گھٹ کر نخنے معلوم ہونے لگے تھے اور نکلنے مفقود الخمر تھے ان کی جگہ سرخ سرخ گڑھے دکھائی دے رہے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

میں اس وقت ایک گلی میں تھا۔ اور بیل گاڑی ایک دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ میری حالت ابتر تھی جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ پیٹ کی تکلیف شرمندگی کے مارے منہ چھپا کر بیٹھ گئی تھی۔ میں لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا، اور ایک دیوار کے ساتھ بیٹھ کر کرا بنے لگا۔

اچانک ایک کچے مکان کا دروازہ کھلا، اور جو صورت نظر آئی اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی، وہ وہی نامعقول حکیم تھا جس کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا تھا، اس کے ساتھ گاڑی بان بھی تھا، حکیم نے گاڑی بان کو ایک بوتل تھائی..... اور بیل گاڑی واپس ہو گئی۔

حکیم نے دروازہ بند کر لیا۔

ابھی میں اٹھنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، میں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

گلی کے افتادہ سرے سے ایک غول بیابانی نازل ہوا اور اس نے مجھے تماشا بنا کر رکھ دیا، شاید گاؤں کے تمام بچے اس غول میں شامل تھے۔

”پاگل ہے پاگل ہے۔“ انہوں نے زوردار نعرے لگانا شروع کر دیے۔

کچھ دیر تو میں محل سے کام لیتا رہا، پھر مجھے غصہ آ گیا۔ انہیں ڈانٹنے ڈپٹنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں پتھروں کی سوجھ گئی۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ وہ پاگل سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ میں ان کی سنگاری سے بچنے کے لیے اچھل پھاند کرنے لگا۔ میری اچھل کود سے وہ اور محفوظ ہوئے اور ان کے شور و غل میں اضافہ ہو گیا۔ ساتھ ہی دو چار پتھروں نے میرے شکستہ جسم سے بھی علیک سلیک کر ڈالی۔

”خبردار۔“ میں بلبلہ کر چپا ”بدبختو..... پتھرت مارو میں پاگل نہیں ہوں۔“

”ارے یہ تو بولتا بھی ہے۔“ ایک بچے نے حیرت سے کہا۔

”ہاں..... سچ مچ کا ہے۔“ دوسرے نے تبصرہ کیا۔

ان کا پتھر جاری رہا۔ تنگ آ کر میں نے بھی دونوں ہاتھوں میں پتھر اٹھالے۔ بچے ابھی تتر بتر ہونے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ دھڑ دھڑ کر کے گلی کے تمام دروازے کھلے اور عورتیں جھانکنے لگیں ان میں ہر سائز اور ہر عمر کی عورتیں موجود تھیں، مجھے آس بندھی کہ وہ بچوں کو نامعقولیت سے روکیں گی۔ لیکن انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ یہ پہلا اتفاق نہیں تھا کہ مجھے پاگل سمجھا گیا ہو۔ لیکن اس سے پہلے محض انفرادی سطح پر ہوا تھا۔ اس بار صورت حال مختلف تھی۔ مجھے اعلیٰ پیمانے پر پاگل سمجھا جا رہا تھا، بے عزتی کے احساس سے میرے کان تپنے لگے۔ اور آنکھیں بھگی سی گئی۔

”بی بی۔“ میں نے درد ناک لہجے میں ایک عورت سے اپیل کی۔ ”انہیں سمجھاؤ۔ انہوں نے مجھے تماشا بنا رکھا ہے۔“

وہ عورت نہ صرف ہنسی..... بلکہ اسنے قریب پڑا ہوا پتھر اٹھا کر میری طرف کھینچ مارا۔ اس نامعقولیت نے میرا دماغ گھما دیا۔ میں نے فوراً جوابی کارروائی کی۔ اور میرے ہاتھ میں دبا ہوا پتھر عورت کی پنڈلی پر پڑا۔ وہ چیختی چلاتی اندر کی طرف بھاگ اٹھی اور دھڑا دھڑ گلی کے تمام دروازے بند ہونے لگے۔ بچے پہلے ہی کھسک گئے تھے..... کیونکہ اچھے بچے، بڑوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے پتھر پھینک کر اپنا پاگل پن مستند کر لیا۔ بچوں اور عورتوں تک تو معاملہ غنیمت تھا..... لیکن مرد حضرات ڈنڈے سنبھالے باہر نکل آتے تو میرا کیا بنتا۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ حکیم کے گھر میں گھس جاؤں۔ وہی میرے پاگل نہ ہونے کا اور واحد گواہ تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اس کا دروازہ پینٹا شروع کر دیا۔

حکیم نے دروازہ کھولا۔ اب وہ کھڑا حیرت سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی رمت بھی نہیں تھی۔

”حکیم صاحب۔“ میں گڑ گڑایا۔ ”خدا کے لیے مجھے بچاؤ..... تمہارے محلے والے مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں۔“

”میرے خیال میں تو وہ درست ہی سمجھ رہے ہیں۔“ حکیم نے جواب دیا۔ ”تم ہو کون..... اور تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ تمہیں پاگل نہیں سمجھوں گا۔ کیا میں تمہیں پاگل دکھائی دے رہا ہوں۔“

”ارے..... تم مجھے نہیں پہچانتے۔“ میں نے لہک کر کہا۔ ”کل شاہ جی کے ہاں تم نے مجھے دوا دی تھی۔ تم نے مجھے نہ جانے کسی ذلیل دوا کھلا دی تھی۔ میرے پیٹ میں وہ شدید درد ہوا کہ الامان۔“

”اوہ..... تم وہ ہو۔ تم ایسے تو نہیں تھے۔“

”یہ تفصیل بعد میں پوچھ لینا۔ فی الحال تو مجھے اپنے محلے والوں سے بچاؤ۔“

”آؤ..... اندر آ جاؤ۔“ حکیم نے دروازہ بند کر لیا۔

”ہاں، اب بتاؤ..... کیا چکر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”چکر تو تم مجھے بتاؤ گے۔ اس قبض توڑ دوانے تو مجھے ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔“

میں نے بھنا کر کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تمہیں میرے پاس آنا ہی پڑے گا۔“ حکیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں جن توڑ دوا کھلائی تھی۔“

”اس دوا کا بھی کوئی توڑ ہے یا نہیں؟“ میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

”ابھی دیتا ہوں..... یہاں بیٹھ جاؤ۔“ اس نے چار پائی کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک پڑیا لیے واپس آ گیا۔ ”لو یہ سفوف پھانک لو۔ تکلیف ختم ہو جائے گی۔“

میں نے جلدی سے وہ سفوف پھانک لیا۔

”اب بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا گزری ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”تمہارا لباس تار تار ہے۔“

آدمی کی بجائے گرد پوش معلوم ہو رہے ہو۔ سارا بدن چھلا ہوا ہے۔ کیا شاہ جی نے کتے چھوڑ دیے تھے تم پر؟“

”کیا بتاؤ حکیم جی۔“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”گزشتہ رات آگ میں جلا تھا اور تمہارے چنگل میں پھنسا تھا۔ آج کانوں پر گھسٹ گھسٹ کر اس حال کو پہنچا ہوں، میری قسمت ہی ایسی ہے۔“

”تم کانٹوں میں پہنچے کیسے؟“

”بس حکیم جی..... سرمایہ دار ایک ایسی لعنت ہے، جس کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاہ جی نے میرا مقابلہ ایک پھرے ہوئے سائنڈ سے کر دیا تھا.....“

میں حسب خواہش بات پوری نہ کر سکا..... حکیم نے فوراً ہی انقلابی تقریر شروع کر دی۔

جس کا اختتام کچھ یوں ہوا۔ ”تم فکر نہ کرو کامریڈ..... ہم اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔“

اب تم محفوظ ہاتھوں میں ہو، کامریڈ..... سرخ سلام۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے زوردار سیلوٹ چھاڑ دیا۔

”سرخ سلام۔“ میں نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔ ”میری حالت اتنی ابتر ہے کہ میں تمہیں سیلوٹ بھی نہیں کر سکوں گا۔“

”کوئی بات نہیں..... ذرا اپنے پیر دکھاؤ۔“ حکیم نے کہا۔ ”میں ابھی مرہم لگا دیتا ہوں۔“

وہ مرہم بنانے کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ مرہم لگتے ہی مجھے آرام آ گیا۔ دل سے بے ساختہ حکیم کے لیے دعائیں نکلنے لگیں۔ ایسا باکمال آدمی نہ جانے اس ویرانے میں کیوں جھک مار رہا تھا۔

میں اپنے آپ کو سمیٹ اور حکیم کو دعائیں دے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ ایک اور مصیبت نازل ہو گئی۔ اس کی نوعیت مختلف تھی اور یہ اس وقت نازل ہوئی جب حکیم دوسرے کمرے میں گیا ہوا تھا۔

اچانک میرے سارے جسم پر بڑے بڑے سرخ دانے نکلنا شروع ہو گئے۔ سلسلہ پیروں سے شروع ہوا..... اور چہرے تک پہنچ کر کا۔ اس کے فوراً بعد ان دانوں میں خارش شروع ہو گئی۔ حکیم دوبارہ کمرے میں آیا تو میں پورے کمرے میں اچھلتا پھر رہا تھا۔

”اب کیا ہو گیا؟“ حکیم نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کوئی دورہ پڑ گیا ہے۔“ ”پتہ نہیں..... اچانک دانے نکل آئے ہیں۔“ میں نے بازو اس کے سامنے کر دیا، لیکن بدستور اچھلتا رہا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ حکیم متاسف نظر آنے لگا۔ ”میرا خیال ہے، میں نے پھر تمہیں غلط دوا پلا دی۔“

”کیا!“ میں چلایا۔ میرا جی چاہا کہ حکیم کی گردن ہی مروڑ دوں۔

”ہاں بھئی..... میری ہی غلط معلوم ہوئی ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب کیا کروں۔ خراب یادداشت میرے لیے وبال بن گئی ہے۔“

”تمہارے لیے تو نہیں..... البتہ میرے لیے ضرور وبال ثابت ہو رہی ہے۔“ میں نے اچھلتے ہوئے کہا۔ ”اب خارش اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں کھجائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔“ خدا کے لیے..... مجھے کوئی دوا دو۔“ میں نے چیخ کر فریاد کی۔

”اب میں کچھ نہیں کر سکتا، میرے مظلوم کا مرید۔“ اس نے بے حد خلوص سے کہا۔ ”اس دوا کا میرے پاس کوئی توڑ نہیں۔ بس کا مرید..... صبر کرو۔“

”تم نے تو مجھے مروادیا حکیم جی۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا آپ نوپتے ہوئے کہا۔ ”اچھا..... یہ بتا دو۔ اس نامعقول دوا کا اثر کب ختم ہوگا۔“

”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔ ”دو تین گھنٹوں میں خود بخود ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

میرا جی چاہا کہ اس سے لپٹ کر اسے بھی یہ بھی عذاب سونپ دوں۔ لیکن اس سے بگاڑ مول لینا ٹھیک نہیں تھا۔

دفعۃً دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ دروازہ کسی توپ کی زد میں ہے۔ حکیم تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ میں بدستور کھجانے اور پاگلوں کی طرح اچھلنے کودنے میں مصروف رہا۔ حکیم واپس آیا تو میرا شغل جاری تھا۔ اب تو میرے منہ سے کف بھی جاری ہو گیا تھا۔

حکیم واپس آیا تو تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کئی نئے چہرے تھے۔ وہ یقیناً محلے والے تھے۔

”یہی ہے، وہ پاگل۔“ ایک شخص نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”ذرا حرکتیں تو دیکھو اس کی۔“

”یہ پاگل نہیں ہے بھائیو۔“ حکیم نے انہیں سمجھایا۔ ”اے خارش ہو گئی ہے۔“ ”خارش بھی تو آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔“ دوسرے نے دلیل دی۔ ”بہر حال، اس کے پاگل ہونے میں کوئی شک نہیں۔“

میرے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ ان کی طرف متوجہ ہوتا۔ خارش مجھے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اسے بتاتا کہ کسی ہوش مند آدمی کو پاگل کہنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ پاگل پن کا الزام بڑی عجیب چیز ہے..... دلدل کی طرح..... جتنی تردید کرو..... اتنا ہی اپنے خلاف ثبوت فراہم کرتے چلے جاؤ گے۔ چنانچہ میں بدستور کمرے میں اچھلتا کودتا رہا۔

”بھائیو یقین کرو، یہ پاگل نہیں ہے۔“ کا مرید حکیم نے انہیں پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ارے..... اس نے میری بیوی کے پتھر مارا ہے۔“ پہلے آدمی نے حکیم پر آنکھیں نکالیں۔ ”اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ پاگل نہیں ہے۔“

”ہوسکتا ہے، کچھ اور سمجھ کر مارا ہو..... میرا مطلب ہے..... کنکر..... یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔“ حکیم نے بات بنانے کی کوشش میں میرا بالکل ہی بیڑا غرق کر دیا۔

”بائیں..... یہ میری بیوی کو کچھ اور سمجھے گا!“ وہ شخص دہاڑا۔ ”سمجھ کر تو دیکھے۔ میں خون پی جاؤں گا اس کا..... اور یہ عمر کیسی ہوتی ہے؟“

”بس ایسی ہی ہوتی ہے۔“ حکیم نے کراہ کر جواب دیا۔

”ان لوگوں کے درمیان مباحثہ ہو رہا تھا اور میں اس سے بے نیاز، اچھلتا کودتا پھر رہا تھا۔ اس اچھل کود میں، میں اس شخص سے جا ٹکرایا، جس کی بیوی کو پتھر لگا تھا۔ ہم دونوں ہی گر

پڑے۔ یہ ٹکر میرے لیے بے حد مخدوش ثابت ہوئی۔ تمام محلے والے مجھ پر قابو پانے کی نیت سے یوں ٹوٹ پڑے، جیسے میں کوئی مالی غنیمت ہوں۔

میں اپنا بچاؤ کیا کرتا..... مجھے تو اپنا آپ کھانے سے فرصت نہیں تھی۔ حکیم نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی تو میرے ساتھ اسے بھی جکڑ لیا گیا۔ لیکن میری خارش، جکڑ بند یوں کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ مجھے کچھ نہ ملا تو میں نے خود کو ان لوگوں کے جسموں سے رگڑنا شروع کر دیا۔

مجھے خارش کے سوا کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ اور جب ہوش آیا تو خود کو اصطبل میں بند پایا۔ حکیم بھی میرے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ میرے پاگل پن کے جراثیم حکیم پر بھی اثر انداز ہو گئے ہیں ہیں۔ حکیم بوکھلایا ہوا تھا اور اسے مجھ پر غصہ بھی آرہا تھا۔ وہ بچے جھاڑ کر میرے پیچھے بڑ گیا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ اس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”میں بلا وجہ مارا گیا۔ وہ لوگ مجھے بھی پاگل سمجھ رہے ہیں۔“

”خدا ان لوگوں کو غارت کرے۔“ میں نے کمر کھاتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہارے بارے میں تو خیر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں ہرگز پاگل نہیں ہوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ حکیم بھنا گیا۔

”تمہارا کیا مطلب تھا؟“ میں نے اس پر آنکھیں نکالیں۔ ”یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم ذمے دار ہو، اس کے۔ نہ تم مجھے وہ قبض توڑ دو اٹھلاتے، نہ میرے پیٹ میں تکلیف ہوتی اور نہ میں اس منحوس گاؤں کا رخ کرتا۔“

”اب کیا کروں..... یادداشت.....“

”ابھی ٹھیک ہو جائے گی تمہاری یادداشت۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کا سر کھانا شروع کر دیا..... اور وہ بری طرح چیخیں مارنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے ہاتھ روک لیا کہ کہیں حکیم کو بھی میرے پاگل پن کا یقین نہ ہو جائے۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر میں نے حکیم کو اکسایا۔ ”ان لوگوں کو بتا دینا کہ ہم دونوں ہوش مند ہیں۔“

”یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔“ حکیم سر ہلاتے ہوئے ہولا۔ ”اب تو فیصلہ پنچائیت ہی میں ہوگا۔“

”کیا!“ اس کی بات سن کر میں کھانا بھی بھول گیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ ہمارے پاگل پن سے پنچائیت کا تعلق؟“

”یہاں کا دستور یہی ہے۔“ حکیم بولا۔ ”یہاں ہر بات کا فیصلہ پنچائیت کرتی ہے۔ یہاں تو مردہ بھی اس وقت تک نہیں دفنایا جاتا، جب تک پنچائیت یہ تصدیق نہ کر دے کہ وہ واقعی مر چکا ہے۔“

”عجیب دستور ہے۔“ میں نے پھر اچھلنا شروع کر دیا۔ ”اچھا..... اگر پنچائیت ہمیں پاگل قرار دے دے تو کیا ہوگا۔“

”تو تم یہیں بند رہو گے۔“

میں نے دل ہی دل میں حکیم، اس ہستی کو اور ان کی پنچائیت کو لاکھوں سناڈا لیں۔ کوئی دو گھنٹے بعد خارش کے زور میں کی آگئی۔ شامہوتے ہوتے صرف دانے رہ گئے۔ خارش سے نجات مل گئی۔ خارش ختم ہوتے ہی مجھے ایسا سکون ملا کہ میں دیوار سے ٹیک لگا کر سو گیا۔

میری آنکھ اس وقت کھلی جب حکیم نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

رات ہو چکی تھی۔ اصطبل میں حکیم کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ پتہ چلا کہ ہمیں پنچائیت کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہ لوگ ہمیں وہاں لے جانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے سب سے آگے کھڑے ہوئے شخص کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مصافحے کے بعد میں نے اس سے معاف کر ڈالا۔ میں ان کے ذہنوں سے یہ تاثر دھوڑا لٹا چاہتا تھا کہ میں پاگل ہوں۔ اس کے لیے خلیق ہونے کا مظاہرہ ضروری تھا۔ لیکن اس مصافحے اور معافانے کا نتیجہ بہت خراب نکلا۔ وہاں موجود تمام لوگوں کے منہ بن گئے۔

”یہ تم نے کیا کیا برخوردار۔“ حکیم بڑی شدت سے کراہا۔ ”اب تو پنچائیت یقیناً تمہارے خلاف فیصلہ دے گی۔“

”کیوں..... میں نے ایسا کون سا قصور کر دیا۔“

”تم نے دین مسیح سے نہ صرف ہاتھ ملایا ہے بلکہ اس سے گلے بھی ملے ہو۔ وہ تو اصطبل کی صفائی کرنے آیا ہے۔“ حکیم نے انکشاف کیا۔

میں دم بخود رہ گیا۔ میں نے تو بہتری کی سوچی تھی..... لیکن معاملہ الٹا ہو گیا۔ اب کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں اپنا مصافحہ اور معافانہ واپس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ البتہ آئندہ کے لیے نصیحت ہوئی تھی۔

”اب چل بھی دو۔“ اس شخص نے کہا۔ جو سب سے آگے کھڑا تھا۔ ”بیچ تمہارے منتظر ہیں۔“

”تم خاکروب ہو کر ان معاملات میں کیوں دخل دیتے ہو۔“ میں اسی پرالٹ پڑا۔ اب میں مزید کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ارے میاں..... یہ جعدار نہیں ہیں۔“ حکیم اور زیادہ زور سے کراہا۔ ”یہ چودھری اللہ دتہ ہیں اور یہ پنچائیت کے ایک رکن بھی ہیں۔“

”معاف کیجیے گا جناب دتہ صاحب۔“ میں نے جلدی سے معذرت کی۔ ”کیونکہ آپ سب سے آگے کھڑے تھے، اس لیے میں نے آپ کو جعدار سمجھ لیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی صورت نے بھی مجھے ورغلا دیا۔ اس پر مزید ستم..... آپ کا حلیہ..... بس ایک بانس اور ہوتا آپ کے پاس تو مزہ ہی آ جاتا۔“

”اے..... میں کہہ رہا ہوں، بس اب چل دے۔“ دتہ کے نتھنے بڑی طرح پھڑکنے لگے۔ ”میں تجھ سے نمٹ لوں گا۔ تو یقیناً پاگل ہے۔“

اب خاموشی ہی مناسب تھی۔ میری ہر بات کا غلط مطلب لیا جا رہا تھا۔ میں خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ چل دیا۔ حکیم میرے ساتھ تھا پنچائیت کا بندوبست ایک کھنڈر میں کیا گیا تھا۔ کھنڈر کی دیواریں امتداد زمانہ کے باعث گھٹ کر منڈیر جتنی رہ گئی تھیں..... اور دور دور کے مناظر صاف دکھائی دیتے تھے۔ اس کمرے بے دیوار میں شاید پورا گاؤں موجود تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ برسوں کے بعد انہیں ان کی من چاہی تفریح میسر آئی تھی۔ ویسے بھی پاگل اتنی آسانی سے دستیاب کہاں ہوتے ہیں۔ وہ غریب تو پاگل خانے کی اونچی اونچی دیواروں سے سر پھوڑتے رہتے ہیں۔

میں نے ایک نظر مجمع پر ڈالی۔ وہ عورت سب سے زیادہ شور مچا رہی تھی، جسے میرے ہاتھوں پتھر کھانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا..... جو میرے پاگل پن کی سند تھی۔ برابر ہی اس کا شوہر بھی کھڑا تھا۔ بچوں کے حلیے بھی نہایت خراب تھے..... اور مجھے یقین تھا کہ اگر وہ پاگل خانے ہی میں ہوتے یا پھر ممکن ہے، یہ میرے پتے ہوئے جانبدار ذہن کا کوئی کرشمہ ہو۔ بہر حال مجھے تو ایسا ہی لگا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ سب مجھے پاگل قرار دینے کی نیت سے وہاں جمع ہوئے تھے۔

پنچائیت کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ یعنی مجھ سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ”تو تمہیں اس سے انکار ہے کہ تم پاگل ہو؟“ ایک بچے نے پوچھا۔ وہ سر بیچ معلوم ہوتا تھا۔

”میں ہرگز پاگل نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
”لیکن تمہاری حرکتیں پاگلوں جیسی ہیں۔“ دوسرا بولا۔

”قصہ یہ ہے جناب کہ میں مسافر ہوں۔ سفر کے دوران پیٹ میں درد ہوا۔ ان حکیم

صاحب نے..... میں نے حکیم کی طرف اشارہ کیا۔ ”..... مجھے دوا دی۔ پیٹ کا درد تو ٹھیک ہو گیا، لیکن سارے جسم پر سرخ سرخ دانے نکل آئے۔ پھر ان میں خارش ہونے لگی..... یہ دیکھیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی آستین اوپر اٹھا دی۔ ”شاید حکیم جی کے مکان میں آنے والوں کو یاد ہو کہ جب وہ آئے تو میں دیوانوں کی طرح اپنا سارا جسم کھجور کا پتھر بنا دیا۔“

دو ایک افراد نے فوراً میرے بیان کی تائید کر دی۔
”لیکن تم نے گاؤں کی ایک عورت کے پتھر کیوں مارا؟“ سر بیچ نے پوچھا۔
اس کا سیدھا سا جواب یہ تھا کہ میں نے پتھر کے جواب میں پتھر مارا تھا۔ لیکن یہ جواب مجھے پاگل ثابت کر دیتا۔ میرے جواز کو وہاں کون تسلیم کرتا۔ دوسرا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر میں الجھن میں رہا۔ پھر مجھے جواب سوچ ہی گیا۔ ”وہ حرکت تو میں نے کسی کے کہنے پر کی تھی۔“ میں نے کہا۔

”کیا!“ تمام لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ”کس نے کہا تھا تمہیں کہ اس عورت کو پتھر مارو۔“ سر بیچ نے پوچھا۔

”ہوایہ کہ جب میں خارش سے بے حال ہونے لگا اور میں نے حکیم صاحب سے فریاد کی تو یہ مجھے صرف اس شرط پر دوا دینے پر رضامند ہوئے کہ میں اس عورت کو پتھر ماروں۔“ یہ کہہ کر میں نے ڈرامائی انداز میں عورت کی طرف اشارہ کیا۔
”تت..... تم..... مجھے بھی پتھر مارنے والے تھے۔“ وہ عورت بہت زور سے چیخی۔

اب مجھے احساس ہوا کہ جوشِ خطابت میں، میں نے ایک اور عورت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تو وہاں موجود تمام عورتیں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ اب میں اس الجھن میں پڑ گیا کہ اس عورت کو کیسے پہچانوں۔ پھر میری نظر اس کے شوہر پر پڑ گئی، جسے میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ ”معاف کرنا بھائیو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ میرا اشارہ اس خاتون کی طرف تھا۔ ”ہاں..... تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اس حرکت پر حکیم صاحب نے مجبور کیا تھا..... ورنہ مجھے ان نیک دل، پاک سیرت، مہربان اور بد شکل خاتون سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ میں تو ایک سیدھا سا داسا فر ہوں۔“

اس عورت نے بد شکل قرار دیے جانے پر بڑا دوا دیا کیا لیکن بچوں نے اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔

”کیا تو اس ہے یہ۔“ حکیم غصے سے بولا۔ ”میں نے کب کہا تھا کہ اس عورت کو پتھر مارو۔“

”آپ ہی نے تو کہا تھا جناب۔“ میں نے حکیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا.....

حکیم سے انتقام لینے کا یہ بہت اچھا موقع تھا..... اس نے اور اسکی دواؤں نے مجھ پر بڑے ظلم توڑے تھے۔“ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ نیک دل خاتون آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوتی، اس لیے آپ اسے سزا دینا چاہتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ پھر لگنے کے بعد وہ مرہم لینے آپ ہی کے پاس آئے گی اور آپ خود اسے مرہم لگائیں گے اور یوں بات بن جائے گی۔“ میں نے مزید کہا۔

حکیم سے کچھ بولا نہ گیا۔ وہ بری طرح اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

دوسری طرف اس عورت کا شوہر کسی فلمی ولن کی طرح دباڑا۔ البتہ اس سے ایک غلطی ہوگئی۔ وہ کچھ زیادہ ہی زور سے دباڑا تھا۔ نتیجتاً اسے پھندا لگ گیا..... اور وہ کھانتے کھانتے بے حال ہو گیا۔ اس کی بیوی، محبوبیت بھری نظروں سے حکیم کو دیکھے جا رہی تھی۔

حکیم مجھ پر جھپٹا..... لیکن میں بھکائی دے گیا۔ ساتھ ہی میں نے لوگوں کی نگاہیں بچا کر اس کا منہ چڑا دیا۔ حکیم اس قدر مشتعل ہوا کہ اول فول بکنے لگا۔ وہ مجھے برا بھلا کہتے ہوئے پھر میری طرف جھپٹا۔ میں نے پھر کئی کافی اور اس کا منہ چڑا دیا۔ حکیم اس مرتبہ آپے سے باہر ہو گیا۔ لیکن میں کہاں اس کے ہاتھ آنے والا تھا۔ ساتھ ساتھ میں نے منہ چڑانے کا شغل بھی جاری رکھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکیم ہانپتے ہوئے، دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔ بچوں نے متفقہ طور پر اسے پاگل قرار دے دیا۔ پھر اسے لے جا کر اصطبل میں بند کر دیا گیا۔

اب میرے لیے بہتر یہی تھا کہ ان لوگوں سے اجازت لوں..... اور کھسک لوں۔ میں نے چودھری سے اجازت چاہی تو اس کے چہرے پر تکدر کے آثار نظر آنے لگے۔ ”پنچائیت نے تمہیں ہوش مند قرار دے دیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اب تم جانا کیوں چاہتے ہو۔“

”صاحب..... میں یہاں رہنے کے لیے تھوڑا ہی آیا ہوں۔ مجھے تو جانا ہی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ غرایا۔ ”تم ہم جیسے مہمان نواز لوگوں کے ماتھے پر کلک کا ٹیکا نہیں لگا سکتے۔ ہم مہمان نوازی کی روایت کا بڑا احترام کرتے ہیں..... اور ہاں، تم جاؤ گے کیسے..... تمہیں سواری بھی تو ہم ہی فراہم کریں گے۔“

اس کی یہ بات معقول تھی، چنانچہ میں نے بلاتال مان لی۔ ویسے بھی رات کے وقت سفر..... اور وہ بھی پیدل۔ میرے لیے رات وہاں گزارنا ہی بہتر تھا۔

وہ لوگ عجیب و غریب تھے۔ ذرا سی دیر میں میرے اور حکیم والے واقعے کو بھول گئے۔ اب لگتا تھا کہ حکیم اب کسی کو یاد ہی نہیں ہے۔ نہ انہیں اس بات سے دلچسپی تھی کہ اچھا بھلا حکیم پاگل کیوں ہو گیا۔ وہ تو بس مجھے مہمان بنانے پر تلے ہوئے تھے۔

رات کے کھانے کے لیے اسی کھنڈر میں دسترخوان بچھا دیا گیا۔ کھانا بہت سادا..... لیکن بے حد خوش ذائقہ تھا۔ باجرے کی روٹیاں اور مکئی کا ساگ..... ساتھ میں مکھن۔ حسب روایت کھانا مجھے ایک وقت کے فاقے کے بعد میسر آیا تھا، چنانچہ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ پنچائیت کے تمام اراکین میرے ساتھ تھے۔ میں کئی روٹیاں کھا گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سر پنچ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ فوراً ہی ایک پنچ نے میری پلیٹ میں مزید سالن ڈال دیا۔

”بس جناب شکریہ۔“ میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”میں کھا چکا ہوں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ سر پنچ ناراض ہو کر بولا۔ ”تمہیں کھانا پڑے گا۔ یہ ہماری روایت ہے۔“

میں نے اپنا پیٹ دبا کر دیکھا، اور خاصے غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ سر پنچ کی ناراضی منول لینا ٹھیک نہیں۔ مزید کچھ کھانے کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ پلیٹ میں دیکھا۔ سالن خاصی مقدار میں تھا۔ میں نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے محض دونوالوں میں سمیٹ لیا۔ پھر میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

سر پنچ نے پہلے کی طرح میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ گرفت اس بار قدرے سخت تھی اور اس کے غصے کی غمازی کر رہی تھی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس اثناء میں میری پلیٹ میں اور ساگ ڈال دیا گیا۔

”چلو اور کھاؤ۔“ سر پنچ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”تم ہماری روایت کو پامال نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں اس طرح نہیں جانے دیں گے۔“

”آپ کی روایت سر آنکھوں پر جناب۔“ میں گھبرا کر بولا۔ ”لیکن اب مزید کھانا میرے بس سے باہر ہے۔“

”کیسے باہر ہے؟“ سر پنچ بھڑک گیا۔ ”تم نے ہم لوگوں کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ تم ہمارے منہ پر کا لک ملنا چاہتے ہو۔ لیکن تم ہمیں نہیں جانتے۔ ہم مہمانوں کا احترام کرتے ہیں، لیکن روایات کی توہین کرنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑتے۔ چلو، کھاؤ۔ ورنہ۔“

اس ورنہ کے بعد بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ دو مزید نوالوں میں پلیٹ صاف کر ڈالی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میرا پیٹ ڈھول کی طرح پھول گیا تھا۔ میں تو پہلے ہی گنجائش سے زیادہ کھا چکا تھا۔ اب تو پانی پینے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ میں نے پانی کو نظر انداز کر کے اٹھنا چاہا۔ اس بار سر پنچ نے میرا ہاتھ تھام کر جھکے سے مجھے بٹھا دیا۔

”اے..... تم پھر ہماری توہین کر رہے ہو۔“ وہ دھاڑا۔ ”تم بار بار کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچتے ہو۔ چلو، کھانا کھاؤ۔“

میں نے مظلوم نگاہوں سے سرخچ کو دیکھا، پھر پلیٹ پر نظر ڈالی، جس میں اس مرتبہ کافی ساگ ڈال دیا گیا تھا۔ ”جناب..... اب تو ایک لقمہ بھی نہیں لیا جائے گا۔“ میں نے بلبل کر کہا۔ ”آپ لوگوں کا از حد شکر گزار ہوں۔ لیکن آدمی کو کھاتے وقت اپنا پیٹ بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ ذرا سوچئے تو..... آخر میں کہاں تک کھائے جاؤں۔“

”مجھ بھی ہو، تمہیں کھانا ہوگا۔“ سرخچ نے روٹی کی تھالی میری طرف بڑھادی۔ ”کوئی بہانہ نہیں چلے گا، سمجھے!“

میں نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے اور ان کی نگاہوں سے برہمی ظاہر ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں نے ان سب کی توہین کی ہے۔ ان کے تیوروں سے پتہ چلتا تھا کہ کھانے سے انکار کرتے ہی میری تکا بولی کر دی جائے گی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے ایک روٹی اور اٹھالی۔ اس بار ساگ ویسے ہی زیادہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ساگ ختم کرنے سے پہلے ہی میں فوت ہو جاؤں گا..... اور یہ دنیا میں پہلا واقعہ ہوگا کہ کسی شخص نے بسیار خوری کے باعث دسترخوان پر بیٹھے ہوئے وفات پائی ہو۔

اس بار وہ پلیٹ صاف کرتے کرتے مجھے اچھارا ہو گیا۔ پیٹ جو پہلے ڈھول کی مثال پیش کر رہا تھا، اب نقارے کو بھی مات کر گیا۔ اگر اس وقت میرے پیٹ پر ضرب لگائی جاتی تو آواز میلوں تک سنائی دیتی۔ میں ڈکار لینے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب ان لوگوں کو صبر آ گیا ہوگا۔ اس لیے میں نے اٹھنے کی کوششیں شروع کر دیں..... لیکن مجھ سے اٹھنا نہیں جا رہا تھا۔ پھر میں بیٹھا ہی رہ گیا..... اور میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ معلوم نہیں کہ کوشش میں کس حد تک ناکام ہوا۔

”اب تو آپ لوگوں کو اطمینان ہو گیا ہوگا۔“ میں نے بمشکل کہا۔ ”آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کھانا پیٹ سے باہر نکل کر میرے پورے وجود میں پھیل گیا ہے۔ میرا ختم کھانے سے لبالب بھر چکا ہے۔“

”نہیں۔“ سرخچ نے میری پلیٹ میں اور ساگ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تمہیں اور کھانا ہوگا۔“

”خدا کے لیے جناب۔“ میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر انہیں اپنا منہ کھول کر دکھایا۔ مجھے یقین تھا کہ حلق میں بھی چند نوالے ہوں گے، جو انہیں نظر آ جائیں گے۔ ”اب میں ایک لقمہ بھی

نہیں لے سکتا۔“

”تم نے پھر ہماری توہین شروع کر دی۔“ سردار دھاڑا۔ ”چلو..... کھاؤ۔“

”اب میں نہیں کھا سکتا۔ اب تو میرے منہ میں زبردستی ہی لقمے ٹھونسنے چاہتے ہیں۔“

”یہ بھی ہو جائے گا۔ روایات کی خاطر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔“ ایک سچ بولا۔

”بہتر ہوگا کہ تم خود ہی کھا لو۔“ سردار نے کہا۔

میں نے کہہ دیا نا کہ اب میں نہیں کھا سکتا۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے، تو تم نے پلیٹ کیوں سیدھی کر رکھی ہے۔“ ایک اور سچ بولا۔

اب میری سمجھ میں ان کی روایت آئی۔ لاعلمی نے مجھے مروا دیا تھا۔ تاہم میں نے جلدی سے پلیٹ پلیٹ دی۔ اب وہاں سے اٹھنے کا مسئلہ تھا۔ میرے پلیٹ اٹھتے ہی ان لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آنے لگی۔

”چلو..... اب تمہارے سونے کا بندوبست کریں۔“ سرخچ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے بہت زور لگایا..... لیکن اتنا زیادہ بوجھ اٹھانے کا اتفاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ میرے لیے تو سانس لینا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔ ”جناب..... مجھے اٹھوایے۔ میں تو ہل بھی نہیں سکتا۔“ میں زور دینے والے انداز میں بولا۔

سرخچ نے گاؤں سے چند نوجوان بلوائے، جنہوں نے ڈنڈا ڈولی کر کے مجھے بستر تک پہنچایا۔ وہ بڑے تندرست و توانا نوجوان تھے، لیکن مجھے بستر تک پہنچاتے پہنچاتے ہانپ گئے۔ میں جانتا تھا کہ میرا وزن تو اتنا زیادہ نہیں ہے۔ البتہ کھانے کے وزن نے انہیں ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ کر اپنے نصیب پر غور کرنے لگا۔ پہلے تو یہ ہوا کرتا تھا کہ مجھے کئی انوکھے واقعات پیش آتے تھے اور اس کے بعد کوئی جسمانی تکلیف لاحق ہوتی تھی۔ اب یہ حال تھا کہ واقعات کم پیش آتے تھے اور عذاب زیادہ اترتے تھے۔ اس وقت میں اچھارے کے عذاب سے دوچار تھا۔ ایسے میں نیند کہاں آتی ہے۔ اس رات میں دوا کے استعمال سے تائب ہو گیا۔

پھر صبح کا ذب کے وقت مجھے نیند آئی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے جگا دیا گیا۔ میں بھنا کر رہ گیا۔ لیکن ان مہمان نواز لوگوں کے سامنے میری ایک نہ چلی۔ میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ شاید گاؤں میں کسی کو کوئی سانحہ پیش آ گیا ہے۔ ورنہ اتنی صبح واویلا کیا معنی رکھتا ہے۔ میں بستر سے اتر آیا۔ ”کیا بات ہے چودھری صاحب؟“ میں نے سرخچ سے پوچھا۔ ”خیر تو ہے

جناب۔“

”ہاں..... ہاں، خیر ہی خیر ہے۔“ اس نے طمانیت آمیز لہجے میں جواب دیا۔
”پھر اتنی جلدی کیوں جگا دیا مجھے؟“

”جلدی کہاں بھائی۔ ساڑھے چار بجے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ تو ناشتے کا وقت ہے۔“
میراجی چاہا کہ دیوار سے سر ٹکراتا شروع کر دوں۔ یہ مصیبتیں اٹھانے سے تو بہتر تھا کہ
میں وفات ہی پا جاتا۔ میں اپنے ارادے پر عمل کر گزرتا، لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ وہ مداخلت
بے جا کے ذریعے مجھے سکون سے وفات بھی نہیں پانے دیں گے..... اور دیوار سے سر ٹکرانے کی
بنا پر پاگل قرار دے کر اسٹبل میں الگ بند کر دیں گے۔

وہ مجھے اندھیری رات میں باہر لے آئے۔ ایک رہٹ کے پاس میرا منہ دھلویا گیا۔
میں نے صحرا میں حواج ضروریہ سے فارغ ہونے سے البتہ صاف انکار کر دیا۔ منہ ہاتھ دھوتے
ہی ایک بار پھر کھنڈر میں دسترخوان لگا دیا گیا۔ اس بار میں پلیٹ اور گلاس کے معاملے میں بہت
مختار رہا تھا۔ میں نے جلد ہی دونوں اوندھا دیں۔ وہ سب میری غلت دیکھ کر ہنس پڑے اور میں
خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

”اب بتاؤ، تمہیں جانا کہاں ہے؟“ سر سچ نے پوچھا۔ ”تاکہ سواری کا بندوبست کیا
جاسکے۔“

”بات یہ ہے چودھری صاحب کہ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچنا ہے، جہاں سے مجھے ریل مل
سکے۔“

”یہاں دور دور ایسا کوئی گاؤں نہیں ہے، جہاں ریل رکتی ہو۔“ سر سچ نے پر تفکر لہجے میں
جواب دیا۔ ”البتہ یہاں قریب ہی ریلوے لائن ہے، جس پر سے ریل گزرتی ہے۔ اگر تم کہو تو
ہم ریل رکوا دیں۔“

”ریل کیسے رکے گی جناب۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
”تم صرف حکم کرو۔ ریل رکوانے کی ترکیب ہم خود سوچ لیں گے۔ اے، مہمانوں کے
لیے ہم کیا نہیں کر سکتے۔“

میراجی خوش ہو گیا..... لیکن ساتھ ہی یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں اس مہمان نوازی کے
پیچھے بھی کوئی روایت نہ ہو۔ میں ان کی روایات کے بارے میں لاعلم تھا..... اور گزشتہ شب اپنی
لاعلمی کی زبردست سزا بھگت کا تھا۔ اب تو یہی بہتر تھا کہ کسی طرح اس جنجال سے نکل ہی
جاؤں۔

”ٹھیک ہے، چودھری صاحب جیسی آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں..... مرضی ہماری نہیں، تمہاری ہوگی۔“ اس نے زور دے کر کہا۔
”ٹھیک ہے۔ آپ ریل رکوا دیجیے۔ میں اس میں سوار ہو جاؤں گا۔“ میں نے جواب
دیا۔

پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ صورت حال کس قدر خراب ہے۔ میری جیب میں تقریباً
سوا سو روپے پڑے تھے۔ ریل رکوانے کے بعد ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا یقیناً نہت مہنگا ثابت
ہوتا۔ جرمانہ وغیرہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس رقم کہاں تھی۔ دوسری طرف مجھے یہ علم بھی
نہیں تھا کہ میں ہوں کس قصبے میں۔ چودھری کی بات سن کر میں نے سوچ لیا تھا کہ ریل رکنے
سے پہلے ہی دوائے غیاب استعمال کر لوں گا۔ غائب حالت میں سفر کرنا زیادہ مناسب تھا۔ ہر
چند کہ میں دوا سے عاجز آ چکا تھا۔ لیکن اس سے مفر بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کر کے میں مطمئن
ہو گیا۔

فورا ہی دو بیل گاڑیاں منگوائی گئیں۔ ایک پر میں بیٹھا۔ چودھری اور دو بیچ میرے ساتھ
تھے۔ دوسری بیل گاڑی میں چھ سات افراد مع ساز و سامان کے ساگئے۔ چودھری نے مجھے اب
تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ٹرین رکوانے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرے گا۔ میں نے بھی
پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ ممکن ہے، یہ ان کی روایات کے خلاف ہو، اور کوئی نئی مصیبت گلے
پڑ جائے۔ ریلوے لائن تک پہنچتے پہنچتے دن خاصا چڑھ چکا تھا۔

ہم لوگوں نے ریلوے لائن کے قریب ہی ڈبہ ڈال لیا۔ بالکل ٹینک کا سماں پیدا ہو گیا۔
لائن کے دوسری طرف جنگلات کا سلسلہ تھا۔ بیل گاڑیاں کھڑی کر دی گئیں۔ سردار نے اپنے
ساتھیوں کو الگ لے جا کر انہیں کچھ ہدایات دینے لگا۔ شاید ریل روکنے کی کوئی ترکیب زیر غور
تھی۔ انہیں کچھ دیر سمجھانے کے بعد وہ میری طرف آ گیا۔

”میں نے ان لوگوں کو سمجھا دیا ہے۔“ اس نے مجھے خوشخبری سنائی۔ ”یہ دیکھنا کہ گاڑی
کیسے رکتی ہے۔ تم شاید ہم دیہاتیوں کو بے وقوف سمجھتے ہو گے۔ لیکن جلد ہی تمہیں اندازہ
ہو جائے گا کہ ہم کتنے عقلمند ہیں۔“

دوپہر ہو گئی..... اور مجھے ان کی عقلمندی کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ کوئی
ریل ہی نہیں آئی۔ ایک تو انتظار کی کوفت اور اس پر طرہ یہ کہ دھوپ شدید تھی۔ سب بیڑوں کے
نیچے پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ البتہ ایک آدمی باری باری لائن پر ڈیوٹی دینے پر مامور کر دیا گیا۔
وہ لوگ بیل گاڑی سے رسی کا ایک لچھا اتار لائے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد چودھری نے ایک دیہاتی
سے کچھ کہا اور وہ جا کر بیل گاڑی سے کھانے کا توشہ اتار لایا۔ ایک جھنڈ کے درمیان ہموار
زمین دیکھ کر دسترخوان بچھا دیا گیا۔ اس بار میں نے ان کی روایات کا خاص خیال رکھا تھا۔

کھانے کے بعد بھی دو گھنٹے تک ریل نہیں آئی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ گاؤں والے بیزار نظر آنے کی بجائے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے لیے وہ تفریح تھی۔ البتہ میں انتظار کرتے کرتے مر جانے کی حد تک بیزار ہو گیا تھا۔

شام ہو گئی۔ اور ریل نہیں آئی۔ یہ بات بے حد حیرت انگیز تھی۔ شاید میرا نصیب ہی ایسا تھا کہ کوئی کام توقع کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ شام ہوتے ہی ان لوگوں نے کبڈی شروع کر دی اور میں بور ہوتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان لوگوں کے مزے آ گئے ہیں۔

رات کا کھانا بھی وہیں کھایا گیا۔ پھر لائٹیں روشن کر دی گئیں۔ وہ لائٹیں اس ساز و سامان میں شامل تھیں، جو دوسری تیل گاڑی میں الاؤ روشن کیا گیا اور وہاں اچھا خاصہ قصہ خوانی بازار لگ گیا۔ وہ سب اپنی جگہ مگن تھے، جب کہ میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ اتنی دیر ان ریلوے لائن تو میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے تو وہ گاؤں ہی ساری دنیا سے نرالا گاؤں معلوم ہوتا تھا۔

انہی ہنگاموں میں صبح ہو گئی۔ اس دوران، ریل تو کجا، میں نے پٹر پوں پر چلنے والا ٹھیلہ تک نہیں دیکھا۔ ریلوے لائن پر ان لوگوں کی چوکی کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ لیکن ریل کونہ آنا تھا۔۔۔۔۔ نہ وہ آئی۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد چودھری کا ایک آدمی اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بے حد پشیمان دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا بات ہے منیر دین؟“ چودھری نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے؟“

”بس چودھری جی..... بھول ہو گئی۔“

”کیا بھول ہو گئی؟“

”چودھری جی..... معاف کرو تو بتاؤ؟“

”میں کہتا ہوں، جلدی بتاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے پہلے ہی ریل آ جائے۔“ چودھری نے اسے ڈانٹا۔

”ریل کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔“ اس نے دانت نکال کر کہا۔ ”پہلے مجھے معاف کر دیں۔“

”اچھا بابا..... معاف کیا۔ اب بتاؤ، کیا بھول ہوئی ہے، تم سے؟“

”اس لائن پر گاڑی نہیں چلتی جناب۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”کیا کو اس کر رہے ہو؟“ چودھری اٹھ کھڑا ہوا۔

”بس سرکار..... یہی تو بھول ہوئی مجھ سے کہ آپ کو پہلے یہ بات بتانا بھول گیا۔ لیکن آپ مجھے معاف تو کر ہی چکے ہیں۔“

چودھری صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ اس نے دھیر سے کہا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اتنی شدت سے غصہ مجھے پہلے کبھی نہیں آیا تھا..... اور ستم بالائے ستم..... میں اس غصے کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس خیر دین کو کھا جانے والی نظروں سے گھور کر رہ گیا۔ سب لوگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لیکن میرا جو حال تھا، وہ میں ہی جانتا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس گاؤں کے لوگوں کا یہ حال ہے تو وہاں کا کام کیسے چلتا ہوگا۔ اب بتائیں..... وہ مردود چوٹیں گھنٹے قیام کے بعد یہ انکشاف کر رہا تھا کہ وہ ایک مٹروک ریلوے لائن ہے، جس پر ہم ریل کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں وہاں سے زندگی بھر نہیں نکل سکوں گا۔ میں بری طرح پھنس گیا تھا۔

”اب کیا ہوگا بھائی مسافر؟“ چودھری نے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یہ بھی علم ہے کہ مجھے شمال کی طرف جانا ہے یا جنوب کی طرف۔“

”اب ایک ہی صورت ہے۔“ چودھری بولا۔ ”تیل گاڑی پر ناتھن چلے جاؤ۔ ناتھن یہاں سے پچاس کوس دور ہے۔ تیل گاڑی دو دن میں وہاں پہنچائے گی۔“

اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ ناچار، میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ طے یہ پایا کہ میرے ساتھ صرف گاڑی بان جائے گا۔ ان سبھوں نے مجھ سے معاف کیا اور آنکھوں میں انسو بھر کر مجھے الوداع کہنے لگے۔ اچانک میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ مجھے چودھری سے ایک بات ضرور معلوم کرنا تھی۔

”چودھری صاحب، یہ تو بتا دو کہ تم ریل کیسے رکواتے۔“ میں نے پوچھا۔

”ارے..... آسان ترکیب تھی۔ نہیں سمجھتے۔“ چودھری نے مجھے یوں دیکھا، جیسے روئے زمین پر سب سے کوڑھ مغز آدمی ہوں۔

”نہیں..... میں نہیں سمجھا۔“ میں نے بے حد خجل ہو کر کہا۔

”خیر میں بتاتا ہوں۔“ چودھری نے سسپنس پیدا کرنے کے لیے دو چار طویل سانس لیں۔

”ترکیب یہ تھی کہ ہم تمہیں باندھ کر ریل کی پٹری پر ڈال دیتے۔“

”کیا!“ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو چودھری صاحب؟“

”ہاں بھائی..... ہم نے یہی سوچا تھا۔ تمہیں بندھا پڑا دیکھ کر وہ ریل روکنے پر مجبور ہو جاتے۔ پھر تمہیں ریل میں بٹھانا کچھ مشکل نہ تھا۔“

میں نے بڑی ممنونیت آمیز نگاہوں سے اس خیر دین کو دیکھا، جسے اب تک میں دل ہی دل میں سلواتیں سنا تا رہا تھا۔ غضب خدا کا..... اگر یہ سب کچھ ہوا ہوتا تو میں کہاں ہوتا۔ وہ میرا محسن تھا۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔

”چلو بھائی۔“ میں نے کوچ بان سے کہا۔ اب میں وہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔

اب بیل گاڑی کا سفر تھا اور میں تھا۔ ناہموار راستہ تھا۔ ہر دھچکے کے ساتھ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے اپنا انجام بخیر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب کہ مجھے دو دن تک اسی بیل گاڑی میں سفر کرنا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر میں ہول بھی رہا تھا۔

اچانک ایک افتاد اور آ پڑی۔ اونچے نیچے راستے پر چلتے چلتے اچانک بیل گاڑی کا ایک پہیہ نکل گیا۔ کوچبان تو اچھل کر ایک طرف جا گرا۔ میری ریڑھ کی ہڈی سن ہو کر رہ گئی۔ یقیناً کئی مہرے ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے۔ اٹھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ ہلنا بھی ناممکن ہے۔ دوسری طرف بیل بدستور بھاگے جا رہے تھے۔

کمر کی تکلیف اتنی بڑھی کہ میں حسب روایت بے ہوش ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ہوش آیا تو دھوپ خاصی بڑھ چکی تھی۔ جھاڑیوں میں کوچ بان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ شاید وہ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ بھاگا ہو یا ممکن ہے، کوئی اور بات ہو۔ کچھ بھی ہو، میں بس اتنا جانتا تھا کہ اس اجنبی علاقے میں بے بار و مددگار پڑا ہوں۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی..... لیکن مجھ سے ہلا بھی نہ گیا۔ بے بسی کے شدید احساس نے میری آنکھیں بھگودیں۔ اسی وقت قدموں کی آٹھیں سنائی دیں، لیکن میں گھوم کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چند لمحے بعد جو چہرہ میرے سامنے آیا..... وہ سکندر کا تھا۔ عام حالات میں، میں اسے دیکھ کر سلگ اٹھتا..... لیکن اس وقت تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والا معاملہ تھا..... اور پھر وہ محاورہ بتا بھی نہ سکا..... بلکہ شہیر تھا۔

”کیا ہو گیا، جن بادشاہ؟“ اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

”جن بادشاہ مت کہو مجھے۔“ میں نے بے حد کمزور آواز میں کہا۔ ”میں بھی تمہاری طرح کا انسان ہوں۔“

”نہیں..... میری طرح کے تم نہیں ہو سکتے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”تم میری مدد نہیں کرو گے؟“ میں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ”آپ تو میری مدد کرنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن اب خود مدد مانگنا شروع کر دی۔“

اس بے بسی کے عالم میں بھی مجھے غصہ آ گیا۔ ”تم کیسے آدمی ہو۔ میری مدد کرنے کی بجائے میری بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہو۔“ میں چلایا۔

”میں دشمن نہیں، آپ کا دوست ہوں۔“ اس نے بے حد سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”اور میں مذاق نہیں اڑا رہا ہوں بلکہ آپ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ میں بھنا گیا۔ ”جو کچھ تم سمجھانا چاہتے ہو، اس تکلیف کے عالم میں میری سمجھ میں آئیگا! ارے..... پہلے مجھے اس تکلیف سے نجات دلاؤ۔ پھر سمجھاتے رہنا۔“

”پھر سمجھ میں نہیں آئے گی۔“ وہ بے حد متاسف ہو کر بولا۔ ”وہ بات آپ اسی تکلیف میں سمجھ سکتے ہیں۔“

”تو پھر سمجھا بھی چکو۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کب تک یہ غیر فطری زندگی گزارتے رہو گے۔“ اس کا لہجہ یلکھت تبدیل ہو گیا۔ ”تم نے خوب دیکھ لیا ہے کہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو کر تم ہمیشہ عذاب سے دوچار ہوتے ہو، اذیتیں اٹھاتے ہو..... اس کے باوجود اس منحوس دوا سے پیچھا نہیں چھڑاتے۔“

میں سنائے میں رہ گیا۔ مجھے تکلیف کا احساس بھی نہیں رہا۔ ”کک..... کون ہو تم؟“ میں ہکلا یا۔

”میں جن ہوں..... سچ مچ کا جن۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میری ہلکی بندھ گئی۔ میں بڑے عرصے سے جن برادری کو بدنام کرتا پھر رہا تھا۔ وہ یقیناً میرا احتساب کرنے کے لیے آیا تھا۔ ”جج..... جن بھائی، مجھے اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ میں اس دوا کو بھول جاؤں گا۔“

”میں نے کہا نا..... میں تمہارا دوست ہوں۔ میں تمہیں عذاب سے نجات دلانے کے لیے ہی آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔ حیرت انگیز طور پر میری تکلیف فوراً ہی رفع ہو گئی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اٹھا دیا۔ ”اب آنکھیں بند کر لو۔“ اس نے حکم دیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بعد اس نے آنکھیں کھولنے کو کہا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور حیران رہ گیا۔ میں اس وقت ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ

فارم پر کھڑا تھا۔ میرا ہاتھ اب بھی اس جن کے ہاتھ میں تھا، جسے میں سکندر کے نام سے جانتا تھا۔

”بس..... ٹرین آنے ہی والی ہے۔“ سکندر نے مجھے چونکا دیا۔

”اس..... کیا فرمایا آپ نے؟“

”یہ آپ جناب کیا لگا رہی ہے۔“ اس نے بڑی محبت سے مجھے ڈانٹا۔ ”میں نے کہا نا کہ میں تمہارا دوست ہوں۔“

”پھر بھی جناب عالی۔“ میں گھٹکھٹا کر بولا۔ ”حفظ مراتب کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔“

”یہ حفظ مراتب کہیں آئیہ الکرسی کو تو نہیں کہتے۔“ اس نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

”الفاظ کے سلسلے میں وہ الجھا ہوا لہجہ میرا جانا پہچانا تھا۔ میں اچھل کر رہ گیا۔“ تہہ..... تم

کہیں مسکرائیل تو نہیں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”آگئے نا پانی اوقات پر۔“ اس کے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”ابھی آپ جناب کرتے

مرے جارہے تھے۔ اب تم کہنا شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر بعد تو تراق پر اتر آؤ گے۔“

”یار..... جلدی سے اپنا چہرہ دکھا دو۔“ میں نے کھسیا کر کہا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ تم طبعث

حضور کو پیارے ہو گئے۔“

اس نے جلدی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اگلے ہی لمحے مسکرائیل کا چہرہ میرے

سامنے تھا۔ میں اس سے لپٹ گیا۔

”بس بھی کرو میرے یار۔“ اس نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے چکار کر کہا۔ ”گلتا ہے، فلمیں

کثرت سے دیکھنے لگے ہو۔“

میں اس سے لپٹا کھڑا رہا..... اور وہ میری پیٹھ تھپکتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹرین پلیٹ فارم

سے آگئی۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک سیلپر کی طرف لے گیا۔ سیلپر خالی تھا..... لیکن

میں بوکھلا گیا۔

”کیا کر رہے ہو؟ خدا جانے، کس نے ریزرو کر لیا ہو۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”یہ ہم دونوں ہی کے لیے ہے۔“ اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

ٹرین چل رہی تھی..... اور اب میں مسکرائیل کو دیکھنے کے جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ میں

بہت الجھن محسوس کر رہا تھا۔ مسکرائیل سے بہت سارے سوالات پوچھنا تھے۔ میں کچھ دیر تک

ان سوالات کو ذہن میں ترتیب دیتا رہا۔ مسکرائیل مجھے دیکھ کر مسکرائے جارہا تھا۔ ”مجھے معلوم

ہے، تمہارے پیٹ میں اچھارا ہو رہا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور یہ کھانے کی وجہ

نہیں..... بلکہ تمہارے پیٹ میں سوالات کا ہجوم بچل رہا ہے۔“

میں کھسیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے سوالات کا موقع بھی مل گیا۔ ”تمہیں غائب ہونے کی صلاحیت واپس مل گئی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ فوراً ہی غائب ہو گیا۔ میں نے بوکھلا کر اسے پکارنا شروع کر دیا۔ ”مسکرائیل..... او

بھائی مسکرائیل..... کہاں ہو؟“

”کیوں شور مچا رکھا ہے؟“ عقب سے اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ موجود تھا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارے سوال کا جواب تھا۔“ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”بڑے بے قراطہ ہو گئے ہو۔“ میں نے تمللا کر کہا۔ ”خیر..... تمہاری خبر تو میں اچھی طرح

لوں گا۔ ہاں..... تو یہ کیسے ہوا؟“

وہ یلکھت سنجیدہ ہو گیا۔ ”یار..... غائب ہونے والی دوا کے کپسول تو غیر مؤثر ثابت ہو

ہی چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے قدرتی نظام میں خرابی کا سبب تمہاری دوائے غیب ہی

ہے۔ پھر میں نے تریاتی کپسول استعمال کیا..... اور میں غائب ہو گیا۔“

میں ششدر رہ گیا۔ گویا دوا اس پر الٹا اثر کرتی تھی۔

”اور تم یہاں کیسے؟“

”تمہاری ہی تلاش میں آیا تھا۔ تمہارے نصرت چچا سے پتہ چلا تھا کہ تم ایک لڑکی کے

چکر میں خوار ہونے نکل کھڑے ہوئے ہو۔ ویسے یار، ایک بات بتاؤ۔ ادھر تم ریشماں پر مر مٹے

تھے اور یہاں اس لڑکی کے چکر میں غیر فقار یہ ہونے والے تھے۔ جہاں لڑکی دیکھتے ہو، پھسل

پڑتے ہو۔ تم لوگوں کو کیجائی راس نہیں آتی کیا؟“

میں شرمندہ ہو گیا۔ ”ارے۔ یہ یونہی..... دل کا اصل معاملہ تو ریشماں ہی کے ساتھ

ہے۔“ میں نے کھسیا کر کہا۔ ”یہ تو محض انسانی ہمدردی کے تحت ہی خوار ہوتا پھر رہا ہوں۔“

”اب انسانی ہمدردی کو بھی چھوڑ دو۔“ اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تم شادی

شدہ ہو۔ اور زیتون بہت حاسد لڑکی ہے۔ اگر تمہاری انسانی ہمدردیاں جاری رہیں تو وہ تمہارا

جینا حرام کر دے گی۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس کی بات کا پورا مفہوم میری سمجھ میں نہ آسکا۔ ”کک..... کیا

مطلب؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”کس چیز کا مطلب بتاؤ؟“ اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”تم تو ہر

بات سے بے خبر ہو۔ تمہیں کچھ بھی تو معلوم نہیں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں تمہاری معلومات اپ لوڈیٹ کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے مربیانہ انداز میں کہا۔
جب تم غائب ہو گئے تو میں نے سوچا کہ جائے استاد خالی است۔ سو میں نے تمہارا روپ اختیار کیا۔ محلے میں کسی کو علم نہیں کہ تم غائب ہو۔ تم یہاں مارے مارے پھر رہے تھے اور میں وہاں تمہارے معاملات نمٹا رہا تھا۔“

”اور مجھے پتہ بھی نہیں..... جب کہ میری شادی بھی ہوگئی!“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”ہاں..... میں نے کہا نا کہ میں نے تمہارے تمام معاملات نمٹا دیے۔“

”یعنی عروسی وقت بھی.....“

”نہیں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں نے کہا کہ رخصتی اس وقت ہوگی جب دنیا میں میرا واحد رشتہ دار..... میرا بھائی موجود ہوگا۔ یقین کرو بھائی..... زیتون بہت خوش تھی۔“

”زیتون!“ میں اچھل پڑا۔ اب مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی اس نے شادی شدہ ہونے کی اطلاع فراہم کرتے ہوئے زیتون کا تذکرہ کیا تھا۔ ”کیا تم نے ابو العمران بن کر زیتون سے شادی کی ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”مبارک ہو۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کئی جھٹکے دیے۔ ”بہت بہت مبارک ہو۔ آج سے تم ہی ابو العمران ہو۔ میں کوئی اور نام رکھ لوں گا۔ زیتون تمہیں ہی مبارک ہو۔ میں کنوارا ہی بھلا۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ویسے میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا سر توڑ دوں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولا۔ ”کاش، یہ ممکن ہوتا لیکن تم نے اس پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔ وہ کسی اور کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی۔ کاش۔ وہ مجھے مل سکتی۔“

”وہ تمہیں مل گئی ہے۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ میں دوستی کے نام پر اپنا سب کچھ تمہیں سونپنے دے رہا ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔“ اچانک ہی اس کے تیور بدل گئے۔ ”یاد رکھو، میں اصلی جن ہوں۔ تمہاری زندگی اجیرن کر دوں گا۔ ویسے بھی تمہارا بہت قرض ہے، ہم لوگوں پر۔ تم جن بن کر میری برادری کو رسوا کرتے پھر رہے ہو۔“

میں نے غور سے اسے دیکھا..... اس توقع پر کہ شاید وہ ہنس پڑے۔ لیکن اس کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر میری شی گم ہوگئی۔ ”یار مسکرائیل..... ہم تم دوست ہیں..... بلکہ اس دنیا میں تو میں تمہارا استاد بھی ہوں۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”میں نے کہا نا، خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔ تمہیں پتہ ہے، میں نے زیتون کو تمہاری بیوی بنانے کا فیصلہ کتنی اذیتیں اٹھا کر کیا ہے۔ اپنی محبوبہ کو تمہاری جھولی میں ڈال دیا ہے۔ میرا دل خون ہو گیا ہے۔ اب تم اسے ٹھکرا نہیں سکتے۔ ورنہ میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا۔“

”میں دوست کی محبوبہ کو بہن..... میں نے کہنا چاہا۔“

اس نے میرے منہ پر بڑی سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس..... اب ایک نازیا لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں تمہارا گلگھونٹ دوں گا۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اب تمہیں اس کے ساتھ زندگی گزارنا پڑے گی۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن اس کا ہاتھ اب بھی میرے منہ پر جما ہوا تھا۔ پھر شاید اسے مجھ پر رحم آ گیا اور اس نے میرا ذریعہ گویائی بحال کر دیا۔ میں نے تین چار گہری سانس لیں۔ ”خیر تمہاری قربانی میں رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں پوری زندگی کوئلے کی کان میں نہیں گزار سکتا۔“

”تمہارے تو اچھے بھی گزاریں گے۔“

”تم تمام عمر تو یہاں نہیں رہ سکتے۔“ میں نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ”تمہارے جاتے ہی میں فرار ہو جاؤں گا۔“

”اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکو گے۔ میں تو تمہیں، تمہاری قبر سے بھی نکال لاؤں گا۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ میری زندگی پر نازل ہونے والا سب سے بڑا اور دائمی عذاب تھا۔ اس کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ وہ میری طرح جعلی نہیں، بلکہ اصلی جن تھا..... اور وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ میرے اختیار میں تو شاید صرف خودکشی تھی..... اور میں جانتا تھا کہ وہ میرے بس کی بات نہیں۔ یعنی میں صبر کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

مسکرائیل بغور میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا، جھٹ بولا۔ ”اب تم صحیح نتیجے پر پہنچے ہو۔“

”اس کے علاوہ بھی میرا کوئی کام نہ بنایا ہے تم نے؟“ میں نے پوچھا۔

”سارے ہی کام نمٹا دیے ہیں۔“

”ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“

”بھئی..... وہ گامے شاہ والا گروہ تھا نا..... اس کا کام تمام کر دیا ہے۔ اس گروہ کا سرغنہ وہی نصرت چچا تھا..... تمہارا جعلی چچا۔ میں نے تمہارے دوست سلطان کے ذریعہ ان سب کو

میں تھا اور ہم دونوں گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک مجھے بڑی شدت سے بھوک کا احساس ہونے لگا۔

”پہلے اللہ توکل ریستورنٹ چلو۔“ میں نے مسکرائیل کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”بہت زور کی بھوک لگی ہے۔“

”ارے ہاں..... میں اتنی دیر سے سوچ رہا تھا کہ اس قدر اداس کیوں ہوں۔“ مسکرائیل چپکا۔ ”اب یاد آیا۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“

میں نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جیب میں پیسے بھی ہیں؟“

”کم از کم اب تو ایسی باتیں نہ کیا کرو۔“ وہ بھنا کر بولا۔ ”لکھ جتی ہو..... اور کھانا کھلاتے ہوئے دم نکلنے لگتا ہے۔“

”لکھ جتی میرا بینک ہوگا۔“ میں نے سر دآہ بھر کے کہا۔ ”اس وقت تو میں تقریباً فلاش ہو رہا ہوں۔“

”خوب..... تو دس، بیس ہزار کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ تمہارے لیے۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اس کی آنکھیں مخصوص انداز میں چمک رہی تھیں۔ وہ چمک اس وقت نظر آتی تھی، جب وہ شرارت کے موڈ میں ہوتا تھا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جیب کو بھاری پاکر حیران رہ گیا۔ باہر نکال کر دیکھا تو وہ سوکے نوٹوں کی گڈی تھی..... بالکل نئی گڈی۔ میں نے ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور اللہ توکل ریستورنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ہمیں دیکھ کر نیبل مین فضلو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”چائے پینے آئے ہیں نا؟“ اس نے بے حد پر امید لہجے میں پوچھا۔ اندازہ ایسا ہی تھا، جیسے مثبت جواب پر اس کی زندگی اور موت کا انحصار ہو۔

”پاگل ہوا ہے کیا؟“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”ابے..... یہ تو کھانے کا وقت ہے۔“

ایسا لگا، جیسے فضلو بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ اسی وقت ریستورنٹ کا مالک رجیم آ گیا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھ کر دانت نکال دیئے..... اور بہت بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”کیا حال ہے جناب؟“

”اللہ کا کرم ہے۔“ ہم دونوں نے بیک آواز کہا۔

”یہ فضلو کو کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا ہے نا..... بس، دم نکل گیا ہے اس کا۔“

”کیا مطلب؟“ میں گڑ بڑا گیا۔ ”ہم دونوں کے ایک ساتھ نظر آنے میں کیا قباح

گرفتار کر دیا۔ تمام اخباروں میں تمہاری اور سلطان کی تصویریں چھپیں۔ سلطان کو ترقی ملی۔ اب وہ ڈی ایس پی ہے۔ ہمیں پانچ لاکھ کا انعام الگ ملا اور اسمگلنگ کا جو مال پکڑا گیا ہے، اس کا صلہ الگ ملے گا۔ کروڑوں کا مال پکڑا گیا ہے۔ خاصی لمبی رقم ملے گی تمہیں۔ پانچ لاکھ تو میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرادیے ہیں۔“

میرا جی خوش ہو گیا۔ عجیب دوست تھا وہ..... میری زندگی تباہ بھی کی..... اور سنوارنے کی کوشش بھی!

”اب تم اپنا کاروبار بھی کر سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے دوست، تمہارا شکریہ۔“ میں نے کہا۔ ”میں دواؤں کا اسٹور کھولوں گا۔“

”ضرور کھولنا۔ بس، اب ذرا ڈھنگ سے زندگی بسر کرو۔ دوائے غیاب کے چکر سے نکل جاؤ۔ وہ تمہیں راس نہیں ہے۔“

”میں بھی اس عرصے میں یہی سوچتا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”صرف سوچو نہیں..... اب جان چھڑالو۔“

اچانک مجھے بحیثیت سکندر اسکا رویہ یاد آ گیا۔ ”لیکن تم نے سکندر بن کر میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“ میں نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے اس چکر سے ابتدا ہی میں نکال سکتے تھے۔“

”یقیناً..... لیکن میں چاہتا تھا کہ تم دوا کے ہاتھوں ذرا اچھی طرح خوار ہو جاؤ تاکہ اس کا نام لینا بھی بھول جاؤ۔ ایسی باتیں سمجھانے سے کبھی سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم نے جو کیا، بہتر ہی کیا۔“ میں نے کہا۔

مجھے اس سے شکایتیں تو بہت تھیں، لیکن اس نے میری جتنی مدد کی تھی، اس کے پیش نظر انہیں لبوں پر لانا مناسب نہیں تھا۔ بعد کا سفر خاموشی سے کنا۔ مسکرائیل بھی کسی سوچ میں گم تھا۔

ٹرین کراچی کی حدود میں داخل ہوئی تو مجھے اس قدر خوشی ہوئی کی بیان سے باہر ہے ایسا لگ رہا تھا کہ ہنگامہ خیز شہر سے پھڑے ہوئے برسوں ہو گئے ہیں۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔

اسٹیشن پر وہی ہنگامہ تھا..... وہی نفسا نفسی تھی، جو کسی ٹرین کی آمد کے بعد ہمیشہ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ ٹیکسی والوں کی بن آئی تھی اور وہ منہ پھاڑ کر کرایہ مانگ رہے تھے۔ مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب مسکرائیل نے ٹیکسی والے سے بحث نہیں کی اور اس کا مطالبہ بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

اورنگ آباد پہنچ کر مسکرائیل نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا۔ اب وہ اسماعیل کے روپ

ہے؟“

”شروع میں تو میں بھی پریشان تھا۔ آپ تو بہت عرصے سے یہاں کھانا کھا رہے ہیں۔ آپ کی خوراک زیادہ نہیں تھی۔ البتہ اسماعیل صاحب.....“ اس نے مسکرائیل کی طرف اشارہ کیا۔ ”شروع ہی سے خوش خوراک ہیں۔ اب آپ پر صحبت کا اثر ہو گیا ہے اور ماشاء اللہ.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ”ادھر کچھ عرصے سے آپ دونوں الگ الگ آتے رہے ہیں..... اور یہ فضلہ خدا کا شکر ادا کرتا رہا ہے۔ اکیلے ہونے کے باوجود بل بتاتے وقت اس پر برا وقت شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ دوسرے بال نوپنے لگا تھا۔ افسوس کر رہا تھا کہ لکھ پڑھ لیتا تو حساب تو آ جاتا۔ اس پر آپ نے کہا کہ ایسا ہوتا تو یہاں بیرا گیری کیوں کرتا..... کسی بینک میں ملازم ہوتا۔ اس پر یہ دھاڑیں مار مار کر رو دیا تھا۔ آج آپ دونوں ساتھ آئے ہیں تو بس..... اللہ خیر کرے۔ مجھے ڈر ہے کہ گزر نہ جائے۔“

میں نے مسکرائیل کو گھور کر دیکھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں اس کی بھوک کے بارے میں جانتا تھا۔ ہر دو تین گھنٹے بعد اسے بھوک لگنے لگتی تھی۔ اس مسئلے کا حل اس نے یہ نکالا ہو گا کہ ایک بار اسماعیل بن کر کھانا کھا گیا..... اور دوسری مرتبہ میرا روپ دھار کر آ گیا۔ ”خیر..... آج تو مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے۔“ میں نے فضلہ کو اطمینان دلایا۔ لیکن وہ اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

رحیم اپنے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا اور میں مسکرائیل کے ساتھ ایک میز کی طرف چل دیا۔ فضلہ گویا کسی نادیدہ رسی سے بندھا ہمارے پیچھے پیچھے تھا۔ آرڈر دینے کا کام میں نے مسکرائیل کے سپرد کر دیا۔ کیونکہ میری غیر حاضری کے دوران اس کا تجربہ یقیناً بہت وسیع ہو چکا تھا۔ ”ہاں..... کیا کیا ہے کھانے میں؟“ مسکرائیل نے فضلہ سے پوچھا۔

”جی..... آلو گوشت، آلو قیمہ، آلو مٹر، آلو گو بھی، آلو پا لک، آلو چنا، آلو.....“ ”کیا مصیبت ہے۔ یہ تم لوگ اتنے آلود زدہ کیوں ہو۔“ مسکرائیل دھاڑا۔ ”ایسا کر..... تمام ہاٹریوں میں جتنے بھی آلو ہیں، سب نکال کر لے آ۔ اور آلو کے سوا کوئی چیز بھی لایا تو جان سے مار دوں گا۔“

فضلہ نے دانت نکال دیے۔ ”کیوں مذاق کرتے ہیں صاحب۔“ مسکرائیل ہنس دیا۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے اتنا لمبا چوڑا آرڈر دیا، جو سات خوش خوراک آدمیوں کے لیے بہت کافی ثابت ہو سکتا تھا۔

کھانے کے دوران خاموشی رہی۔ مسکرائیل تو، یوں لگتا تھا، جیسے عبادت میں مصروف ہو۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فضلہ کو پکارا۔ ”ابے..... فضلہ،

پانی لے آ۔“

فضلہ دونوں ہاتھوں میں پانی کے جگ لے کر ہماری طرف لپکا۔ دونوں جگ اس نے میز پر رکھ دیے۔ مسکرائیل نے آنکھیں نکالیں تو وہ جلدی سے بولا۔ ”ابھی لاتا ہوں تیسرا جگ۔“ یہ کہہ کر وہ پانی کی ٹنکی کی طرف جھپٹا۔ مجھے ہنسی روکنا دو بھر ہو گیا۔ پانی کے بعد مسکرائیل نے فضلہ سے ایک اور فرمائش کی۔ ”دو..... آلو چائے لے آ جلدی سے۔“

فضلہ منہ کھول کر رہ گیا۔ وہ سچ سچ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

”ابے، چائے لے آ۔“ میں نے بھنا کر کہا۔

ہماری چائے نوشی کے دوران فضلہ پلیٹیں گن کر خدا جانے کیا جمع تفریق ضرب تقسیم کرتا رہا۔ اس کے باوجود ہمارے کاؤنٹر پر پہنچنے کے پانچ منٹ بعد اس نے ہمارے بل کا اعلان کیا۔ ”پونے بیس روپے ساڑھے اٹھتر پیسے۔“

”کیا بکواس ہے۔“ رحیم دھاڑا..... اور فضلہ دوبارہ حساب کتاب میں مصروف ہو گیا۔ بڑی مشکل سے وہاں سے جان چھوٹی۔ میں گھر پہنچنے کو بنے تاب ہو رہا تھا۔ گلی سے گزرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ زیتون کے دروازے پر لٹکے ہوئے پردے میں بھونچال سا آ رہا ہے۔ یہ سوچ کر میری طبیعت بگڑنے لگی کہ اب میری آئندہ زندگی اس تیج آنکھوں کے ساتھ گزرے گی۔

گھر پہنچ کر ایسا لگا، جیسے برسوں کے بچھڑے محبوب سے آ ملا ہوں۔ اس سے پہلے کبھی مجھے گھر کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ گھر پہنچتے ہی پہلے تو میں یوں سارے گھر میں ناچنا چا پھرا، جیسے درود یوار سے گلے مل کر رونے کا ارادہ ہو۔ کم از کم باتیں کرنے کا تو دل چاہ رہا تھا۔ پھر میں نے بستر کا راستہ لیا۔ مسکرائیل کسی کام سے باہر چلا گیا۔

جانا پچھانا بستر مجھے تھکیاں دے رہا تھا۔ ادھر کئی دن کی صعوبتیں اٹھا کر بدن نڈھال ہو چکا تھا۔ میری آنکھ جھپک گئی۔ لیکن وہ پرسکون نیند نہیں تھی۔ میں خواب دیکھ رہا تھا کہ زیتون میرے گھر میں دندناتی پھر رہی ہے۔ گھر کے سارے بلب رو رہے ہیں، پھر زیتون میرے قدموں میں گر کر بھوں بھوں رونے لگی۔

میں نے ہز بڑا کر آنکھیں کھول دیں، کم از کم خواب کا آخری حصہ تو حقیقی تھی۔ زیتون مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اور مسلسل روئے جا رہی تھی۔ میں نے جھکے سے اسے ایک طرف ہٹا دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری زندگی کسی عذاب میں گزرے گی۔ یہ بات یقینی تھی کہ زیتون مجھے کبھی چین سے سونے بھی نہیں دے گی۔

وہ اب بھی روئے جا رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ البتہ بھوں بھوں کی آواز اتنی تیز تھی کہ خدشہ تھا، تمام محلے والے میرے دروازے پر جمع ہو گئے ہوں گے۔ بات شرمندگی کی ضرورت تھی لیکن خطرہ کوئی نہیں تھا۔ آخر وہ میری منکوحہ تھی۔ جہاں تک شرمندگی کا تعلق ہے، تو آہستہ آہستہ اس کا عادی ہو جاتا۔

”کیا ہوا؟ کیا مصیبت ہے؟“ میں نے اسے ڈپٹا۔

”تم..... تم بے وفا ہو۔“ اس نے گریہ وزاری میں بریک لگا کر کہا۔

مجھے مسکرائیل پر بہت زور کا غصہ آیا۔ یقیناً اس نے زینت والی کہانی نمک مرچ لگا کر زیتون کو سنا دی ہوگی۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بے وفائیں ہوں۔“ میں نے منہ پکا کر کے کہا۔ ”تم کس بے وفائی کی بات کر رہی ہو۔؟“

”غضب خدا کا..... مجھ سے پوچھ رہے ہو!“ اس نے آنکھیں نکالیں۔ ”میرا گھر اجاڑنے کے لیے میرے ہی ابا کے ذریعے شادی کا پیغام بھجوایا..... اور اب کیسے معصوم بن رہے ہو۔“

میں چکرا گیا۔ ”شادی کا پیغام؟ کیا کہہ رہی ہو زیتون۔ کیا تمہاری مجھ سے شادی نہیں ہوئی؟“

”مجھ سے کہاں ہوگی۔ تم تو پہلوان کی بہن..... ہائیں، کیا کہا تم نے۔“ اچانک اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ ”تمہارے منہ میں گھی شکر۔ نہیں ہوئی تو کیا ہے۔ جب کہو گے، ہو جائے گی.....“

اب میری سمجھ میں آتا تو اچکا تھا کہ مسکرائیل مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میری شادی زیتون سے نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کبھی نہیں ہوگی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ زیتون نے پیغام بھجوانے کی بات کی ہے اور پہلوان کی بہن کا حوالہ بھی دیا ہے۔ تو کیا رہشماں..... لیکن اس بات کی تصدیق مسکرائیل ہی کر سکتا تھا۔ زیتون سے کچھ پوچھنا مخدوش تھا۔

”بکواس مت کرو۔ میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”اور یہ کیا طریقہ ہے۔ تم جب جی چاہے، منہ اٹھا کر چلی آتی ہو۔“

جواب میں اس کی گریہ وزاری پھر شروع ہو گئی۔ اس بار میں بری طرح بوکھلا گیا۔ وہ میری منکوحہ تو تھی نہیں کہ میرے گھر اس کی موجودگی کا کوئی جواز ہوتا۔ ”دیکھو پلیز..... روؤ مت۔ لوگ جمع ہو جائیں گے۔“ میں نے اس سے رحم کی اپیل کی۔

”جمع ہونے دو لوگوں کو..... میں کیا کروں۔“ اس نے بھنا کر کہا اور اس مرتبہ ٹاپ گیر میں رونے لگی۔

میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی..... پھر کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپیں۔ میں دہل کر رہ گیا۔ رہشماں کے ملنے کی امید پیدا ہوئی تھی، لیکن زیتون میرا بیڑا غرق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

پھر دروازے میں مرزا دہشت کا مدقوق چہرہ نظر آیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ میں کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ زیتون کو دیکھ کر خوش ہوا تھا یا مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھلی تھیں۔ پھر وہ تیزی سے چھپنا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

”زیتون..... کہاں تھیں تم زیتون؟ میری زندگی میں اجالا کر کے کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔“ اس نے گلہ گیر آواز میں کہا۔

اچانک اس کی کمر پر زیتون کا دو ہنر پڑا۔ اسی وقت میں نے اسے دھکیل دیا۔ ”میں زیتون نہیں ہوں۔“ میں نے بھنا کر کہا۔ ”وہ رہی زیتون۔“ میں نے زیتون کی طرف اشارہ کیا۔

وہ زیتون کی طرف والہانہ انداز میں بڑھا، لیکن ٹھٹک کر رہ گیا۔

”تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔“ زیتون دانت پیس کر بولی۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔“ مرزا نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ ”لیکن میں تمہیں اپنے دوست کو درغلانے کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”ارے..... تم ہوتے کون ہو اجازت دینے والے۔“ زیتون نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”منہ نوچ لوں گی تمہارا۔“

”ضرور نوچ لو۔ میں تو اسے ہمیشہ کے لیے تمہارے نام لکھنے کو تیار ہوں۔“ مرزا نے بے حد ڈھنکائی سے کہا۔ ”اف..... یہ پھول سے ہاتھ.....“

اسی وقت مسکرائیل نازل ہو گیا۔ ”اپنے دوست کو سمجھا لو۔ یہ زیتون کے ساتھ فری ہونے کی کوشش نہ کرے۔“ اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔

”مجھے فری ہونے ہی نہیں دیتی۔“ مرزا نے فریاد کرنے والے انداز میں صفائی پیش کی۔

”ارے..... تم میرے لگتے کیا ہو؟“ زیتون چلائی۔

”لگتا تو کچھ نہیں ہوں..... لیکن ایسا چاہتا ہوں۔“ مرزا نے عرض کیا۔

مسکرائیل مرزا کی طرف بڑھا ہی تھا کہ سلطان نازل ہو گیا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”جنگ ہونے والی ہے۔“ میں نے کراہ کر کہا۔ ”لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ قلو پٹرہ کے حصول کے لیے جنگیں لڑی گئی تھیں۔ انہیں یہ منظر دکھا دو۔ جب زیتون کے لیے یہ دونوں

اس کی بے تکی مثال پر غصہ تو بہت آیا، لیکن یہ پتہ چل چکا تھا کہ اب وہ ڈی ایس پی ہے۔

ویسے بھی اس کا قصور نہیں تھا۔ ایک روز پہلے تک وہ مسکرائیل کو میرے روپ میں دیکھتا رہا تھا۔

”شادی کا خوف لاحق ہے عمران میاں کو۔“ مرزا نے میری طرف جواب دیا۔ پھر براہ راست مجھ سے مخاطب ہو گیا۔ ”میاں..... شادی بری بلا ہے۔ میری مانو تو بچ نکلو۔ میں تمہاری جگہ قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ آخر دوست ہوں..... اور دوستی کا امتحان تو بحران ہی میں ہوتا ہے۔“

”میں خوب سمجھتا ہوں تمہاری دوستی۔“ میں نے دانت پس کر کہا۔ ”تم نے سلطان کے ساتھ مل کر مجھے اغوا کیا..... مجھے مصیبتوں میں پھنسوا یا۔ مجھے بوتل میں بند کرنے چلے۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ میں طمطراقیل سے کہہ کر.....“

”بس کرو پیر بھائی۔ غصہ تھوک دو۔“ سلطان نے میری بات کاٹ دی۔ ”آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ جن بادشاہ بھی ہمیں معاف کر چکے ہیں۔“

میں نے غصے سے مسکرائیل کی طرف دیکھا۔ یہ بھی اسی کا کیا دھرا تھا۔ پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر گویا غصہ تھوک دیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم اس ناول نگار کو سمجھا دو۔ یہ مجھے دوستی کے راگ نہ سنایا کرے۔“

”ٹھیک ہے۔“ مرزا نے کہا۔ ”آئندہ میں دوستی کا تذکرہ تحت اللفظ میں کیا کروں گا۔“ میں نے مزید خون جلانا مناسب نہ سمجھا۔ مرزا کی باتیں ایسی ہی ہوتی تھیں..... ہڈیوں تک کو سلگا دینے والی۔

”میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ تمہارے رپوارڈ کی رقم ساڑھے آٹھ لاکھ بنی ہے۔ کل پرسوں میں چیک بن جائے گا۔“ سلطان نے کہا۔ ”اور ہاں میں جن بادشاہ کے اعزاز میں آئندہ جمعرات قوالی کر رہا ہوں۔ اس میں تم مع اہلیہ مہمان خصوصی ہو گے۔“

”ہرگز نہیں۔ تم قوالی نہیں کراؤ گے۔“ میں نے کڑک کر کہا۔ ”طمطراقیل کے عقیدے کے مطابق موسیقی حرام ہے۔“

”خیر چلو فاتحہ پڑھی اکتفا کر لوں گا۔“

”فاتحہ مرے ہوؤں کی ہوتی ہے۔“ میں نے اعتراض کیا۔

”اچھا..... تو اپنا عقیدہ کروالوں گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میرا عقیدہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔“

لڑکتے ہیں تو قلوبطرہ کے لیے کیا نہیں ہو سکتا۔“

”لڑکی..... تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ سلطان زیتون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں..... میں تو اب صاحب سے ملنے آئی تھی۔“ زیتون نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”پیر بھائی..... اب تو باز آ جاؤ ان حرکتوں سے۔ غضب خدا کا..... کل تمہاری شادی ہو نیوالی ہے..... اور آج یہ.....“

”اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”اچھا..... تو کیا میرا قصور ہے۔“ سلطان نے آنکھیں نکالیں۔

”اسی سے پوچھو۔“ میں نے زیتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو سکون سے سو رہا تھا..... اور یہ میری شادی کا کیا چکر ہے؟“

جواباً مسکرائیل نے اتنی کڑی نظروں سے مجھے گھورا کہ میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

”اب کیسے معصوم بن رہے ہو۔“ زیتون تنگ کر بولی۔ ”خود میرے ابا کو اس پہلوان کے گھر رشتہ لینے بھیجا۔ کل شادی ہو رہی ہے..... اور معصومیت تو دیکھو..... جیسے کچھ پتہ ہی نہیں۔“

مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ شادی مرگ کی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔ میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہا تھا، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟

”اور تم دونوں کیوں لڑ رہے تھے؟“ سلطان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مسکرائیل اور مرزا سے مخاطب تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں تو زیتون سے مصافحہ کر رہا تھا۔“ مرزا نے کہا۔

”اور میں اس سے معاف کرنے والا تھا کہ آپ نے مداخلت کر دی۔“ مسکرائیل نے مرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہ جانے کیا بات ہے، اسماعیل صاحب سے زیتون کے حسن کی تعریف برداشت ہی نہیں ہوتی۔“ مرزا نے کہا۔

”اچھا لڑکی..... اب تم چل دو یہاں سے۔ کل تک تم پر اور پابندی رہے گی۔ پرسوں سے بے شک، تم یہیں رہ پڑنا۔“ سلطان نے زیتون سے کہا۔

”رہے گی میری جوتی۔“ زیتون نے بھنا کر کہا۔ ”پرسوں سے تو میں یہاں تھوکوں گی بھی نہیں۔“ پھر وہ پاؤں پچختی ہوئی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد سلطان میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ مجھے نظروں ہی نظروں میں تول رہا تھا۔ ”کیا بات ہے پیر بھائی۔ کل تک تو بالکل ٹھیک تھے۔“ اس نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

”آج اتنے کمزور لگ رہے ہو، جیسے نچوڑا ہوا لیوں۔“

”دیکھا جائے گا۔“ میں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

میں ان دونوں کے ملنے کی دعائیں کرتا رہا، تاکہ مسکرائیل سے اپنی شادی سے متعلق بات کر سکوں۔ سلطان تو کچھ دیر پہلے اٹھ گیا، لیکن مرزا ابھی تک ڈٹا ہوا تھا۔

”یار عمران بھائی۔“ چند لمحے بعد وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”تمہارے سہرے کے پھول تو کل کھل جائیں گے۔ اب میرے بارے میں بھی سوچو۔ تمہارے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔“ اس کی آواز گلو گیر ہوئی۔

مجھے اس پر ترس آ گیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے مسکرائیل سے پوچھا۔ ”تم زیتون سے دستبردار ہو سکتے ہو؟“

”دستبردار ہی سمجھو۔“ مسکرائیل ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میرا گھر یلو مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ہماری طرف ایک ایسا روغن دریافت ہو گیا ہے، جو سینگلوں کی افزائش کے لیے حیرت انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اب تو مشک بو کے سینگ بھی میرے.....“ یہ کہہ کر اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا..... اور سینگ غائب پا کر مایوس ہو گیا۔

میرزا آنکھیں پھاڑے مسکرائیل کو یوں دیکھ جا رہا تھا، جیسے اس کے سر پر جج سینگ نکل آئے ہوں۔

”یہ کبھی کبھی بہک جاتا ہے۔“ میں نے مسکرائیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مرزا کو تسلی دی۔ ”ویسے بھی مجھے اپنی محبوبہ سے دستبردار ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ اس وقت تو اس پر قیامت گزر رہی ہوگی۔“

مرزا نے بے حد ممنون نگاہوں سے مسکرائیل کو دیکھا، جو اپنی کھوپڑی سہلائے جا رہا تھا۔

”تو زیتون کے والد سے بات کروں تمہارے لیے؟“ میں نے مرزا سے پوچھا۔

”ضرور کرو۔ وہ لڑکی تو دن میں بھی مشکل نظر آتی ہے، کوئی اور لڑکی دیکھتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ مرزا نے زور دے کر کہا۔ ”میرے لیے وہ ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

خوبصورت لڑکی سے شادی کر کے میں وبال میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ارے یار..... میری صورت بھی تو دیکھو ذرا۔“

اس کی بات معقول تھی۔ وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا..... لیکن ثابت کر رہا تھا۔ دنیا میں اتنے حقیقت پسند لوگ کم ہی ہوں گے۔ ورنہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ دیکھنے میں انتہائی کریہہ..... اور شادی کی آرزو حسینہ عالم سے..... بہر حال یہ اس کی شخصیت کا مضبوط پہلو تھا۔ میں دل ہی دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

”لیکن مرزا..... وہ تو تمہارا منہ نوچنے پر تلی رہتی ہے۔“

”یہ تو محبت کی ادا ہے۔“ مرزا نے بتیسی کی نمائش کر ڈالی۔ ”دیکھ لینا..... شادی کے بعد میرے پاؤں دھو دھو کر پیے گی۔“

”اچھا..... اب تم ٹلو، اور مجھے سونے دو تمہارا کام ہو جائے گا۔“

”کل برات کس وقت جائے گی؟“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا..... اور میں گز بڑا کر رہ گیا۔

”عصر مغرب کے درمیان نکاح ہے۔“ مسکرائیل نے جلدی سے کہا۔ ”تم دو بجے آ جانا۔“

مرزا کے رخصت ہوتے ہی میں مسکرائیل سے لپٹ گیا۔ وہ ہائیں ہائیں کرتا رہ گیا.....

”ارے تم واقعی سچے دوست ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے میرے سارے کام واقعی نمٹا دیے۔ لیکن یہ ریشماں دالا معاملہ کیسے بنا؟“

”میں نے جگے سے بات کی تھی۔“ مسکرائیل نے جواب دیا۔ ”اس سے پتہ چلا کہ ریشماں اس کی حقیقی بہن نہیں بلکہ ایک بڑے گھر کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کے باپ کے جگے پر بڑے احسانات تھے۔ پھر ریشماں کے ماں باپ ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے تو جگے ہی نے ریشماں کی پرورش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ریشماں کو تعلیم دلائی۔ میں نے جب جگے سے تمہارے لیے بات کی تو جگے نے کہا کہ اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ ریشماں خود کرے گی۔“

”اور ریشماں میرے سخت خلاف تھی؟“

”کوئی لڑکی اس شخص کے خلاف نہیں ہو سکتی، جس نے اس کی آبرو بچائی ہو۔“ مسکرائیل نے مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”البتہ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل تھا اور تم میں تھوڑی سی کمی تھی۔“

”پھر اس نے مجھے قبول کیسے کر لیا؟“

”وہ کمی پوری ہو گئی تھی۔“

”کیسے پوری ہو گئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ کمی کیا ہے؟“

”میں نے اس کی ڈائری پڑھی تھی۔ اس میں تمہارا تذکرہ بہت ذالہ انداز میں کیا گیا تھا۔ اس میں اس کمی کی وضاحت بھی تھی، جس کا تم ریشماں کے خیال میں، شکار تھے۔“

مسکرائیل نے جواب دیا۔ ”پھر میں اسے پڑھانے کے لیے جانے لگا..... ابوالعمران بن کر۔“

جاتا ہے۔ فزکس کیمسٹری کے معنی تک یاد نہیں رہتے۔ پھر میں نے اسے اردو پڑھانا شروع کر دی۔ یقین کرو، وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی، میری اردو سن کر جب میں نے پہلی مرتبہ اس سے تشریفے کو کہا تو تم اسے دیکھتے..... ہنستے ہنستے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ بس، پھر وہ تم سے متاثر ہوتی گئی۔“

میں بوکھلا گیا۔ ”تت..... تم نے..... اظہار محبت بھی کیا تھا، اس سے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بے فکر ہو۔“ اس نے مجھے دلا سہ دیا۔ ”ویسے اگر اظہار محبت کر دیا ہوتا تو کل تمہارے سہرے کے پھول نہ کھل رہے ہوتے۔ پیارے بھائی، میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ لڑکی براہ راست اظہار کو گھٹیا بن تصور کرتی ہے۔“

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ ”یار، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کل میری شادی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کل یقین بھی آ جائے گا۔“ مسکرائیل نے اطمینان سے کہا۔

”اور یار..... شادی کی تیاریاں اتنی جلدی کیسے ہو جائیں گی؟“

”سب ہو جائے گا۔ کوئی فکر نہ کرو۔ تم تو بس ریشماں کے بارے میں سوچتے رہو۔“

اور واقعی..... میں ریشماں کے تصور میں گم ہو گیا۔ فکر کی کوئی بات تھی بھی تو نہیں۔ بظاہر تو شادی کا کوئی انتظام نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن میرے لیے یہی کافی تھا کہ تمام انتظامات کا وعدہ، ایک جن زادے نے کیا ہے، جو میرا دوست ہے۔

نکاح تک میں خوابناک کیفیت میں رہا..... سب کچھ غیر حقیقی سا لگ رہا تھا۔ دو بجے تک مرزا دہشت، سلطان، یاسین اور دفتر کے کچھ احباب آ گئے۔ چھپر چھاڑ کا سلسلہ چل نکلا۔ پھر محلے کے لوگ بھی آ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میری شادی پر محلے والوں نے ہمسائیگی کا حق ادا کر دیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میری اتنی خالائیں، پھوپیاں، چچیاں اور نانیاں وغیرہ موجود ہیں..... اور ان سب کو مسکرائیل نے میری غیر موجودگی میں بحیثیت ابو العمران دریافت کیا تھا۔ وہ سب میری بلائیں لے رہی تھیں۔ اور مجھ پر واری صدقے ہو رہی تھیں۔ لڑکیاں بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ یہ سوچ کر فکر مند ہو جایا کرتا تھا کہ اپنی شادی کے موقع پر یہ نسوانی جم غفیر میں کہاں سے..... اور کیسے پروڈیوس کروں گا۔ لیکن مسکرائیل نے واقعی تمام معاملات نمٹا دیے تھے۔

ایجاب و قبول تک تو مجھے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ یہی احساس رہا کہ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں..... پھر رخصتی ہو گئی اور چاند میرے گھر اتر آیا۔ ریشماں کو جملہ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ سب دوست مجھے گھیر کر بیٹھ گئے۔ محلے کی چند بڑی بوڑھیاں بھی رک گئی تھیں، تاکہ وہ

شادی کا گھر معلوم ہوتا رہے۔ پھر تمام دوستوں کو رخصت کر کے میں جملہ عروسی کی طرف بڑھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور مسرت کے بوجھ سے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اندر ریشماں دلہن بنی مسہری پر بیٹھی تھی اور اس نے سر جھکا رکھا تھا۔

اب میں بوکھلایا..... کیا کیا جائے..... پھر بچپن میں سکھائے گئے آداب یاد آ گئے اور میں نے با آواز بلند اسے سلام کر ڈالا۔ جواب کم از کم میری سماعت تک تو پہنچ نہیں سکا۔ ”مم..... میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

”جی..... تشریفے۔“ دھیمی آواز میں جواب ملا اور ساتھ ہی گھونگھٹ کے نیچے جیسے بھونچال سا آ گیا۔

میں نے دل ہی دل میں مسکرائیل کو صلو اتیں سنائیں اور مسہری پر تشریف لیا گیا۔ دوستوں کے بیان کردہ ضابطوں کے مطابق اگلا مرحلہ گھونگھٹ اٹھانے اور حسن کی تعریف کرنے کا تھا۔ لہذا میں نے پہلا قدم اٹھایا۔ گھونگھٹ تو میں نے اٹھا دیا..... لیکن اس کے بعد نگاہیں خیرہ اور دماغ شل ہو کر رہ گیا۔ ریشماں ویسے ہی بہت خوبصورت تھی..... لیکن دلہن بن کر تو وہ کوئی آسمانی مخلوق ہی نظر آ رہی تھی۔ میں اس کی کیا تعریف کرتا..... میری تو سٹی گم ہو گئی تھی۔

”آ..... آپ بہت خوبصورت ہیں۔“ میں نے حسب ہدایت اشارت لیا۔ لیکن آگے کیا کہنا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ریشماں آہستہ سے ہنس دی..... جیسے گھٹنیاں سی بج اٹھی ہوں۔

میں نے حواس اور حوصلہ مجتمع کیا۔ ”آپ کی رنگت ایسی ہے، جیسے..... جیسے بورک پوڈر کو منچر آ یوڈین میں ملا کر گوندھا لیا گیا ہو..... اور یہ آپ کی سیاہ زلفیں..... خالص کاربن کی طرح ہیں۔ آپ کے ہونٹ دیکھ کر مجھے سرخ ٹمس پیپر یاد آتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں بالکل سے بھرے ہوئے جار کی مانند.....“

”یہ سب کچھ آپ فراز کی زبان میں بھی کہہ سکتے تھے۔“ اس نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ لہجے میں شکایت تھی۔

”کون فراز؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”اچھا فراز؟“

”اس کی زبان میں کیوں کہوں..... میری اپنی زبان کٹ گئی ہے کیا؟“

”جی..... ی..... ی..... اس نے حیرت سے کہا۔ ”آپ تو احمد فراز کو بہت پسند کرتے تھے۔“ ”کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”قسم لے لو..... تمہارے سوا میں نے کبھی کسی کو پسند نہیں کیا۔“

”اب تمہیں نام بھی سوچ لینا چاہیے۔“ سلطان نے کہا۔
 ”نام تو میں پہلے ہی رکھ چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لڑکا ہوا تو عمران..... لڑکی
 ہوئی تو عمرانہ۔“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ مرزا چکا۔ ”لیکن لڑکی ہوئی تو تم ابو العمرانہ کہلاؤ گے۔“
 میں جھینپ کر رہ گیا۔

”پھر بھی تمہیں کوئی نام تو سوچنا ہی چاہیے۔“ مسکرائیل بولا۔
 بات آئی گئی ہو گئی۔ پھر وہ وقت بھی آپہنچا، جب میں فلمی روایت کے مطابق، بند
 دروازے کے سامنے اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اندر سے کوئی خبر آنے والا تھی۔
 حقیقت یہ ہے کہ میں نہ تو تشویش محسوس کر رہا تھا اور نہ ہی مضطرب تھا۔ البتہ وقت گزاری کے
 لیے ٹہل ضرور رہا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور نرس باہر آئی۔ وہ بڑی طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر
 ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”لُل..... لڑکا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

”جی..... وہ..... دو..... دو تھے۔ لیکن صرف ایک ہی نظر آ رہا ہے۔ دوسرے کو
 صرف چھو کر ہی اس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔“

میں بوکھلا کر رہ گیا۔ گویا ایک بچہ پیدا کئی طور پر غائب تھا۔

چند روز میں پتہ چلا کہ وہ کبھی حاضر ہو جاتا ہے..... اور کبھی غائب۔ یہ بڑی دشواری کی
 بات تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا ادھر سے ادھر ہو جاتا اور ہمیں ٹولنا پڑتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پھونک پھونک
 کر قدم رکھنے لگے۔ یہ اس نامعقول دوا کا شاید آخری تحفہ تھا۔ میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

..... پھر ایک روز مسکرائیل، سلطان اور مرزا ہمیں مبارک باد دینے، ہمارے گھر آئے۔

”کہاں ہیں، وہ دونوں؟“ سلطان نے پوچھا۔

”ایں..... ابھی تو یہیں تھا۔“ میں نے دیکھا تو ایک بچہ پھر غائب تھا۔

”یہ لیٹا تو ہے۔“ مسکرائیل نے اشارہ کیا۔

سلطان اور مرزا نے گھور کر اسے دیکھا۔ انہیں بچہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مسکرائیل فوراً معاملے
 کی نزاکت بھانپ گیا۔ اس نے جھٹ بات بنائی۔ ”میرا مطلب ہے، یہیں ہوگا۔“

ریشماں نے بچے کو ٹول کر گود میں اٹھایا اور سلطان کی طرف بڑھا دیا۔ سلطان حیران نظر

”تو وہ جو شعر آپ مجھے سناتے تھے.....“
 ”ایکسکوز می۔“ میں نے کہا اور باہر کی طرف بھاگا۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر میں
 نے مسکرائیل کو جھوٹا ڈالا۔ ”اے بھائی..... یہ احمد فراز کا کیا چکر ہے۔ کون ہے، وہ؟“
 ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔“ مسکرائیل نے کہا۔ ”بہر حال، وہ ایک شاعر ہے۔“
 ”اور مجھے اس کی زبان میں بات کرنی ہے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”کہیں سے
 مجھے اس کی زبان لا دو۔“

”احق ہوں تم..... فراز کے کئی مجموعی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرو۔“

”اس وقت مطالعہ کروں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں شاعری.....“

”روکو..... رکو..... ارے بھائی، اسی فراز کی وجہ سے تو تمہاری شادی ہوئی ہے۔“
 مسکرائیل نے کہا۔

”کیا مطلب ہے، تمہارا؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا..... رہنماں تم سے متاثر تو تھی، لیکن تم میں اسے ذوق لطیف
 کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی نظر میں تم ایک خشک آدمی تھے۔ میں نے اس کی الماری میں
 شعری مجموعوں کی کثرت دیکھی تو سمجھ گیا۔ بس، پھر کیا تھا۔ میں نے بہت سارے مجموعے
 خریدے..... رٹال لگایا اور روز ریشماں کو غزلیں سنانے لگا۔ تب اسے پتہ چلا کہ تم خوش ذوق بھی
 ہو۔ اور بات بن گئی۔“

”تم نے مجھے مروادیا۔“ میں کراہا۔ ”ارے..... میں تو اس معاملے میں نہایت ہی
 بد ذوق ہوں۔ اب کیا ہوگا؟“

”شادی تو ہو چکی ہے۔“ مسکرائیل مسکرایا۔ ”ذوق اب بہتر کر لینا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا..... اور جگہ عروسی کی طرف واپس چل دیا۔

☆.....☆.....☆

داستانوں کی روایت کے مطابق تو میری داستان ختم ہو چکی..... لیکن میری داستان
 درحقیقت بے حد غیر روایتی ہے۔ ابھی اس کا ایک باب باقی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں طبعاً
 شرمیلا آدمی ہوں۔ اپنی ازدواجی زندگی کا تذکرہ ہرگز نہیں کروں گا۔ بہر طور، زندگی ایک ڈھرے
 پر لگ گئی تھی۔ میں نے شہر کے ایک بارون علاقے میں اپنا میڈیکل اسٹور کھول لیا۔ فرصت کے
 اوقات میں فراز، ناصر کاظمی اور دیگر شعراء کا مطالعہ کرتا..... تاکہ ذوق لطیف رکھنے والی بیوی کے
 معیار پر پورا اتر سکوں..... پھر میرے شجر زندگی پر پہلی کوئیل پھونٹنے کے دن آئے۔
 اس روز سلطان، مرزا و ہشت بیگ اور مسکرائیل میرے اسٹور پر جمع تھے۔

آ رہا تھا۔ لیکن اس نے بچے کو گود میں لے لیا..... پھر شاید اس نے بچے کی نادیدہ پیشانی چوم لی۔
 ”اے رکیوں بے وقوف بنارہے ہو۔“ مرزا منمنایا۔ ”زبردستی ایک کے دو بنا کر پبلک کو
 الو بناتے ہو؟“

”لو، خود دیکھ لو۔“ سلطان نے بچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔
 ”میں اتنا بے وقوف نہیں.....“ مرزا نے کہنا چاہا..... لیکن اسی وقت میرے پسر شیرخوار
 نے وہ حرکت کر ڈالی، جو بچے اطمینان سے، خود کو اٹھانے والوں پر کر ڈالتے ہیں۔ مرزا کا سینہ
 بھیگ گیا اور وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ ”نظر تو نہیں آ رہا..... لیکن کچھ بتاتے ہں کہ باپ پر گیا
 ہوگا۔“ اس نے بھنا کر کہا۔

”نام کیا رکھے؟“ مسکرائیل نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ نام پہلے سے سوچ لینا۔“

”ایک کا تو نام عمران ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کس کا؟“ مرزا نے پوچھا۔

”اس کا، جو حاضر ہے۔“ سلطان بولا۔

”اور دوسرے کا؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ”بعد میں دیکھیں گے۔“ میں نے بات ڈال دی۔

”ارے..... مجھ جیسا ناول نگار جو موجود ہے۔“ مرزا نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ ”میں بتاتا

ہوں، تم اس کا نام غامض رکھ لو۔“

”یہ کیا نام ہوا؟“ سلطان نے کہا۔

میں نے ریشماں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے وہ منفرد نام

برائیں لگا۔ مجھے بھی فوراً ہی وہ نام پسند آ گیا۔ ”لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مطلب ہی کے لحاظ سے تو یہ سو فی صد مناسب ہے۔“ مرزا سر ہلا کر بولا۔ ”غامض کا

مطلب ہے ناقابل فہم، پوشیدہ۔“

”بس، ٹھیک ہے۔“ ریشماں نے کہا۔ ”اس کا نام غامض ہوگا۔“

”لیکن کہیں تم ابوالغامض نہ ہو جانا۔“ مسکرائیل نے وارننگ دی۔

”نہیں..... نہیں..... ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

ریشماں مسکرانے لگی۔ میں اسے دوائے غیاب کے متعلق بتا چکا تھا۔ آخر وہ میری نصف

بہتر تھی۔

قسم کے ناول، مابعد الطبیعت، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
 انڈیل پبلک
 0301-7283296
 0334-9639911
 424
 عظیم احمد طارق *
 نزد محفہ کھرکالیہ